جامعہ
جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ
مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
1927

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زیر ادارت

مولینا اسلم جیراجپوری　　　ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی

جلد ۱۲	بابتہ ماہ جنوری ۱۹۲۹ء	نمبر ۱

فہرست مضامین

کیا اکبر اُمّی محض تھا؟

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اکبر لکھنا پڑھنا مطلقاً نہیں جانتا تھا۔ انگریز مورخین کی بھی یہی رائے ہے۔ البتہ نریندر ناتھ لا نے اپنی کتاب 'پروموشن آف لرننگ' میں اس سے اختلاف کیا ہے[1]۔ بیورج نے اپنی کتاب کا جو پیش نامہ لکھا ہے اس میں اس نے نریندر ناتھ کے خیال کی تردید[2] کرکے اکبر کے ناخواندہ ہونے پر زور دیا ہے۔ ہم ان سطور میں اس مسئلہ پر مفصل بحث کرتے ہیں۔

جہانگیر اپنی تزک میں لکھتا ہے[3]:-

"پدرمن در اکثر اوقات با دانایان ہر دین و مذہب صحبت می داشتند۔ خصوصاً باپنڈتان و دانایان ہندو باآنکہ اُمی بودند از کثرت مجالست با دانایان و ارباب فضل در گفتگو ہا چناں ظاہر می شد کہ ہیچ کس پے بامّی بودن ایشاں نمی برد و بدقائق نظم و نثر چناں می رسیدند کہ مافوقے بران متصور نبود۔"

اسمتھ اپنی مشہور تاریخ 'اکبر' میں لکھتا ہے[4] کہ "اگرچہ اکبر کی تعلیم کے لئے چار استاد یکے بعد دیگرے مقرر ہوئے مگر اُن کی سب کوششیں ناکام رہیں۔ اکبر استاد کے نقطۂ خیال سے بالکل ناکارہ تھا اُسے لکھانے پڑھانے کیلئے جس قدر کوششیں کیگئیں اُن سب کا اس نے اس کامیابی سے مقابلہ کیا کہ وہ الف بے بھی نہ سیکھ سکا۔ وہ آخر عمر تک نہ کچھ پڑھ سکتا تھا اور نہ اپنا نام لکھ سکتا۔"

---

[1] نریندر ناتھ لا۔ پروموشن آف لرننگ صفحہ ۱۳۹

[2] ایضاً ایضاً پیش نامہ صفحہ ی ط

[3] تزک جہانگیری مدوّنہ سرسید احمد مرحوم صفحہ ۱۴

[4] اسمتھ۔ 'اکبر' صفحہ ۲۲

اسمتھ کا یہ خیال کہ وہ آخر عمر تک لکھ پڑھ نہیں سکتا تھا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ جب چار استاد یکے بعد دیگرے مقرر کئے گئے تو یہ قریب قریب ناممکن ہے کہ اکبر جیسا ذہین اور قوی حافظہ لڑکا لکھنا پڑھنا بھی نہ جان سکے۔ یہ مانا کہ اکبر نہایت بدشوق اور کھلاڑی تھا جس سے اُس کے استاد عاجز تھے۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ وہ لکھنا پڑھنا مطلقاً کچھ نہ سیکھ سکا۔ علاوہ بریں ہمایوں کی سخت تاکید اور نگرانی تھی اسی لئے یکے بعد دیگرے چار استاد مقرر ہوئے۔ جہاں ایک استاد کی غفلت معلوم ہوئی وہ علیحدہ کردیا گیا اور دوسرا مقرر ہوا۔ ہر نیا استاد شروع شروع میں اکبر سے ضرور کام لیتا ہوگا ہمایوں کس طرح گوارا سکتا تھا کہ اُس کا اکلوتا بیٹا لکھنا پڑھنا بھی نہ جانے۔ فارسی خط بمقابلہ لاطینی یا ہندی خط کے مشکل اور پیچیدہ ضرور ہے مگر اس قدر نہیں کہ ایک ذہین لڑکا متواتر چار یا پانچ استادوں کی کوششوں کے باوجود اسے نہ سیکھ سکے۔ یہ مانا کہ اُس زمانہ میں مطبوعہ کتب نہ تھیں اور نہ خطِ شکستہ کا زیادہ رواج تھا مگر اسی کے ساتھ یہ بھی تو صحیح ہے کہ اکثر قلمی نسخے آجکل کی مطبوعہ کتب سے نہایت عمدہ لکھے ہوتے تھے اور اِس زمانہ کی طباعتِ سنگ بھی آخر کیا ہے؟ یہ بھی تو قلمی خط کا عکس ہے۔

ہاں اس میں کچھ شک نہیں کہ اکبر عالم فاضل نہ تھا مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ لکھنا پڑھنا مطلقاً نہیں جانتا تھا۔ تاریخ فرشتہ میں ہے[۵]۔

"اگرچہ خط و سواد کامل نہ داشت اما گاہے شعر گفتے و در علم تاریخ وفنے تمام داشت وقصص ہند نیکومی دانست۔"

لفظ 'کامل' صاف طور پر بتلا رہا ہے کہ وہ کچھ لکھنا پڑھنا ضرور جانتا تھا۔ اگر وہ محض جاہل وناخواندہ ہوتا لفظ 'کامل' کی جگہ 'مطلقاً' یا 'کلیتہً' استعمال کرتا۔

اسمتھ کی رائے تمامتر اکبرنامہ کی ایک عبارت پر منحصر ہے جسکا ترجمہ خود اُس نے اپنی

---

[۵] تاریخ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۵۱۶۔

کتاب میں نقل کیا ہے۔ اصل عبارت یہ ہے[1]:۔

"بر خردمندانِ دقیقہ شناس پوشیدہ نیست کہ تعین معلم دریں جا از باب رسوم و عادت است نہ از قسم اکتساب کمالات۔ وگرنہ دانش پرور ایزدی را بہ تعلم از مخلوق و توجہ بسبق چہ نیاز و لہذا ہرگز خاطر اقدس و باطن مقدس متوجہ تعلیم صوری نہ بود۔ و عمدۂ حِکم و مصالح بے میلیٔ آنحضرت بحرف آموزی رسمے آنکہ درزمان ظہور انوار فتوحاتِ غیبی برجہانیاں ظاہر شود کہ دریافت بلند ایں خدیو زماں آموختگی و ساختگی نیست۔ واد الٰہی است کہ تگاپوئے بشری را درآں مدخل نبودہ۔

وآنحضرت درآں زماں بہ نجنوری ظاہری وفراوانی دولت صوری اختصاص داشتہ از اظہار کمالات معنوی خود تجاہلِ عارف نمودہ اکثر اوقات بہ بازی می پرداختند و درنقاب خفا کارِ ہوشمندی می کردند بطوریکہ دوربینان روزگار را بر آں نظر می افتاد۔"

اس تمام عبارت کا لب لباب یہ ہی تو ہے کہ جب اکبر خداوند تعالیٰ سے براہِ راست علم و تلقین حاصل کرتا ہے تو اُسے کسی انسان کے شاگرد ہونے کی کیا ضرورت۔ اس عبارت میں دو مقدر سوالوں کے جواب ہیں۔ ایک سوال تو یہ کہ اکبر نے حرف آموزی سے کیوں جی چرایا اس کا تو یہ جواب دیا ہے کہ "تاکہ بڑے ہونے پر جب اُس سے فتوحاتِ غیبی ظاہر ہوں تو لوگ اسے الہام سمجھیں۔ اگرچہ لفظ 'الہام' استعمال نہیں ہوا مگر مصنف کی مراد اسی سے ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ جب اکبر کو یہ سعادت حاصل تھی تو وہ دوسرے کم سمجھ نادان بچوں کی طرح کھیل کود میں کیوں اپنا وقت ضائع کیا کرتا تھا۔ اس کا یہ جواب دیا ہے کہ کمالات معنوی کے اظہار سے تجاہلِ عارفانہ کیا کرتا تھا تاکہ دیکھنے والے ہی دیکھ سکیں کہ وہ لہو ولعب کے پردہ میں کس قدر عقل کا کام کرتا ہے۔ اسمتھ نے اس عبارت کا بیورج والا ترجمہ نقل کیا ہے۔ اس نے "عمدۂ حِکم و مصالح بے میلی

---

[1] اکبرنامہ (مطبوعہ کلکتہ ۱۸۷۷ء) جلد اوّل صفحہ ۲۷۱۔

آنحضرت" کا ترجمہ بالکل غلط کیا ہے۔ وہ " عمدۂ حکم و مصالح " کے یہ معنی سمجھا ہے کہ اکبر عمدہ حکمتوں سے ماہر تھا۔ پورے فقرہ کا ترجمہ اس طرح کیا ہے:۔ "اکبر کے عمدہ حکمتوں میں ماہر ہونے اور نیز حرف آمیزی کی طرف مائل نہ ہونے کا سبب یہ ہے ....۔"

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ کی اس غلطی سے اصل مطلب پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ لیکن ذرا غور کرنے سے کافی فرق معلوم ہوتا ہے۔ اکبرنامہ کے مصنف کا منشا اس فقرہ سے اکبر کی بدشوقی اور اُس کے لکھنے پڑھنے کی طرف مطلقاً توجہ نہ کرنے کی بہترین مصلحت بیان کرنا ہے۔ اس طریقہ بیان سے مصنف کی غرض اخفائے حقیقت زیادہ صاف معلوم ہوتی ہے بمقابلہ اس مفہوم کے جو بیورج نے لیا ہے۔

تعجب ہے کہ باوجود اکبرنامہ و آئین اکبری میں اکثر مقامات پر اکبر کے براہ راست چشمۂ لم یزلی سے انوار علم و حکمت مقتبس کرنے کا تذکرہ ہے جو خوشامد و غلط بیانی کے علاوہ بمقتضائے "پیراں نمی پرند و مریداں می پرانند" خدع و زور سے کسی طرح خالی نہیں۔ اسمتھ جیسا قابل مورخ اس قسم کے بیان کو اس قدر صحیح سمجھتا ہے کہ سرمو اس سے تجاوز کرنا نہیں چاہتا۔

اُمّی محض ہونے کا دعوی ایسے شخص کے لئے جو انبیا و رُسل اور بانیانِ مذاہب کے طبقۂ عالیہ میں کسی نہ کسی طرح جگہ پانے کیلئے بیقرار ہے ایسی صورت میں جبکہ رسالت مآب محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو مسلمانوں کے نزدیک خاتم الرسل اور سردار انبیا ہیں اُمّی محض تھے ایک معمولی بات ہے۔

یہاں تک تو اسمتھ کا جواب ہوا۔ رہا جہانگیر کا ریمارک۔ اس کا بھی ایک جواب تو یہی ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ تزک جہانگیر کے دو نسخے ہیں۔ ایک وہ جس کو سر سید احمد مرحوم نے مدوّن کیا اور جسکو روجرز نے انگریزی کا جامہ پہنایا۔ دوسرا نسخہ وہ جس کا پرائس نے ترجمہ کیا۔ اصل نسخہ ہنوز شائع نہیں ہوا اس کا برٹش میوزیم میں کوئی نسخہ موجود نہیں۔ اس لئے میں نہ دیکھ سکا۔ پرائس کا ترجمہ اس وقت پیش نظر ہے اسمیں ایک مقام پر جہانگیر اکبر کی بابت لکھتا ہے[۱]:۔

---

[۱] پرائس۔ انگریزی ترجمہ واقعات جہانگیری مطبوعہ ۱۸۲۹ء صفحہ ۴۴ و ۴۵۔

"ان پنڈتوں کے ساتھ میرے والد ہمیشہ گفتگو کیا کرتے تھے۔ وہ درحقیقت ہندوؤں کے ہر قسم کے علما کے ساتھ صحبت رکھتے تھے۔ اگرچہ وہ اُن کی قابلیتوں سے خاص طور پر فائدہ نہ اٹھا سکے لیکن ان کی نثر و نظم میں اس قدر لطافت آگئی تھی کہ ایک انجان شخص ان کو جملہ علوم و فنون کا عالم جید خیال کرتا ہوگا۔"

اگر پرائس والی تزک کے اس مقام کا دوسری تزک کی اوپر نقل کی ہوئی عبارت سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دونوں عبارتوں میں ایک ہی مضمون ہے لیکن پہلی عبارت میں لفظ امّی دو جگہ آیا ہے اور اس میں ایک جگہ بھی نہیں۔

اس دوسری تزک (جسے پرائس نے واقعاتِ جہانگیری کا نام دیا ہے) کے اصلی ہونے کی بابت بہت کچھ شکوک ظاہر کئے گئے ہیں۔

ریو مرتب فہرست متحف برطانوی لکھتا ہے[۱] کہ دوسری تزک جو جعلی ہے شاہجہاں کے اوائل عہد میں اصلی تزک کو جس میں شاہجہاں کے خلاف بہت سی باتیں ہیں پس پشت ڈالنے کے لئے لکھی گئی۔

ایلیٹ بھی ریو کا ہم خیال ہے۔ اس نے ان دونوں تزکوں کے چند جزوی اختلافات کو بیان کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ تزک کسی بادشاہ کی نہیں بلکہ جوہری کی تصنیف ہو سکتی ہے کیونکہ اس میں زر و سیم اور جواہرات کی قیمتوں سے خاص طور پر اعتنا کیا گیا ہے[۲]۔ جس قدر اختلافات بیان کئے گئے ہیں وہ زیادہ تر مختلف چیزوں کے مصارف کے تخمینہ کی بابت ہیں۔

میرا خیال ہے کہ اس تنقید مخالف کا خواہ وہ ریو کی ہو یا ایلیٹ کی ہو اس مشکوکہ تزک کی بحث ما نحن فیہ پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ کیونکہ اس بحث کا تعلق نہ شاہجہان سے ہے جو شاہجہاں کی وجہ سے بدلدی گئی نہ زر و سیم کی قیمت یا تخمینۂ مصارف سے ہے کہ اس میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہو۔ اس کا تعلق تو اکبر کے امّی وغیر امّی ہونے سے ہے جسے دونوں نقادوں کی تنقیدوں سے کچھ سروکار نہیں۔

---

[۱] ریو۔ فہرست کتب فارسیہ متحف برطانوی صفحہ ۲۵۳۔

[۲] ایلیٹ۔ تاریخ ہند جلد ۶ صفحہ ۲۵۱ سے ۳۹۱ تک۔

علاوہ بریں "واقعاتِ جہانگیری" اگر جہانگیر کی لکھی یا لکھائی ہوئی نہیں ہے تو کم ازکم اس کے شاہجہان کے ابتدائی عہد میں لکھے جانے سے کسی کو انکار نہیں اور یہ وہ زمانہ تھا جو نہ تو اکبر کے عہد سے بہت پیچھے تھا اور نہ اُس ذہنیت سے جو عہدِ اکبری میں بانیٔ دینِ الٰہی کے زیرِ حمایت نشو ونما پا رہی تھی متاثر تھا۔ اس لئے اس نام نہاد واقعاتِ جہانگیری کی شہادت تزکِ اصلی کے مقابلہ میں کم ازکم بحث ما نحن فیہ کے متعلق زیادہ معتبر ہو سکتی ہے۔

رہی کیتھولک مشن کی شہادت کہ اکبر اُمّی محض تھا اس کا جواب یہ ہے کہ جب اکبر اور ارکانِ سلطنت کسی خاص غرض سے اس کے خواندہ ہونے کو چھپا رہے تھے تو ایک اجنبی جماعت جسے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع خاص صورت میں ملتا تھا حقیقتِ حال کیونکر معلوم کر سکتی تھی۔

اکبر کے اُمّی ہونے کی تائید میں ایک دلیل یہ پیش کیجاتی ہے کہ ہندوستان میں بادشاہوں کا ناخواندہ ہونا کوئی نئی بات نہیں۔ علاء الدین خلجی اور سلطان حیدر علی لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ ان کی بابتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس بات کی کوئی شہادت موجود نہیں کہ یہ مکتب میں بٹھائے گئے تھے یا ان کی تعلیم کے لئے استاد مقرر ہوئے تھے۔ یہ دونوں سپاہی زادہ تھے اور سپاہی زادہ اُس زمانہ میں عام طور پر نوشت وخواند سے بے بہرہ ہوتے تھے۔ ان کے مقابلہ میں ہمایوں کو اکبر کی تعلیم کی طرف پوری توجہ تھی۔ وہ خود عالم تھا۔ اُس نے کئی استاد یکے بعد دیگرے مقرر کئے۔ اس کا ایک خط موجود ہے جس میں اس نے اکلوتے بیٹے کو تعلیم کی بابت بہت کچھ شفقت انگیز نصیحتیں کی ہیں۔

یہ امر دیگر ہے کہ پدرِ شفیق کی اس قدر توجہ واقتضا کے باوجود وہ علم حاصل نہ کر سکا لیکن اس کے ساتھ یہ لغو ہے کہ وہ لکھنا پڑھنا بالکل نہ سیکھ سکا۔ ذہین بچے لکھنا پڑھنا بہت جلد سیکھ جاتے ہیں البتہ شوق نہ ہونے کی صورت میں زیادہ ترقی نہیں کر سکتے۔ کوئی ایسی مثال نہیں کہ بچہ باقاعدہ مدرسہ میں بٹھایا گیا ہو یا اس کے لئے استاد مقرر کیا گیا ہو اور کچھ زمانہ تک یہ سلسلہ جاری رہا ہو اور وہ تاہم لکھنے پڑھنے سے نابلد رہا ہو۔ الف بے تے لکھنے کے بعد سب سے پہلے لڑکے کو اپنے نام لکھنے کا شوق ہوتا ہے۔ لفظ اکبر کا لکھنا مشکل نہیں۔ پھر یہ کس طرح ذہن میں آسکتا ہے کہ وہ اپنا نام تک

لکھنا نہیں جانتا تھا۔

ہمایوں اپنے بیٹے کو اکثر خط لکھا کرتا تھا۔ یہ کسی طرح قرینِ قیاس نہیں کہ ایسے بیٹے کے پاس جسکی تعلیم کے لئے استاد مقرر ہوں باپ کا خط آئے اور وہ اُسے مطلقاً نہ پڑھ سکے۔

ابوالفضل نے آئین اکبری میں "آئین آموزش" کے زیر عنوان جو کچھ لکھا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ "بفرمودۂ گیتی خداوند" طریقۂ حرف آموزی وتعلم اس قدر سہل کر دیا گیا کہ "بدیں روش آنچہ بسالہا آموختے بماہ بل بروز کشید و جہانے بہ شگفت درآمد"

اس سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ اکبر سواد خواں تھا۔ تب ہی تو وہ یہ طریقہ نکال سکا۔ اگر خود اُس نے یہ طریقہ ایجاد نہیں کیا تو کم از کم مشورہ ضرور دیا۔ طریقۂ نوشت وخواند کی تسہیل کی بابت مشورہ وغیرہ دینا اسی شخص کا کام ہوسکتا ہے جو خود لکھنا پڑھنا جانتا ہو۔ اور اگر بفرض محال اُس نے اپنے زمانۂ طفولیت میں لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا تو کیا یہ قرین قیاس ہے کہ اس کے تخت سلطنت پر متمکن ہونے کے بعد جب "آئینِ آموزش" اس قدر سہل ہو جاتا ہے تو وہ اس سے متمتع نہیں ہوتا اور جوں کاتوں ناخواندہ رہنا گوارا کرتا ہے۔ مذہبی آزادی وروحانی بلند پروازی تو آگے چلکر پیدا ہوئی۔ اوائل حکومت میں تو وہ ہر طرح محتاط و پاسدار مذہب تھا۔ اگر طفولیت میں اُس نے بفرض محال لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا تھا تو نئے قسم کے خیالات پیدا ہونے تک یعنی اُس زمانہ تک جب "امّی" بننے کا سودا پیدا ہوا وہ ضرور لکھنا پڑھنا سیکھ گیا ہوگا۔

علاءالدین اور حیدر علی کی بابت یہ نکتہ بھی قابل لحاظ ہے کہ ان دونوں میں سے کسی نے نبی یا بانئ مذہب ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ لہٰذا اگر ان کی ناخواندگی مشہور رہے تو وہ درحقیقت ناخواندہ ہی ہوں گے خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ ان کی تعلیم کا کچھ حال معلوم نہیں۔ لیکن اکبر کا ناخواندہ مشہور ہونا اسکے مذہبی خیالات کی بنا پر کافی مشکوک ہے اور دیگر دلائل کی روشنی میں کلیۃً مردود۔

---

۵ آئین اکبری مطبوعہ کلکتہ جلد اول صفحہ ۲۰۱۔

ابوالفضل آئینِ اکبری میں لکھتا ہے[1]:۔

"روز بروز کاردانان آگاہ دل آنرا بوقت عرض ہمایوں رسانند و ہر کتابے را از آغاز تا بانجام شنوند و ہر روز کہ بداں جا رسد بشمارۂ آں ہندسہ بقلم گوہر بار نقش کنند و بعدد اوراق خوانندہ را نقد از سرخ و سفید بخشش شود"

اس عبارت سے ظاہر ہے کہ اکبر ہندسہ لکھنا جانتا تھا۔ بلاخ مَن نے اس عبارت کا ترجمہ اس طرح پر کیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ فقط نشان کر دیتا تھا۔ اس کے ترجمہ کا ترجمہ یہ ہے "...... جہاں کہیں پڑھنے والے رُک جاتے ہیں۔ بادشاہ اپنی قلم سے صفحات کے عدد کے مطابق نشان بنا دیتا ہے ......" یعنی وہ "بشمارۂ آں ہندسہ" کا ترجمہ "صفحات کے عدد کے مطابق" کرتا ہے۔ وہ 'کردن' کو فعل مفرد سمجھکر 'نقش' کو مفعول قرار دیتا ہے اور لفظ 'ہندسہ' سے صفحات مراد لیتا ہے۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ دراصل 'نقش کردن' فعل مرکب ہے بہ معنی "ثبت کردن" اور 'ہندسہ' اس کا مفعول ہے۔ اس جملہ کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ ہر روز جہاں کہیں پڑھنے والا پہونچتا ہے اُس کے عدد کے مطابق ہندسہ بنا دیتا ہے۔ 'اسکے' میں ضمیر راجع ہے یا تو 'روز' کی طرف یا 'جا' کی طرف۔ یعنی شمارآں سے مراد یا تو 'شمار روز' یعنی تاریخ ہے یا "شمار جا" یعنی شمار صفحہ۔ مطلب یہ ہے کہ ہر روز اپنی قلم سے جہاں تک پڑھا جاتا ہے تاریخ بنا دیتا ہے۔ بلاخ من کا ترجمہ غلط بھی ہے اور بے معنی بھی کیونکہ صفحات کے نمبر کے مطابق نشان بنا دینے کے کچھ معنی نہیں۔ اگر یوں کہتا کہ صفحات کے نمبر پر نشان کر دیتا ہے تو بھی ایک بات ہوتی۔ گلیڈون نے اس فقرہ کا ترجمہ قریب قریب صحیح کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ[2] تاریخ ماہ کے ساتھ اس جگہ جہاں پڑھنے والا چھوڑتا ہے نشان بنا دیتا ہے۔ بہرحال اس فقرہ سے دو معنی سمجھے جا سکتے ہیں یا تو صفحات کے نمبر

---

[1] آئین اکبری مترجمہ بلاخ من جلد اوّل صفحہ ۱۰۵۔

[2] انگریزی ترجمہ آئین اکبری از گلیڈون (مطبوعہ کلکتہ) صفحہ ۱۳۰

لکھ دینا یا تاریخ بنا دینا (آخری معنی زیادہ صحیح ہیں) دونوں صورتوں میں اکبر کا مہندسہ لکھ دینا ثابت۔

امیر حیدر حسینی واسطی بلگرامی نے جو غلام علی آزاد کے نبیرہ تھے اکبر کی تاریخ میں ایک کتاب موسوم بہ "سوانح اکبری" لکھی ہے۔ اکبرنامہ۔ تاریخ بدایونی۔ طبقات اکبری۔ تاریخ فرشتہ اکبرنامہ شیخ اللہ داد فیضی سرہندی۔ ماثر الامرا اور چہار دفتر منشآت ابوالفضل۔ اس کتاب کے ماخذ ہیں۔ منشآت ابوالفضل کی بابت قابل مصنف لکھتا ہے کہ عام طور پر تین دفتر متداول ہیں اور چوتھا دفتر جو پر از معلومات ہے کمیاب ہے۔ میں نے اس سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ اس تالیف کی اہمیت کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بلاخ من جیسا فاضل مورخ اسے "تنقیدی تاریخ" بتاتا ہے اور لکھتا ہے[۵] کہ "تاوقتیکہ تاریخ عہد اکبر کے متعلق تمام مصادر و ماخذ کا ترجمہ نہ ہو جائے میں یورپین مورخین کو یہ رائے دونگا کہ انہیں 'سوانح اکبری' کو اپنی محنت و کاوش کی بنیاد قرار دینا چاہئے۔ اس کتاب کی تالیف میں ان تاریخوں سے مدد لیگئی ہے جن سے بیشتر مورخین نے کام نہیں لیا۔ ہندوستانی کی لکھی ہوئی تنقیدی تاریخ غالباً صرف یہی ایک ہے۔"

اس سوانح اکبری میں فاضل مورخ اکبر کے مکتب میں بیٹھنے کا حال یوں لکھتا ہے[۶]۔

"مکتب نشستن شاہزادہ و ذکر اساتذہ او۔ ہفتم شوال سال نہصد و پنجاہ و چہار کہ از عمر شاہزادہ چہار سال و چہار ماہ و چہار روز بسر شدہ بود در مکتب درآوردند و ملا زادہ عصام الدین ابراہیم را بایں خدمت اختصاص بخشیدند و از سوانح ایں کہ برائے افتتاح ساعتے خاص باتفاق اہل تنجیم تعین کردہ بودند۔ چوں ساعت مختار رسید شاہزادہ ندوق بازی در گوشہ رفت کہ با ایں ہمہ توجہ و اہتمام جنت آشیانی ہر چند تکاپو نمودند پے نبردند۔ و ہمانا حکمت ایزد دریں باب نزد مولف آنست کہ ظاہر بیناں معلوم کنند کہ حصول این

---

[۵] ترجمہ آئین اکبری۔ بلاخ من صفحہ ۳۱۶ حاشیہ ذیلی۔

[۶] سوانح اکبری قلمی نسخہ صفحہ ۱۹۔ برٹش میوزیم۔

امر موقوف بر عنایت فیاض حقیقی است۔ در ہند رسوم اصحاب علم نجوم گرفتار نباید بود۔ چنانچہ پادشاہ با آنکہ در ساعتِ مختار ستارہ شناساں آغاز خوانداں نہ نمود لیکن استعداد شائستہ درادراک دقائق شعر و انشا پیدا کرد و خود ہم سخن را موزوں می نمود "

اس عبارت کے آخری حصہ سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ وہ تعلیم سے ضرور بہرہ اندوز ہوا۔ فاضل مورخ نے اکبر کے "ساعتِ مختار" کے وقت روپوش ہوجانے کی جو مصلحتِ ایزدی بیان کی ہے اگر معقول نہیں نہ سہی اس کا اصل مطلب پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ ہمارا مدعا اس عبارت کے نقل کرنے سے صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ 'سوانح اکبری' کے فاضل مؤلف کے نزدیک بھی اکبر کسی صورت سے امی اور ناخواندہ نہ تھا۔ وہ بہرصورت حاصل ہے۔

علاوہ بریں رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں ظفرنامہ کا ایک قدیم قلمی نسخہ ہے۔ اس کے سرورق پر اکبر کے دست خاص کا لکھا ہوا لفظ 'فروردیں' موجود ہے۔ اس کے نیچے جہانگیر کے قلم کی لکھی ہوئی یہ تصدیق ہے کہ یہ لفظ عرش آشیانی کا لکھا ہوا ہے اور پھر اس کے نیچے شاہجہاں کی تحریر ہے۔ یہ لفظ 'فروردیں' نہ کسی مبتدی بچہ کا خط معلوم ہوتا ہے اور نہ کسی منشیِ خوش قلم کا۔ اوسط درجہ کا خط ہے۔

ان سطور کو ملاحظہ کرنے کے بعد قارئین کرام خود اندازہ فرماسکتے ہیں کہ اسمتھ کا یہ خیال کہ "اکبر آخر عمر تک نہ کچھ پڑھ سکتا تھا اور نہ اپنا نام لکھ سکتا" یا جہانگیر کا یہ ریمارک کہ "اُمّی بودند" کہاں تک صحیح یا غلط ہے۔

زرتشت اور بدھ

(۲)

(بسلسلہ ماہ نومبر)

جب ہم زرتشتیت کے خدا کی حقیقت و ماہیت سے گزر کر اُس کے افعال و اعمال کی طرف توجہ کرتے ہیں تو ہم کو یہ نظر آتا ہے کہ اہورا مزدہ کی تمام طاقتیں حق و عدل کو اپنی پشت پناہی میں لئے ہوئے ہیں اور جملہ سئیات و منکرات کے خلاف صف آرا ہیں۔ یہ دوگونہ خیال فوراً عقیدۂ جزا و سزا کی تعمیر کر دیتا ہے۔ زرتشت ایک ایسے وقت کی آمد کا امید وار ہے جبکہ حق و باطل کا یہ معرکہ اول الذکر کی فتح کامل پر ختم ہو جائیگا۔ حق کی یہ جیت دنیا کے حق و ناحق کے بڑے بڑے کیمپوں سے لیکر معمولی افراد کے باہمی تنزاعات و مشاجرات تک حاوی ہوگی۔ (حدیث نبوی متعلق یوم الحساب .... یہاں تک کہ بے سینگ والی بکری سینگ والی بکری سے بدلہ لیگی!) پس زمین پر خدا کی بادشاہت آنیوالی ہے، اور جبروت" اسکی زندہ و موجودہ علمبردار ہے۔ مرنے پر ہر شخص کا جائزہ لیا جاتا ہے جس کے بعد نیک کردار لوگ اہورا مزدہ کے "دارالنغمات" میں چلے جاتے ہیں، اور بُرے لوگ ایک غار تاریک و عمیق میں جا گرتے ہیں جہاں تمام ارواح خبیثہ انکی رفیق حال اور شریک عذاب ہوتی ہیں (ملاحظہ ہو یاسن ۴۸-۷، ۵۱-۴۵-۸، اور ۵۰-۴ نیز ۴۶-۱۱، ۳۱-۲۰، اور ۴۹-۱۱) ان فیصلجات میں مسند عدل و قضا پر خود زرتشت متمکن ہوتا ہے۔

"جو لوگ افکار سینہ کی اقلیم کا تاج و تخت حاصل کر لیتے ہیں وہ اُس دن انتہائی کسمپرسی کی حالت میں ہوں گے۔ وہ نالۂ و فغاں کرتے ہوں گے اور پیغمبر کی نوید راحت کے لئے تڑپتے ہوں گے۔ لیکن اُسوقت پیغمبری ان کی محرومی پر مُہر لگا دیگا اور اُن کو

چہرۂ حق کے مشاہدے سے دیدہ پردوختہ کردے گا" (یاسن ۳۲ - ۱۳)

"فانی انسانوں میں سے جس کسی کو اسپیتاما زرتشت کی خوشنودیِ مزاج حاصل کرنے کی توفیق ہوگی اُس کو امورامرزدہ زندگی دوام بخشیگا" (یاسن ۴۶ - ۱۳)

زرتشت، شافع امت کی قبا میں بھی نظر آتا ہے، چنانچہ:

"جو کوئی انسان، مرد ہو خواہ عورت، ایسے کام کرتا ہے جو خدا کی نظر میں پسندیدہ اور بہترین اعمال ہیں اُس کو مزدہ آہورا فکرِ صالح کے توسط سے جبروت عطا کریگا۔ میری جماعت کے جو لوگ فرائض عبادت و عبودیت بجالائینگے ان کو اپنی معیت میں لیکر میں پُل صراط کو عبور کردوں گا" (یاسن ۴۶ - ۱۰)

گاتھہ کے اندر اسی قسم کے بیانات کے بین السطور میں ایسا مترشح ہوتا ہے کہ شفاعت کے دائرے میں زرتشت انہی لوگوں کو لینا چاہتا ہے جنہوں نے اسکی حیات میں اسکی ہدایت و لقا کو حاصل کیا اور غالباً وہ ان لوگوں کو اپنے علَم کے سایہ میں رکھنا نہیں چاہتا جو اُس کے بعد اُسکی امت میں داخل ہونا چاہیں، البتہ اپنے ذاتی مریدوں کے ساتھہ اُس کا جو تعلق ہے اس کا رشتہ موت سے منقطع نہ ہوگا۔

زرتشت کی شریعت میں عورتوں کو جو بلند مقام دیا گیا ہے اور نسائیت کے متعلق جس غیر معمولی اور مفرط قسم کی فیاضی سے کام لیا گیا ہے وہ زرتشتیت کی ممتاز ترین خصوصیات میں سے ہے۔ عورت کی قدر و قیمت میں غالباً عورت کو اتنی اہمیت نہیں ہے جتنی کہ "شخصیت" کو ہے! شخصیت علی الاطلاق زرتشت کی نظر میں انتہائی محترم چیز ہے اور اس کے تمام مظاہر کو وہ خراج عزت ادا کرنا چاہتا ہے۔ اور بلاشبہ عورت بھی ایک شخصیت کی حامل ہے۔ ہیئت اجتماعیہ کے اندر اپنے فرائض اور اس کُل کے ایک پرزے کی حیثیت سے عورت اہم نہیں ہے، بلکہ محض اس بنا پر کہ وہ بھی ایک مستقل شخصیت کا مظہر ہے! خود زرتشت کا[1] خدا اپنی تمام ذات و صفات میں سب سے زیادہ ایک "شخصیت" ہی ہے[1]!

---

[1] نوٹ آئندہ صفحہ پر ملاحظہ ہو۔

زرتشت کے دین کا ایک دوسرا عنصر یہ ہے کہ داعیٔ مذہب مستقبل میں ایک "نجات دہندہ" کا منتظر ہے جو اپنی ذات میں خود زرتشت ہی ہوگا، لیکن اُس وقت کا زرتشت نہیں بلکہ اُسکا نقش ثانی جسکی نشوونما بعد میں ہوگی! گاتھہ کی بشارت ہے:

"آنیوالے نجات دہندہ کی ذات قدسی کا جو اپنے وقت میں "بیت شریعت کاملیں" ہوگا، زرتشت کے ساتھ ایک رشتۂ خلت، اخوت، یا ابوت ہوگا" (یاسن ۴۵-۱۱)

"مستقبل کے نجات دہندہ کو جاننا چاہئے کہ خود اُس کا انجام کیا ہوگا"؟ (یاسن ۴۸-۹)

گویا زرتشت اپنے ہی انجام بخیر کے لئے یہاں دست بدعا ہے!

"لوگوں کو مزدہ کی مرضات حاصل کرنا چاہئے تاکہ آیندہ نجات دہندہ (موعودہ اہورا) کے قدوم میمنت لزوم کیلئے راستہ صاف ہو" (یاسن ۵۳-۲)

عہد حاضر میں ایک ہادی و قائد کی موجودگی اور مستقبل میں ایک نجات دہندہ کی آمد کی خوشخبری، ان دونوں چیزوں نے ملکر زرتشتیت کے تخیل کو بہت مستحکم و پائندہ بنا دیا، جو محض خواب و خیال

نوٹ صفحہ گزشتہ:-

بدھ کے بعض مقولوں کا جو اس نے عورت کے متعلق کہے ہیں ان خیالات سے موازنہ کیجئے اور "تفاوت رہ" کو ملاحظہ کیجئے

"پس یہ ہے عورت کی سرشت! ایسی حالت میں وہ کیونکر محبوب یا معتمد ہوسکتی ہے؟" (فو شو ہنگ سان گنگ صفحہ ۲۹۵)

"ایک شخص معہ اپنی اس عقل و دانش کے جو اس نے اپنی سابقہ ولادتوں میں پیدا کی ہے قانون فطرت کا محرم بنسکتا ہے لیکن ایک عورت — وہ ضعف ارادہ، نقص عقل، اور غلوئے محبت کی پُتلی — بھلا کس طرح پرستاریٔ حق کی مہمات کی بجا آوری سے عہدہ برآ ہوسکیگی؟"

"پس ہر مرد کو ہوش و حواس سے کام لینا چاہئے اور عورت کو مردود سمجھکر اُس کے دامن سے بچنا چاہئے۔" (صفحات ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۸، کتاب مذکور)، (بتخاطب آمرا جو بدھ کو اپنا باغ نذر کرنا چاہتی تھی!)

سے بہت بالاتر تھا بلکہ جس نے ایک حقیقی واقعیت حاصل کرلی تھی، چنانچہ زرتشت نے اپنی زندگی میں اپنی قوم کے اندر ایک عادل ومحتسب خدا کے عقیدے کو پورے طور پر نقش دل کردیا۔ ہستی باری کے متعلق بعد کے اَدوَار میں اگرچہ یہ تصور مسخ وموہوم ہوتا رہا لیکن اُس کا جو نقش اول زرتشت نے قائم کردیا تھا وہ اہلِ زرتشت کے قلوب سے قطعی طور پر کبھی محو نہ ہوا۔ البتہ زرتشت کی وہ بشارتیں بروئے کار نہ آئیں، کوئی دوسرا پیغمبر اس کے عقب میں مبعوث نہ ہوا، جسکی وجہ سے قدیم شرک وبُت پرستی کا بیشتر حصہ پھر عود کر آیا لیکن زرتشتیت کا روح رواں یعنی ایک خدائے عادل ومحسن کا خیال، حی ولایموت رہا اور موجودہ "پارسیت" خواہ وہ اپنے کسی اور مقاصد میں ناکام رہی ہو، لیکن اپنے ان مخصوص صفات رکھنے والے خدا کی پرستش کی وہ ایک زندہ یادگار ہے، وہ خدا جو کسی نہ کسی دن اپنے ایوانِ عدالت کو منعقد کریگا اور کسی نجات دہندہ کو بھیجے گا۔

زرتشت کی تعلیمات کی اولین مخاطب اسکی قوم ہی ہے لیکن نفس خطاب کی عمومیت اس تخصیص کو گوارا نہیں کرتی، بلکہ یہ معلم اعظم ساری نوعِ انسانی کو اپنی چشم تصور کے سامنے اپنے پیغام کو قبول کرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ عالمگیر دعوت کیلئے وہ بارگاہِ خداوندی سے اس طرح پروانۂ اجازت طلب کرتا ہے:

"اے مزدہ! مجھکو حکم فرما کہ میں ہر زندہ متنفس کو اپنی ملت میں داخل کرلوں" (یاسن ۳۱-۳)

وہ توبہٗ وانابت کی ایک صلائے عام دیتا ہے:

"ہم اپنے کلمۂ حق کے ذریعے سے قزاقوں کے انبوہ کو انکے کیفر کردار کو پہونچائیں گے"
(یاسن ۲۸-۵)

"غلط کاری کا کفارہ کہاں ہے؟ یہ نہیں تو معافی کی جستجو کے کیا معنی ہیں؟" (یاسن ۵۱-۴)

"جب تورانی فرائیانہ (ایک غنیم قبیلہ) کی مبارک وسعید ذریات کے منبع قلب سے

چشمۂ حق اُبلے گا تب وہ فکر صالح کے حریم درس میں داخل ہوں گی اور اُس وقت مژدۂ انکو امان بخشے گا"۔ (یاسن ۴۶ - ۱۲)

اب ہم اپنی عنان توجہ ہندوستان کے پیغمبر اعظم گوتم سدھارتھ کی طرف پھیرتے ہیں، یعنی عارفِ خانوادۂ ساکیا، مہاتما بُدھ ! جیسا کہ معلوم ہے ابتداء میں ہندوستان اور ایران کا قدیم مذہب ایک ہی تھا، لیکن اوّل الذکر ملک کے اندر اس مذہب کو ایک دوسرا ماحول ملا جس کے زیر اثر اُس نے عرصۂ دراز تک ایک مختلف نوعیت کی نشو و نما حاصل کی۔ اہلِ تاریخ کا روایاتی مکتب اگر صحیح کہتا ہے تو اس کا یہ منشا ہے کہ قبل بدّھ کی بعثت کے قریباً نصف صدی کا دور اس مذہب پر ایسا گزرا جس کے اندر اُس نے مخصوص قسم کی ارتقائی تغیرات قبول کئے لیکن اسی مسئلہ کے متعلق مورخین و محققین کی ایک دوسری جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ یہ زمانہ پانسو برس سے لیکر ایک ہزار سال تک طویل ہے ! بہر حال اسی انقلاب کی نوعیت کا یہ حال تھا کہ ایک عام ذہنی بیداری پیدا ہو گئی تھی اور کم از کم ارض و سما کے پُر شوکت مظاہر والے "اربابِ فطرت" اب انسان کی جبینِ نیاز کا مطالبہ کرنے سے قاصر تھے ! اس کے علاوہ ایک اور ادارہ اور ایک اور عقیدہ پیدا ہو گیا تھا جنمیں سے ایک کا ظہور ایران کے اندر مسیح کے عہد تک ہوا اور دوسرا کبھی بھی معرضِ وجود میں نہ آیا۔ ہمارا روئے سخن علی الترتیب برہمنیت کے احبار و رہبان کے نظام اور تناسخ ارواح کے تخیل مذہبی کی طرف ہے !

آخر الذکر عقیدہ کی ہمہ گیری کا یہ حال تھا کہ اُس کے اثر سے گوتم بدھ بھی نہ بچا، چنانچہ نئے مجدد اعظم کی ذہنیت کی تشکیل میں اس عوام و خواص کے یقین نے معتد بہ دخل پایا۔ گوتم نے ایک ایسے عہد طلائی میں تربیت پائی جس کے محاسن و قبائح دونوں اُس کے دل و دماغ کی ترکیب کے عناصر بنے ! ہندوستان جنت نشان کی عام فضا کا ایک نظارہ کر لیجئے اور اس فضا کی طبعی پیداوار کے وجود میں آنیکے منتظر ہو جائیے : ایک وسیع و عریض ملک ہے جس کے طول و عرض میں سرسبزی و شادابی، زرخیزی و زرریزی کا ایک منظر بچھا ہوا ہے، اجناس خوراک اور اسباب معیشت کی فراوانی ہے، امن و امان کا دور دورہ ہے عظیم الشان شہر آباد ہیں جو ایک زبردست تمدن کا گہوارہ

بننے کے لئے تیار ہیں، لیکن آبادی کے لئے زمین کسی طرح ناکافی نہیں ہے نہ کسی پر دنیا تنگ ہے، اقتصادی کشمکش کی طرح سیاسی تصادم بھی مفقود ہے، چنانچہ کوئی ایسا زبردست محرک موجود نہیں ہے جو کسی عظیم حرکت کے لئے داعیۂ عمل بنے۔ لوگوں کے افکار و خیالات اپنی ذات کے اندر محدود تھے اور کوئی پبلک ذہنیت پیدا نہ تھی، نہ جماعت و ملت کے مقاصد کی خاطر اپنے ذاتی مفاد کی قربانی کے جذبے نے پرورش پائی تھی۔ ضعف و پیری اور مرض و موت کے علاوہ انسان کو نظام کائنات سے کوئی شکوہ نہ تھا۔ آبادی کو کوئی اندرونی یا بیرونی خطرہ لاحق نہ تھا اور اسی وجہ سے ملت نوازی اور وطن خواہی کے تخیلات و جذبات کتمِ عدم سے منصۂ شہود پر نہ آئے تھے۔ اسی شے کا فقدان کامل تھا جو اُس وقت کے ہندوستان کی زندگی کا سب سے مرکزی عنصر ہے۔ بیشک جنگیں بکثرت ہوتی رہتی تھیں، لیکن سب ذاتی و شخصی اغراض کے لئے۔ ایک خاندان انحطاط پذیر ہوتا تو دوسرا تاج و تخت اور علم و نشان کا مالک بنجاتا۔ مگر یہ اختلال و اضطراب بر اعظم ہند کے بحر اعظم کا محض سطحی تموج ہوتا۔ چنانچہ علی العموم ہر چہار اطراف میں سکون طاری رہتا اور لوگوں کے لئے آقاؤں کی اس تبدیلی میں موسمی تغیرات سے زیادہ جدت یا اہمیت نہ تھی! نسل و خون کے احساسات بالکل معدوم اور معطل تھے چنانچہ مروجہ جنگوں کے کسی میدانِ کارزار میں کسی ایک قوم کو بحیثیت مجموعی دوسری قوم کے خلاف صف آرا نہ دیکھا گیا، بلکہ وہ صرف دو سلطنتوں کے پرچموں کا تصادم ہوتا تھا۔ ایک ہی نسل کے افراد تقریباً نصف بر اعظم کی وسعت میں پھیلے ہوئے تھے جس کے اندر متعدد اور مختلف تاجداروں کے علم لہراتے ہوتے تھے، نیز ایک سے زیادہ قومیت کے لوگ کسی ایک ہی حکومت کی رعایا بھی ہوتے تھے! اس تمام قرن میں ایک مرتبہ بھی ملک کی وحدتِ ملی کے قلعہ کی فصیل میں کسی بیرونی تیشے کی ضرب سے ایسا رخنہ نہ پڑا جسکی طرف احاطۂ قلعہ کی ساری آبادی دوڑ پڑی ہو اور اس رخنے کو اپنے جسموں سے پُر کرنے کی جد و جہد میں اُس کو اپنا گوشۂ لحد بنانا قبول کیا ہو! یہ کام خاندان تو کرتے تھے یا کبھی کبھی شہر، لیکن کبھی کسی پوری قوم نے اس وحدتِ ارادہ اور اشتراکِ عمل کا ثبوت نہ دیا! ہندوستان کی حکومت قومیں نہ تھیں، اُنکی صحیح تر تعبیر "ذاتی جائدادوں" سے کیجا سکتی ہے جنکے

اندر حکمراں روح کوئی نہ کوئی مسلکِ حیات ہوتا تھا۔

پس گوتم نے ہندوستان کے اندر کسی قومی مصیبت کو نہ دیکھا، بلکہ صرف انفرادی و شخصی مشکلات کو! اُس کے مشاہدے کے سامنے کوئی ملی وطنی حادثہ یا خطرہ نہ تھا جیساکہ زرتشت کے وطن کے اندر درپیش تھا، بلکہ محض انسانیت عمومی کے مشترک و عالمگیر ہموم و غموم تھے جو مصائب کی حیثیت سے زرتشت کے متخیلہ سے مَس بھی نہ ہوتے تھے! پس مقدس گوتم اور زرتشت بزرگ کی دعوتوں اور تحریکوں میں جو اُصولی فرق (انفرادیت و اجتماعیت کا) تھا وہ ان دو مذاہب کی تاریخ کے "مطالعۂ مقابلہ" (Comparative Study) میں ایک اہم ترین نکتہ ہے!

گوتم ایک محبت پاش شاہی باپ کی آغوشِ شفقت میں پلا تھا، جہاں وہ ہر قسم کی نا ملائم چیزوں سے مامون و مصئون تھا، وہ شاہی محل کے حصارِ سنگیں کی ایک منزلِ عشرت سے محصور تھا، جہاں اگر دن تھا تو عید کا، اور رات تھی تو شبِ برات۔ اس لبریزِ عیش زندگی کے طوفانِ نازونعم میں اگر اُسکو ایک امتلائی احساس ہونے لگا ہو تو چنداں عجیب نہیں! اس شبستانِ عشرت کی ہنستی فضا سے گھبراکر شہزادہ گوتم کا اُس کو خیرباد کہدینا اس قدر بوالعجبی آمیز نہیں ہے جسقدر کہ عین توقع کے مطابق اور حالات کا طبعی نتیجہ!

پس جیساکہ "ٹھنڈے سایہ کے نیچے بندھا ہوا ہاتھی صحرا کے آزاد خارزار کے لئے زنجیریں توڑانے لگتا ہے[۱]"، گوتم نے بالآخر اپنے دیوانۂ محبت باپ سے ذرا باہر چلنے پھرنے کی اجازت حاصل کرلی۔ یہ نقل و حرکت پہلے تو محلاتِ شاہی کے چمنستانوں اور نزہت گاہوں تک محدود رہی لیکن بہت جلد پایۂ تخت کے کوچہ و بازار تک جاپہونچی۔ اس وقت ہر قسم کی احتیاط پیش بینی ملحوظ رکھی جاتی تھی کہ نازک دل شہزادہ کوئی ناگوار منظر نہ دیکھنے پائے، لیکن مقدراتِ الٰہی کا سدباب کون کرسکتا تھا! شہزادہ محلِ شاہی کے دروازے پر جونہی اوّل روز نمودار ہوا تو ہاتفِ تقدیر نے کہا:

---

[۱] بالفاظ نوشوہنگ سانگ گنگ، صفحہ ۱۹۱۔

آمد آں یارے کہ ما می خواستیم!

اقلیمِ عرفان و روحانیت کا تاج و تخت اسی شہزادۂ عالی تبار کا منتظر تھا!

من از آں حسنِ روز افزوں کہ یوسف داشت دانستم

کہ عشق از پردۂ عصمت بروں آرد زلیخا را!

الغرض شہزادۂ گوتم کی سیر و گشت کے دوران میں کئی بار ایسا اتفاق ہو ہو گیا کہ سرِ راہ بعض بڈھے، کمزور، اور بیمار لوگ نظر آگئے، متعدد دفعہ مردہ نعشوں کا منظر بھی پیش نظر ہوگیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام اسباب کارکنانِ قضا و قدر نے ترتیب دئے تھے۔

بامید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد!

شہزادہ ہر بار مکدر و کبیدہ خاطر ہو ہو کر گھر لوٹتا، روز بروز یہ احساس شدید سے شدید تر ہوتا گیا کہ اُس کا یہ سارا عیاشانہ حصار، قصور و محلات، اشجار و انہار اور خدم و حشم، نیز اُسکی حور تمثال بیوی جو اُسکی آغوشِ محبت کا سب سے خوشنما گلدستہ تھی، معہ اُس نومولود نورِ نظر و لختِ جگر کے جس کی آمد نے محلِ شاہی کی بزمِ طرب کو اور بھی چمکا دیا تھا، صرف ایک حسنِ اتفاق کا نتیجہ ہیں، نیز یہ کہ وہ دائمی نہیں!

خوش است عمر دریغا کہ جاودانی نیست — بس اعتبار بریں پنج روز فانی نیست،

درختِ قد صنوبر خرام انساں را — مدام رونقِ نوبادۂ جوانی نیست،

گلیست خرم و خنداں و تازہ و خوشبو — ولے امیدِ ثباتش چنانکہ دانی نیست!

کدام بادِ بہاری وزید در آفاق — کہ باز در عقبش آفتِ خزانی نیست!

شہزادہ کا یہ رنگِ طبیعت دیکھکر باپ نے اُس کی دلبستگی کا سامان کرنا چاہا تاکہ اسکی توجہ ان پریشان کن خیالات سے ہٹا کر دوسری طرف منعطف ہو جائے، چنانچہ رقاصہ لڑکیوں کی ایک جماعت بھیجی گئی جنہوں نے محبوب شہزادے کو اپنے جھرمٹ میں لے لیا اور مشاغلِ نشاط شروع کردئے، لیکن وہ بالکل غیر متاثر رہا۔ باپ نے یہ معلوم کرکے حسینوں کے مجمع کو دوچند اور مرغوب تر

کردیا، لیکن شہزادے کی بے حسی و سرد مہری میں بالکل فرق نہ آیا! تب تو یہ کیا گیا کہ ماہپاروں اور مہرخوں کے ایک پورے پرستان نے دلگرفتہ شہزادے کو اپنی آغوشِ عیش میں لے لیا، لیکن وہاں زبانِ حال پر یہی شکوہ تھا کہ:

دیکھئے حوریں دکھائی جاتی ہیں　　　امتحاں ہے عاشقِ ناشاد کا!

اپنے لختِ دل کی یہ وحشت اور گریزپائی دیکھکر باپ نے گوتم کو ایک ایوانِ عیش میں پہونچا دیا اور حسن و رعنائی کے انتہائی زہدشکن نمونوں کو وہاں اُس کی مصاحبت کے فرائض تفویض کئے، ساتھ ہی چاروں طرف سے دروازے بند کردیئے گئے اور "شوقِ فضول" اور "جراتِ رندانہ" کی آخری فضا پیدا کردی گئی لیکن وہاں یہ حال تھا کہ ع

بآبِ خضر اگر عاشق رسد لب ترنمی سازد!

ایک ہی ضرب میں ساری زنجیریں کٹ گئی تھیں اور اب اُس جوانِ حق کا پائے آزاد سیم وطلا اور لعل و گوہر کی بیڑیوں کو پازیب تسلیم کرنے کیلئے تیار نہ تھا!

شاد باش اے عشقِ خوش سودائے ما　　　وے طبیبِ جملہ علت ہائے ما!
اے علاجِ نخوت و ناموسِ ما　　　وے تو افلاطون و جالینوسِ ما!

قصہ مختصر شہزادۂ گوتم کی طبیعت ذرا بھی افاقہ پذیر نہ ہوسکی، دل کی تڑپ اور لپٹ "جنون و خفقان" کی درجے کو پہونچ گئی، چنانچہ ایک دن رات کو جو کہ چاندنی رات تھی اور "منزلِ نور" کو جانیوالے مسافروں کے "شدرحال" کیلئے موزوں ترین وقت وساعت، ہر دلعزیز شہزادہ اس ساری جنت ارضی کو چھوڑ کر جنگل کی راہ لیتا ہے۔ ایک شاعر نے اس "شبِ ہجرت" کو بڑے اثر انگیز طریقے سے یوں بیان کیا ہے:

اے زمینِ خاک برسر! یوں نہ ہو اندوہگیں،　　　میں شریکِ غم ہوں تیرا، تیری خاطر ہوں حزیں،
تیری خاطر اور تیرے بچوں کی خاطر اے زمیں!　　　مضطرب دل میں مرے دلکو قرار اصلا نہیں،
نیم بسمل میں بھی ہوں تو ہے اگر نخچیرِ غم

لے لیا اپنے جگر میں مَیں نے تیرا تیرِ غم

اتنی صورت ہے تیری لے سیہ پوش آسماں، نو گھٹا ہے اشکِ غم کی یا ہے آہوں کا دھواں
اشکِ خوں دامن پہ ہیں یا ہیں شفق کی سرخیاں داغِ تاباں ہیں مہ و خورشید سینے میں عیاں

تو ہے محزوں اہلِ عالم کے مصائب دیکھکر
شامِ غم، صبحِ قیامت ہیں مرے شام و سحر

اے ستارو! تم سراپا بنکے چشمِ انتظار دیکھتے ہو میری جانب صورتِ اُمیدوار،
لو اب آیا میں! اب آیا تم پہ ہونیکو نثار کب سے ہوں آوارگی کی آرزو میں بیقرار،

آہ میں جکڑا ہوا سونیکی زنجیروں میں ہوں
ہر گھڑی آزاد ہو جانے کی تدبیروں میں ہوں

عشرتِ ایامِ آغازِ جوانی الوداع! الوداع اے تاج و تختِ مرزبانی الوداع!
الوداع اے ذوق و شوقِ عیشِ فانی الوداع! الفراق اے خرمی و شادمانی الوداع!

الوداع و الوداع لیل و نہارِ آرزو،
اے دلِ غمدیدہ اب بنجا مزارِ آرزو!

آہ پھر تیری جدائی آہ او آرامِ جاں! اُف! مچلتا ہے تڑپتا ہے دلِ ناشادماں!
تجھکو سوتا چھوڑ جاؤں سنگدل اتنا کہاں! آئینہ رو! تیری فرقت مجھپہ ہے کوہِ گراں!

عزم راسخ ہے مگر منہ تجھسے موڑوں کس طرح!
رشتۂ عہدِ وفا کو آہ توڑوں کس طرح!

تیری فرقت اور پھر اُس گوہرِ شہوار کی جو کہ آرامیدہ دامانِ صدف میں ہے ابھی[1]
جس کو نیسانِ محبت نے عطا کی زندگی آب و تابِ زیست بڑھجائیگی جس سے واقعی

---

[1] شاعر اُس تاریخی نظریہ کا معتقد معلوم ہوتا ہے جس میں گوتم کے ترکِ خانماں کے وقت اُسکے بچے کو شکمِ مادر کے اندر فرض کیا گیا ہے۔

شمعِ دل لعفروز ہوگا خانۂ جاں کے لیئے،
مایۂ نورِ بصارت چشمِ حیراں کے لیئے!

اے فریبِ الفتِ فانی نہ تو بھٹکا مجھے! آہ اے جھوٹی محبت دے نہ اب دھوکا مجھے!
دیدنی ہے رنگِ گل پھر اُس سے مطلب کیا مجھے! گھر نظر آیا ریاضِ دہر کانٹوں کا مجھے!

یہ کشاکشہائے بیجا ہیں سلاسل کی طرح
توڑ دوں انکو طلسمِ نقشِ باطل کی طرح!

رخصت اے ماں باپ بیوی! رخصت اے اہلِ دیار دیکھنا میری جدائی پر نہ ہونا اشکبار،
کی تمہاری ہی لیئے میں نے یہ ہجرت اختیار دیکھیئے کیا کیا دکھائے گردشِ لیل و نہار!

المدد لے جستجوئے صادقِ راہِ نجات!
کونسی خلوت میں ہے اے شمعِ رازِ کائنات!

گوتم نے اپنے صحرائی دار الہجرۃ سے اپنے باپ کو یہ پیام بھیجا:

"میں جو اس طرح اپنے گھر بار کو چھوڑ کر نکل گیا ہوں تو اس واقعہ پر کوئی ماتم نہ کیجئے۔ یکجائی، خواہ وہ کتنی ہی طویل ہو، دائمی نہیں ہو سکتی......جو قانونِ مفارقت اس قدر ہمہ گیر اور قدیم العہد ہے اُس کے خلاف چند روزہ بقا کا کیا چارہ ہے؟ میرے لئے ماتم کرنا بے محل ہے اس لئے کہ میں نے اپنے پیچھے جس رنج و غم کو چھوڑا ہے وہ ایک عارضی صدمہ ہے......جب یہ نقشِ محبت ماند پڑ جائے گا تو زخمِ غم بھی مندمل ہو جائے گا......اگر میں اپنے شوقِ آزادیِ روح میں اپنی بشری محبت کے تقاضے سے آپ لوگوں سے برابر وابستہ رہتا تو جو علیحدگی اس وقت میں نے دانستہ اختیار کی ہے وہ ایک دوسری طریقے سے عارض حال ہوتی، یعنی موت یہ کام انجام دیتی! غور کیجئے وہ میری والدۂ محبوب جن کی آغوشِ رحم میں مَیں نے بانوں پھیلائے تھے اور جس کے لئے میں اس طرح کتنے شدید درد و کرب اور تشنگی و تکلیف کا باعث ہوا تھا، اس وقت کہاں ہے؟ اُس کے سارے مصائب و شدائد

بے ثمر ثابت ہوئے! میں اُس کے کیا کام آیا؟...... جس طرح لکھا ہے ابر اپنی متواتر گردش و حرکت میں چند لمحوں کے لئے باہم بغل گیر ہو جاتے ہیں میری نظر میں تو اہلِ زمین کے فانی اتحاد و وصل کی یہی تعبیر ہے!" (بُدھا کارتیا، ۶، ۱۶)

تاہم وہ اس "المیہ" کی درد انگیزی کو تعلیم کرتا ہے چنانچہ :-

"اپنے اعزہ و اقربا کی یہ جدائی کونسا دل ہے جس میں ہُوک نہ پیدا کرے گی! لیکن آہ! اس جدائی سے تو بہر حال مفر نہیں، پس میں انجام کو آغاز میں خود ہی انگیز کئے لیتا ہوں اور اپنے عاشق باپ کے ظلِ شفقت کو خیرباد کہتا ہوں!" (ایضاً ۹، ۳۲)

"ہماری جتنی مرغوبات و مالوفات ہیں اگر وہ لازوال تباہی جا سکتیں اور تغیر و مفارقت کے خطرے سے بالاتر ہو سکتیں تو یہی دنیا بہشت بن جاتی اور ہم کو اپنے گھروں کی چار دیواری کے اندر ہی دار القرار مل جاتا! لیکن آہ آسمان کے نیچے یہ چیز کہاں!"
(فوشو ہنگ سان کنگ ۱۸۶۳)

"میں نے آپ لوگوں کو پہلے ہی جتا دیا ہے کہ ناموسِ فطرۃ کا منشا یہ ہے کہ جو چیزیں آج باہم بغل گیر ہیں اُن کا رشتۂ مواصلت ایک وقت منقطع ہو کر رہے گا پس عشق و محبت کی ریشمی ڈوریاں بھی شکستنی ہیں۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ جامِ الفت کے اس بادہ خوار کمبخت دل کو سینے سے نکال کر پھینک دیا جائے!" (ایضاً ۱۸۶۱)

"اگر دنیا کی چیزیں مجھکو قیام و دوام کی ضمانت دیتیں اور ہم لوگ کمزوری و عمر رسیدگی، بیماری و موت کے خمیازوں سے آزاد ہوتے تو کچھ شک نہیں کہ میں بھی ساغرِ محبت کی شکم سیر ہو کر جرعہ نوشی کرتا اور اس بزمِ عیش سے کبھی بھی نہ اکتاتا![1]" (ایضاً ۳۰۳)

---

[1] یہ عشرت و عیش و کامرانی کب تک — عشرت بھی سہی تو نوجوانی کب تک؟
گر یہ بھی سہی تو قرارِ دولت ہے محال — دولت بھی سہی تو زندگانی کب تک؟ (۔۔۔)

اس آخری بیان کے بین السطور میں ممکن ہے کچھ رنگ طعن ہو!

خیر گوتم نے دنیا تو چھوڑ دی اور راہ و فا کی "منزلِ اول" بخیر و خوبی طے ہو گئی لیکن منزلِ مقصود کی "دلی ہنوز دور" تھی۔ مروجہ خداؤں کو اُس نے ٹھکرا دیا تھا لیکن کوئی ایسا نہ تھا جو زرتشت کی طرح مزدہ آہورا کے ساتھ اُس کا معانقہ کرا سکتا۔ معبد ہندی کے بت خانہ کا ایک عجیب مضحکہ خیز منظر تھا۔ یہاں اصنام و اوثان کے پرے جمے ہوئے تھے جن کو کلید برداران کعبۂ دینی یعنی برہمنوں نے اپنی صنعت خیالی سے زرق برق لباس پہنائے تھے اور طلائی و جواہراتی زیورات سے آراستہ و پیراستہ کیا تھا۔ لیکن در اصل اس "لباس مجاز" کے اندر یہ دیوتا دہی قوائے فطرت تھے جو قدیم ویدک مذہب کے معبود تھے۔ پجاری لوگ اندرا اور ماترلش کی ناز برداریاں کرتے اور سوما کی شراب طہور کے جام اُن کی نذر کرتے! ان پیشکشوں کو شرفِ قبول بخشنے کے لئے یہ دیوتا اپنے قدوم میمنت لزوم سے اپنے استھانوں کو سرفراز فرماتے اور بالخصوص مہاراج اندرا اپنی سبز قدمی کی قیضا سے باران رحمت کو بھی نازل فرماتے! اسی طرح محرمانِ سراپردۂ راز (برہمن احبار) مقدس آتشدان کے شعلوں کو جنبش دیتے اور فوراً اگنی دیوتا نزول اجلال فرماتے! برہمن پجاریوں کی یہ ساری جنگ زرگری ایک آزاد فکر ناظر کے لئے کھلا ہوا راز تھا۔ درحقیقت یہ دیوتا اُن کے دیوتا نہ تھے بلکہ اُن کے خادم و غلام، اور حصول زرق و استحصال عیش کی نفسانی اغراض کے لئے اُنکے آلۂ کار! اُن کے صمٌ بکمٌ خدا اپنی ہی طرح کی گوز و کر مخلوق کے حاجت روا و مشکلکشا تھے اور جو لوگ اُن کے مواد ترکیبی اور اُن سنگی خداؤں کے طریقِ "تدبیر امر" کی "ریشہ دوانیوں" کے محرم راز تھے ان کے لئے وہ سنگریزوں سے زیادہ نہ تھے!

ان طریقوں کی لغویت اور دور از کاری الم نشرح تھی لیکن تاہم گوتم نے ابتداء کار میں ایک عرصہ تک پرانے وسائل سے کام لیا۔ اس نیاز مندی و تقلید کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کو ابھی اپنے قلب و روح کی عظمت کا پورا اندازہ نہ ہوا تھا۔ پس اُس نے پہلے مروّجہ مذہب ہی میں نور حقیقت کی تلاش کی آزمایش کی اور اسی اثناء میں شدید عبادتوں اور ریاضتوں کا سلسلہ جاری رکھا۔

ان مُراقبانہ اعمال کی حقیقی نوعیت ساحرانہ تھی۔ الغرض تپو نفر کی اعتکاف گاہ سپنتا اسکیلا کی طرح گوتم نے بھی مشاہدۂ حق کے لیئے ایک تنہا گوشے میں ایک "روحانی رصدگاہ" قائم کی۔ لیکن شاہدِ حقیقت کی رونمائی کی ساری آرزوئیں یاوس ناکامی ہوئیں اور گوتم کے ذاتی تجربہ کی بنا پر:

"تزکیۂ نفس، حریت روح، اور معرفتِ کبریٰ کے حصول کے لیئے یہ شغل کشود کار نہیں کر سکتے۔" (بدھا کاریتا ۱۲، ۹۸)

گوتم جس چیز کی تلاش میں آوارۂ غربت ہوا تھا وہ کسی "ازلی یا کسبی گناہ" سے آزادی کا ذریعہ نہ تھا بلکہ دنیا کی اسی "قیدِ حیات" کی "بندِ غم" سے گلو خلاصی کا کوئی وسیلہ! "سارے جہان کے اسی درد" نے اس کے درد کو بیدرماں بنا رکھا تھا اور اُس کے دل پر ایک کوہِ غم ہر گھڑی سوار رہتا تھا۔ اسی مشکل معمے کے حل کے طور پر اُس کا خیال تناسخ کے تصور کی طرف منتقل ہو گیا!

گوتم ایک غیر معمولی طور سے مُزکی و مطہر روح کا مالک تھا اس لئے طلعتِ حقیقت کی نقاب برداری کے لئے اُس نے ہر ممکن و ناممکن نفس کشی و پرہیزگاری کے مطالبات کو پورا کیا، لیکن دل جتنا پاکیزہ تھا دماغ اتنا بیباک نہ تھا، یہی وجہ ہے کہ اتنا بڑا شاہین روح بھی بالآخر تقلیدِ عام کا صید زبوں بن گیا! اسی نقادانہ میدان میں ہم اُس کو زرتشت سے فروتر پاتے ہیں! تعجب ہے کہ اُس نے عقیدۂ تناسخ کا کبھی آزادانہ جائزہ نہ لیا اور اُس کی مزعومہ صداقت کو مغلوبانہ قبول کر لیا۔ زندگی اور آلامِ زندگی کو اُس نے ہم رشتہ یکدگر سمجھا اور آخرالذکر کو ختم کرنے کا علاج یہی دیکھا کہ اول الذکر ہی کا خاتمہ کر لیا جائے! پس زرتشت کے بالکل برعکس، گوتم بدھ کا فلسفۂ حیات تمامتر ایک مایوسی، نفی اور سلبیت کی دعوت ہے۔ وہ نفس کشی اور ترکِ لذات کا داعی ہے اور یہی تخیل ہے جو آج کے دن تک ہندوستان کے مذہبی دماغ پر مستولی ہے۔

مکاتبِ مذہب کے اس مکتب کا منشا یہ ہے کہ انسانی روح بے شمار ولادتوں یا جنموں کے ایک طویل سلسلے کے بعد جو مصیبت و مشقت سے لبریز ہوتے ہیں حقیقی زندگی و آزادی حاصل کرتی ہے۔ گوتم تمام ذی روح مخلوق کی زندگی کو یکساں پر محن سمجھتا ہے، چنانچہ جب کسانوں کے ساتھ

جلتی دھوپ میں وہ بیلوں کی گردنوں کو بھی جوئے کے نیچے خونچکاں ہوتے ہوئے دیکھتا ہے تو بے اختیار اُس کے مُنہ سے نکل جاتا ہے کہ "افسوس کتنا روح فرسا منظر ہے!" ہاں تو نفس و شیطان کی کشمکش کے درمیان روح کے ارتقائی مدارج طے کرتا ہوا انسان اگر اتفاق سے کسی ادنیٰ سی لغزش کا مرتکب ہو جائے تو اسکی منزل پھر کھوٹی ہو جاتی ہے۔ وہ کسی جانور کے پیکر میں منتقل کر دیا جاتا ہے، چنانچہ مختلف و متدارج حیوانات کے قالب در قالب اس کو یہ سفر تناسخ پھر طے کرنا پڑتا ہے اور انسانی جسم کا بندرگاہ از سر نو حاصل کر کے ساحلِ مراد کا دوبارہ عزم کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ بغیر کسی افتاد و حادثہ کے یہ ساری منازل و مراحل ختم ہو جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو کامیاب روح کا پھر ایک ایسے دار القرار میں خیر مقدم کیا جاتا ہے جو ایک لامتناہی عیش و طرب کا مقام ہے اور جہاں پرہیزگاری اور نیکوکاری کا نعم البدل ہر قسم کی ماکولات و مرغوبات سے دیا جاتا ہے اور ایک بے غل و غش زندگی بسر ہوتی ہے۔ لیکن ابھی معاملے کو ختم نہ سمجھیئے۔ بہت ممکن ہے کہ اس "سفر سقر" پر یہ روح پھر گامزن نظر آنے لگے! اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اس "خام بہشت" کے اندر روح کا جمع کردہ ذخیرۂ استعداد رفتہ رفتہ ختم ہو جاتا ہے جسکی وجہ سے اُس پر ایک اضطراب طاری ہونے لگتا ہے اور جنت کی مخملی سیج پر پڑے پڑے یکبارگی اُس کے گلے کا پھول مالا مرجھانے لگتا ہے، اور بس اُسکے بہشت کے سادی رفقا صرفِ نالۂ و شیون ہو جاتے ہیں۔ راندۂ درگاہ ہونے والی روح کے لئے یہی پیام الوداع ہوتا ہے! چنانچہ زمین پر اُس کا پھر ہبوط ہوتا ہے اور ارضی زندگی کا پُر عذاب ہفتخواں از سر نو شروع ہو جاتا ہے اور روح اُس غار کی تہ سے بار دگر چڑھائی شروع کرتی ہے جہاں سے اُسنے گزشتہ دفعہ وہ پُر کوفت معراج حاصل کی تھی!

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے؟

یہ سارے کاروبار ہم کو ایک طلسم ہوشربا نظر آتے ہیں، لیکن گوتم اپنی تخئیل روحانی میں ان کا گویا برائی العین مشاہدہ کرتا تھا، نظریۂ تناسخ کسی بالغ نظرانہ مطالعۂ واقعات پر مبنی نہیں ہے۔ لطف یہ ہے کہ جس معمائے ہستی کی وہ عقدہ کشائی کرنے کا مدعی ہے اس کی توجیہ کرنے سے وہ

قاصر ہی نہیں بلکہ اُس کو پیچیدہ تر بنادیتا ہے! اُس کا کہنا ہے کہ مختلف افراد کی زندگیوں کی عدم مُساوات کی اس طرح تعلیل ہوتی ہے اور آئینِ کائنات کے سر بعض کے خلاف تلخی بغض سے کام لیں یا بعض لوگوں کو بیوجہ منظورِ نظر بنانے کا جو الزام عاید ہوتا ہے اُس کو وہ ایک آیت عدل سے بدل دیتا ہے، لیکن تناسخ کے اُصول کی روشنی میں فطرت کی ستم ظریفیاں اور بھی ظالمانہ ہو جاتی ہیں۔ الغرض حرماں نصیب گوتم کی ناشاد روح ہمارے دلوں میں بڑے درد کا احساس پیدا کرتی ہے! گوتم کے حساس دل نے مصائب حیات کے مناظر سے ہر چند پیچ و تاب کھایا لیکن اُس کے ذہن نے ذرا بھی رسائی کا ثبوت نہ دیا کہ وہ مذہب تناسخ کی مضحکہ خیزی کو دیکھ لیتا!

گزشتہ بیانات میں جس طرح ہم دیکھ چکے ہیں، زرتشت نے جو تخیل ذاتِ باری کے متعلق قائم کیا تھا وہ بجائے خود ایک مکمل عقیدہ تھا جس کے اندر ایک مزید تکمیل کا اشارہ مضمر تھا لیکن یہ "تکمیل دین" و "اتمام نعمت" اس وجہ سے وجود میں نہ آسکی کہ جن ہادیوں کے ظہور کی زرتشت نے بشارت دی تھی وہ مبعوث نہ ہوئے۔ لیکن ذات واجب الوجود کے بارے میں بدھ کا تصور یہ ہے کہ ایک آفاق گیر طاقتِ مجردہ جسد کائنات کے اندر کارفرما ہے، جو بلا انقطاع و تعطل ہمہ وقت مصروف عمل ہے جسکی غایتِ مقصد بجز اس کے کچھ نہیں ہے کہ استحقاق و معاوضہ کے باہمی مقتضیات توازن کو پورا کرتی رہے۔ بظاہر یہ مقصد ناقابلِ حصول نظر آتا ہے اور کبھی اُس تک رسائی ہوئی بھی تو مصائب و نوائب کا ایک بحرِ ناپیدا کنار عبور کر کے، اور پھر اگر یہ عسیر الوصول سعادت نصیب بھی ہوئی تو اُسکی سبک انجامی سخت یاس افزا ہے اس لئے کہ چند روز کے بعد سر منزل پھر آغاز سفر میں تبدیل ہو جاتا ہے! تمام شعوری زندگی مصیبت و مشقت سے لبریز ہے اور جتنی دنیا آگے بڑھتی ہے اُس عذاب میں اضافہ ہوتا ہے پس ایک ہی مطلوب مقصد فنا ہی جو نجات کی منزلِ دور و دراز کا ایک مختصر راستہ ہی!

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

پس بدھ کی اصل عظمت اُسکے فلسفۂ زندگی میں نہیں ہے بلکہ اُسکی تفسیر حیات تو بالکل

ایک ناقابلِ رشک چیز ہے۔ اُسکی شخصیت کی اہمیت کا راز ہم کو کسی دوسری شے میں تلاش کرنا ہوگا!
اصل یہ ہے کہ بدھ ایک پیدائشی قائد تھا۔ تسخیرِ خلق کا ایک عجیب ملکہ قدرت نے اسکو ودیعت کیا تھا۔ اُس کے ایک اشارۂ ابرو پر لاکھوں انسان سربسجو دِ عقیدت ہو جاتے تھے۔ اُس کی سیرت کی کتابوں میں ہم جوق جوق اور فوج درفوج لوگوں کو داخلِ سلسلہ ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اگرچہ یہ سارا دفترِ اساطیر ایک مبالغہ آمیز رنگ میں ہے لیکن مشربِ بدھیت نے جو عالمگیر فتوحات اشاعت حاصل کیں انکو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ واقعات کی عام شاہراہِ بیان ضرور تاریخی ہے۔ حیرت ہے کہ ایسے خشک، یاس انگیز، اور صبر آزما عقیدۂ مذہبی نے کیوں کر اس کثیر تعداد اتباع کے قلوب پر قبضہ کیا، اور پھر جس طرح اُس کا خیر مقدم کیا جاتا ہے وہ بجائے خود ایک دیدنی حقیقت ہے۔ اس موقع پر لوگ کسی معمولی گرمجوشی اور ولولہ انگیزی کا ثبوت نہیں دیتے، بلکہ پھولوں کی بارشوں اور وجد آور نغموں کے درمیان بُدھیت کے قدوم میمنت لزوم کا نظارہ دیکھنے میں آتا ہے! لطف یہ ہے کہ انسانوں کے ساتھ جانور بھی بُدھ کو اپنا محسنِ اعظم سمجھتے ہیں اور اس نجات دہندۂ جن و بشر کی راہ میں اپنی آنکھیں فرش کرتے ہیں!

"ذی روح مخلوق کی تمام اصناف و اقسام ایک دوسرے سے وابستۂ آشنائی و اُلفت ہوگئی تھیں، باہمی خوف و ہراس کافور ہوگیا تھا۔ عداوت و نفرت مفقود تھی...
..... اشراف و اشرار ہر دو کی روحیں یکساں طور سے بدھ کی قدوسیتوں کی ثنا و صفت میں رطب اللسان تھیں۔ عقیدت و ارادت کے ان مناظر میں اور ہدیہ و پیشکش کے ان مظاہر میں ہر متنفس ایک روحانی کیف و سرخوشی سے سرشار تھا!"

(فوشو ہنگ سان کنگ ۱۱۷۲)

"طوفانی ہوائیں، تاریک بادل اور ہر قسم کا غبار و ظلمت غائب ہوگیا تھا۔ خلائے سماوی سے بہشتی پھول اُترتے تھے اور ساری کائنات معہ اپنی ارواحِ طیبہ کے ایک مسلسل عالمِ وجد میں جھوم رہی تھی!" (ایضاً ۱۲۷۳)

فدائیت اور شیدائیت کی یہ روح ہم کو کس درجہ حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے! غالباً اس غیر متوقع ذہنیت کی توجیہہ میں دو عمومی اسباب بیان کئے جا سکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ عقیدۂ تناسخ کے تہ دل سے قائل ہیں اُن کے لئے زندگی، دوزخِ ارضی کی ایک غیر مختتم عذاب کے ہم معنی ہے۔ مصائب و شدائد، آلام و غموم کے اس دریا کے ناقابلِ پیائش عمق کا محض تصور ہی تھکی ہوئی روحوں کو اور ماندہ کر دے گا۔ ممکن ہے کہ تعلیمیافتہ فلسفیانہ رنگ طبیعت کے لوگ کسی ذہنی تسکین و تسلی کے حیلے اس تخیل مذہبی سے نکال لیں، لیکن عوام الناس کے لئے تو وہ یکسر ایک سوہان روح چیز ہے۔ لیکن بدھیت کے ظہور کے ساتھ جو تناسخ پیش کیا گیا اُس کا ایک روشن پہلو بھی تھا اور وہ یہ کہ "کشتگانِ" تناسخ جو "ہر زماں از غیب جانے دیگر است" کے عذاب دائمی میں گرفتار تھے اُن کے بعض اغلال و سلاسل اب کاٹ دئے گئے تھے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ گوتم بدھ نے بشارت دی تھی کہ دنیا کے لئے سلسلہ تناسخ کی بیڑی کی اب صرف سات یا آٹھ کڑیاں اور جھیلنے کو رہ گئی ہیں۔ ان معدودے چند منازل کو طے کر کے ہر روح اُس مقام تک پہنچ جائیگی جہاں سے آخری دار النجات نظر آنے لگیگا! بس یہ ایک نسبتہً مستقبل قریب کی گلو خلاصی کا مژدۂ جاں بخش تھا جس پر روحوں کا لبیک کہنا بالکل قدرتی تھا؎

کیا بات ہے تمہاری نوید نجات کی!

لیکن بد قسمتی سے پھر جلدی یہ عقیدہ بدعت و ضلالت کے گھن میں آ گیا جس کی تحریک کا سرچشمہ شاید بدھ کی ذات ہی بنی تھی۔ گوتم سدھارتھ کی رحمتِ عالم ہستی جب پردہ کر گئی تو فطرةً اُس کے پس ماندہ شیدائیوں کے جم غفیر کے قلوب کے اندر ایک بیتاب شوق بقا پیدا ہوا!

باشد کہ باز بینیم آں یار آشنا را!

چنانچہ اکثر نے مقام نجات کو ایک ایسے مُلک سکھنت میں فرض کرنا شروع کیا جہاں بدھ اعظم کی مبارک معیت انہیں پھر حاصل ہو گی۔ تناسخ کے علاوہ ایک دوسرا عقیدہ بھی پیروانِ بدھ میں شائع تھا جس کا تعلق یاما سے تھا۔ یاما عبارت ہے ایسے مقام سے جہاں بعد موت کے زندوں کے آباؤ اجداد کی روحیں آسودہ ہوتی ہیں۔ اور انہی کے ایصالِ ثواب کے لئے شرادھ کے مراسم انجام دئے جاتے تھے۔ یہ

قدیم آریائی عقیدہ تھا اور ممکن ہے کہ یہ ہند عتیق کے اصل اور اولین باشندوں کے تخیلات سے ماخوذ ہو۔ غالباً اس کا ایک اور منبع بھی تھا جیسا کہ آیندہ معلوم ہوگا۔ دراصل ایک بہشتی دُنیا کا عقیدہ بدھ کے مذہب کا کوئی جزو طبعی نہ تھا بلکہ عین اُس کی ضد تھا، لیکن بہرحال اس عقیدہ کو بھی مروجہ مذہبیات سے مستعار لے لیا گیا اور بدھیت کی تعلیمات میں داخل کر لیا گیا، چنانچہ یہ ہم کو چین میں بھی نظر آتا ہے جو بدھ کی نام نہاد امت کا سب سے بڑا وطن ہے۔

چنانچہ ندی اور گدا اپنے دو مریدوں کو خطاب کرتے ہوئے، ایک خطبے کے دوران میں بدھ کہتا ہے:

"جو کچھ ہونا تھا وہ ہو گیا، اب آئندہ کوئی زندگی نہ ہوگی"۔ (فوشوہنگ سان کنگ ۱۳۳۱)

اور تخاطب راجہ بمبسار ا:

"یہ اپنی جداگانہ ہستی کا خیال ہی تمام آلام و محن کا ذمہ دار ہے جس نے اہل عالم کو سلاسل عذاب میں جکڑ بند کر رکھا ہے، لیکن جس وقت یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ کوئی "انا" موجود نہیں ہے تو یہی انکشاف ان تمام بیڑیوں کے لئے ایک تیشہ ثابت ہوتا ہے"۔ (ایضاً ۱۳۳۶)

مقام کوسل کے تبلیغی خطبات کے دوران میں بدھ نے کہا:

"جو کچھ میں تمہیں دیتا ہوں اُسکو مضبوط پکڑو۔ میری تکمیل نفس کا نتیجہ دیکھو کہ میرا سلسلۂ حیات اب ختم ہو گیا، آئندہ میرے لئے نہ کوئی جسم ہے نہ جنم، بلکہ جملہ علائق جسمی و مادی سے آزادی کامل"۔

(فوشوہنگ سان کنگ ۱۶۲۸)

مذکورہ بالا اقتباسات فوشوہنگ سان کنگ سے لئے گئے ہیں جو کتاب بدھا کا رتیا (بزبان سنسکرت) کا چینی ترجمہ ہے۔ چینی زبان میں یہ چیز پانچویں صدی مسیحی میں منتقل کیگئی اور اگرچہ تمام عمومی مطالب کا خاکہ وہی رکھا گیا ہے اور بدھ کے مختلف خطبات و مواعظ کے الفاظ کم و بیش محفوظ رکھے گئے ہیں لیکن اُس کے اندر "مقامی فضا" بھی پیدا کر دیگئی ہے یعنی اہل چین کے اس وقت کے تخیلات و معتقدات کی کافی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے۔ بدھ کے اپنی چینی امت کے ساتھ ذاتی تعلقات کے معاملہ میں یہ تحریف

خاص طور پر نمایاں ہے۔

بھبارا اور کوسل کے خطابات کی طرح بدھ نے تل لوگوں (یہ اُس جگہ کے باشندے ہیں جہاں بدھ کا وصال ہوا ہے) کے سامنے اپنی الوداعی تقریر میں، از روئے روایت، یہ کہا:

"جو شخص میرے مقام سکونت میں بہت دور و دراز کسی جگہ رہتا ہے لیکن جادۂ نیکوکاری پر گامزن ہے وہ میرا (معنوی) ہمسایہ ہے۔ علیٰ ہذا القیاس ممکن ہے کہ کوئی آدمی میرے سایۂ دیوار میں رہتا ہو لیکن فاسق ہونے کی وجہ سے مجھ میں اُس میں بعد المشرقین ہو!"

(فوشو ہنگ سان کنگ ۱۹۸)

اور پھر اپنے مریدوں کو تاکید ہے کہ:

"جو وسائل و اعمال، تزکیۂ قلب وحصول نجات روح کے لئے تم کو تعلیم کئے گئے ہیں اُن پر پوری جد و جہد کے ساتھ عمل پیرا رہو۔ اُس مسکن امن کو اپنا مطمح نظر بناؤ جس کے دروازے مفارقت کے لئے بند ہیں۔" (ایضاً ۲۰۹۸)

فوشو ہنگ سان کنگ کے اختتامی باب میں اُس کا مصنف بدھ کے متعلق کہتا ہے:

"بس وہ اُسی مقام بقا و سرمدیت میں چلا گیا۔ جو لوگ اُس کے آئین حیات پر ایمان رکھتے ہیں وہ اس کے نقش قدم پر چلتے ہوئے بالآخر اُس کی حضوری میں پہونچ جائیں گے۔ بس تمام جن و انس کو، بلاتمیز و استثنا، اس پُرعظمت اور مجسمۂ رافت و رحمت آقا کی تقدیس کرنی چاہئے جو بلندترین حقانیت و معرفت کے مقام پر فائز ہوا تاکہ تمام ذی روح موجودات کا نجات دہندہ ثابت ہو۔ کون ایسا ہے کہ اُس کا (بدھ کا) ذکر مبارک اُس کا سامعہ نواز ہو اور وہ اس کا والہ و شیدا نہ ہو جائے؟" (ایضاً ۲۳۰۵)

کس قدر حیرت کی بات ہے کہ جس شخص کی ساری زندگی اس قدر اہتمام و التزام اور اس درجہ قطعیت و حتمیت کے ساتھ ذات و شخصیت کی واقعیت کے ابطال و انکار میں بسر ہوئی ہو اُس کا ذکر اِس قسم کی مبلغانہ زبان میں کیا جائے! بلاشبہ فوشو ہنگ سان کنگ کی تعلیمات مسیحیت کے مَس

سے متاثر و متغیر ہوئیں لیکن مسائل تشخص و تعین کے متعلق بدھ کے جو پُرزور احتجاجات ہیں وہ اس حقیقت کی غمازی کرتے ہیں کہ داعیانِ مذاہب کی ذات کی پرستش کے رجحانات اُس کے عہد میں بھی موجود تھے! سچ یہ ہے کہ خود بدھ اعظم کی یگانۂ روزگار مقبولیت و محبوبیت کا راز بھی نفسیاتِ انسانی کے اسی نکتہ میں نہاں تھا!

ہندویت میں بھی بدھیت (غیر معروف) کی طرح جو اپنے بعض اطراف و جوانب میں ہندو مذہب کی گویا شاخ ہے 'شخصیت' بمنزلہ صفر کے سمجھی گئی ہے۔ ان مذاہب کے تخیل میں ذات و نفس ایک ایسی چیز ہے جس کو نظر انداز کرنا چاہئے 'جس کی وقعت کو کم کرتے رہنا چاہئے اور بالآخر اُس کو بالکل اُڑا دینا چاہئے۔ یہی "ترکِ وجود" اور "نفئ خودی" نجات و وصال کے مترادف ہے! ہستئ مطلق ان علائق و قیود سے بالکل مبرا و منزہ ہے۔ یہ صرف انسانیت کے لواحق و عوارض ہیں 'اور جس قدر انسانیت اپنے درجے میں فروتر ہو گی اُسی قدر یہ لوازمات اُس میں زیادہ ہوں گے۔ ہندوستان کی تاریخ مذہب کے عہد اساطیری سے گزر کر جہاں مشاہیر اور نیم خداؤں کی کثیر التعداد شخصیتیں نظر آتی ہیں' ہم کو برائے نام افراد ہی بر اعظم ہند کی ناپیدا کنار دنیا میں ایسے ملتے ہیں جن کے حالات زندگی داستانِ امیر حمزہ بنائے جانے سے محفوظ رہے ہوں! اور جس کی وجہ سے اُن کی شخصیت ایک افسانویت کے ساتھ مدغم ہو گئی ہو۔ اِس ملک نے صرف معدودے چند ہی بادشاہ اِس پایہ کے پیدا کئے جن کا شہرہ حدود ہند کو عبور کر کے دوسرے ممالک میں پہونچا۔ چندر گپت' اشوک۔ اب شاید بمشکل کسی تیسرے کا نام لیا جا سکتا ہے! شعراء میں والمیکی اور ویاس سے بعض غیر ملکی لوگ آشنا ہیں' رشی ویشِشٹ اور وشوامتر اور مذاہب فلسفہ کے بعض بانیان کا بیرونی حلقہ شناسائی کچھ اس سے زیادہ ہے' لیکن ان تمام بین الاقوامی واقفکاروں میں بمشکل کوئی ایسا ہوگا جو اُس جماعت سے باہر کا ہو جو "ہندیات" کے مخصوص ماہر ہیں! لیکن وہ عظیم الشان ابطال جنہوں نے ہندوستان پر عمیق اثرات ڈالے' مثلاً نغماتِ وید' اور اُپنشد و بھگوت گیتا کے مصنفین' اور وہ ارباب سیاست جنہوں نے اس ملک کے حکمرانوں کی زمام حکومت کی رہنمائی کی۔ ان سب کی شخصیتیں

عام آبادی کے ہجوم میں گم ہیں! ہم کو یہ معاملات تو بخوبی معلوم ہیں کہ برآہمہ کے کیا معنی ہیں، انکے کیا اعمال و فرائض اور کیا اغراض و مقاصد زندگی ہیں اور بلاشبہ برہمنیت (ربانیت یا رہبانیت) کی روحِ مجردہ ہندوستان کی خلقت کی اصل قائد و حاکم ہے! لیکن ہم خود اُن مخصوص افراد کے متعلق بالکل تاریکی میں ہیں جو اس فلسفۂ حیات کے داعی اور مظہر تھے! ہندوستان کی گمنامی پسند دُنیا کی قریباً تمام کی تمام گمنام شخصیتوں کا مقابلہ روشناس عالم یونانی حکمار، رومی اُمرار عساکر، عبرانی انبیار و رُسل، اور مسیحی اولیار و اصفیا سے کیجیے اور دو بالکل برعکس مناظر کا مشاہدہ کیجیے!

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر　　نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے!

ہندِ قدیم کے تمام نامعلوم الاسم رجال اعظم میں صرف ایک بُدھ کی منارہ نما ہستی نظر آتی ہے جس کے وجود کے مرکز قطبیت کے گرد ایک خلقت نے ہجوم کیا اور قلبی خلوص و محبت کے ہدیے پیش کیے لیکن اپنے ان تمام مظاہر ذات کی جس نے پوری سختی سے ہمت شکنی کی:

"لوگو! میرا سایۂ عاطفت مت ڈھونڈو! اپنی روح کے ملجا و مامن خود بنو!"

(کتابِ وصالِ مقدس ۲، ۳۳)

ہیہات! میں ہنوز ایک خام طالبعلمانہ حالت میں ہوں جس کو اپنی تکمیل نفس کے لیے ابھی بہت کچھ مدارج طے کرنے باقی ہیں اور میرا محترم اور محبوب آقا کوسِ رحلت بجا رہا ہے؟

بُدھ اس بے محل ماتم گری اور روحانی بیراہ روی کی اطلاع پا کر فوراً آنند کو طلب کرتا ہے اور اس کو یوں تسلی دیتا ہے:

"بس بس آنند! اس اضطراب و اضطرار اور شور و شیون کے کیا معنی؟ کیا میں نے تم لوگوں کو اس سے قبل بے شمار موقعوں پر اُس ناموسِ فطرۃ سے روشناس نہیں کیا ہے کہ جو چیزیں ایک دوسرے سے بحد عزیز و قریب ہیں اُن کے لیے یہ جدائی مقدر ہو چکی ہے؟ پس میرے معاملہ میں یہ اٹل قانون کیونکر معطل ہو سکتا ہے؟ میرے لیے اس کلیۂ مطلقہ میں کوئی استثنا تلاش نہیں کیا جا سکتا! آنند! عرصۂ دراز تک تم میرے ساتھ اس طرح وابستہ

محبت و الفت رہے جس کی کوئی حد و حساب نہیں، مدت مدید تک، اے آنند! تم نے مجھپر اپنی مہربانیاں اور احسانات صرف کئے ہیں اور میرے ساتھ ایک انتہائی قربت و محبت کا رشتہ پیدا کر لیا ہے جو غیر منکستنی ہے! تمہاری زندگی قابل داد ہے۔ آنند! بس اپنی مخلصانہ اور صادقانہ جد و جہد کو اسی طرح جاری رکھو، اور مستقبل قریب میں تم بھی میری طرح تمام مکروہات ہستی یعنی شہوت نفس وغیرہ، اور تمام سیئات وجود یعنی انفرادیت و شخصیت اور فریب نظر و جہالت وغیرہ سے نجات پا جاؤگے!" (ایضاً، ۳۲۵ تا ۳۵)

تسلی! لیکن کتنی بیدردانہ اور سرد مہرانہ تسلی! لیکن بُدھ کی جنتِ خیال میں اس سے بڑھکر اور کیا تھا؟ یہ ایک ایسے خون در دل کے درد کا مایوسانہ درماں تھا جو بالکل بے یار و مددگار رہا جاتا ہے اور جس کے سامنے زندگی کا طوفانی سمندر ہے جس کو اُسے ایک ایسی کشتی میں بیٹھکر عبور کرنا ہے جس کا ناخدا بحر سرمدی کی امواج سے وصل ہو رہا ہے!

گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفتہ است!

ہم نے گزشتہ صفحات میں دو تصویریں کھینچی ہیں، اور فلسفۂ مذہبی کی دو مختلف دنیاؤں کا منظر پیش کیا ہے۔ یہ دونوں مرقعے بخط مستقیم ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ لیکن تحقیق تاریخی کے ماضیٔ قریب میں ایک اہم انکشاف ہوا ہے جس نے نہایت غیر متوقع طریقے سے اِن ہر دو متضاد مظاہر میں ایک راہ تطبیق بتائی ہے!

جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی جنوری و جولائی (۱۹۱۵ء) کی اشاعتوں میں ایک تاریخی مقالہ ڈاکٹر سپونر کے قلم سے نکلا جسمیں اُن "حفریات" (کھدائیوں) کی ایک روئداد ہے جو ڈاکٹر موصوف کی زیر نگرانی شہنشاہ چندرگپت کے محلات (متصل پٹنہ) کے موقع پر عمل میں آئیں محقق ممدوح کا بیان ہے کہ میں نے اس محل کو شہر پرسی پولیس (پایۂ تخت ایران بزمانہ چھٹی صدی قبل مسیح) کے دریافت شدہ قصر شاہی کا نقش ثانی پایا! اس تاریخی سُراغ کے پیچھے پیچھے چل کر اور بعض دیگر آثار و قرائن کا اُس پر اضافہ کرکے وہ اِس نتیجہ پر پہونچا ہے کہ عہد مذکور میں شمالی ہند کے اندر اہل ایران کی

وسیع نو آبادیاں قائم تھیں، جو یہاں نہ صرف تاجرانہ حیثیت سے وارد ہوئے تھے بلکہ اس ملک کے فاتح اور حاکم تھے۔ نیز اُس کا خیال ہے کہ خود بدھ بھی دراصل ایرانی النسل ہے! وہ اِس نظریہ میں اس حد تک متجاوز ہے کہ بدھ کے لقب ساکھیمنی کا ترجمہ بھی وہ "دانشمند ایرانی" کے الفاظ سے کرتا ہے!! اُس کا یہ بھی قیاس ہے کہ گوتم کی اوائل عمر بھی مجوسیت کے ماحول میں بسر ہوئی! اور یہ کہ اُس کی دعوتِ دینی کی حقیقی تفسیر یہ ہے کہ وہ مجوسیت اور ہندویت کے درمیان ایک مفاہمت ہے! ممکن ہے کہ اس تاریخی خواب کی کچھ بہتر تعبیر مستقبل میں ملے اگر یہ خیال پایۂ ثبوت کو پہونچ گیا تو ایک یادگار تحقیق ہوگی جس کی دیگر تفصیلات ہندوستان کے غبار آلود مذہبی تاریخ کے مطلع پر بہت روشنی ڈالیں گی۔ اسوقت بھی اُس کے اشارات کی بعض کرنیں چند تاریک گوشوں پر پڑتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں چنانچہ اس نظریہ کی روشنی میں یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستانی مذہبیات کا عقیدۂ تناسخ ممکن ہے کہ بجائے ڈراویدی توہمات (انتقالِ ارواح موئی باجسام حیوانات) سے ماخوذ ہونے کے، ایرانی تخیل "فراوشی" کی خوشہ چینی ہو جس سے مراد نوعِ انسانی کے افراد کے وہ روحانی نسخے ہیں جو "عالم مثال" کی دوسری دنیا میں اس حیاتِ ارضی کے قبل و بعد موجود رہتے ہیں۔ کچھ بعید نہیں کہ مجوسی اور ہندو ہر دو عناصر کا معجون مرکب ہمارے سامنے مذہب گوتم کی شکل میں موجود ہو! اس لئے کہ بدھیت کا جو سب سے زیادہ مرکزی عقیدہ ہے یعنی نفئ وجود، وہ زرتشتیت کی ہر شاخ سے بھی بالکل مختلف ہے اور ہندویت کے سوادِ اعظم کے معتقدات سے بھی قطعاً متبائن!

ہم نے یہاں زرتشت اور بدھ دونوں کے مذاہب پر پہلو بہ پہلو نظر ڈالی ہے اور اب ہم یہ استفتا پیش کرنا چاہتے ہیں کہ اِن ہر دو ملتوں کے داعیوں اور بانیوں کی جو نیت اور جو مطمحِ نظر تھا کیا، وہ پورا ہوا؟ زرتشتیت "زمین پر خدا کی حکومت" کی مبشر ثابت نہ ہوسکی اور نہ زرتشت کی اُمید کے مطابق وہ کافۃ الناس کو اپنے علم کے نیچے لانیمیں کامیاب ہوئی، بخلاف اس کے اُس نے، عرصہ ہوا کہ اپنے کو تبلیغی مذاہب کی فہرست سے بھی خارج کرلیا ہے اور اُس کی داخلی نشو و نما بھی مدت ہوئی کہ معطل ہے۔ بدھ کی محبوب شریعت کا یہ حشر ہوا کہ جب ایک دفعہ اُس کا مسلکِ فنا ساحلِ فنا پر جا لگا تو اُس نے پھر

کسی نشاۃ ثانیہ کا ثبوت نہیں پیش کیا۔ بدھمت کا جو حقیقی سرچشمہ تھا وہ قرنہا قرن ہوئے کہ بالکل مکدر یا خشک ہوگیا اور اگر گوتم بدھ کی اصلی تعلیمات و عقائد کو پیش نظر رکھا جائے تو ہم کو نام نہاد لیکن کثیر التعداد پیروانِ بدھ کی مردم شماری میں غیر معمولی قطع و برید کرنی پڑیگی۔ جو بدعت و تحریف بدھمت کے حرم میں ظہور پذیر ہوئی اسکی نوعیت یہ ہے کہ اُس کے حلقہ بگوش یہی نہیں کہ اس کے نقوش قدم سے بہت پیچھے پڑ گئے ہوں، بلکہ وہ اصلی شاہراہ سے بالکل برعکس سمت میں جارہے ہیں!

ہر دو مذاہب کے سروں پر جو گردشیں آئیں اُن کے تاریخی تبصرے سے میں نے جو تجربہ اخذ کیا ہے اگر اُسے میں قارئین کے سامنے پیش کرنے کی جسارت کروں تو میری تشخیص یہ ہوگی کہ یہ دونوں کاروانِ دعوت اپنی منزلِ مقصود کو نہ پہونچے۔ دونوں جگہ ناکامی کا سبب اثباتِ وجود کے احساس کا فقدان تھا۔ زرتشتیت کے معاملے میں یہ قصور زرتشت کی ذات کا نہیں، بلکہ اسکے مخاطبین کی نااہلیت سے متعلق ہے، لیکن بدھمت کے بارے میں تو تخریب کے جراثیم اصل مذہب کی استخوانِ بست ہی میں پائے جاتے ہیں!

بدھ کے تمام خاکۂ نجات کا سنگ بنیاد یہ سلبی تخیل ہے کہ وجود ذاتی کا کہیں واقعی وجود نہیں۔ یہ محض ایک اعتباری اتفاق ہے جو ضمناً ایک ایسی دنیا میں ظہور پذیر ہوگیا ہے جس پر ایک غیر شخصی جبروتِ مجردہ کی فرمانروائی ہے اور اُس کے پیش نظر جو منزلِ اخیر ہے وہ "تکمیل و استحکام" کی ہے اور انسانی افراد کی یکجائی پیدائش کے مبنی بر محبت واقعہ کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ جیسے "جزِ سمار میں پارہائے ابر کا آنی معانقہ!" اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بدھمت کے سر بفلک قلعہ کی بنیاد ہوا پر رکھی گئی۔ شخصیت کو غیر واقعی ثابت کرنے کی مذبوحی کوشش میں اُس نے خود اپنے وجود کی واقعیت ہی پر ضرب کاری لگائی! چنانچہ شمالی ممالک میں چین اور تبت کے اندر رائے عامہ کے اجماع نے عملاً اس عقیدہ پر فتویٰ ابطال صادر کر دیا ہے۔ روح انسانیت نے بقائے دوام کا مطالبہ کیا اور وہ ایک شخصی نجات دہندہ یا شفیع کے لئے تشنہ لب ہوئی اور جب کسی کو نہ پایا تو اس خالی مسند پر خود حضرت گوتم کو متمکن کر دیا!

توڑ ڈالیں فطرۃ انساں نے زنجیریں تمام — دوریٔ جنت سے روتی چشم آدم کب تلک!

جنوب میں سیلون اور برما نے بھی متفق اللفظ ہو کر اس نفیٔ خودی کی نفی کر دی، جہاں مذہبی زندگی نے قدرے سکون پذیر ہو کر ایک معتدل قسم کی آرام دہ اور خشک "لا ادریت" کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس کی وجہ سے متعلقہ لوگوں کے اضطرابات اور مشکلات قریباً بدستور قائم ہیں اور مستقبل کا مطلع کوئی اُمید بخش منظر پیش نہیں کرتا!

زرتشتیت کی اصلی ہیئت اُس کے بانی کی وفات کے ساتھ ہی ختم ہو گئی۔ اُس کے متبعین ایک شخصیت کے حق میں اپنے اعتماد کو تفویض کرنے سے قاصر ثابت ہوئے اور ایک آئینِ حیات و معاشرت سے وابستہ دامن ہو گئے، کیونکہ یہ آخرالذکر طرزِ عمل اُن کے دل و دماغ کے لئے زیادہ سہل العمل تھا۔ ایک آئین تو محض ایک ذہنی مفاہمت ہی چاہتا ہے درآنحالیکہ ایک شخص قبل اس کے کہ اس کے ساتھ کافی عرصہ تک سابقہ پڑے اور از خود اعتماد کی تخلیق ہو، ہم سے تسلیم و توکلِ کامل کا مطالبہ پیشگی کر دیتا ہے، چنانچہ یہی زیادتی اُس کی اثر آفرینی کی ناکامی کی وجہ ہوتی ہے۔ ایرانی دل و دماغ سے اس "ایمان بالغیب" کی توقع ہی عبث تھی! یہ طبعاً بڑے ہی متشکک لوگ تھے۔ مزدہ اہورا کے ساتھ انکی عقیدت بھی کافی ناقدانہ رنگ رکھتی تھی۔ چنانچہ اُس کے وعدہ وعید کے ساتھ ساتھ ہی وہ آثار گرد و پیش پر بھی نظر رکھتے تھے اور "با خدا ہم ہوشیار" کے مقولے پر عامل تھے! اگرچہ انکی اصلی غایت و نیت کو دیکھتے ہوئے ہم اُن کے اس تذبذب و اضطراب کو بالکل غیر محمود نہیں قرار دے سکتے اسلئے کہ وہ بہرحال روحانی مفاد کے درپے رہتے تھے خواہ بعض اوقات مادی چیزوں ہی کو کشود کار کا وسیلہ کیوں نہ بنانا پڑے۔ اسی ایمانی تزلزل کا یہ کرشمہ تھا کہ جب مجوسیت کی مدائنی شاخ، چند در چند حوادث کے نتیجہ میں، قدیم زرتشت کی مقدس اُمت بھیر بن گئی اور اُس نے ایران کے قلب و روح پر تسلط حاصل کر لیا تو اس انقلاب کے باوجود بھی وہ اپنے بعض مراسم و عقائد سے دست بردار نہ ہوئی جنکو زرتشتیت کے ساتھ کوئی رابطہ نہ تھا! اس جدید مذہب نے اپنے تئیں دنیا کے سامنے اس شان سے پیش کیا کہ وہ اپنے مُردوں کو برسرِ عام کھولکر رکھوا تا تھا، ابتدائی و اولین تعلق خون کے حلقے کے بعد ہی رشتۂ مناکحت

کو جائز رکھتا تھا، سحر و ساحری کے ایک طول و طویل اور تکلیف دہ نظام کو اپنے پیرووں پر عاید کرتا تھا اور آگ کی پرستش کا حکم دیتا تھا، ساتھ ہی اپنے ایک واحد، قائماً بالقسط، اور حکیم و علیم خدا کے وجود کی شہادت دینے سے بھی بند نہ تھا!

رند ہزار شیوہ را طاعتِ حق گراں نبود!

ان سارے معاملات کے حقیقی تصفیہ کے لئے ازبس ضروری و اہم صرف یہ بات ہے کہ ہم مظاہرِ "وجود" یا "شخصیت" کے بارے میں ایک صحیح نقطۂ نظر تک رسائی حاصل کریں۔ اگر ہم بُدھ کا زاویۂ نگاہ قبول کرلیں تو لاریب کہ ہستی کے تمام مصائب و آلام کا تریاق بجز اس کے بتائے ہوئے علاج کے کچھ نہیں۔ لیکن اگر حقیقت و حقانیت کا حامل وہ عقیدہ ہے جس پر زرتشتیت کی بنیاد ہے، نیز جس کا اعلان اُن تمام انبیا و رُسل نے کیا ہے جو بُدھ کی بہ نسبت ہمارے عہد سے بمراحل نزدیک تر ہیں؛ تو پھر ہم کو اُسی شاہراہ جدّ و جہد پر اپنا کاروان عزم چل کھڑا کر دینا چاہیئے جو ایک ایسی منزل عظمیٰ پر جا کر ختم ہوتا ہے جس کا تصور بھی اس وقت ہمارا واہمہ بمشکل کر سکتا ہے!

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا رازداں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا

حقیقتِ حج

ارکانِ اسلام میں سے حج ایک ایسا رکن ہے جو توحید کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ جیسی موحدانہ عبودیت، مخلصانہ خشیت الٰہی، اور والہانہ شیفتگی اس میں پیدا ہوتی ہے کسی دوسری عبادت میں نہیں پیدا ہوتی۔ اُس مرکزِ توحید کو جہاں حج کے مناسک ادا کئے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ نے کچھ ایسی خصوصیت بخشی ہے کہ وہاں مؤمن کے قلب پر وہ کیفیت طاری ہوتی ہے جس کا گمان اور اندازہ بھی دوسری جگہ نہیں کیا جاسکتا۔

دنیاوی حیثیت سے یہ رکن امتِ اسلامیہ کے اتحاد اور ترقی کا ذریعہ اور اُس کے جملہ دینی اور دنیوی مفاسد کا مصلح ہے۔ اس میں اخوت اور مساوات کا عملی درس ہے جس سے شیرازۂ ملت مستحکم ہوسکتا ہے۔ یہ تبادلۂ خیالات کی ایک مقدس انجمن ہے جس میں اقوامِ مسلمہ ایک دوسرے سے اعانت و ہمدردی، دماغی و عقلی فوائد حاصل کرسکتی ہیں۔ یہاں عالمِ اسلامی کا اجتماع ہے جس سے امت کے ہر قسم کے تنازعات و اختلافات مٹائے جاسکتے ہیں، اور ایک متفقہ نظامِ عمل تیار ہوسکتا ہے۔

تاریخِ حج | عہدِ الست کا حامل انسان ابتدائی دور میں باوجود نبیوں اور رسولوں کی تعلیموں کے توحید کی طرف کم مائل ہوا۔ اور اپنی نادانی سے زیادہ تر مظاہر پرستی میں مبتلا ہو کر شرک کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو برگزیدہ فرمایا، جو اپنی مستحکم توحید اور شانِ حنیفیت کے باعث موحدوں کے پیشوائے اعظم ہوگئے۔ انہوں نے اکیلے اللہ کی خاطر اپنے باپ، گھر، خاندان اور وطن سب کو چھوڑ دیا۔ اور جس وقت حجاز کے اس بے آب و گیاہ خطہ میں اپنے بیٹے حضرت اسماعیل کو لیکر آئے اسوقت دونوں نے ملکر خلوصِ قلب اور دلی دعاؤں کے ساتھ اکیلے اللہ کی عبادت کے لئے کعبہ کو تعمیر کیا جو دنیا میں موحدوں کی سب سے پہلی مسجد ہے۔ اللہ نے انکی دعائیں قبول کیں، اس گھر کو مبارک اور سرچشمۂ ہدایت بنایا، اور حضرت ابراہیم کو حکم دیا کہ لوگوں میں حج کا اعلان کر دو، وہ پاپیادہ اور دُبلی سواریوں پر جو راہ دور سے آتی ہیں آئیں گے، اور اپنے لئے فائدے حاصل

کریں گے۔

اس اعلان کے بعد سے حج شروع ہوا اور سلسلہ جاری ہوتا چلا آیا۔ لیکن قرنوں پر قرن اور صدیوں پر صدیاں گزرنے کے بعد اس میں تغیرات پڑنے لازمی تھے۔ اولاد ابراہیم میں سے بنی اسرائیل کا قبلہ جن میں انبیاء پیدا ہوتے تھے اور اللہ کی ہدایت اترتی تھی بیت المقدس قرار پا گیا۔ اور کعبہ کا حج ان لوگوں کی رہنمائی میں ہونے لگا جو علم شریعت سے بے بہرہ اور توحید کی حقیقت سے ناآشنا تھے۔ انہوں نے اس موحدانہ عبادت کو مشرکانہ رسوم اور خرافات کا مجموعہ بنا دیا۔

جب بنی اسماعیل میں دعائے ابراہیمی کا ظہور ہوا، اور نبوت کبریٰ کے وارث رسول عربی محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے، تو انہوں نے بحکم الٰہی پھر اس رکن توحید یعنی حج کو شرکیات سے پاک کر کے اپنی اصلی شکل میں قائم کیا۔ ۹ھ پہلا سال ہے جس میں دوبارہ صحیح اصول پر یہ فریضہ ادا کیا گیا، جو تاریخ میں حج اکبر کے نام سے مشہور ہے۔

فریضۂ حج | یہ رکن چونکہ بنیاد اسلام یعنی توحید، نیز ملت کے ہر طرح کے منافع کا کفیل ہے، اسلئے سال کا ایک چوتھائی حصہ یعنی شوال، ذیقعد، ذالحج تین مہینہ اس کے لئے مخصوص کیا گیا۔

حج کی نیت کرنے والے خالص توحید اور اکیلے اللہ کی رضامندی کی طلب کے لئے جائیں، نہ لڑیں نہ جھگڑیں، نہ عورتوں سے ملاعبت کریں، اور زاد راہ ساتھ رکھیں۔ تجارتی سامان بھی فروخت کے لئے لیجانا ممنوع نہیں ہے۔

ہر مسلم جو حج میں جانے کی استطاعت رکھتا ہو لازم ہے کہ زندگی بھر میں ایک بار ضرور یہ فریضہ ادا کرے۔

احرام | کعبہ ابھی سیکڑوں میل ہے لیکن حجاج معینہ میقاتوں سے نہا دھو کر اور دو رکعت نماز پڑھکر اس مقدس مسجد کا زائرانہ لباس پہن لیتے ہیں۔ ایک لنگی اوپر، ایک لنگی نیچے۔ زیب و زینت کچھ نہیں۔ خوشبو اور آرائش ممنوع۔ آقا اور غلام برابر ہو گئے۔ شاہ و گدا کا امتیاز اٹھ گیا۔ اخوت اور مساوات سب کے سب ایک رب العزت کے آستانہ کے فقیر سب کی توحید کا دم بھرنے والے۔

اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ، لَا شَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ

ہر ایک کے ورد زبان۔ سارے جھگڑے مٹنے ختم۔ شکار و ذبح حرام۔ اور لہو ولعب بند۔

قافلہ رواں اور دواں ہے۔ وفور شوق سے دل بیتاب ہو رہے ہیں کہ کب اس منزل پر پہونچیں جہاں برکتیں اترتی اور رحمتیں برستی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ جگہ آگئی۔ لبیک کے نعروں سے فضا گونج اٹھی۔ زائرین بے قرارانہ داخل ہوئے اور پاک وصاف ہو کر اس گھر میں پہونچے جو دنیا کے تمام گھروں سے زیادہ محترم ہے۔

حجر اسود | عہد ابراہیمی میں پیمانِ عام لینے کا دستور یہ تھا کہ ایک پتھر رکھدیا جاتا جس پر لوگ آآکر اپنے ہاتھ مارتے۔ اس کے معنی یہ تھے کہ جس عہد کے لئے وہ پتھر رکھا گیا ہے اسکو انہوں نے تسلیم کرلیا۔

حضرت ابراہیم نے جب کعبہ تعمیر کیا تو اس کے ایک کونے پر ایک پتھر نصب کردیا کہ اس گھر میں جسکی بنیاد اکیلے معبود کی پرستش پر ہے جو داخل ہو پہلے اس پر ہاتھ رکھکر پھر طواف کرے یعنی سات چکر لگائے۔ گویا وہ اپنے آپ کو اس کی توحید پر جسکی عبادت کے لئے یہ گھر ہے نثار کرتا ہے۔ اگر جان بھی دینی پڑیگی تو بھی اس سے منحرف نہ ہوگا۔

اسی پتھر کا نام حجر اسود ہے۔ نہ اسمیں کوئی طاقت ہے نہ اسمیں کوئی قوت۔ نہ یہ جنت کی چٹان ہے نہ عرش معلیٰ کا فرش۔ صرف تجدید عہد ابراہیمی اور پیمانِ حنیفیت کے لئے ایک نشان ہے اور بس۔ اس کو چھونے یا ہجوم کی صورت میں دور ہی سے اس کی جانب ہاتھ اٹھا دینے کو استلام کہتے ہیں۔ چونکہ یہ توحید کا مقدس پیمان ہے اس لئے ہاتھ یا پتھر کو چوم بھی لیتے ہیں۔ مسجد حرم میں پہونچکر سب سے پہلا کام یہی استلام ہے جس سے طواف شروع ہوتا ہے۔

نادان ہیں وہ لوگ جو عہد توحید باندھنے والوں پر سنگ پرستی کی تہمت لگاتے ہیں۔ حج کے جتنے اعمال ہیں وہ تو سارے کے سارے شرک کے مذبح ہیں۔ حجاج کی امتیازی صفت قرآن میں یہ ہے "حُنَفَاءَ لِلّٰہِ غَیْرَ مُشْرِکِیْنَ بِہٖ" یعنی وہ اللہ کی طرف یک رُخے ہونیوالے ہیں۔ کسی کو اُس کا شریک بنانے والے نہیں۔

طواف | یہ نظارہ کس قدر روح پرور ہے !! سیکڑوں ہیں جو حجرِ اسود کی طرف ہاتھ اٹھا کے طواف شروع کر رہے ہیں۔ ہزاروں ہیں جو پروانہ وار گھوم رہے ہیں اور اللہ کے نام، اُس کی توحید اور اُس کے آستانہ پر نثار ہو رہے ہیں۔ دل سینوں میں اچھل رہے ہیں، آنسو آنکھوں سے اُبل رہے ہیں، اور منہ سے یہ کلمات نکل رہے ہیں:۔

اَللّٰھُمَّ اَلْحَرَمُ حَرَمُكَ ۔ وَالْعَبْدُ عَبْدُكَ ۔ جَاءَكَ تَائِبًا هَارِبًا مِّنَ الذُّنُوْبِ ۔ هٰذَا مَقَامُ الْعَائِذِ بِكَ يَا اَللّٰهُ ۔

بکثرت کعبہ کی چوکھٹ تھامے ہوئے خشوع اور خضوع کے ساتھ استغفار میں محو ہیں۔ بیسیوں غلاف سے لپٹے ہوئے گریہ وزاری کر رہے ہیں۔ بہت سے دیواروں سے لگے ہوئے سجدہ میں پڑے ہیں اور رو رو کر دعائیں مانگ رہے ہیں۔ ایک وارفتگی کا عالم ہے جو سارے مجمع پر چھایا ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساحتِ قرب کی طنابیں کھینچ گئی ہیں اور جلالِ کبریائی سے قلوب پگھل پگھل کر پانی ہو رہے ہیں۔

یوں تو اللہ تعالیٰ کب اور کہاں نہیں مگر بعض بعض زمان و مکان کو اس نے خاص خاص خصوصیتیں دے رکھی ہیں جو دوسروں میں نہیں۔

مقامِ ابراہیم | طواف کے بعد اُس تجلی گاہ میں آتے ہیں جو مطاف کے حاشیہ پر ہے۔ یہ معمارِ کعبہ حضرت ابراہیمؑ کا مقام ہے جہاں مرمر کا ایک حجرہ اور سائبان بنا ہوا ہے۔ یہ خاص قبولیت کا مصلیٰ ہے۔ یہاں صلوٰۃ شکر کا دوگانہ ادا کر کے دعائیں کرتے ہیں اور فرطِ رقت سے دل کا خون آنکھوں سے بہاتے ہیں۔

سعی | صفا اور مروہ میں دو فرلانگ سے زیادہ فصل نہیں جس میں بیچ ابن سعود کی بنائی ہوئی پختہ سڑک ہے اور اوپر ترکوں کا ڈالا ہوا سائبان۔ مسجد حرم سے مشرقی جانب پہلا قدم جو باہر رکھا جائیگا وہ اسی سڑک پر پڑیگا۔ دورویہ بازار ہے اور مکہ کا بڑا بازار۔

طواف کر کے حجاج سعی کیلئے نکلتے ہیں کہ یہ بھی شعائر الٰہی میں سے ہے۔ کبھی ایک متبرک ہستی نے پانی کی جستجو میں ان پہاڑیوں کے درمیان بے تابانہ چکر لگائے تھے اور اس کی یہ ادا رب العزت کو بھا گئی تھی۔

سعی میں بھی دلوں میں وہی رقت ہے اور وہی سوز و گداز۔ تیز گامی بھی ہے اور آہستہ خرامی بھی۔ کبھی حمد و ثنا ہے اور کبھی استغفار و دعا۔ سات بار دوڑتے ہیں اور ہر دوڑ میں وہی محویت ہے اور وہی استغراق۔ جھنڈ کے جھنڈ ہیں مگر ایک کو دوسرے کی خبر نہیں۔

سڑک کے دونوں جانب دوکانیں کھلی ہوئی ہیں اور خرید و فروخت جاری ہے لیکن یہ گدایانِ آستانہ کسی اور ہی دھن میں ہیں۔ ان کو کچھ خبر نہیں کہ کدھر بازار ہے اور کیسا کاروبار۔ ان کا سودا ہی دوسرا ہے۔

سعی سے فارغ ہونے کے بعد تمتّع یعنی خالی عمرہ کی نیت کرنے والے جامۂ احرام اُتار دیتے ہیں کیونکہ ان کا کام پورا ہو گیا۔ جب حج میں جائیں گے تو پھر اس کو پہن لیں گے لیکن قِران یعنی حج و عمرہ دونوں کی ساتھ نیت کرنے والے ابھی اسی فقیرانہ لباس میں رہیں گے تاوقتیکہ جملہ مناسکِ حج پورے نہ کر لیں۔

اب ہر ایک کے لئے زمانۂ حج تک اپنی اپنی محنت اور کوشش ہے۔ جسقدر چاہیں حرم میں نمازیں پڑھیں، دعائیں مانگیں اور طواف کریں اور جو کچھ ہو سکے خیرات و مبرات میں حصہ لیں۔ یہ مقدس مقام اور یہ موقع روز روز نہیں مل سکتا۔

عرفات | آٹھویں تاریخ آگئی۔ حج کے لئے روانگی ہے۔ راستہ بھرا پڑا ہے۔ اونٹوں کی چار چار قطاریں ایک ایک ساتھ چل رہی ہیں۔ ہزاروں گدھوں پر ہیں اور لاکھوں پیدل۔ سب کے سب کسی خاص دھن میں ہیں۔ نہ بات ہے نہ چیت نہ شور ہے نہ ہنگامہ۔ شام کو منا میں پہونچے۔ رات کو وہیں منزل رہی۔ صبح کو پھر کوچ ہوا۔ دوپہر کو اُس مبارک میدان میں داخل ہوئے جو حج کی جگہ ہے جسکی کشش ان سب کو کھینچکر لائی ہے۔ کاروان پر کاروان پہونچ رہے ہیں اور جہاں تک نگاہ جاتی ہے ڈیرے ہی ڈیرے لگے ہیں۔

عہد ازلی کے متوالے۔ خمخانۂ الست کے سرشار، پیمانِ حنیفیت کے سرمست، مغرب، مشرق، شمال، جنوب، دنیا کی چاروں سمتوں سے، دور دراز راہوں سے، سمندروں کو عبور اور بیابانوں کو

کو قطع کرتے ہوئے اپنے مالک کی حضوری میں حاضر ہوئے ہیں۔ سب توحید کے فرزند آپس میں بھائی بھائی، ایک ہی بھیس اور ایک ہی رنگ میں۔ ایک ہی آستانہ کے پجاری اور ایک ہی در کے بھکاری۔ جلتے ہوئے پتھروں پر تپتی ہوئی دھوپ میں سر کھولے ہاتھ جوڑے اللہ کے سامنے کھڑے ہیں اور درد بھرے دل کو اُس کے آگے انڈیل رہے ہیں۔ دعائیں ہیں اور التجائیں، تسبیح ہے اور تحلیل، گناہوں کا اقرار ہے اور توبہ اور استغفار۔

یہ موقع زندگی میں کسی خوش قسمت ہی کو نصیب ہوتا ہے۔ جو مانگنا ہے مانگ لو۔ جو مقصد ہو طلب کر لو۔ دین کے لئے بھی دنیا کے لئے بھی، اپنے لئے بھی اوروں کے لئے بھی، کوئی مدعا رہ نہ جائے۔ کوئی آرزو چھوٹ نہ جائے۔ بڑے کریم کا دربار ہے جو یہاں آنیوالوں کو کم سے کم جو چیز دیکر راضی ہوتا ہے وہ جنت ہے۔

لیکن ہائے، ہائے، اس اجتماع میں یہ انفرادیت! بھائیوں سے بھائی خبر تک نہ ہوئے، نہ ایک نے دوسرے کو جانا۔ نہ دل کی راہیں کھلیں۔ نہ آپس کے دکھ درد معلوم ہوئے۔ رشتۂ اخوت کہاں گیا شیرازۂ الفت کیوں ٹوٹا ہوا ہے؟

خطیب جو رسول پاک کے منبر پر کھڑا ہوا وہ بھی کچھ نہ بولا۔ ایک ڈھلا ہوا مصنوعی خطبہ، فصیح و بلیغ، مقفّٰی و مسجع پڑھکر اُتر آیا۔ نہ ضروریات ملت کی خبر نہ شناسائی۔ نہ حالاتِ امت پر نظر نہ راہنمائی۔ خالی رسم کی خانہ پُری تھی، صرف قافیہ بندی کی شاعرانہ دادطلبی، اور محض بے مغزی کا مظاہرہ!!

ضرورت تھی کہ عرفات میں اقوام و امم کا تعارف ہوتا۔ باہم ملتے جلتے۔ راہ و رسم پیدا کرتے جس سے ساری امت ایک رشتہ میں منسلک ہو جاتی۔ اور یہ دشوار نہ تھا۔ جس جس ملک یا قوم کے لوگ آئے تھے اپنے میں سے ایک ایک کو چنکر اپنا امیر بنا لیتے۔ یہ امرا مکہ میں باہم ملتے۔ تبادلۂ خیالات کے بعد انہیں میں سے ایک منتخب دماغ عرفات میں خطبہ پڑھتا جس میں ملت کی اجتماعی رہبری ہوتی اور کم سے کم ایک سال کا لائحۂ عمل۔

منبر | ہادیِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے منبروں کو ہدایت کے لئے نصب فرمایا ہے۔ انکا رشتہ

قلوب کے ساتھ ہے کیونکہ ان سے جو آوازیں نکلتی ہیں وہ دلوں کی تہ تک نفوذ کرتی ہیں یہ بمنزلہ برقی بیٹری کے ہیں جنسے دلوں کے قمقموں میں روشنی اور حرارت پہونچتی ہے۔ ان سب کا مخزن میدان عرفات کا منبر ہے جو افسوس ہے کہ مدتہائے دراز سے خاموش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امت کے قلوب بے نور، افسردہ، منتشر اور متفرق ہیں۔ تنظیم کی صورت صرف نصب مرکزیت ہی اور کچھ نہیں۔ کیونکہ مرکز کی طرف ہر فرد متوجہ ہو جاتا ہے جس سے خود بخود ساری قوم منظم ہو جاتی ہے۔ جیسے شمع، کہ اُس کے روشن ہوتے ہی گھر کی کل چیزیں اپنی اپنی جگہ پر نظر آنے لگتی ہیں۔ افراد یا جماعتوں وغیرہ سے اُس کو شروع کرنے میں ہمیشہ ناکامیابی ہوگی۔ کیونکہ یہ الٹا راستہ ہے۔

مزدلفہ عرفات میں حج سے فراغت ہوگئی۔ جس کام کے لئے آئے تھے وہ کام ہو چکا۔ غروب کے وقت قافلے روانہ ہوگئے اور مشعر حرام کے پاس آکر ٹھہر گئے۔ حجاج تھکے ماندے بالعموم سو رہے۔ اِلّا ماشاء اللہ۔

اے غفلت زدہ کاروان! یہاں ذکر الٰہی کا حکم تھا۔ سونے کیلئے تو زندگی پڑی ہے نہیں تو موت کی نیند کیا کم پڑی ہے۔ یہ اُس مالک کی یاد کا موقع تھا جس نے ایسا دن دکھایا سب ملکر اسکی حمد و ثنا پڑھتے اور اُس کا شکریہ ادا کرتے۔ تنہا بیٹھ کے ورد اور وظیفہ نہیں۔ کیونکہ یہ انفرادیت ہے اور یہاں جمہوریت چاہیئے۔

قربان گاہ خلیل صبح اٹھکر مزدلفہ سے منا میں آگئے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں توحید کے پیشوائے اعظم اور حنفاء کے سرگروہ نے اپنے پہلوٹھے بیٹے کو اللہ کے حکم کے مطابق قربان کرنے کیلئے پیشانی کے بل زمین پر لٹا دیا تھا اور چھری نکال چکے تھے کہ آسمانی رحمت نے لپک کر ہاتھ تھام لیا اور کہا بس، تم اپنی طرف سے سب کچھ کر چکے اور اس کڑے امتحان میں پورے اُتر گئے۔

اسی کا فدیہ یہ ذبح عظیم ہے کہ ہر سال دین حنیف کے شیدائی اور ملت ابراہیمی کے فدائی لاکھوں ذبیحے یہاں اللہ کے نام پر قربان کر کے سنت خلیل کو تازہ کرتے ہیں۔

قربانی یہ مجمع جو اطراف و اکناف عالم سے آکر جمع ہوا ہے بیت اللہ کا زائر اور اپنے رب کا

مہمان ہے۔ اس لئے اس نے اپنے ان بندوں پر جنکو استطاعت دی ہے یہ فرض عائد کیا ہے کہ ان ضیوف کی میزبانی کریں جس کے بدلے میں ان کو اجر اور ثواب ملے گا۔ دور دور کے ذی مقدرت بھی جو خود نہ حاضر ہوں جانوروں کو قربانی کے لئے بھیجکر اس کار خیر میں حصہ لے سکتے ہیں۔

یہی قربانی کی اصل حقیقت ہے یعنی اسکی غرض حجاج کی ضیافت ہے نہ کہ محض خونریزی۔ اللہ کا حکم یہی ہے:۔

فَكُلُوا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ

یعنی قربانی کو خود بھی کھاؤ اور مصیبت زدوں اور محتاجوں کو بھی کھلاؤ۔

قربانی کے بعد حج کی تکمیل اور اس فریضہ سے سبکدوشی ہو جاتی ہے۔ اب کھانا ہے اور کھلانا اور فرق مراتب کا لحاظ۔ اسوجہ سے مساوات کے لباس جامۂ احرام کی ضرورت نہیں رہی۔ حجاج سر منڈاتے، بال ترشواتے اور ناخون کٹاتے ہیں اور صاف ستھرے ہو کر اپنے کپڑے پہن لیتے ہیں۔

تین دن تک یہاں مجمع رہتا ہے اور تینوں دن قربانیاں ہوتی ہیں۔ یہی ایام تشریق ہیں۔

صدیوں سے اس قربانی کی جو حالت ہو رہی ہے اس کا بیان تکلیف دہ ہے۔ لاکھوں جانور ذبح کر کے ڈالدئے جاتے ہیں جنکے کھانے کیلئے گدھ اور گیدڑ بھی نہیں ہوتے۔ آخر ان کو دفن کر دینا پڑتا ہے۔

کاش یہاں بھی تنظیمی شکل ہوتی۔ ہر ہر قوم کے ڈیرے جداگانہ قطعات میں لگتے جو اپنی جماعت کے اندازہ اور ضرورت کے مطابق قربانیاں کرتے۔ ایک جگہ پکواتے اور ایک ساتھ کھاتے کھلاتے۔ قومیں بھی ایک دوسرے کی مہمانی اور میزبانی کا لطف اٹھاتیں اور باہم الفت و موانست پیدا کرتیں۔

ہر جماعت کے لوگ اپنے ہمراہیوں کو اپنی زبان میں عرفات کا خطبہ سناتے اور سمجھاتے۔ اس صورت میں جو حاجی وہاں سے آتا وہ ملت کا پیغام اپنی بستی میں لاتا جس سے تمام عالم اسلامی میں ایک اجتماعی روح پھیل جاتی۔

رمی جمرات | منا میں تین جگہ تین نشانات بنے ہوئے ہیں جو شیطان سے تعبیر کئے جاتے ہیں۔ ان پر تینوں دن حجاج کنکریاں مارتے ہیں۔ گویا اس رجم سے اس عدوئے دین پر جو انسان کو فریب دیکر

تعمیل فرمان اور توحید الٰہی سے روکتا ہے لعنت کرتے ہیں۔ یہ دستور پیشتر سے چلا آتا تھا۔ اسلام نے بھی اس کو قائم رکھا۔[1]

وداع تین دن یا کم سے کم دو دن منا میں رہکر مکہ میں آجاتے ہیں اور طواف کر کے حج کے کل فرائض سے فارغ ہو جاتے ہیں۔ اب کوئی وطن کو پلٹتا ہے، کوئی مدینہ شریف کو جاتا ہے اور مجمع منتشر ہونے لگتا ہے۔ اسوقت ایک اجتماع عام کی ضرورت تھی جس میں سب ملکر اپنے رب کا ذکر کرتے۔ مواعظ بھی ہوتے اور خطبات بھی۔ حمد و ثنا کے قصیدے پڑھے جاتے اور شکر کے ترانے گائے جاتے۔ عربی میں بھی۔ عجمی میں بھی۔ ایرانی میں بھی تورانی میں بھی۔ اس کے بعد طواف وداع کر کے اس حرم پاک سے رخصت ہوتے۔

---

[1] قرین قیاس یہ ہے کہ رمی جمار کی تاریخ عہد ابراہیمی سے نہیں بلکہ اصحاب فیل کے واقعہ سے تعلق رکھتی ہے جو کعبہ کو ڈھانے آئے تھے۔ اہل مکہ نے جو اس طاقتور لشکر کے رو در رو مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتے تھے ان تینوں جگہوں پر پہاڑ سے ان پر پتھراؤ کئے تھے جیسا کہ "ترمیھم بحجارۃ من سجیل" سے ظاہر ہوتا ہے کیونکہ ترمی کا فاعل بھی وہی مخاطب ہے جو پہلی آیت میں "الم تر" کا فاعل ہے نہ کہ "طیر" جیسا کہ عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں۔ یہ لشکر جب عذاب الٰہی سے ہلاک ہو گیا تو اس کی یاد تازہ رکھنے کیلئے حج سے واپسی کے وقت ان مقامات میں رجم کا دستور مقرر ہو گیا۔ اسی طرح ابرہہ کے راہبر ابو رغال ثقفی کی قبر پر بھی جو مکہ اور طائف کے درمیان مقام مغمس میں ہے ہر عرب جو گزرتا ہے رجم کرتا ہے۔

کلام اثر

خواجہ درد کے شاگرد اثر کا دیوان ابتک شائع نہیں ہوا۔ عرصہ سے ہمارے محترم مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو کو اسکی تلاش تھی۔ اثر کی ایک مثنوی انجمن کی طرف سے شائع ہو چکی ہے لیکن دیوان دستیاب نہ ہوتا تھا۔ جامعہ کے کتب خانہ میں دیوان اثر کا ایک قلمی نسخہ ہے۔ جسکی نقل انجمن کو دیدی گئی ہے۔ مولوی صاحب کا قصد ہے کہ اور کوئی نسخہ مل جائے تو مقابلہ کرکے اُسے انجمن کی طرف سے شائع کر دیں۔ ذیل میں ہم اسی قلمی دیوان سے دو غزلیں ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

صرفِ غم ہم نے نوجوانی کی — واہ کیا خوب زندگانی کی

تیرے داغوں کی اے غمِ اُلفت — خوب ہم نے بھی باغبانی کی

کس کے ہاں تم کرم نہیں کرتے — کبھو ایدھر نہ مہربانی کی

اپنے نزدیک دردِ دل میں کہا — تیرے نزدیک قصہ خوانی کی

ہرزہ گوئی سے مجھکو دی ہے نجات — ہے گی منت یہ بے زبانی کی

نہیں طاقت کہ دم نکال سکوں — اب یہ نوبت ہے ناتوانی کی

اثر اس حال پہ بھی جیتا ہے
کیا کہوں اس کی سخت جانی کی

اثر کیجیے کیا، کدھر جائیے — مگر آپ ہی سے گزر جائیے

کبھو دوستی ہے کبھو دشمنی — تمہی کون سی بات پر جائیے

مرا دل مرے ہاتھ سے لیجئے اور — ستم ہے مجھی سے مکر جائیے

کئی روز کی زندگانی ہے یاں — نبے جسطرح زیست کر جائیے

اثر ان سلوکوں پہ کیا لطف ہے
پھر اُس بے مروت کے گھر جائیے۔

ماموں جان

(بسلسلہ ماہ نومبر)

چوتھا ایکٹ

وانشکی کا کمرہ: یہ اُس کا سونے کا بھی کمرہ ہے اور دفتر بھی۔ کھڑکی سے لگی ہوئی ایک میز ہے جس پر حساب کی کتاب اور بے شمار کاغذات کا انبار ہے؛ اس کے بعد ایک لکھنے کی میز؛ کتابیں رکھنے کی بریکیٹ، ترازو وغیرہ۔ پاس ہی ایک چھوٹی میز ہے جس پر استروف کا سامان ہے؛ رنگ، برش اور نقشہ کھینچنے کی چیزیں۔ اس کے پاس ایک بڑا تھیلا ٹنگا ہے۔ ایک قفس جس میں ایک چڑیا بند ہے۔ دیوار پر ایک افریقہ کا نقشہ ٹنگا ہے جس کا بظاہر کوئی مصرف نہیں ہے۔ ایک بڑا صوفا جس پر امریکن چمڑہ چڑھا ہوا ہے۔ بائیں طرف ایک دروازہ جو اندر کے کمروں میں کھلتا ہے۔ داہنی طرف ایک دروازہ ہے جو ہال میں کھلتا ہے۔ دروازہ کے قریب، داہنی طرف ایک پائدان پڑا ہے تاکہ کسان اور دیہات سے آنیوالے لوگ کمرے کا فرش نہ خراب کریں۔ خزاں کی ایک شام۔ خاموشی۔

تلی گن اور مارینا آمنے سامنے بیٹھے اُون کات رہے ہیں۔

تلی گن: ماریناٹموفیونا! آؤ کام جلد ختم کر دیں۔ ابھی خداحافظ کہنے جانا ہوگا۔ گھوڑے جوتنے کو کہہ دیا گیا ہے۔

مارینا: (چرخہ کو اور زیادہ تیزی سے چلانیکی کوشش کرتی ہے) تھوڑی اُون رہ گئی ہے۔

تلی گن: وہ ہارکو جارہے ہیں۔ وہیں رہیں گے۔

مارینا: اچھا ہے۔

تلی گن: وہ بہاں ڈر گئے ہیں...... دونوں...... یلنا اینڈریونا کہتی رہتی ہیں "میں ایک گھنٹہ یہاں نہیں ٹھہروں گی۔ یہاں سے چلدو۔ یہاں سے چلدو! "ہم ہارکو میں قیام کریں گے" وہ کہتی ہیں

"شہر کو ذرا گھوم پھر کے دیکھ لیں پھر اپنا سامان منگوالیں گے ...." وہ اپنے ساتھ بہت سامان نہیں لئے جا رہے ہیں۔ ماریا؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی قسمت میں نہیں ہے کہ یہاں رہیں۔ اُن کی قسمت میں نہیں ہے .... اللہ کی مرضی یہی ہے۔

ماریا: یہ اچھا ہے کہ وہ یہاں نہ رہیں۔ ذرا صبح کے جھگڑے اور پستول کی لڑائی کا خیال کرو ـــ خدا کی پناہ یہ حیوانیت سے بدتر ہے!

تلی گن: بے شک۔ ایک ایسا موضوع جس پر آلیواز دوسکی[1] کا قلم جادو رقم جولانیاں دکھائے۔

ماریا: وہ منظر نہیں بھولتا۔ وہ خوفناک منظر (ایک وقفہ) اب ہم پھر پُرانی طرح رہیں گے، جیسے پہلے رہتے تھے۔ ہم آٹھ بجے ناشتہ کیا کریں گے، ایک بجے دوپہر کا کھانا کھائیں گے، اور سرِ شام شب کا کھانا کھا لیا کریں گے۔ ہر بات پُرانے طریقہ سے ہوگی جس طریقہ سے ہونی چاہئے، جیسا اور لوگ کرتے ہیں .... جو عیسائیوں کا دستور ہے۔ (ایک آہ سرد کے ساتھ) مدت ہوئی میں نے نوڈلس[2] نہیں چکھے۔ خدا مجھ پر رحم کرے!

تلی گن: ہاں؛ زمانہ ہوگیا کہ کھانے پر نوڈلس نہیں لائے گئے۔ (ایک وقفہ) .... آج صبح میں گاؤں سے گزر رہا تھا کہ دوکاندار نے مجھے پکار کر کہا "ارے بے شرم، دوسروں کے ٹکڑوں پر کب تک پڑا رہے گا؟" یہ بات میرے دل پر تیر کی طرح لگی۔

ماریا: نہیں، پیارے، تم اس کا ذرا اثر نہ لو۔ ہم سب خدا کے ٹکڑوں پر پڑے ہیں۔ اُسی کا دیا کھاتے ہیں۔ اس میں چاہے میں ہوں، یا تم ہو یا سونیا، یا آئوان پطرووچ، کوئی بے کار نہیں رہتا ہم سب محنت کرتے ہیں، کام کرتے ہیں! سب .... سونیا کہاں ہے؟

---

[1] ایک روسی مصنف۔ مترجم۔

[2] نوڈل ایک آبی پرندہ ہے جسے روسی شوق سے کھاتے ہیں۔ اس لفظ کے لغوی معنی سادہ لوح کے ہیں اور چونکہ یہ پرندہ نہایت آسانی سے پکڑ لیا جاتا ہے اسلئے اسے یہ نام دیا گیا۔ افسوس کہ مجھے اس پرندہ کا اُردو نام نہیں معلوم۔ مترجم۔

تلی گن : باغ میں اب تک بیچاری ڈاکٹر کے ساتھ آٹورن پٹرووچ کو ڈھونڈنے میں لگی ہے۔ انہیں ڈر ہے کہ کہیں وہ خودکشی نہ کرلے۔

ماریںا : اور اُس کا پستول کہاں ہے؟

تلی گن : (چپکے سے) مَیں نے اُسے کوٹھری میں چھپا دیا ہے!

ماریںا : (مسکراکر) خوب!

(باہر سے وائنٹسکی اور اشروف داخل ہوتے ہیں)

وائنٹسکی : مجھے اکیلا چھوڑ دو (ماریںا اور تلی گن سے) جاؤ! مجھے اکیلا رہنے دو۔ خواہ ایک گھنٹہ کے لئے سہی! اپنی نگہبانی میں نہیں برداشت کرسکتا۔

تلی گن : ضرور، ضرور، وانیا۔ (پنجوں کے بل باہر جاتا ہے)

ماریںا : راج ہنس کہتا ہے، قیں، قاں، قاں! (اپنا اون اکٹھا کرتی ہے اور باہر جاتی ہے)

وائنٹسکی : مجھے اکیلا چھوڑ دو!

اشروف : بڑی خوشی سے اکیلا چھوڑ دوں گا۔ میں تو کب کا چلا گیا ہوتا لیکن میں پھر کہتا ہوں جب تک میری چیز نہ واپس کروگے میں نہیں جاؤں گا۔

وائنٹسکی : میں نے تم سے کوئی چیز نہیں لی۔

اشروف : میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں مجھے نہ روکو۔ مجھے کب کا چلا جانا چاہئے تھا۔

وائنٹسکی : میں نے تم سے کوئی چیز نہیں لی (دونوں بیٹھ جاتے ہیں)

اشروف : دیکھو، میں کچھ دیر اور توقف کرتا ہوں، اس کے بعد مجھے معاف کرنا میں زبردستی کروں گا۔ ہم تمہارے دونوں ہاتھ باندھ دیں گے اور تمہاری تلاشی لینگے۔ میں بالکل سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔

وائنٹسکی : تمہیں اختیار ہے (ایک وقفہ) مَیں بھی کیسا بیوقوف بنا: دو مرتبہ پستول چلایا اور دونوں مرتبہ وہ بچ گیا! میں اس کے لئے خود کو بھی معاف نہیں کروں گا۔

اشروف : اگر بندوق، گولی، بارود وغیرہ سے آپ کو کھیلنا ہے تو بہتر ہے کہ آپ خود اپنے کو نشانہ بنائیں۔

وانٹسکی: (اپنے کاندھے ہلاکر) یہ عجیب بات ہے۔ میں نے قتل کا ارادہ کیا اور مَیں گرفتار نہیں کیا گیا۔ کسی نے پولیس کو خبر نہیں کی۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ مجھے پاگل سمجھا ہے (ایک حقارت کی ہنسی ہنس کے) میں پاگل ہوں لیکن وہ لوگ پاگل نہیں ہیں جو اپنی بھدی موٹی بے وقوفی پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ اپنی کھلی ہوئی بے حسی و بے ذوقی پر پروفیسری کا نقاب ڈالتے ہیں۔ وہ لوگ پاگل نہیں ہیں جو بڈھوں کے ساتھ شادی کرتے ہیں اور انہیں ہر شخص کے سامنے فریب دیتے ہیں۔ مَیں نے اپنی آنکھوں سے تمہیں اُس کا پیار لیتے ہوئے دیکھا! میں نے دیکھا!

اشروف: بے شک' میں نے اس کا پیار لیا۔ لیکن اس سے زیادہ تم نے کچھ نہیں دیکھا۔

وانٹسکی: (دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے) نہیں نہیں' تمام دنیا پاگل ہے کہ تمہیں تمہارے کئے کی سزا نہیں دیتی!

اشروف: بس کرو۔ کیوں پاگل ہوئے ہو؟

وانٹسکی: اچھا پاگل ہوں۔ میرا کوئی قصور نہیں' مجھے بیوقوفی کی باتیں کرنے کا حق ہے۔

اشروف: کیا بہانہ ڈھونڈا ہے! تم پاگل ہرگز نہیں۔ تم میں یہ کمزوری ہے کہ بہت جلد متاثر ہو جاتے ہو۔ پہلے مَیں ہر اس شخص کو جو کمزور قلب کا ہو اور جلد اثر لیتا ہو بیمار سمجھتا تھا۔ لیکن اب میرا خیال ہے کہ انسان کے لئے یہ معمولی بات ہے کہ وہ کمزور قلب ہو۔ تم بالکل اور انسانوں کی طرح ہو۔ پاگل نہیں ہو۔

وانٹسکی: (اپنے ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا لیتا ہے) مَیں نادم ہوں! کاش تم اندازہ کر سکتے میں کسقدر نادم ہوں! اس سخت اور تکلیف دہ احساس ندامت سے کسی درد کو نسبت نہیں۔ (افسوس کے ساتھ) کیا کروں؟ کیا کروں؟ (میز پر جھک جاتا ہے) اسے کیسے برداشت کروں؟ میں کیا کروں؟ میں کیا کروں؟

اشروف: کچھ نہ کرو۔

وانٹسکی: میرے لئے کوئی دوا تجویز کردو! ارے میرے اللہ! میں سینتالیس سال کا ہوں۔ اگر میں ساٹھ برس کا ہو کر مروں تو ابھی تیرہ برس مجھے اور زندہ رہنا ہے۔ اُف! اُف! یہ طولِ حیات! ان تیرہ برسوں کو میں کس طرح گزاروں؟ اس طویل مدت مَیں کیا کروں؟ ان تیرہ برسوں کو مَیں کس چیز سے پُر کروں؟

آہ، جانتے ہو........ (اشروف کے ہاتھ کو زور سے پکڑ کر) جانتے ہو، کاش یہ ممکن ہوتا کہ اپنی باقی زندگی کسی نئے طریقہ سے گزار سکتا۔ ایک خاموش شہری صبح آنکھ کھلتی اور ایسا محسوس ہوتا جیسے مجھے ایک دوسری زندگی ملی، جیسے میرا تمام ماضی فراموش ہے، صفحۂ یاد سے حرفِ غلط کی طرح متروک ہے۔ گویا میرا ماضی دھوئیں کی طرح پھیل کر غائب ہو گیا۔ (روتا ہے)۔ ایک نئی زندگی شروع کرنا......آہ! مجھے بتاؤ اسے کیسے شروع کروں........ کیا شروع کروں.......

اشروف: (پریشان ہو کر) چپ رہو! خاموش ہو جاؤ! نئی زندگی! ہمارے اور تمہارے دونوں کے لئے کوئی اُمید نہیں۔

وائنٹسکی: کیا؟

اشروف: مجھے یقین ہے کوئی امید نہیں۔

وائنٹسکی: خدا کے لئے مجھے کوئی دوا دو۔ میرا علاج کرو (اپنے دل کی طرف اشارہ کر کے) اس جگہ میرے سخت درد ہو رہا ہے۔ میرا دل جل رہا ہے۔

اشروف: (زور سے) بس، بس! (آہستہ آہستہ) وہ جو ہم سے سَو یا دو سَو برس بعد زندہ رہیں گے اور جو ہماری اس بے ذوقی، بے وقوفی اور بے لطفی سے زندگی گزارنے پر ہنسیں گے، ہم پر طعنہ زن ہونگے۔ وہ، وہ، ہاں وہ شاید خوش رہنے کا کوئی ذریعہ تلاش کر لیں؛ مگر ہم........ میرے اور تمہارے لئے ایک اُمید ہے، صرف ایک، جب ہم اپنی اپنی قبروں میں سوتے ہوں گے تو شاید، شاید ہمیں کوئی اُمید افزا نہ خوش آیند خواب نظر آئے (ایک آہ کے ساتھ) اے ضعیف آدمی، سارے ضلع میں صرف دو پڑھے لکھے، دو باتمیز انسان تھے۔ دو انسان تھے جن کی ہر شخص عزت کرتا تھا۔ میں اور تم مگر دیکھتے ہو؟ کوئی دس سال کے اندر اندر اس زندگی کے طوفان نے اس مذاق اُڑانے والی ہنسنے والی فرومایہ زندگی کے بھنور نے ہماری کشتیٔ حیات کو الٹ دیا اور ہمارے وجود کو اپنے ناپاک و ناسعود چھینٹوں سے زہر آلود کر دیا اور ہمیں بھی اور لوگوں کی طرح قابلِ نفرت، قابلِ ملامت بنا دیا (زور سے) مگر مجھے اپنے مطلب سے باز رکھنے کی کوشش نہ کرو، میری چیز واپس دیدو۔

وائنٹسکی : میں نے تم سے کوئی چیز نہیں لی۔

اشروف: تم نے میرے بکس سے مارفیا کی ایک شیشی نکالی ہے (ایک وقفہ) دیکھو۔ اگر تم اپنی زندگی ختم کرنے پر مصر ہو تو جنگل چلے جاؤ اور گولی مار لو۔ لیکن میرا مارفیا مجھے دیدو ورنہ چرچے ہوں گے اور چہ میگوئیاں ہوں گی۔ لوگ سمجھیں گے کہ میں نے تمہیں شیشی دی۔ میرے لئے یہ کیا کم ہے کہ میں تمہاری لاش کا معائنہ کروں گا۔ کیا تم سمجھتے ہو مجھے اس سے تکلیف نہ ہوگی۔

(سونیا آتی ہے)

وائنٹسکی : مجھے اکیلا چھوڑ دو۔

اشروف: (سونیا سے) صوفیا الکزنڈریونا، تمہارے ماموں نے میرے دوا کے بکس سے مارفیا کی ایک شیشی نکال لی ہے اور واپس نہیں دیتے۔ ان سے کہو کہ یہ .... واقعاً بہت نازیبا حرکت ہے اور میرے پاس ضائع کرنے کو وقت نہیں ہے۔ مجھے جانا ہے۔

سونیا : ماموں جان، آپ نے مارفیا چرایا؟ (ایک وقفہ)

اشروف: انہوں نے ضرور نکالا۔ میں قسم کھا سکتا ہوں۔

سونیا : اسے واپس دیدیجئے۔ آخر آپ نے ہم سب کو اس قدر خوفزدہ کیوں کر رکھا ہے؟ (پیار سے) ماموں جان دیدیجئے! میں بھی شاید آپ ہی کی طرح زندگی سے بیزار اور تنگ ہوں! لیکن دیکھئے میں صبر کر رہی ہوں اور مایوسی کو راہ نہیں دیتی۔ میں اسے برداشت کر رہی ہوں اور اسے برداشت کئے جاؤنگی یہاں تک کہ زندگی آپ ختم ہو جائے گی .... آپ کو بھی صبر کرنا چاہئے (ایک وقفہ) اسے واپس دیدیجئے (اُس کے ہاتھ چومتی ہے) پیارے ماموں جان، میرے اچھے ماموں جان! اسے واپس دیدیجئے! (روتی ہے) آپ مہربان اور نیک دل ہیں۔ آپ ہم پر رحم کھائینگے اور اسے واپس دیدینگے۔ صبر کیجئے، ماموں جان! ــــ صبر کیجئے!

وائنٹسکی : (میز کی دراز سے شیشی نکالتا ہے اور اُسے اشروف کو دیتا ہے) لو، یہ لو! (سونیا سے) لیکن ہمیں فوراً کام میں لگ جانا چاہئے، جلدی کرو، کوئی کام ...... کام ...... ورنہ مجھ سے نہیں ....

مجھے یہ نہیں برداشت ہوگا۔

سونیا: ہاں، ہاں، کام۔ اپنے لوگوں کو رخصت کرتے ہی ہم بیٹھ جائیں گے اور کام کریں گے .... (میز پر پڑے ہوئے کاغذات کو اُلٹ پلٹ کر) ہر چیز بے ترتیب ہو رہی ہے۔

اشرف: (شیشی بکس میں رکھتا ہے اور اس کا ڈھکنا بند کرتا ہے) اب میں جا سکتا ہوں۔

(ہیلنا داخل ہوتی ہے)

ہیلنا: آڈورن پیٹرووچ! کیا تم یہاں ہو؟ ہم جا رہے ہیں۔ الکزنڈر کے پاس جاؤ۔ وہ تم سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔

سونیا: چلے جاؤ، ماموں جان! (وانیشکی کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے) آیئے چلیں۔ ابا کی اور آپ کی صلح ہو جانا چاہیئے۔ یہ ضروری ہے۔

(سونیا اور وانیٹسکی جاتے ہیں)

ہیلنا: مَیں جا رہی ہوں۔ (اشرف کو اپنا ہاتھ دیتی ہے) خدا حافظ۔

اشرف: ابھی سے؟

ہیلنا: گاڑیاں تیار ہیں۔

اشرف: خدا حافظ۔

ہیلنا: تم نے مجھ سے آج وعدہ کیا تھا کہ چلے جاؤ گے۔

اشرف: مجھے وعدہ یاد ہے۔ میں ابھی جا رہا ہوں (ایک وقفہ) تم یہاں سے ڈر گئی ہو؟ (اُس کا ہاتھ لے لیتا ہے) ایسا بھی کیا ڈر؟

ہیلنا: مجھے خوف معلوم ہوتا ہے۔

اشرف: بہتر تو یہ تھا کہ تم ٹھیرتیں! کیا کہتی ہو؟ کل میرے ہاں ـــــ

ہیلنا: نہیں، اب جانا طے ہے۔ اور مَیں تمہیں آزادانہ اور بے خطر اسی لئے دیکھ رہی ہوں کہ جانا طے ہے۔ میں تم سے صرف ایک عنایت کی طلبگار ہوں: مجھے اچھے دل سے یاد کرنا۔ میں چاہتی ہوں

تم میری عزت کرو۔

اشرف: اُف! (بے صبری سے) ٹھہر جاؤ۔ میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ ٹھہر جاؤ۔ سمجھ لو تمہیں اس دنیا میں کچھ نہیں آتا ہے۔ تمہاری زندگی کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ تمہارے دل و دماغ کو مشغول رکھنے کے لئے کوئی کام نہیں ہے اور آج نہیں تو کل تم اپنے جذبات سے شکست کھاؤ گی، جذبات کے تابع ہوگی، یہ ناگزیر ہے اور میں جانتا ہوں یہ شکست بجائے ہار کو یا کرسک میں کہیں واقع ہونے کے یہاں واقع ہوتی، یہاں، قدرت کی گود میں.......یہاں جہاں شعریت ہے، جہاں کی خزاں بھی دلنواز اور خوبصورت ہے........یہاں کھیت اور جنگل ہیں........ٹرگنیف کے انداز میں کہوں تو یہاں قصبات اور آبادیاں ہیں، سبزہ، نمی، طراوت ہے اور نیم تباہ شدہ مکانات ہیں........

یلینا: تم نرے احمق ہو........میں تم سے خفا ہوں، تاہم میں........تمہیں لطف کے ساتھ یاد کروں گی۔ تم دلچسپ آدمی ہو، تم میں ایک جوہر ذاتی ہے۔ ہم اب کبھی نہ ملیں گے اس لئے — کیوں چھپاؤں؟ — واقعی مجھے تم سے ذراسی محبت ہوگئی ہے۔ آؤ، ہاتھ ملاؤ اور دوستوں کی طرح جدا ہو۔ میری طرف سے اپنا دل صاف رکھنا۔

اشرف: (اُس کا ہاتھ دبا کر) ہاں، بہتر ہے کہ تم جاؤ........(خوش خیالی میں) تم ایک محبت کرنے والی، نیک دل، سادہ خاتون ہو تاہم تمہارے پورے وجود کے ساتھ ایک عجیب تخیل وابستہ ہے۔ تم اپنے شوہر کے ساتھ یہاں آئیں اور ہم سب جو اس سے پہلے اپنا اپنا کام کرتے تھے، محنت کرتے تھے اور چیزیں تخلیق کرتے تھے، اپنا کام چھوڑ کر اپنے فرائض کو بھول کر ہاتھ پر ہاتھ رکھکر بیٹھ گئے۔ گرمی بھر ہمیں سوا تمہاری ملاقات اور تمہارے شوہر کے گٹھیا کے علاج کے کوئی کام نہ تھا۔ تم دونوں کی کاہلی ہم میں سے ہر ایک میں سرایت کرگئی ہے۔ مجھے تم نے لُبھایا اور پورے ایک مہینہ سے میں بیکار ہوں اور اس عرصہ میں لوگ بیمار ہوئے اور کسانوں کے مویشی میرے چھوٹے، غیر تربیت یافتہ پودوں والے باغات میں گھسے اور اُسے پامال کرگئے........اور اسی طرح جہاں جہاں تم اور تمہارے شوہر جائیں گے اپنے ساتھ تباہی، پامالی لیجائیں گے........میں مذاق کر رہا ہوں معاف کرنا......

مگر تاہم کیا میں غلط کہتا ہوں؟ اور مجھے یقین ہے کہ اگر تم یہاں ٹھہر جاتیں تو تباہی اور پامالی اس سے بھی زیادہ ہوتی۔ میرا کہیں ٹھکانا نہ ہوتا......... اور یہ تمہارے لئے بھی کوئی بہتری کی صورت نہ ہوتی خیر جاؤ۔ یہ کامڈی اب ختم ہے، بہتر!

یلنا: (اُس کی میز سے ایک پنسل لیکر اور جلدی سے اُسے اپنی جیب میں رکھتے ہوئے) میں یہ پنسل تمہاری نشانی کے طور پر لیجاؤں گی۔

اشرف: یہ عجیب راز ہے......... ہم دونوں دوست تھے اور یکدم نہ معلوم کس سبب سے .... اب ہم ایک دوسرے سے کبھی نہیں ملیں گے۔ یہی دنیا میں ہر چیز کے ساتھ ہے ...... اس وقت جبکہ یہاں کوئی نہیں ہے ـــــ اور قبل اس کے کہ ماموں جان گلاب لیکر آئیں ـــــ مجھے اجازت دو کہ جدائی کے وقت تمہارا بوسہ لوں...... اجازت ہے؟ (اُس کے رخسار کا بوسہ لیتا ہے) شکریہ!

یلنا: خدا تمہیں خوش رکھے۔ (اِدہر اُدہر دیکھتی ہے) اچھا آؤ! زندگی میں ایک مرتبہ تو تمہیں گلے لگا لوں۔ (اُسے زور سے بھینچتی ہے اور دونوں باری باری جلدی سے ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتے ہیں) اب جاتی ہوں ـــــ جاتی ہوں!

اشرف: جلدی کرو اور جاؤ۔ اب جب گاڑی تیار ہے تو چلی ہی جاؤ۔

یلنا: میں سمجھتی ہوں کوئی آرہا ہے (دونوں آہٹ کو سنتے ہیں)

اشرف: خدا حافظ!

(سربریاکف، وانشکی اور ماریا واسیلیونیا ایک کتاب لئے، داخل ہوتے ہیں۔ تلی گن اور سونیا بھی اُن کے پیچھے آتے ہیں)

سربریاکف: (وانشکی سے) گزشتہ را صلوٰۃ۔ جو کچھ گزرا ہے اُس کے بعد سے ان چند گھنٹوں میں میرے دل میں اس قدر خیالات آئے ہیں اور میں نے اس قدر سوچا ہے اور میرے خیالات ایسے بدلے ہیں کہ اگر میں لکھنے پر آؤں تو آیندہ نسلوں کے فائدے کے لئے زندہ رہنے کے فن پر ایک مستقل تصنیف تیار کر سکتا ہوں۔ میں خوشی سے تمہاری معذرت قبول کرتا ہوں اور معاف کرتا ہوں

خدا حافظ!

(وہ اور وانٹسکی ایک دوسرے کا تین مرتبہ بوسہ لیتے ہیں)

وانٹسکی: آپ کو برابر اسی قدر رقم پہونچتی رہے گی جس قدر پہلے پہونچتی تھی۔ سب کام سابق کیطرح ہونگے۔

(یلنا اینڈریونا سونیا کو گلے لگاتی ہے)

سریریاکف: (ماریا واسلیوینا کا ہاتھ چومتا ہے) اماں ......

ماریا: (اُسے چومتے ہوئے) (الکزنڈر، اپنی تصویر دوبارہ کھنچوا کر اُس کی ایک نقل مجھے ضرور بھیجدینا۔ تم جانتے ہو میں تمہیں کتنا چاہتی ہوں۔

تلی گن: خدا حافظ، حضور والا! ہمیں بھول نہ جائے گا!

سریریاکف: (اپنی بیٹی کو پیار کرتے ہوئے) خدا حافظ........ خدا حافظ، نام بنام خدا حافظ، (اشروف سے ہاتھ ملاتے ہوئے) آپ کی پُرلطف صحبت کا شکریہ۔ مجھے آپ کے مطمح نظر، آپ کے نکتۂ خیال، آپ کے جوش اور آپ کے مقاصد سے کافی دلچسپی و ہمدردی ہے لیکن ایک بڈھے آدمی کو اجازت دیجئے کہ اپنے رخصتانہ پیغام میں ایک ضروری بات آپ سے عرض کرے۔ آپ کو کام اور محنت کرنا چاہئے۔ میرے دوستو! کام اور محنت! (سب کے آگے کمر خم کرتا ہے) میں آپ سب کی خوشی و آسودگی کی دعا کرتا ہوں!

(باہر جاتا ہے اس کے پیچھے ماریا واسلیوینا اور سونیا جاتی ہیں)

وانٹسکی: (گرمجوشی سے یلنا اینڈریونا کا ہاتھ چومتا ہے) اللہ تمہارا نگہبان، میری پیاری ہیلین! خدا حافظ، خدا حافظ! .... میرا قصور معاف کر دو....... اب ہماری ملاقات نہ ہوگی۔

یلنا: (متاثر ہو کے) خدا حافظ، میرے پیارے، بہت پیارے آئیون پیٹرووچ (اُس کی پیشانی چومتی ہے اور باہر جاتی ہے۔

اشروف: (تلی گن سے) ارے مفت خورے! خوب یاد آیا۔ ذرا اُن سے کہدو میری گاڑی بھی لے آئیں۔

تلی گن : ابھی کہتا ہوں۔ (جاتا ہے)

(صرف اشرف اور وائنٹسکی رہ جاتے ہیں)

اشرف : (میز پر سے رنگوں کی شیشیاں اٹھا کے، انہیں اپنے تھیلے میں رکھتے ہوئے) تم جا کے انہیں رخصت کیوں نہیں کر آتے؟

وائنٹسکی : انہیں بغیر میرے رخصت کئے ہی جانے دو۔ میں ...... میں رخصت نہیں کر سکتا۔ میرے دل پر ایک غبار ہے۔ مجھے جلد ہی اپنے کو مصروف رکھنے کے لئے کوئی چیز تلاش کرنا چاہئے...... کام! کام! (میز پر رکھے ہوئے کاغذ الٹ پلٹ کر دیکھتا ہے)۔

(ایک وقفہ ۔ گاڑی کی گھنٹیوں کی آواز آتی ہے)

اشرف : گئے ۔ پروفیسر خوش ہے۔ اب وہ نہیں آئے گا۔

ماریا : (داخل ہوتی ہے) گئے ۔ (ایک آرام کرسی پر بیٹھ جاتی ہے اور موزہ بنتی ہے)

سونیا : (داخل ہوتی ہے) گئے۔ (اپنے آنسو پونچھتی ہے) خدا خیریت کے ساتھ پہنچائے (اپنے ماموں سے) اچھا ماموں جان، ہمیں کام کرنا چاہئے۔

وائنٹسکی : کام، کام......

سونیا : ایک مدت ہو گئی کہ اس میز پر میں اور آپ ساتھ نہیں بیٹھے (میز پر رکھے ہوئے لمپ کو روشن کرتی ہے) مجھے یقین ہے کہ روشنائی نہیں ہوگی (قلم دان اٹھاتی ہے، کپ بورڈ کی طرف جاتی ہے اور اس میں روشنائی ڈالتی ہے) لیکن میرا دل دکھتا ہے کہ وہ چلے گئے۔

(ماریا واسلیو ونا آہستہ آہستہ کمرے میں آتی ہے)

ماریا : گئے۔ (بیٹھ جاتی ہے اور پڑھنے میں مشغول ہو جاتی ہے)

سونیا : (میز کے پاس بیٹھتی ہے اور حساب کے رجسٹروں کے ورق الٹتی ہے) سب سے پہلے، ماموں جان ہمیں حسابات درست کرنا چاہئے۔ ہم نے حسابات مرتب کرنا بالکل ترک کر دیا ہے۔ آج پھر کوئی اپنا حساب مانگ رہا تھا اور ہم اُسے نہیں بنا سکے۔ اُسے بنا دیجئے۔ اگر ایک حساب آپ تیار

کریں گے تو دوسرا ئیں تیار کر دوں گی۔

وانٹسکی: (لکھتا ہے) "خرچہ .... بہ حساب جناب ...." (دونوں خاموشی سی لکھتی ہیں)۔

ماریںا: (انگڑائی لے کر) میں تو آرام کرنے جاتی ہوں۔

اشرف: کیسی خاموشی ہے! قلم چوں چوں اور جھینگ چرچر کرتا ہے۔ موسم خوشگوار اور پرسکون ہے۔ میں نہیں جانا چاہتا (گھنٹیوں کی آواز آتی ہے) میرے گھوڑے تیار ہیں .... میرے دوستو مجھے اب سوائے خدا حافظ کہنے کے کوئی کام نہیں ہے۔ خدا حافظ کہتا ہوں —— اپنی میز کو خدا حافظ کہتا ہوں —— اور چلتا ہوں! (اپنے نقشے تھیلے میں رکھتا ہے)

ماریںا: تمہیں جلدی کاہے کی ہے؟ تم ٹھہر کیوں نہیں جاتے؟

اشرف: جانا ہی بہتر ہے۔

وانٹسکی: (لکھتا ہے) "دیا گیا مبلغ دو ربل پچھتر کاپک"۔

(ایک مزدور داخل ہوتا ہے)

مزدور: میخائل لوودچ، گھوڑے کس گئے۔

اشرف: میں نے سن لیا (مزدور کو دوائیوں کا بکس، تھیلا، بستر وغیرہ دیتا ہے) لو، یہ لے چلو۔ دیکھو بکس الٹنے نہ پائے۔

مزدور: نہیں، حضور۔

اشرف: اچھا اب (خدا حافظ کہنے جاتا ہے)

سونیا: اب کب آپ سے ملاقات ہوگی؟

اشرف: میرا خیال ہے اگلی گرمیوں سے پہلے نہیں۔ جاڑوں میں ملنے کی کوئی امید نہیں ...... اس کے کہنے کی ضرورت نہیں کہ خدانخواستہ کوئی بات ہو، میری موجودگی کی ضرورت ہو تو مجھے فوراً اطلاع کرنا میں آجاؤں گا (ہاتھ ملاتا ہے) تمہاری مہماں نوازی، تمہاری مہربانی —— تمہاری تمام عنایتوں کا شکریہ (اتا کے پاس جاتا ہے اور اس کے سر کو چومتا ہے) خدا حافظ، بڑی اماں۔

مارینا: تم بغیر چائے پئے نہیں جارہے ہو؟
اشرف: کوئی ضرورت نہیں، انّا۔
مارینا: شاید تم دودھ کا ایک گلاس پیو گے؟
اشرف: (غیرارادی طور پر) شاید۔

(مارینا باہر جاتی ہے)

اشرف: (ایک وقفہ کے بعد) میرا ایک گھوڑا لنگ کرنے لگا ہے۔ میں نے کل دیکھا جب اُسے پانی پلانے لئے جارہا تھا۔
وائنٹسکی: اُس کے نال بدلوا دو۔
اشرف: گھر پہونچ کر لوہار کے ہاں جانا ہوگا۔ اس سے مفر نہیں (افریقہ کے نقشے تک جاتا ہے اور اسے غور سے دیکھتا ہے) میں سمجھتا ہوں کہ اس افریقہ کے اندر اس وقت بڑی خوفناک گرمی پڑرہی ہوگی!
وائنٹسکی: ہاں غالباً۔
مارینا: (ایک کشتی لئے واپس آتی ہے جس پر دودھ کا ایک گلاس اور ایک روٹی کی قاش ہے) یہ لیجئے۔

(اشرف دودھ پیتا ہے)

مارینا: تمہاری تندرستی کے نام، میرے پیارے (کرخم کرتی ہے) اس کے ساتھ کچھ روٹی بھی کھاؤ۔
اشرف: نہیں مجھے یوں ہی پسند ہے۔ اچھا اب، خدا حافظ۔ اللہ آپ سب کو اچھا رکھے (مارینا سے) بیٹھو، انّا، باہر آنے کی ضرورت نہیں۔
(باہر جاتا ہے؛ سونیا ایک موم بتی لئے اُسے رخصت کرنے جاتی ہے؛ مارینا اپنی آرام کرسی پر بیٹھتی ہے)
وائنٹسکی: (لکھتا ہے) "دوسری فروری، مٹی کا تیل بیس پاؤنڈ۔ سولہ فروری، مٹی کا تیل پھر

بیس پاؤنڈ۔ گیہوں ...." (ایک وقفہ)

(گھنٹیوں کی آواز)

ماریا: گیا (ایک وقفہ)

سونیا: (واپس آتی ہے اور موم بتی میز پر رکھتی ہے) گیا۔

وانٹسکی: (گنتا ہے اور لکھتا ہے) "جملہ میزان .... پندرہ ...... پچیس ....."

(سونیا بیٹھ جاتی ہے اور لکھتی ہے)

ماریا: (انگڑائی لیتی ہے) یا اللہ۔ رحم کر!

(تلی گن پنجوں کے بل کمرے میں آتا ہے، دروازے کے پاس بیٹھ جاتا ہے اور آہستہ آہستہ ستار کے سُر درست کرتا ہے)

وانٹسکی: (سونیا کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اُس سے) میری جان، میرا دل دکھ رہا ہے! آہ! تجھے کیسے دکھا دوں میرا دل کیسا دکھ رہا ہے!

سونیا: اس درد کی کوئی دوا نہیں۔ ہمیں یہ زندگی گزارنی پڑے گی! (ایک وقفہ) ہم زندگی گزارے جائیں گے ماموں جان! نہ معلوم کتنی طولانی شامیں اور نہ معلوم کتنے لمبے بے لطف دن اسی طرح آئینگے اور گزارنے پڑیں گے! ہم اپنی مصیبتوں کو صبر کے ساتھ برداشت کریں گے، جو ہمارے مقدر میں ہے اُس پر شاکر رہیں گے۔ ہم دوسروں کے لئے کام کریں گے، آج اور آج کے بعد بھی اُس وقت تک جبکہ ہم بڈھے اور ناکارہ ہو جائیں گے اور ہمیں کوئی آرام نہ ملے گا' اور جب ہمارا وقت آ جائیگا ہم کسی کی شکایت نہ کریں گے اور چپ چاپ جا کر سو رہیں گے' مر جائیں گے! اور وہاں' قبروں والی نگری میں ہم اپنی داستان سنائیں گے کہ ہم نے تکلیفیں اُٹھائی ہیں، آنسو بہائے ہیں، کہ زندگی ہمارے لئے' ایک بارِ گراں تھی اور خدا ہم پر ترس کھائے گا اور آپ کو اور مجھے، ماموں جان۔ پیارے ماموں جان' ایک زندگی عطا ہوگی جو روشن' خوشگوار اور پُر لطف ہوگی۔ ہم خوشیاں منائیں گے اور اپنی ان تلخیوں کو تبسم کے ساتھ' نرمی کے ساتھ یاد کریں گے ــــ اور ہمیں آرام نصیب ہوگا۔

مجھے یقین ہے، ماموں جان مجھے پورا پورا یقین ہے۔ (گھٹنوں کے بل آہستہ آہستہ سرک کر اُس کی گود میں پڑ جاتی ہے اور اپنا سر اُس کے ہاتھوں میں رکھدیتی ہے، ایک بڑے درد مند لہجہ میں) ہمیں آرام نصیب ہوگا!

(تلی گن آہستہ آہستہ ستار بجاتا ہے)

سونیا: ہمیں آرام نصیب ہوگا! ہمارے کانوں میں فرشتوں کی آوازیں آئیں گی، ہم ساری کائنات کو روشنی سے منور دیکھیں گے۔ ہم دنیاوی مصیبت، دنیاوی بدی کو ایک عالمگیر شفقت، ایک ہمہ گیر مرحمت میں غرق ہوتے دیکھیں گے! اور ہماری زندگی دغدغہ اور وسوسہ سے بَری اور خدشوں سے آزاد ہوگی۔ ایک بوسۂ محبت کے مثل آسودہ، معصوم اور شیریں ہوگی۔ مجھے یقین ہے، مجھے یقین ہے (ماموں جان کے آنسو اپنے رومال سے پونچھتی ہے) بیچارے، مصیبت کے مارے ماموں جان! آپ رو رہے ہیں (روتی ہے) آپ کو زندگی میں کوئی راحت کوئی خوشی نصیب نہیں ہوئی لیکن صبر کیجیے، ماموں جان، کچھ دن صبر کیجیے۔ ہمیں آرام نصیب ہوگا (اپنی باہنیں اُس کے گلے میں ڈالدیتی ہے) ہمیں آرام نصیب ہوگا! (چوکیدار دستک دیتا ہے) ہمیں آرام نصیب ہوگا!

(تلی گن آہستہ آہستہ ستار بجاتا ہے، ماریا واسلیوونا اپنی کتاب کے حاشیہ پر نشان لگاتی ہے۔ مارینا موزہ بنتی ہے)

سونیا: ہمیں آرام نصیب ہوگا!

پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے۔

محنت، موت اور علالت

ایک روایت

مصنفہ

لیو ٹالسٹائے

۱۹۰۳ء

جنوبی امریکہ کے باشندوں میں ایک روایت عام ہے۔

وہ کہتے ہیں خدا نے انسانوں کو پہلے پہل ایسا بنایا کہ انہیں کام کی حاجت ہی نہ ہوتی تھی، نہ انہیں گھر چاہیئے تھے، نہ کپڑے، نہ خوراک۔ سو برس کی عمر تک وہ جیا کرتے تھے، اور بیماری تو وہ جانتے ہی نہیں تھے کیا چیز ہوتی ہے۔

تھوڑی مدت بعد جو خدا نے توجہ کی اور دیکھنا چاہا کہ لوگ کیونکر زندگی بسر کر رہے ہیں، تو اُسنے دیکھا کہ بجائے اپنی زندگی اطمینان و مسرت میں کاٹنے کے انہوں نے ایک دوسرے سے لڑائی جھگڑا کرنا شروع کر دیا تھا، اور ہر شخص کے خود غرض ہونے کی وجہ سے معاملات نے کچھ ایسی صورت اختیار کرلی تھی کہ بجائے زندگی سے خوش ہونے کے وہ اب اس پر لعنت بھیجتے تھے۔

پھر خدا نے سوچا "یہ ان کے الگ الگ ہر ایک کے بس اپنے اپنے ہی مطلب کے لئے زندہ رہنے کا نتیجہ ہے۔ اور اس صورت حالات کو بدلنے کے لئے خدا نے ایسا انتظام کر دیا کہ ہر ایک کے لئے ناممکن ہو گیا کہ بن کام کئے زندگی بسر کر سکے۔ بھوک اور سردی سے بچنے کے لئے اب اُن کے لئے لازمی ہو گیا کہ گھر تعمیر کریں، اور زمین کھودیں اور اناج اور پھل کاشت کریں اور انہیں جمع کریں۔

خدا کا خیال تھا "کام ان میں اتفاق پیدا کریگا" بے ایک دوسرے کی مدد کے نہ تو یہ کوئی اوزار بنا سکیں گے، نہ شہتیروں کو تیار کر کے کہیں لے جا سکیں گے، نہ گھر بنا سکیں گے، نہ فصل بو یا کاٹ سکیں گے، نہ ہی اپنے اپنے لیئے کپڑا بُن یا سی سکیں گے۔

"اسی طریقہ ہی سے اُن کو سمجھ آئے گی کہ جتنا ہی خلوصِ دل سے ملکر یہ کام کریں اتنا ہی زیادہ کما سکتے ہیں، اور اتنی ہی بہتر اُن کی زندگی بسر ہو سکتی ہے" اس سے اِن میں اتفاق پیدا ہو گا"

ایک زمانہ اسی حالت میں گزر گیا، اور پھر خدا دیکھنے آیا کہ لوگ کس طرح سے رہ رہے ہیں، اور آیا خوش ہیں یا نہیں۔

لیکن اب کے اُن کی حالت پہلے سے بھی بُری تھی، کام تو وہ مِل کے ہی کرتے تھے (سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا) لیکن سارے ملکر نہیں، بلکہ چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنا کر، اور ہر ٹولی یہی چاہتی تھی کہ دوسری ٹولی سے کام چھین لے، اور وہ ایک دوسرے کی راہ میں حائل ہوتے تھے، اور اپنی طاقت اور اپنا وقت لڑائی جھگڑوں میں کھو دیتے تھے، اور ہر ایک کی حالت بُری تھی۔

خدا نے جو دیکھا کہ یہ حالت بھی ٹھیک نہیں تو اُس نے ایسا انتظام کرنے کا فیصلہ کیا کہ انسان کو اپنی موت کا وقت کبھی معلوم نہ ہو، اور وہ اچانک ہی مر جایا کرے اور اُس نے یہ فیصلہ انسانوں کو سنا دیا۔

خدا کا خیال تھا کہ "ہر ایک جو سمجھے گا کہ موت مجھے اچانک آئے گی تو یہ چند روزہ نفع نقصانوں کی خاطر اپنی اُس زندگی کو جو ان کے حصہ میں آئی ہے برباد نہیں کریں گے"

لیکن ایسا بھی نہ ہونے پایا، جب پھر خدا دیکھنے آیا کہ انسان اپنی زندگی کیونکر بسر کر رہے ہیں اُس نے دیکھا کہ جتنی خراب اُن کی زندگی پہلے تھی اتنی ہی اب بھی ہے۔

جو سب سے زیادہ قوی اور توانا واقع ہوئے تھے، انہوں نے اس بات سے فائدہ اُٹھا کر کہ انسان اچانک مر جاتا ہے اُن لوگوں کو جو اُن سے مقابلتہً کمزور تھے دبا لیا تھا، بعض کو تو مار بھی ڈالا تھا، اور بعض کو مار ڈالنے کی دھمکیاں دی تھیں، جو سب سے قوی اور توانا تھے بالکل کوئی کام نہ کرتے

تھے، اور سستی کی وجہ سے اُن کی طبیعتیں اُچٹ گئی تھیں، اور جو کمزور تھے انہیں اپنی طاقت سے بڑھکر کام کرنا پڑتا تھا، اور آرام کبھی نصیب نہ ہوتا تھا۔ انسانوں کا ہرگروہ دوسرے گروہوں سے ڈرتا تھا اور انہیں نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا، اور انسانوں کی زندگی پہلے سے بھی زیادہ خوشی سے خالی ہوچکی تھی ۔

یہ سب کچھ دیکھکر، خدا نے حالات سدھارنے کی خاطر اب آخری طریقہ استعمال کرنے کا فیصلہ کیا ۔ اُس نے ہر قسم کی بیماریاں انسانوں کے ہاں بھیجدیں ۔ خدا کا خیال تھا کہ جب انسان ایسی حالت میں ہوں گے کہ ہر ایک کو بیماری لاحق ہوسکے تو یہ سمجھ جائیں گے کہ جو تندرست ہوں انہیں بیماروں پر رحم کرنا چاہیئے اور اُن کی مدد کرنی چاہیئے تاکہ اگر وہ خود کبھی بیمار ہو جائیں تو اور لوگ جو تندرست ہیں انکی باری میں ان کی مدد کرسکیں ۔

اور پھر خدا چلا گیا، لیکن پھر جب وہ یہ دیکھنے کے لئے آیا کہ اب جبکہ انسانوں کو بیماریاں لاحق ہوسکتی ہیں، یہ کس طرح زندگی بسر کر رہے ہیں، تو اُس نے دیکھا کہ اُن کی زندگی پہلے سے بھی بدتر تھی، وہ بیماری جو کہ خدا کا مقصد تھا انسانوں کو ایک کر دے اُن کے مزید تفرقہ کا باعث ہوئی تھی، وہ لوگ جو اتنے توانا تھے کہ دوسروں پر جبری حکومت کرسکیں، اب اپنی بیماریوں کے ایام میں بھی اُن دوسروں کو اپنی خدمت پر مجبور کر رہے تھے، لیکن جب ان کی اپنی باری آتی تھی تو دوسروں کی بیماری پر اُن کی خدمت نہ کرتے تھے، اور جن لوگوں کو مجبور کیا جا رہا تھا کہ دوسروں کا کام کریں اور بیماری میں اُن کی خدمت کریں کام کر کر کے ایسے تھک گئے تھے کہ اپنے بیماروں کی تیمارداری کے لئے بھی اُن کے پاس کوئی وقت نہ تھا، اور اس لئے مجبوراً انہیں ویسے ہی چھوڑ دیتے تھے ... اس مقصد سے کہ بیماروں کا منظر دولتمند لوگوں کے عیش و عشرت میں مخل نہ ہو، ایسے گھروں کا انتظام کر دیا گیا تھا جہاں یہ نادار مصیبتیں جھیل جھیل کے آخر مر جائیں، ان لوگوں کی بستیوں سے دور جنکی ہمدردی اُن کی خوشی کا باعث ہوسکتی تھی، اور ایسے لوگوں کے پلّے پڑکے جو ان کی تیمارداری میں رحم کو بالکل بھول جاتے تھے، ٹکوں کے غلام تھے، اور اُن سے صاف اظہار نفرت کر دیتے تھے، علاوہ ازیں لوگ بیماروں کو وبائی سمجھتے تھے، ڈرتے تھے کہ یہ کہیں ہمیں بھی لاحق نہ ہوجائیں، اس لئے نہ صرف بیمار لوگوں سے پرہیز

کرتے تھے بلکہ ان لوگوں سے بھی بچ بچ کر رہتے تھے جن کا کام بیماروں کی تیمار داری تھا۔

پھر خدا نے اپنے دل میں کہا "اگر اس طریقہ سے بھی انسان نہیں سمجھ سکتے کہ اطمینان اُن کو کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔ تو وہ مصیبتیں جھیلنے ہی سے یہ بات سیکھیں" اور خدا نے انہیں چھوڑ دیا کہ جو چاہیں کریں۔

اور جب انسانوں کو اختیار دیدیا گیا تو مدتیں صرف کرنے کے بعد اُن پر یہ بھید کھلا کہ اُنہیں خوشی حاصل ہو سکتی ہے اور انہیں اس کے حصول کی کوشش کرنی چاہیئے۔ تھوڑی ہی مدت ہوئی ہے کہ ان میں سے بعض بعض کو سمجھ آنے لگی ہے کہ کام بعض کے لیئے دن رات کی مصیبت اور بعض کے لیئے جان جوکھوں کی غلامی نہیں ہونا چاہیئے بلکہ ایک مشترکہ اور دل خوش کن مشغلہ ہونا چاہیئے جو سب انسانوں میں اتحاد پیدا کرے، انہیں سمجھ آنے لگی ہے کہ جب موت ہر وقت ہمارے سر پر کھڑی رہتی ہے تو ہر ایک انسان کا مناسب مشغلہ یہی ہو سکتا ہے کہ زندگی کے جو سال اور گھنٹے اور منٹ اُس کے حصے میں آئے ہیں، اتحاد اور محبت سے گزارے، انکو سمجھ آنے لگی ہے کہ بیماری بجائے اس کے کہ وہ لوگوں میں تفرقہ پیدا کرے، اُن کے باہمی اتحاد کا ایک ذریعہ ہونی چاہیئے۔

تنقید و تبصرہ

پیغام صلح ۔ نورس اجمل ۔ مونس

رسائل

"پیغام صلح" کا آخری نبی نمبر | مدینہ کے تاجدار حضرت آقائے نامدار سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ تمام دنیا کے لئے ایک مستقل اور صحیح شاہراہ عمل اور ہدایت کامل ہے' اس لئے اُسے زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر انداز میں شائع کرنا مخلوق خدا کی زبردست خدمت ہے ۔

جہاں خود اہل اسلام کے اسلام اور ایمان کی صحت و تقویت کے لئے وہ بے خطا نسخہ ہے' وہاں اُن ہٹ دھرموں اور بے دینوں کے لئے بھی تازیانۂ عبرت و بصیرت' جو اسلام کی بہتر سے بہتر حقانیت سے درگذر کر کے اپنی مخالفت اور اسلام سے اپنے عناد قلبی کا مرکز صرف حضرت ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس پر قائم کر چکے ہیں' اس لئے کہ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ حضور کی سیرت ہی وہ چیز ہے جسنے بڑے بڑوں کے کفر توڑ کے رکھ دیئے ۔

روشن خیال یورپ اس حقیقت کی تہ بہت پہلے پا چکا تھا اور وہاں کے اہل قلم اور ہمارے دوست نما دشمنوں نے اس سیل رحمت کا بے سود دفاع شروع کر دیا تھا ۔ ویسے بھی یورپ سے آج ہر جماعت اور ہر متنفس غیر معلوم اور غیر محسوس طریقہ پر متاثر ہے ۔ اور یورپ ہی کی تقلید میں یہی فتنہ اب ہندوستان میں رواج پا رہا ہے اور بڑے افسوس کی بات ہے اور ہمسایہ قوم کی ایک کثیر جماعت سے ہمیں شکایت کا موقعہ ہے کہ وہ اپنے عقاید و خیالات کا پرچار' خلاف اصول و قاعدہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر گندے سے گندے حملے کرنا ہی سمجھے ہوئے ہیں ۔

اس اعتبار سے بڑی ضرورت ہے کہ ہمارے صاحب علم و فہم اہل قلم حضرات اس طرف خاص

توجہ فرمائیں اور قومی جرائد کا یہ مذہبی فرض ہے کہ اُن کے رشحات کو بہتر اسلوب اور کثیر تعداد میں شائع اور رائج کریں۔ اُس کے بعد "اللہ جسے چاہے ہدایت بخشے اور جسے چاہے گمراہ کرے"۔

بڑی خوشی کی بات ہے، ہمارے قومی صحیفوں نے اس طرف کافی توجہ شروع کی ہے، انہی میں سے ایک "پیغام صلح" بھی ہے، جو ویسے بھی عموماً اسلام اور پیغمبر اسلام کی سیرۃ پر نہایت مفید، کارآمد اور ہدایت وبصیرت افروز مقالات شائع کرتا رہتا ہے۔ اِس کے "آخری نبی نمبر" کا تقریباً ہر مضمون پڑھنے اور بار بار پڑھنے کے لائق ہے جسے مسلمانوں کے علاوہ ہر اُس شخص کو پڑھنا چاہیے جسے حقیقت ومعرفت کی تلاش ہو۔

انجمن احمدیہ کی یہ خدمت جو خالص اسلام اور حضرت داعی اسلام خاتم انبیا صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ کے متعلق ہے عرصہ سے جاری ہے اور یقیناً قابلِ توجہ ہے۔

سالانہ چندہ ؎، اس خاص نمبر کی قیمت درج نہیں، غالباً مفت مل جائیگا۔

ملنے کا پتہ :- نیجر "پیغام صلح" لاہور

(ا۔ا۔م)

نورس | یہ اورنگ آباد کالج کا دوماہی رسالہ ہے جس کا جدید سلسلہ اب تقریباً ایک سال کے بعد پھر شروع ہوا ہے اور یہ دیکھکر بے انتہا مسرت ہوئی کہ رسالہ ٹائپ میں چھپتا ہے۔ مضامین کا معیار اچھا خاصا ہے۔ نومبر ودسمبر ۲۸ء کا رسالہ ہمارے پیش نظر ہے جسمیں مولوی احمد حسین صاحب کا مضمون "اسباب قحط ہندوستان" خاص طور پر پڑھنے کے لائق ہے۔ سالانہ چندہ درج نہیں

ملنے کا پتہ :- اورنگ آباد کالج، اورنگ آباد (دکن)

اجمل | معین الدین حارث صاحب بی۔ اے (جامعہ) نے مسیح الملک حکیم محمد اجمل خانصاحب مرحوم ومغفور کی یادگار میں دو مہینے ہوئے یہ روزنامہ بمبئی سے جاری کیا ہے۔ ۲۰ × ۲۶/۴ سائز کے ۸ صفحوں پر شائع ہوتا ہے۔ "اجمل" ایک کٹر قومی پرچہ ہے اور اس لئے وطن پرست طبقہ کی امداد کا مستحق ہے۔

ہم کو یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ دو ماہ کی قلیل مدت میں پرچہ کی اشاعت ایک ہزار سے متجاوز ہوگئی ہے
حارث صاحب کو ہمارا مشورہ ہے کہ چونکہ پرچہ صرف چار صفحوں پر شائع ہوتا ہے اس لئے زیادہ جلی اور
کئی کئی سرخیاں نہ دیا کریں۔ اس سے اخبار میں کافی جگہ بیکار ضائع ہوتی ہے۔ نیز بمبئی کی مقامی خبروں
اور دنیا کی خبروں کا نچوڑ جو وہ " ایک نظر میں سب کچھ " کے عنوان سے شائع کرتے ہیں ابھی کافی
توجہ کا محتاج ہے۔ مقامی خبروں کے لئے نصف صفحہ اور " ایک نظر میں سب کچھ " کے لئے کم از کم
پہلے صفحہ کا وہ تمام حصہ ہونا چاہئے جس پر خبریں دیجاتی ہیں۔

ہمارے خیال میں خبریں بھی بہت تفصیل سے دینا ضروری نہیں۔ اسوقت ۲ دسمبر کا پرچہ
ہمارے سامنے ہے۔ لکھنؤ میں سائمن کمیشن کے جلوس کے سلسلہ میں پنڈت جواہر لال پر جو حملہ ہوا
اس کی تفصیل اس پرچہ میں ۳ کالم سے زیادہ پر دی گئی ہے۔ لیڈنگ آرٹیکل عموناً ایک ڈیڑھ کالم کا ہوا
کرتا ہے۔ اگر یہ بالکل بند کردیا جائے یا کبھی کبھی بہت ضروری مسائل پر ہوا کرے تو بہتر ہوگا۔ " اجمل "
کا سائز چونکہ چھوٹا ہے اور تعداد صفحات صرف چار۔ اس لئے یہ ضروری باتیں نظر انداز کرنیکے لائق نہیں۔

حارث صاحب چونکہ جامعہ کے ایک عزیز طالب علم رہ چکے ہیں اس لئے اُنکے اخبار سے
ہم کو خاص دلچسپی ہے اور اسی بنا پر بلا تکلف بعض تبدیلیاں تجویز کردیگئیں۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ " اجمل "
ترقی کرے اور حارث صاحب اس کے ذریعہ ملک کی بہترین خدمت کرکے " جامعہ " کا نام روشن کریں۔

مونس | ماہ دسمبر ۱۹۲۸ء سے یہ رسالہ زیر ادارت جناب حفیظ اللہ صاحب دانش گوجرانوالہ سے
جاری ہوا ہے۔ جسکا افتتاحی نمبر ہمارے پیش نظر ہے۔ رسالہ نہایت خراب چھپا ہے۔ اور کاغذ
بھی اچھا نہیں۔ البتہ ٹائٹل بہت خوبصورت ہے۔ اس رسالہ کے اجراء کا مقصد فسانوں کے ذریعہ
ملک و قوم کی ذہنی۔ اخلاقی اور معاشرتی ترقی مقصود ہے۔ مضامین تمام تر عام دلچسپی کے ہیں۔
ملنے کا پتہ :۔ " مونس " گوجرانوالہ

(ج)

کتب

تذکارِ سلف - اُردو قاعدہ - جواہرِ سخن - سرکار کا دربار - وصلی الجید

تذکارِ سلف | ضیاء احمد صاحب ضیاؔ - ایم - اے - ناشر مجالس ادبیہ انٹرمیڈیٹ کالج علی گڈھ - سائز ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۲۴۳ صفحے قیمت ۱۲؍

عہدِ اسلامی کے قرونِ اولیٰ میں ایسے واقعات بکثرت ملتے ہیں کہ ایک شخص نے عدل، صداقت پاسِ عہد اور ایمانداری کے سامنے اپنا اور اپنے عزیز و اقارب کا خیال نہ کیا - روزانہ کی زندگی کے یہی وہ واقعات ہیں جو ظاہر کرتے ہیں کہ پچھلے لوگ ہم سے کتنے بہتر تھے - اِن واقعات کا محفوظ رکھنا اور انہیں بہتر سے بہتر طریقہ پر نمایاں اور بیان کرنا ہماری حیات ملی کے لیئے ازبس ضروری ہے جناب ضیاؔ نے مولانا شبلی کے طرز میں بعض واقعات نظم کیئے ہیں - جو ایک مفید کام ہے - "عہدِ سلف کا ایک زریں صفحہ" اور "اسوۂ حسین" اس مجموعہ کی نمایاں ترین نظمیں ہیں - جناب ضیاء کا اگر یہ شوق جاری رہا تو توقع ہے کہ اُن کی نظموں میں دلکشی اور اسلوب بیان کی عمدگی بھی پیدا ہو جائیگی جو اس مجموعہ میں کمتر پائی جاتی ہے -

---

اُردو کا قاعدہ | مرتبہ .... ناشر قومی کتب خانہ - ریلوے روڈ - لاہور - سائز ۲۰×۲۶/۱۶ - حجم ۲۰ صفحے - قیمت ۱؍

یہ قاعدہ بہت دبیز کاغذ پر چھاپا گیا ہے - ا - خ ' د - غ ' ف - ے ' تک علیحدہ علیحدہ تین حصّوں میں اسباق ہیں - ہر سبق کے بعد حروف شناخت کرنے کی مشق ہے - قاعدہ کسی جدید اُصول پر نہیں لکھا گیا ہے - یہاں تک کہ مرکبات کا بھی وہی پُرانا طریقہ اختیار کیا ہے - جسے آج کل سہل بنانے کی کوشش کی جارہی ہے - بہرحال جو قاعدے عموماً رائج ہیں اُن سے یہ قاعدہ اس لیئے ضرور بہتر ہے کہ اس کا کاغذ ایسا نہیں ہے جسے بچے آسانی سے پھاڑ سکیں -

---

جواہرسخن | از مولوی محمد عبدالمقیت صاحب شمس نیموی۔ ناشر جناب شمس نیموی۔ نیمی۔ ڈاکخانہ فتوحہ ضلع پٹنہ۔ سائز ۲۲×۱۸/۸ حجم ۱۴۸ صفحے۔ قیمت ایک روپیہ۔

قواعد تذکیر و تانیث پر یہ مفید کتاب ہے۔ الفاظ کے مذکر یا مؤنث ہونیکی سند مشاہیر شعراء کے کلام سے پیش کی ہے۔ کتاب کے ایک تہائی حصہ میں متروکات و محاورات کی بھی بحث ہے اور بعض شعراء کے کلام کا انتخاب مع مختصر حالات درج ہے۔ جواہرسخن ٹکسٹ بک کمیٹی صوبہ بہار و اڑیسہ کی منظور شدہ کتاب ہے۔ یقیناً شمس صاحب نے اسکی تالیف پر بڑی محنت کی ہے۔ جو قابلِ داد ہے۔ (ج)

سرکار کا دربار | مؤلفہ احمد الیاس مجتبی صاحب ناشر مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی۔ سائز ۳۰×۲۰/۱۶ حجم ۱۵۲ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ۔

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے حالات اُمتِ اسلامیہ کے لیئے اُسوۂ حسنہ ہیں جنکو تعلیمی نصاب کا لازمی جزو رکھنا اور بچپن ہی سے اسکی تعلیم دینا چاہیئے تھا۔ مگر مدت ہائے دراز سے مسلمانانِ ہند نے اس سے غفلت کی۔ اردو میں اس قسم کی پہلی کتاب جو تعلیمی غرض کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی وہ ہماری سیرۃ الرسول ہے جسکو ہندوستان کے طول و عرض میں بہت سے اسلامی مدارس نے اپنے نصاب میں داخل کیا۔ اور بعض صوبوں میں اسکے ترجمے کر لیئے گئے جو اسکولوں میں پڑھائے جانے لگے۔

مگر یہ کتاب نویں اور دسویں جماعتوں کے طلبہ کے لیئے تھی۔ اور ضرورت یہ ہے کہ اس سے پہلے ہی سے اُن کو اس اُسوۂ حسنہ سے روشناس کیا جائے۔ اس غرض کے لیئے خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی نے ہمارے رسول نامی کتاب لکھی جو مکتبۂ جامعہ کی طرف سے شائع کی گئی۔ اب یہ کتاب یعنی "سرکار کا دربار" تعلیمی نقطۂ نظر سے ہمارے پُرجوش اور نشیط مکتبہ کے کارپرداز مولوی الیاس احمد صاحب مجتبی نے ترتیب دی ہے۔ بچوں کی ذہنیت کو

پیش نظر رکھہ کر اُن کے مناسب حال واقعات لکھے ہیں ۔ زبان سلیس رکھی ہے ۔ اور چھپائی ، لکھائی سب موزوں ۔ اسمیں کہیں کہیں بعض بعض خامیاں تھیں ۔ وہ بھی اب نکالدی گئی ہیں ۔ اُمید ہے کہ اسکا آئندہ اڈیشن بالکل ٹھیک ہوگا ۔ بچوں کی دلچسپی کے لئے مسجد حرم اور مسجد نبوی کی تصویریں بھی دی گئی ہیں ۔ اور سرِ ورق خوبصورت رکھا گیا ہے ۔ جامعہ کے نصاب تعلیم میں ابتدائی چہارم میں یہ کتاب پڑھائی بھی جاتی ہے ۔ دیگر اسلامی سکولوں میں بھی چوتھی یا پانچویں جماعتوں کے دینی نصاب میں اسکو رکھنا نہایت مفید ہوگا ۔

وصلی ابجد منشی عبدالمجید صاحب پروین رقم لوہاری منڈی لاہور نے ا ۔ ب کی پوری وصلی جلی اور خوشخط لکھ کر دبیز آرٹ پیپر پر چھپوا کر شائع کی ہے ۔ حروف نہایت خوشنما ۔ روشن ۔ صاف اور دیدہ زیب ہیں ۔ اور چھپائی کی صفائی بھی نظر فریب ۔ خاصکر جدول اور سیاہی بہت دلکش ہے ۔ وسط میں خود پروین رقم صاحب کا فوٹو بھی ہے ۔

یہ وصلی علاوہ اس کے کہ خوشخطی سیکھنے والوں کے لئے نمونہ کا کام دے ۔ کمرے کی زینت اور آرائش کے لئے بھی عمدہ چیز ہے ۔ اور تصویروں سے کم دلکش نہیں ہے ۔

اصول فن کے لحاظ سے ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں مختلف اساتذہ کے خط کا اتباع کیا جاتا ہے ۔ دہلی والے میر پنجہ کش ، اور مولوی رضی الدین ، اور منشی عبدالغنی کے پیرو ہیں ۔ لکھنؤ میں حافظ نوراللہ ، محمد ابراہیم اور علی رضا ، نیز آخری خطاط منشی شمس الدین صاحب اعجاز رقم کا اسکول ہے ۔ اور لاہور میں امام ویردی کی شاگردی ہے ۔ منشی عبدالمجید صاحب کی یہ وصلی فی الجملہ آزاد ہے ۔ اور کسی خاص اسکول کی نقل نہیں معلوم ہوتی ۔ قیمت فی کاپی عہ تعمیم فائدہ کے لحاظ سے اگر اسکی قیمت کم رکھی جاتی تو بہتر ہوتا ۔

(ا ۔ ج)

شذرات

۱۹۲۸ء ختم ہوگیا - ہم اس پرچہ میں اپنے ناظرین کو نئے سال کی مبارکباد پیش کرتے ہیں - گزشتہ سال جامعہ اور اہلِ جامعہ کے لیئے بڑی مشکلوں اور پریشانیوں کا سال رہا - مسیح الملک مرحوم کے انتقال سے گویا جامعہ کا اصلی بانی اور سرپرست دنیا سے اٹھ گیا - اور ان کا یہ عزیز ترین روحانی بچہ یتیم ہوگیا - اکابر قوم نے مسیح الملک کی یادگار قائم کرنے کا فیصلہ کیا - اور قدرتاً جامعہ ملیہ ہی کو اپنے مرحوم قائد کی بہترین یادگار تسلیم کیا کہ اسی کے قیام و استحکام کی کوشش میں مرحوم نے اپنی عمر کے آخری ایام صرف کیئے تھے - اور یہی وہ اہم تعمیری کام تھا جسکی تکمیل کی تمنا لیکر وہ اس دنیا سے سدھارے تھے -

---

مرحوم کو جو دلی تعلق جامعہ اور جامعہ والوں سے تھا اُسکا علم کچھ جامعہ کے کارکنوں کو ہی تھا - لیکن اہلِ جامعہ کو اسکا اقرار ہے کہ قوم کے تمام ذمہ دار اشخاص ، اور ملک کے تمام ممتاز صحیفوں نے اس گہرے تعلق کو تسلیم کیا اور اس فیصلہ سے کہ جامعہ کو مسیح الملک کی یادگار رہنا یا جائے یقیناً مرحوم کے مقاصد اور ارادوں کے صحیح علم کا ثبوت دیا - گاندھی جی اور ڈاکٹر انصاری نے اجمل جامعہ فنڈ کے لیئے جو اپیل ملک سے کیا اُسکے مؤیدین کی فہرست اٹھا کر دیکھیئے تو مشکل ہی سے ہندوستان کے مشہور قومی رسائل و اخبارات کے فائل دیکھیئے ، شاید ہی کوئی ہو جس نے اس اپیل کی تائید میں ایک بار نہیں بار بار نہ لکھا ہو - لیکن یہ اپیل شروع ۱۹۲۸ء میں ہوا تھا - اور اس سال کے ختم ہونے میں ایک مہینہ باقی تھا کہ اسوقت تک ہماری احسان ناشناس قوم نے اپنے اس محسن اور خادم اور قائد کی یادگار قائم کرنے کے لیئے بمشکل چار ہزار روپے جمع کر پایا تھا ! ہماری قومی زندگی کے انتشار ، باتوں کی چاٹ اور اصلی کام سے بیزاری کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے -

---

لیکن وسط نومبر میں مولنا ابوالکلام صاحب آزاد اور ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری نے یہ فیصلہ کیا کہ اس سلسلہ میں مدراس کا سفر کریں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب شیخ الجامعہ ان کے ہمراہ تھے۔ کچھ عرصہ پہلے سے مدراس کے مشہور اہلِ دل سیٹھ جمال محمد صاحب سے خط وکتابت ہو رہی تھی، تجارت کی عام حالت خراب ہونے کے باعث سیٹھ صاحب کا خیال تھا کہ ابھی اس کام کو ملتوی رکھا جائے۔ لیکن یہ خیال کرکے کہ آخر دنیا کا کام کسی نہ کسی طرح چل ہی رہا ہے انہوں نے جامعہ کے وفد کو دعوت دیدی۔ اور ۱۹ر نومبر کو یہ وفد مدراس پہنچا۔

مدراس میں متعدد جلسے ہوئے جسمیں اراکین وفد نے جامعہ کے مقاصد سے لوگوں کو آگاہ کیا۔ اور خدا کا شکر ہے کہ مدراس کے مسلمانوں نے کام کی اہمیت کو سمجھ کر اور جس نام کو قائم رکھنے کے لیئے روپیہ جمع ہو رہا تھا اسکی عزت و احترام کا خیال کرکے خوب اچھی طرح دل کھول کر مدد کی۔ شہر کے معزز ہندو حضرات نے بھی چندہ میں شرکت فرمائی۔ اور وفد کو اس دورہ میں تقریباً ۴۵ ہزار روپیہ وصول ہو گیا۔

اہلِ جامعہ خصوصیت کے ساتھ مولنا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر انصاری صاحب کے شکر گزار ہیں کہ باوجود دیگر سیاسی مصروفیتوں کے انہوں نے جامعہ کے کام اور اپنے مرحوم رفیق کی یادگار قائم کرنے کے لیئے وقت نکالا۔ مولانا نے تو باوجود ناسازی طبع کے یہ سفر اختیار فرمایا۔ اور سفر کی زحمتوں کے باعث مدراس میں طبیعت اور بھی زیادہ خراب ہو گئی۔ جسکی وجہ سے کئی روز تک مدراس میں اور رکنا پڑا۔ خدا کا بڑا احسان ہے کہ اس نے ہمارے ان دونوں مخدوموں کی سعی کو مشکور فرمایا۔ کاش چند اور اکابرِ امت بھی اس اہم تعمیری کام کے استحکام کے لیئے کچھ وقت نکال سکیں۔

یہ سچ ہے کہ وقتی ضرورتیں ہماری پکار کو ایک لمحہ کی فرصت نہیں دیتیں۔ اور ہر منٹ اپنے

مسائل اپنے ساتھ لاتا اور ان مسائل کے حل کا فوراً طالب ہوتا ہے۔ ہر لمحہ کا کام بیشک اہمیت رکھتا ہے لیکن قومی زندگی کے معمار جہاں جزوی لیپ پوت کے فرائض سے غافل نہیں ہو سکتے وہاں یہ کب درست ہے کہ نئی تعمیروں کی بنیادوں کی استواری و استحکام کی طرف سے بیخبر ہو جائیں۔ سچ یہ ہے کہ وقتی کام فوراً اپنا وقتی انعام بھی پیش کر دیتے ہیں۔ لیکن "عاجلہ" اور "آخرہ" کے فرق کو جاننے والے ان انعاموں کی حقیقت سے ناآشنا نہیں ہوتے۔ اور آنی و وقتی جلسوں اور جلوسوں کے سراب نظر کی خاطر "سعی مشکور" کے انعام ربانی کو کم حقیقت نہیں جانتے۔ اور جب فوری — لیکن ناپائدار اور وقتی — کامیابی کی پرستش کرنے والے ان صبر و استقامت سے کام کرنے والوں سے بھی فوری نتائج کا مطالبہ کرتے ہیں تو یہ شاعر کا یہ قول انہیں سنا دیتے ہیں کہ :-

"بستی بسنا کھیل نہیں بستے بستے بستی ہے"

اور پھر اپنے کام میں لگ جاتے ہیں۔ کاش ہماری قوم میں وقتی نتائج کے مقابلہ میں مستقل کامیابی کی زیادہ قدر ہو۔ اور ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ ہو جو مستقبل کی پائدار بنیادیں رکھنے کے دشوار کام کے لیئے اپنے اندر کافی 'ایمان' بھی رکھتے ہوں۔ اور اسکے لیئے "سعی" کرنے کو بھی آمادہ ہوں۔ "لیڈروں" کی ہم میں کمی نہیں، کچھ "بستی بسانے والے" درکار ہیں۔

مدراس کے وفد کی کامیابی کے سلسلہ میں ہمارا فرض ہے کہ سیٹھ جمال محمد صاحب کا اہل جامعہ کی طرف سے دلی شکریہ ادا کریں، سیٹھ صاحب موصوف مسیح الملک کے خاص احباب میں تھے۔ اور مرحوم کی زندگی ہی میں طویل خط و کتابت اور تبادلۂ خیالات کے بعد آپ جامعہ کے دل سے حامی ہو گئے تھے۔ آپ مسلمانان مدراس بلکہ مسلمانان ہند کے لیئے ایک مایۂ ناز ہستی ہیں۔ خدا نے دولت دی ہے اور وہ چیز جو اکثر دولت والوں کو نہیں ملتی، یعنی اچھا سمجھنے والا دماغ بھی عطا کیا ہے۔ اور پھر وہ چیز بھی ارزانی کی ہے جو ان دونوں سے کیا بہے۔ یعنی درد مند دل۔

صوبہ مدراس میں متعدد خیراتی کام آپ کی فیاضی سے چل رہے ہیں۔ جنمیں خصوصیت

کے ساتھ مدرسہ جمالیہ اور جمالیہ ہوسٹل قابلِ ذکر ہیں۔ اول الذکر قدیم اور جدید علوم دونوں سے کماحقہٗ واقفیت رکھنے والے علماء پیدا کرنے کے لیئے قائم ہے۔ اور اپنے مقاصد میں جامعہ سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ مؤخر الذکر اس لیئے ہے کہ سرکاری کالجوں کے طلبہ کو یہاں وظیفہ دیکر رکھا جائے۔ اور اُنہیں اُن کے کالجوں کی تعلیم کے علاوہ علوم دین سے بھی واقف کیا جائے۔ اِن دونوں کاموں پر ہی سیٹھ صاحب تقریباً ۳ ہزار روپے ماہوار صرف کر رہے ہیں۔ جامعہ کے وفد کو آپ نے فی الحال چار ہزار روپیہ عنایت فرمائے۔ اور سو روپے ماہوار مستقلاً مقرر کیئے۔ اور آئندہ بھی امداد کے لیئے اپنی پوری آمادگی ظاہر فرمائی۔ ہم سیٹھ جمال محمد صاحب۔ سیٹھ سی عبدالکریم صاحب اور دیگر مدراسی معاونین جامعہ کا دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔

شاید ناظرین کو معلوم ہوگا کہ گزشتہ سال شروع دسمبر میں دنیا کے عیسائی طلبہ کی جمعیتہ کا اجلاس شہر میسور میں منعقد ہوا تھا۔ اِس جمعیتہ اجلاس میں دنیا کے تقریباً تمام ممالک سے طلبہ کی تحریکوں کے نمائندے آئے تھے۔ اجلاس کا افتتاح مہاراجہ صاحب میسور نے ایک نہایت ہی مؤثر تقریر سے کیا اور پھر دو ہفتہ تک اسکی کارروائی جاری رہی۔

اجلاس میں علاوہ مختلف ممالک کے نمائندوں کے ہندوستان کے مختلف مذاہب کے نمائندے بھی بُلائے گئے تھے۔ ہندوؤں کی طرف سے کلکتہ یونیورسٹی کے اُستاد فلسفہ پروفیسر رادھا کرشن کو بلایا گیا تھا جو عنقریب اکسفورڈ یونیورسٹی میں معلم فلسفہ کی حیثیت سے جانے والے ہیں مسلمانوں کا نقطۂ نظر پیش کرنے کے لیئے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب شیخ الجامعہ کو دعوت دی گئی تھی ہمیں یہ معلوم کرکے بہت خوشی ہوئی کہ شیخ الجامعہ کی تقریر کو اس کانفرنس میں بہت پسند کیا گیا اور کانفرنس کے نمائندوں نے جنکے ذہن میں اسلام اور اسکی تعلیمات کے متعلق طرح طرح کی بدگمانیاں تھیں اپنے استعجاب اور تشکر کا اظہار کیا۔ اور اکثر نے کہا کہ "اگر یہ اسلام ہے تو ہم بھی مسلمان ہیں" البتہ یہ بات اکثر کی سمجھ میں نہ آئی کہ مسلمان آخر اپنے پیغمبر کو خدا کیوں نہیں مانتے!

کہ عیسائیت کی سب سے بڑی فضیلت انکی نظر میں یہی ہے کہ عیسٰی علیہ السلام (نعوذ باللہ) خدا ہیں !!

اس اجلاس کے سلسلہ میں ہمیں جو کاغذات ملے ہیں ان سے بہت دلچسپ معلومات حاصل ہوسکتی ہیں جو ہمارے لیئے عبرت کا سامان ہو۔ مختلف ممالک کے نمائندوں نے اپنے اپنے دیس کے طالبعلموں کی مذہبی ومعاشرتی حالت پر رپورٹیں پیش کیں۔ اور طلبہ میں عیسائی تعلیم کے پھیلانے اور عیسائی اخلاق کی ترغیب دینے کے وسائل کی طرف توجہ دلائی۔ اس جمعیتہ کے اثر کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ دنیا کے تقریباً ۱۸ لاکھ اعلیٰ تعلیم پانے والوں میں سے تقریباً سوا دو لاکھ یعنی ۱۲½ فیصدی اس میں شامل ہوچکے ہیں۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے تقریباً ۷½ لاکھ اعلیٰ تعلیم پانے والوں میں سے تو ۲۴ فیصدی اسمیں شامل ہیں۔ تیس ممالک میں اس جمعیتہ کی شاخیں ہیں۔ اور مختلف قومی شاخوں کے نمائندوں کا اجلاس ہر دوسرے سال ہوتا ہے۔ یہ دوسالہ جلسے مختلف ممالک میں ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں یہ پہلا جلسہ تھا۔

اس جمعیتہ کے مختلف کاموں میں ہم ایک کام کی طرف اپنے ناظرین کی توجہ خاص طور پر منعطف کرانا چاہتے ہیں۔ یعنی پردیسی اور نادار طلبہ کو مدد پہنچانے اور انہیں اپنی مدد آپ کرنے کے مواقع فراہم کرنے کے متعلق انتظام کی طرف۔ انشاء اللہ ہم کسی آئندہ اشاعت میں ان انتظامات کے متعلق ایک مفصل مضمون ہدیۂ ناظرین کرینگے۔

نومبر کے رسالہ جامعہ میں ڈاکٹر برکت علی قریشی کے مضمون میں حضرت ابن عباسؓ کے متعلق دو ایک فقرے ایسے ہیں جنکی اشاعت علماً اور دیانتاً جائز نہ تھی۔ چنانچہ مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی نے بھی اپنے اخبار سچ میں اسکا شکوہ لکھا۔
صورت یہ ہوئی کہ کارپردازان جامعہ نے بلا مجھ کو دکھائے ہوئے ڈاکٹر صاحب کے اعتماد

پر یہ چھاپ دیا - چھپنے کے بعد جب رسالہ مجھ کو ملا اور میں نے پڑھا تو مجھے بہت قلق ہوا - میرا خیال تھا کہ اسکی معذرت لکھوں گا کہ اس اثنا میں دریا بادی صاحب نے بھی اسکی طرف توجہ مبذول کرائی جسکا میں شکرگزار ہوں -

مولوی صاحب موصوف نے یہ بھی خیال ظاہر کیا ہے کہ ایسے مضامین شائع ہی نہیں کرنا چاہیئے - لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم اس دنیا میں نہیں ہیں جہاں لایسمعون فیھا لغواً ولا تاثیما الا قیلاً سلاما سلاما کا دور ہو - بلکہ عالم ناسوت میں ہیں جہاں رحمانی کلام کے شیطانی آوازیں بھی سننی پڑتی ہیں - ولتسمعن من الذین اوتوا الکتاب من قبلکم ومن الذین اشرکوا اذیً کثیرا - افراد کے لیئے گو یہ آواز کیسی ہی تلخ ہو لیکن قومی حافظہ کا تو ان سے خالی رہنا مناسب نہیں - رہی تردید تو اسکی تردید کرکے خود تردید کی اہمیت کھونی ہے -

مولوی دریا بادی صاحب نے اپنے اس شکوہ میں قدیم طنزیہ انداز میں میرے متعلق جو تعریف کی ہے وہ افسوس ہے کہ نہ اُن کی شان کے مطابق ہے نہ میری - مگر اس موقعہ پر رسالہ جامعہ کے مدیر ہونے کی حیثیت سے اس غلطی پر خواہ وہ کسی کے تسامح سے ہوئی ہو اپنی مسئولیت کا احساس کرتے ہوئے میں درگزر سے کام لیتا ہوں -

---

یہ معذرت میں لکھ چکا تھا کہ رسالہ معارف موصول ہوا - اس میں بھی اس غلطی پر توجہ کی گئی ہے اور بسیط شذرہ لکھا گیا ہے -

عجیب بات یہ ہے کہ دونوں نقادوں نے اس سے دو مختلف فائدے حاصل کرنے کی کوشش کی ہے - مدیر سچ کو میرے ساتھ عناد ہے ، اس لیئے انہوں نے اس موقعہ پر میرے عقیدہ کی توہین سے اپنے ایمان کی پختگی کا اظہار کرکے قلب کی تشفی فرمائی ہے - اور مدیر معارف نے اس ایک غلطی پر مغربی یونیورسٹی کے تمام عربی تعلیم یافتوں کے جملہ حقوق "Research" ضبط کرکے مشرقی مدارس کے طلبہ کے حوالے کردیے ہیں -

نمبر ۱۸۹۲
رجسٹرڈ
جامعہ
جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ
نمبر ۲
بابت ماہ فروری سنہ ۱۹۲۹ء
جلد ۱۲
مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
1927

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری   ڈاکٹر سیّد عابد حسین ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی

نمبر ۲	بابتہ ماہ فروری ۱۹۲۹ء	جلد ۱۲

فہرست مضامین

ایک تصویر

لیونارڈو دا ونچی (Leonardo da Vinci) نے اُس زمانہ میں ایک تصویر بنائی تھی جب اطالیہ میں قدیم یونان کا اثر اپنے عروج پر تھا، ملک کے تمام روشن ضمیر لوگ یونانی جمالیات کے بادۂ کہنہ سے مست تھے، اور یونانی تخیل گہرے سے گہرے جذبات تک سرایت کر گیا تھا۔ لیونارڈو بھی انہیں روشن ضمیر لوگوں میں سے تھا، لیکن اُس کی اپنی شخصیت اسقدر مضبوط اور تخلیقی تھی کہ وہ دوسروں کی طرح یونانی تہذیب میں فنا نہیں ہو گیا تھا، بلکہ اُس کے اثرات کو اپنے جذبات کے قوی اور دل کے وسیع بنانے کے لیۓ استعمال کیا۔ دوسرے یونانی دیوتاؤں اور دیویوں کے عشق میں کلیسا اور حضرت عیسیٰؑ اور دین عیسوی کو بھول گئے، لیونارڈو نے یونانی جمال کو عیسائی اطاعت اور ایثار کے رنگ میں رنگا، اور ایک تصویر بنائی جو صدائے مستانہ بھی ہے اور فلسفہ بھی، عشق بھی اور مذہب بھی۔

یہ تصویر حضرت یوحنا کی ہے، ایک ولی جو مسیح سے کچھ پہلے پیدا ہوئے۔ وہ جنگلوں اور ویرانوں میں بسر کرتے تھے، اور جو لوگ ان کے پاس جاتے ان سے کہتے تھے کہ "میں مسیح نہیں، اس کا پیشرو ہوں۔ میں مسیح کے قدم چھونے کے لائق بھی نہیں، میں صرف اُس کا راستہ صاف کرنے کے لیۓ آیا ہوں۔ میرے نالہ کو ہوش سے سنو، اور بپتیسمہ کے پانی سے اپنے گناہ پاک کرو۔" اعتقاد اور انکسار، جوش اور خود فراموشی کا بہتر نمونہ عیسائی مذہبی تاریخ میں مشکل سے ملے گا۔ اسی واسطے لیونارڈو نے انھیں اپنی تصویر کے لیۓ سب سے مناسب سمجھا، انہیں صحرا میں دکھایا، ان کے چہرہ کو روشن کیا، ہاتھ میں صلیب دی۔ یہ سب عیسائی روایات کی پیروی تھی، باقی جو کچھ تصویر میں ہے وہ یونانی جمالیات کا جوہر ہے۔

یونانی تصور انسانیت کے معموں میں اس قدر مشغول، اس کی عظمت کا اتنا دلدادہ تھا کہ وہ اپنے دیوتاؤں کی کافی تعظیم اور توصیف نہ کر سکا۔ یونانی شہری ریاستوں کی طرح یونان کا عالم بالا

بھی مختلف دیوتاؤں میں تقسیم تھا۔ ہر دیوتا آزاد، خود مختار، بے نیاز انسان کے اُس جذبہ یا انسانی زندگی کے اُس پہلو پر حکومت کرتا تھا جو اُس کے سپرد تھا۔ منروا عقل و دانش کی دیوی تھی، وینس حسن کی، کلیسٹر اور پولکس جہاز رانی کے، ڈایونیسیس انگور اور شراب کا۔

ڈایونیسیس اُس وقت یاد کیا جاتا تھا جب دنیاوی امور سے فراغت ہو، اور خوشی اور مستی مقصود ہو۔ ڈایونیسیس کا مندر صحرا اور چشمے اور درختوں میں چھپی ہوئی وادیاں اور پہاڑیاں تھیں، وہیں اس کے پجاری جاکر اُسے یاد کرتے، اور اپنی مجلس اور شراب خواری میں شریک ہونے کی دعوت دیتے تھے۔ عوام کے تصور میں ڈایونیسیس خوش مزاجی، موٹے ہونٹوں، مخمور آنکھوں اور نمایاں توند کا مجموعہ تھا اور اُسے پجاری بھی ایسے ہی ملتے تھے۔ مگر وہ قوم جو مشرقی شاعری میں ناصح اور واعظ کے نام سے مشہور ہے اِسے کب روا رکھ سکتی تھی۔ اُس نے طے کیا کہ ڈایونیسیس کی مستی شراب کی نہیں، شراب اور شراب خواری محض تمثیلیں ہیں۔ ڈایونیسیس ایک سنجیدہ، خوش اخلاق بلکہ نہایت درجہ پارسا دیوتا ہے۔ اُس کا نشہ روحانی ہے اس لئے اس کی پرستش میں شراب خواری بغرض مستی و مدہوشی ہرگز جائز نہیں۔ یونانی آرٹسٹ کو نہ عوام کی پیروی منظور تھی نہ اخلاقی رہنماؤں کی۔ اُس نے ڈایونیسیس کو ایک خوبصورت مرد کی شکل دی، ایسا جیسے خوش مذاق اور سنجیدہ لوگ اپنی عیش و طرب کی مجلسوں میں دیکھنا پسند کرتے ہیں اور اُسکی آنکھوں میں ایسا خمار پیدا کیا جو روحانیت اور شراب خواری دونوں کا حیرت انگیز مجموعہ تھا۔......

یونانی تخیل کا نیا دور جس میں لیونارڈو کی شخصیت نے نشو ونما پائی تھی، نہ پُرانے دیوتاؤں کو انکی دیرینہ شکل میں پیدا کر سکا، نہ ان کے پجاریوں میں صحیح اور فطری عقیدت۔ ظاہر تھا کہ اگر عیسائی عقیدت نے اُن کو اپنے زیرِ سایہ نہ لیا، یا وہ اپنی صورت دنیا اور تہذیب کی نئی شکل کے مطابق نہ بدل سکے، تو دونوں کو سخت نقصان ہوگا۔ عیسائی مذہب ایک خاص لحاظ سے لوگوں کی فطرت میں سرایت کر چکا تھا، لیکن اُس میں تعمیر اور تخلیق کی طاقت اتنی کم رہ گئی تھی کہ پُرانے دیوتاؤں نے اُس کے قلعہ کو آسانی سے فتح کر لیا۔ ان دونوں میں مطابقت کرنا، اس مطابقت سے ایک نئے مذہب کا کام لینا

اس زمانہ کی تہذیب کا سب سے اہم مسئلہ تھا جس تصویر کا میں ذکر کر رہا ہوں اس کوشش کا ایک نہایت کامیاب نمونہ ہے۔

حضرت یوحنا ایک صحرا میں رونق افروز ہیں، ہاتھ میں صلیب، کندھے پر کملی ہے مگر صحرا پر مستی کالی گھٹا کی طرح چھائی ہے، یہاں تک کہ ان کی صلیب کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا، ان کے سامنے ایک کھوہ ہے ویسا ہی جس میں ڈایونسیس کے پجاری اپنی مجلسیں کیا کرتے تھے۔ حضرت یوحنا کے بال لٹوں میں بندھے ہیں، انکا جسم ویسا ہی سفید اور نرم اور خوبصورت، ان کا انداز ویسا ہی مستانہ، ان کی آنکھوں میں وہی ذومعنی خمار ہے جو ڈایونسیس کے لئے مخصوص تھا، لیکن وہ صلیب کی طرف اشارہ کر رہے ہیں، گویا یہ ساری دنیا، یہ خمار، یہ حسن، سب اُسی کا کرشمہ ہیں۔ اسی اشارہ میں تصویر کا سارا فلسفہ ہے۔

کلیسا نے شروع سے نفس کشی اور رہبانیت کو روحانی ترقی اور نجات کا اکیلا، صحیح اور سیدھا راستہ قرار دیا تھا۔ حضرت عیسیٰ کی تعلیم کا جوہر یہی مانا گیا تھا کہ انسان جسمانی خواہشات، دنیاوی مسرتوں سے دل کو ہٹالے، اور نفس کو روح پر قربان کرے۔ صدیوں کی عادت سے لوگوں کی ذہنیت میں پارسائی کے یہی معنی اور اُس کی یہی صورت مقرر ہوگئی تھی۔ لیکن صدیوں کے تجربہ نے انہیں کچھ مایوس بھی کر دیا۔ رہبانیت اور زہد کی دشواریوں نے ان کی ہمت پست کر دی۔ جب انہوں نے قدیم یونان کا رنگ دیکھا، یونانی انسانیت کی عظمت کا انہیں احساس ہوا، تو وہ اپنے مذہبی عقیدوں اور اصولوں سے منہ پھیر کر اس نئے دین کے معتقد ہوگئے۔ اس دین میں جذبات اور نفس خواہشات کے نشو و نما کا موقعہ تو ضرور تھا لیکن اخلاق کی جڑ کٹ جاتی تھی۔ کچھ لوگ کلیسا کے ڈھرے پر چلنا چاہتے تھے اور انہوں نے یونان اور یونانی تہذیب کو شیطان کا جال بتایا، اور قوم کو آگاہی دی کہ اگر فلاح کی خواہش ہو تو اس سے محفوظ رہیں، زیادہ تر بغیر اپنے عقیدوں کا اعلان کئے ہوئے دونوں تہذیبوں سے لطف یا فائدہ اُٹھاتے رہے۔ کچھ ایسے تھے جنہوں نے مذہب کو بالائے طاق رکھا اور یونانی دیویوں پر عاشق ہو کر نفس کی لگام ہاتھ سے چھوڑ دی۔

ان میں سے کوئی طریقہ بالکل صحیح نہیں تھا، مگر کسی فریق کی نظر میں اتنی وسعت نہ تھی کہ حضرت عیسیٰ اور قدیم یونان کو ایک ہی دل میں جگہ دیسکے۔ لیئونارڈو داونچی نے علاوہ اور کارناموں کے یہ معجزہ بھی دکھایا۔ یوحنا کی تصویر میں صلیب پر فوراً نظر جمتی ہے، انکی ظاہری مستی پارسائی اور ایثار کا پیغام دیتی ہے، لیکن تصویر پر یہ بھی صاف لکھا ہے:

من ایں مے چوں مغان دو پیشیں
زچشم مست ساقی وام کردم

حسن پرستی اور پارسائی کی عداوت صرف عیسائی مذہب کی خصوصیت نہیں۔ یہ عداوت ہر مذہب، ہر ادب، ہر دل میں پائی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی جنگ ہے جو اس زمانہ سے جب انسان میں اخلاق اور مذہب کا احساس پیدا ہوا ابھی تک جاری ہے، اور اُس کا انجام ابھی تک کچھ نہیں نکلا۔ حسن پرستی نے عموماً لوگوں کو ورغلایا ہے، برباد کیا ہے، پارسائی نے اکثر اُن کی برسوں کی جفاکشی کا کوئی صلا نہیں دیا۔ دونوں فریق میں ایسے افراد ہیں جو اپنی تمناؤں کی بیکسی، اپنی آرزوؤں کی نااُمیدی کا اعتراف کرتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو مخالفین پر حملہ آور ہوکر عام توجہ انکی کمزوریوں کی طرف منتقل کراتے ہیں، کہ اُن کی اپنی خامیاں چھپی رہیں۔ اس جھگڑے کا فیصلہ ہر شخص صرف اپنے لئے کرسکتا ہے، اس لئے کہ اس کے سوا اور کوئی اُس کی طبیعت کو اسقدر نہیں سمجھ سکتا جتنا اس امر کے قطعی فیصلہ کے لئے ضروری ہے۔ ہمارا مقصد بھی واعظ اور رند کے درمیان صلح کرانا نہیں ہے بلکہ وہ سلسلۂ خیالات بیان کرنا جو لیئونارڈو داونچی کی تصویر میں پوشیدہ ہے اور اس کو دیکھنے سے ہم پر ایکبارگی ایک عجیب سانشہ پیدا کر دیتا ہے۔

لیئونارڈو نے براہ راست یہ نہیں ظاہر کیا ہے کہ جمال یا جمالیات انسان کو منزل مقصود پر پہنچاتے ہیں۔ اُس کی تصویر ایک عاشقانہ یا صوفیانہ شعر نہیں ہے۔ حضرت یوحنا کو ڈایونسیس کا لباس پہنا کر اس نے ڈایونسیس یا اُس کے پجاریوں کی عزت افزائی نہیں کرنا چاہی ہے، اگر ہم اس کے مطلب کو تعلیمی شکل دینا چاہیں تو اُس کا نتیجہ بالکل برعکس نکلے گا۔ دنیا عموماً سمجھتی ہے کہ زندگی

کا لطف حسن اور نفس پرستی میں ملتا ہے، اور یار ساجنے کے لیے جو ایثار کرنا ہوتا ہے وہ زندگی کو بالکل بے لطف اور ویران کر دیتا ہے۔ لیو نارد و نے ایسے لوگوں کو حقیقت سمجھانے کیلئے اپنا نظریہ پیش کیا ہے، اور اس کا دعویٰ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظریہ حضرت عیسیٰ کی تعلیم کا جوہر ہے۔ وہ یہ ہے کہ جو "مے مرد افگن" کا حریف بننا چاہتا ہے، اور حسن لازوال کی دیدار کا آرزومند ہے، اُسے چاہیئے کہ ایثار اور محبت میں حضرت عیسیٰ کا پیرو بنے، اسی طرح جیسے حضرت یوحنا تھے۔ جس قدر وہ اس راستہ پر سفر کریگا اُس کا ذوق بڑھتا رہیگا، "ہمت رندانہ" اپنے کرشمے دکھائیگی اور اس پر ایسی مستی چھائے گی جو صرف دار اور صلیب پر چڑھنے سے اتر سکتی ہے۔

موجودہ زمانہ میں ماہرین نفسیات نے یہ دریافت کیا ہے کہ تمام جذبات دراصل صرف جنس کی مختلف شکلیں ہیں، جن میں ظاہر ہے کہ روحانیت، مذہب بھی شامل ہیں۔ مذہبی جوش، چاہے وہ زہد کی صورت اختیار کرے، چاہے قلندری کی، صرف جنسی ضبط اور ارادہ پرہیز کا نتیجہ ہے، اور اس میں اور کوئی بڑا بھید نہیں۔ معمولی انسان شادی کرتے ہیں، بچے پیدا کرتے ہیں، اپنے پیشے اور دوسری دلچسپیوں میں اپنی قوت ضائع کرتے ہیں۔ اگر وہ بجائے اس کے زاہد یا قلندر یا مذہبی رہنما بنجائیں اور جنسی جذبات کی پوری قوت محفوظ رکھیں تو وہ بھی عقیدت اور روحانیت کے وہی معجزے دکھا سکتے ہیں جنھوں نے چند شخصیتوں کو مشہور کر دیا ہے۔

سائنس کی تعلیم سے قطع نظر کرنا یا بلا سائنس داں ہوئے اُس کے نظریوں کی تردید کرنا خطرناک ہے، لیکن اگر ہم اس نظریہ میں سے مادیت کی بو نکال دیں تو اُس کی صحت کا اقرار کرنے میں کوئی بے ادبی نہیں، اور بزرگوں کی بزرگی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ضبط نفس کی ساری مصلحت یہی ہے کہ اُس سے انسان کی فطری قوت ضائع نہ ہو، اور ارادہ سے جس طرف حاجت ہو، قوت منتقل کر دی جائے۔ جو شخص اپنے جنسی جذبات حیوانی رغبتوں سے پاک رکھتا ہے وہ بے حس نہیں ہو جاتا، اسکے جذبات خود بخود یا تربیت کے بعد اپنے لئے کوئی اور راستہ نکال لیتے ہیں۔ شہوت محبت بن جاتی ہے، محبت ایثار، عشق کا انجام شادی اور بال بچے یا رنگیلے شعر نہیں ہوتے۔ نظر ہوس کا پیغام نہیں

دیتی۔ اور جب یہ ضبط بالکل فطری ہو جائے' اور انسان اس نئی کیفیت میں نشو و نما پانے لگے تو حسن اُسے اپنا پوشیدہ راز بتا دیتا ہے' عشق میں اُسے آزادی کی لذت ملتی ہے اور ہر تکلیف میں اُس کیلئے عیش کا سامان ہوتا ہے۔

یونانی تہذیب جمالیات کے اس پہلو اور ضبط نفس کی لذت سے بخوبی واقف تھی' افلاطون نے جمال اور حق کو خدائی کا درجہ دیا ہے' اور حسن پرستی کی' جسکا ہر جگہ اور ہمیشہ چرچا رہتا ہے' عین بدمذاقی بھی ثابت کی ہے۔ جمال کا احساس اور نفس پر قابو رکھنا اسکے نزدیک انسانیت کی شرط ہیں لیکن یہ کسی طرح سے نہیں کہا جا سکتا کہ یونانی دل اسقدر پاک تھے کہ وہ اس تعلیم کے تمام لوازمات پورے کر سکیں' اور ایک فلسفیانہ نظریے سے یہ امید نہیں کیجا سکتی کہ وہ مذہبی عقیدے کا کام دے۔ یونانی انسانیت کا یہی ایک کرشمہ ہے کہ اسنے بغیر کسی پختہ مذہب کی مدد کے اخلاق اور تہذیب میں اسقدر بلند رتبہ حاصل کیا۔ بہرحال عیسائی رہنماؤں کیلئے یہ ناممکن تھا کہ وہ اخلاق کی بنیاد صرف جمالیات کی صحیح تعلیم مقرر کریں۔ انکا تصور کمزور تھا' وہ اسی منطق کے قائل تھے جسپر دنیا چلتی ہے۔ انھوں نے جسم کو بذات خود ہوس پرور پایا' اور اُسی تکلیف پہونچانے کیلئے نئے نئے طریقے سوچے' ضبط نفس کو ناکافی سمجھ کر روحانی نشو و نما کیلئے نفس کشی لازم کی گویا ارادہ کیا بلند پروازی کا اور شہپر کاٹ دئے۔ اسکا انجام یہ ہوا کہ ملت کے لئے اُن کی پیروی دشوار ہو گئی اور انکی آبرو اس لئے بچ رہی کہ انسان اپنے عیب کامیابی سے چھپا سکتا ہے۔

اس تنگ نظر "ہیچو ماے برخود پیچیدہ" تہذیب میں جب یونانی انسانیت کے راز فاش ہوئے تو اودہم مچ گیا۔ عام زندگی میں کسی قسم کا توازن یا اعتدال ناممکن ہو گیا' اور اُسی جسم نے جو صدیوں سے ہلاک ہو رہا تھا روح پر بدلہ لیا۔ لیونارڈو دا ونچی نے یہ سمجھ لیا کہ انسانی زندگی میں ایک بہت عظیم الشان انقلاب ہونیوالا ہے' اور اس نے اپنے طرز پر رہبری بھی کی۔ اُس کے تصورات اُسے ان تمام منزلوں کی سیر کرائی جو یونانی انسانیت طے کر چکی تھی' مگر اس نے ایک قدم آگے بھی رکھا۔ یونانی انسان کے پاس ضبط نفس کی رغبت دلانے کیلئے کوئی روحانی آرزو نہیں تھی' نہ کوئی رہنما جو اُس کی کیفیتوں سے واقف ہو۔ عیسائی تہذیب کا جوہر ایک صاحب دل کی سرگزشت تھی' ایک دل کا افسانہ' جسکے سمجھنے کیلئے اُس میں کافی وسعت نہ تھی۔ لیونارڈو دا ونچی نے یہ دیکھ کر رند کے ہاتھ میں صلیب دی' مذہب میں نشہ پیدا کیا اور عشق کو پختہ کار بنا دیا۔

اگر میں واعظ ہوتا؟

عنوان بالا سے ۴ جنوری ۱۹۲۸ء کے ڈیلی ٹیلیگراف میں برٹرنڈ رسل کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا ترجمہ ناظرین جامعہ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ برٹرنڈ رسل کے اس مضمون میں ہندوستان کے قومی ماہرین تعلیم کے لئے غور و فکر کا کافی مواد موجود ہے جو بچوں کو بید مار کر ڈرا دھمکا کر (اور یہ رسم ہمارے سارے ہی مدارس میں ہے) کچھ کرانا، ان کی آئندہ زندگی کے بعض خطرناک عیبوں کے پیدا کرنے کی ذمہ داری لیتا ہے۔ اچھا ہو اگر ہماری آزاد قومی تعلیم ایسے افراد پیدا کرنے کی کوشش کرے جو ان عیبوں سے بمقابلہ دوسروں کے زیادہ پاک ہوں۔

یوسف

اگر میری جان لی جا رہی ہو اور اُس وقت مجھے صرف ۲۰ منٹ اپنی آخری الوداعی تقریر کے لئے دیئے جائیں تو میں کیا کہوں گا؟

اُس وقت ضرورت ہوگی کہ میں سادگی اور اختصار سے کام لوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں اُس وقت ایک بات پر سب سے زیادہ زور دوں گا اور وہ بات ہوگی انسانی دل سے ڈر دور کرنے کی اہمیت۔ میرا خیال یہ نہیں کہ انسانیت اس طرح مکمل کیجا سکتی ہے۔ کچھ بھی کیوں نہ کیا جائے کوئی نہ کوئی خرابی ضرور باقی رہے گی۔ لیکن بہت سے عیب جو ہمارے نوجوانوں میں ہوتے ہیں انکی وجہ وہ تعلیم کی غلطیاں ہیں جنکا تدارک ممکن ہے۔ ان غلطیوں میں سب سے اہم دل میں ڈر پیدا کرنا ہے۔

والدین، مُلّا اور حکومتیں اس بات میں مایوس ہو چکی ہیں کہ عقلِ انسانی کی اپیل سے اپنا رعب داب قائم رکھ سکیں۔ انہیں کمینے ڈرپوک غلام بنانا پسند ہے۔ مجھے یقین نہیں کہ ڈر کے ذریعہ کوئی اچھی بات حاصل کیجا سکتی ہے۔ میرا اعتقاد یہ ہے کہ اس طریقہ سے جو وفاداری حاصل کیجاتی ہے اس کا نہ حاصل کرنا زیادہ بہتر ہے۔ ڈر پر، بہ حیثیت ایک اجتماعی قوت کے دو اعتراض وارد ہوتے ہیں۔ وہ جو ڈراتے ہیں

اتیر برا اثر اور وہ جو ڈرتے ہیں انپر۔ دونوں اہم ہیں اگرچہ آخرالذکر زیادہ اہم ہیں۔

شروع میں انہیں سیجئے جو ڈراتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ وہ بے رحم اور دوسروں کو دبانے کے خوگر ہو جائیں۔ اُن میں اختلاف گوارا کرنے اور دلیل سننے کی تاب نہیں رہتی۔ ایسی کوئی حجت جو یہ بتاتی ہو کہ وہ اپنا رعب وداب غلط طریقہ پر استعمال کر رہے ہیں انہیں سننا گوارا نہیں۔ وہ اُن لوگوں کو ترجیح دینے لگتے ہیں جو بے اصولے ہیں اور جن میں اپنی ذاتی عزت کا احساس نہیں (دراصل) وہ خود ڈر میں مبتلا ہوتے ہیں۔ انہیں اسکا ڈر ہوتا ہے کہ نہیں اپنے اسی رعب داب کو نہ کھو بیٹھیں جو بےانصافی پر مبنی ہو۔ انہیں ڈر ہوتا ہے کہ کہیں انکے ماتحت، واجبی طور پر، اظہار خفگی نہ کریں، انہیں ڈر ہوتا ہے کہ کہیں دنیا زیادہ سمجھدار نہ ہو جائے۔ ان خطروں کے باعث وہ اپنی بے رحمی کو بڑھاتے ہیں اور بیرحمی کی ہر زیادتی سے (انکے دلوں میں) بدلوں کا خوف بڑھتا ہے، غرضکہ اس طرح یہ ایک چکر ہے جو ظلم اور ڈر کی برائیوں کے تعلق کو اور زیادہ گہرا کر دیتا ہے۔

ڈر کا اثر اُن پر جو ڈرتے ہیں اور بھی زیادہ برا پڑتا ہے۔ ڈروں کی مختلف قسمیں ہیں۔ انمیں جسمانی ڈر، جسے روایتاً سب سے زیادہ نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، سب سے کم نقصان دہ ہو۔ اخلاقی اور ذہنی ڈر بہت زیادہ بُرے ہیں۔ ہر ڈر تھوڑا بہت غصہ پیدا کرتا ہے لیکن چونکہ جس سے ڈر ہوتا ہے اس پر غصہ نہیں کیا جا سکتا اس لئے اسکا اظہار ظلم کی صورت میں کمزور پر ہوتا ہے جس طرح اہل قوت کے دل میں ظلم سے ڈر پیدا ہوتا ہے بالکل اُسی طرح اُنکے غلاموں کے دلوں میں ڈر سے ظلم پیدا ہوتا ہے۔

اجتماعی ناپسندیدگی کا ڈر، موجودہ دنیا میں، کمینے پن اور نامہربانی کے بڑے سببوں میں سے ہے۔ لوگ (اس) اجتماعی ناپسندیدگی کے اظہار سے اس لئے محفوظ ہوتے ہیں کہ وہ خود اس کے ڈر سے دب چکے ہیں۔ جب آدمی اپنے پڑوسیوں کی اچھی رائے حاصل کرنے کے لئے کچھ قربانی کرتا ہے تو اُسے بڑا غصہ آتا ہے جب اور کوئی ویسی ہی قربانی کرنے سے انکار کرے۔ وہ ایک خوفناک اخلاقی بن جاتا ہے۔ اور بہت گناہ گار کو سزا دینے کی ٹھان لیتا ہے۔ اُن گناہگاروں میں جو اجتماعی ناپسندیدگی کے سزا یافتہ ہیں، وہ سب شامل ہیں، جو ریاکار ہیں، وہ سب جن کے پاس نئے خیالات ہیں جو لازمی

طور پر خالص سائنٹفک نہ سہی، وہ سب جو اپنے گروہ سے زیادہ وسیع، کم سخت گیر اخلاق پر عمل کرتے ہیں۔ اس لئے اجتماعی ناپسندیدگی کا ڈر پیدا کرنا بڑی خطرناک بات ہے۔ اجتماعی تعاون خود اپنی خوشی اور عقل کے مطابق ہونا چاہیے نہ کہ ہر فرد کی (جماعت کے آگے) ڈرپوک پنے سے تسلیم۔

ڈر کے بُرے اثرات میں سب سے زیادہ بُرا اثر یہ ہے کہ اُس سے حماقت پیدا ہوتی ہے۔ عقل کے لئے ایک ذہنی بے خوفی ضروری ہے۔ اس کے لئے ذہنی آزادی درکار ہے اور ذہنی آزادی وہاں مشکل ہی سے ملے گی جہاں اجتماعی آزادی نہیں۔ اس لئے وہ جماعتیں جو اجتماعی ربط پر بہت زور دیتی ہیں، ضرور ہے کہ احمق انسانوں پر مشتمل ہوں۔ اس لئے وہ لازمی طور پر نہ اجتماعی ترقی کرسکیں گی نہ علمی۔ جوشیلے سے جوشیلا حقوق نسواں کا مدعی بھی اس سے انکار نہیں کرسکتا کہ عورتوں نے ابتک بمقابلہ مردوں کے بہت کم ذہنی آزادی کا ثبوت دیا ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ اس کی وجہ سوائے اس کے اور کوئی نہیں کہ وہ بمقابلہ مردوں کے "اخلاق خوف" کے ماتحت سختی سے رہی ہیں۔

میں اُن سے کانپتا ہوں جنکا کام صرف یہ ہو کہ وہ انسانی روح اور انسانی ذہن کو زنجیروں میں رکھیں۔ میں اس (فہرست میں) پروہتوں، مدرسوں، ۹۰ فیصدی مجسٹریٹوں اور ججوں، اور انہیں سے اکثروں کو جنہوں نے سخت ظاہری اخلاقی معیاروں پر پابندی سے عمل پیرا ہوکر جماعت میں عزت حاصل کی ہے، شامل کرتا ہوں۔ یہ مختلف انسانی طبقے، الگ الگ طریقوں سے، اجتماعی ناپسندیدگی یا تعزیرات کے ذریعہ اُن دعوؤں میں یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں جنہیں ہر صاف گو محقق مشتبہ سمجھتا ہے اور جنہیں اعداد و شمار کا ہر طالب علم اجتماعی طور پر نقصان دہ خیال کرتا ہو۔

میں جانتا ہوں کہ یہ کہا جائیگا کہ نوجوان اس وقت تک "نیک" نہیں ہوسکتے جب تک کہ وہ ان غلط دعوؤں میں یقین نہ رکھیں۔ یہ عجیب انداز ہے اور یہ دو منطقی مغالطوں پر مبنی ہے پہلے یہ یقین کرلیا گیا ہے کہ "عمل صالح" ایک ایسی بات ہو جس کی تائید میں کوئی عقلی دلیل نہیں دیجا سکتی دوسرے یہ یقین کرلیا گیا ہے کہ خلاف عقل اور جھوٹی دلیلیں اس کے لئے کافی ہیں کہ اُن کے ذریعہ

بکلیف وہ اشیا رکرایا جاسکے جس کی تائید میں مسلمہ طور پر کوئی عقلی وجہ نہیں۔

عقلی چلن سکھانا واقعی مشکل ہے۔ لیکن یقیناً وہ عقلی طریقہ سے سکھانا بمقابلہ خلاف عقل طریقوں کے سکھانے کے زیادہ آسان ہے۔ ایک بچے کو یہ بات فرض کرنے کا عادی بنا دیجئے کہ جو آپ اُس سے کہتے ہیں اس کے لئے اچھی دلیلیں موجود ہیں۔ جہاں کہیں وہ اس امر کی تصدیق کر سکے اُسے کرنے دیجئے۔ اُسے اُس وقت تک کچھ نہ کہئے جب تک آپ خود کسی بات کی سچائی میں یقین نہ رکھتے ہوں اس کی سائنٹفک اسپرٹ کی نشو ونما کیجیے تاکہ جب کبھی ہو سکے وہ آپ کے دعوؤں کی تصدیق کر سکے۔ اس طرح آپ ایک ایسا انسان پیدا کرینگے جو صاحب عقل ہوگا۔ یہ بات انکے لئے ناممکن ہے جن کی پرورش گناہ کے اس تخیل پر ہوئی ہے جو جبری مذہبی امتناع پر مبنی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ عاقل انسان اس سارے اخلاقی آئین کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں جو کلیسا نے رائج کئے ہیں، تو اس آئین کی مٹی پلید ہے۔

ڈروں کی ایک اور قسم ہے جہاں خطرہ واقعی موجود ہے لیکن جسے کافی ہوشیاری سے دور کیا جاسکتا ہے۔ اس کی سیدھی سادی مثالیں جسمانی خطرے ہیں۔ مثلاً وہ خطرے جو پہاڑوں پر چڑھنے میں لاحق ہوتے ہیں۔ اور دوسرے بھی بہت سے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک اجتماعی ناپسندیدگی کے ڈر کو لیجیئے۔ یہ بالکل ٹھیک ہے کہ ایک آدمی گھوڑا اچڑا سکتا ہے حالانکہ دوسرا آدمی ٹٹی کیطرف بھی نظر نہیں ڈالے گا۔ اس فرق کیوجہ وہ خاص مزاجی رجحان ہے (شروع سے) دوسرے لوگوں کیطرف ہوا کرتا ہے وہ آدمی جو بھائی بندوں کے سامنے دوستانہ بے خوفی کے ساتھ آتا ہے وہ اپنے اس رویہ کی تصدیق نتائج سے کر سکے گا۔

وہ بچے جو کتوں سے ڈرتے ہیں اُن سے بھاگتے ہیں۔ اسی لئے کتا بھونکتا ہوا انکی ایڑیاں آلیتا ہے۔ برخلاف اس کے وہ بچے جو کتوں سے محبت کرتے ہیں، کتے بھی انہیں چاہتے ہیں۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ ہمارے رویہ کا بھی ایسا ہی حال ہے۔ اچھا نتیجہ مخالفت (ناپسندیدگی) کے مقابلہ میں ہمت کرنے سے نہیں نکلتا۔ وہ تو صرف خالص (سچی) دوستی اور اُسی کی توقع سے پیدا

ہوسکتا ہے۔

خطروں کی ایک اور تیسری قسم ہے جس سے الگ نہیں رہا جا سکتا بلکہ جو آدمی کے نقطۂ نظر کے مطابق خوفناکی اختیار کر لیتے ہیں۔ مالی خسارہ اس کی ایک مثال ہے۔ اکثر انسانوں کی زندگی کا بیشتر حصہ غربت کے ڈر سے ڈھکا رہتا ہے۔ سخت غربت، اُسی مزدور کی سی جس کے پاس کام نہیں، ایک خوفناک برائی ہے۔ اس کے مقابلہ میں وہ غربت ہے جس کا کھاتے پیتے تاجروں کو خوف رہتا ہے۔ اغراض اور رفراجوں کے غلط راستہ پر لیجانے سے یہ ایک بڑی برائی بن سکتی ہے۔

میں یہ کہنا ضروری نہیں سمجھتا کہ صرف ڈر کی عدم موجودگی ہی سے اچھا انسان پیدا ہو سکتا ہے بلا شبہ دوسری باتیں بھی ضروری ہیں۔ لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ ڈر سے نجات حاصل کرنا اہم مقاصد میں سے ایک ہے۔ عقلمندی سے تعلیم دینے سے، بمقابلہ اور دوسری اچھی خصائل کے، یہ آسانی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ڈر سے نجات ملنے سے جسمانی، اخلاقی اور ذہنی منافع حاصل ہوتے ہیں۔ مس مارگرٹ مک ملن اس بات کیطرف اشارہ کرتی ہیں کہ جن بچوں کو بار بار برا بھلا کہا جاتا ہے وہ ٹھیک طرح سے سانس نہیں لیتے۔ بمقابلہ دوسرے بچوں کے یہ بچے (adenoids) ناک کی بیماریوں کا آسانی سے شکار ہو جاتے ہیں۔ اور بہت سی مثالیں اس امر کے ثبوت میں دی جا سکتی ہیں کہ کس طرح ڈر سے تندرستی کو نقصان پہنچتا ہے۔ خصوصاً اسکا دخل ہاضمہ کے ساتھ مسلم ہے۔

ڈر سے جو اخلاقی نقصان پہونچتا ہے وہ اور بھی زیادہ اہم ہے۔ کچھ تو اس کی وجہ صحت کا نقص ہوتا ہے، جیسا کہ یہ اب مسلم ہے کہ اکثر خطرناک اخلاقی عیوب کا تعلق ہاضمہ کی حرکت سے ہے بمثال کے طور پر لالچ کو لیجئے۔ لیکن ڈر سے جو سب سے زیادہ اہم برائی پیدا ہوتی ہے وہ دنیا کے خلاف غصہ کا انداز ہے۔ جب آدمی اپنے ہم جنسوں سے ڈرتا ہے تو مدافعت کے لئے ردِ عمل اس طرح کرتا ہے جس طرح وہ اسوقت کریگا جبکہ کوئی اس کی آزادی نقل و حرکت میں دخل انداز ہو۔ جہانتک کہ جذبات کا تعلق ہے اس کے ردِ عمل کی یہ حالت ہوتی ہے لیکن اس کے چھپے ہوئے غصہ کا اظہار، کچھ حد تک، اس کے ڈروں سے ہوتا ہے اور وہ غیر شعوری طور پر کوئی محفوظ راستہ ڈھونڈ ہتا ہے۔ اسے یہ راستہ (ممکن ہے) مذہبی اور

اخلاقی سزا دہندگی، جنگ و جدل کی محبت اپنے بچوں پر ظلم کرنے، یا ان تمام کے مجموعے میں ملجاے۔ یہ ساری خباثتین، دس میں نو دفعہ، چھپے ہوئے ڈروں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

ذہنی طور پر بھی ڈر کے بڑے نقصان دہ نتائج ہیں۔ کسی غیر معمولی رائے کے ڈر سے انسان اپنے پڑوسیوں کی احمقانہ رایوں کے برخلاف نہیں سوچتا۔ پھر موت کا ڈر ہے جس کے باعث لوگ مذہبی معاملات پر سیدھا نہیں سوچتے۔ اور پھر اپنی راہ آپ ڈھونڈنے کا ڈر ہے جس کی وجہ سے لوگ اپنے فیصلہ کی تائید کے لئے کسی اور کی مثل تلاش کرتے ہیں۔ ڈروں کی مختلف شکلیں دنیا کی آدھی حماقت کی ذمہ دار ہیں۔ ڈر کا بڑا حصہ، جس سے عورتوں اور مردوں کو عمر بھر سابقہ پڑتا ہے، انکے بچپن کے شروع کے چھ سالوں میں جاگزیں کیا جاتا ہے۔ یا تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ بچوں کو نیک بنایا جائے یا وہ والدین کے ڈروں کا اثر ہوتا ہے۔ جہانتک میرا تعلق ہے میں اس نیکی، کی مطلق پروا نہیں کرتا جو ڈر پر مبنی ہے۔ میں ہر جگہ یہ چاہتا ہوں اور خصوصاً بچپن کی تعلیم کے زمانہ میں، کہ ایسے انسان بنائے جائیں جو اجتماعی تعاون کی ضرورت کے مطابق اہل ہوں۔ اُن اسباب کی بنا پر جنکا ڈر سے کوئی تعلق نہیں۔ میری رائے میں اخلاقی تعلیم کا اصل مسئلہ یہ ہے۔ یہ مسئلہ ناقابلِ حل نہیں۔ صرف تعصبوں کے بوجھ اور بے رحم روایت کی وجہ سے مشکل ضرور ہے۔

اشتراک؟

انسان کی جماعتی زندگی پر نظر ڈالئے۔ ہر طرف دو متضاد قوتیں کارفرما دکھائی دینگی۔ ایک قوت جوڑتی ہے دوسری توڑتی ہے۔ ایک باندھتی ہے دوسری کاٹتی ہے۔ ایک ملاتی دوسری جدا کرتی ہے۔ ایک وحدت ونظم کی طرف لیجاتی ہے دوسری کثرت وانتشار کی طرف۔ ایک محبت کی قوت ہے دوسری نفرت کی۔ ایک مثبت ہے دوسری منفی، ایک الٰہی ہے دوسری ابلیسی۔

ایک وہ ہے جس نے معنی ومفہوم سے خالی فرد کو جماعت میں لاکر بامعنی بنایا، فرد کے سینہ میں جماعتی زندگی کی لگن لگائی، آدمی کے بچہ کو اور سب جانداروں سے زیادہ اپنے والدین کا دست نگر بناکر۔ زبان، روایات، تمدن کا سرمایہ ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل کرایا اور ماضی کو مستقبل سے مربوط کیا۔ خاندانوں سے قبیلے اور قبیلوں سے قومیں بنوائیں۔ اور جب ملکوں کی حدود بھی تنگ معلوم ہوئیں تو مختلف ملکوں کے ہم نسل باشندوں کی وحدت پیدا کی، پھر اس تفریق کو بھی مٹایا اور عقاید کے اشتراک سے ملک ونسل کے امتیازات کو مٹایا۔ اور عقاید کے اختلافات کے باوجود ایک خالق اور ایک رب کو سب سے منوا کر بندوں کے انتشار کو آقا کی وحدت میں گم کردیا اور انسانی برادری کا تصور قائم کیا۔

دوسری وہ ہے جس نے ایک ہی آقا کے چاکروں سے باہم ایک دوسرے کی گردنیں کٹوائیں، جس نے قرونِ وسطیٰ کی ایک عیسائی دنیا کو درجنوں وطن پرست قوموں میں بانٹا، جو آج ایک عالم اسلامی کو ترک وعرب، افغان اور ایرانی میں تقسیم کررہی ہے، جس نے خود ان قوموں سے ہر ایک میں دو دو قومیں بنادیں، ایک امیر ایک غریب، ایک حاکم دوسری محکوم، ایک فاعل دوسری منفعل۔ جس نے خاندانی زندگی کے سکون اور وحدت کو عورت اور مرد کے "حقوق" کے چکر میں ڈال کر فنا کیا، جس نے جماعت کو افراد میں تحلیل کردیا، اور ایک قادر اور کافی بالذات فرد کا تصور پیدا کرکے جماعتی تعمیر کی تمام بنیادوں کو — ان کا نام مذہب ہو یا معیشت، فنون لطیفہ یا اخلاق — کھوکھلا کردیا۔

سماجی زندگی کے مطالعہ کرنیوالے کے لئے بڑی دشواری یہ ہے کہ صرف دوسری قوت ہی نہیں بلکہ پہلی بھی اپنے کو اکثر چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں ظاہر کرتی ہے۔ اس لئے کہ کل انسانیت بہ حیثیت ایک جسم کے بہت کم عمل پیرا ہو سکتی ہے۔ البتہ پہلی قوت کی بنائی ہوئی اور دوسری قوت کی مظہر جماعتوں میں روح و ذہنیت کے اعتبار سے زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ پہلی اگر ٹولیاں بناتی ہے تو اس لئے کہ اتحاد ہو سکے، دوسری اتحاد بھی کراتی ہے تو اس لئے کہ اختلاف شدید ہو جائے۔ ایک کی ویرانیاں آبادی کی خاطر اور دوسرے کی آبادیاں بھی ویرانی کے لئے ہوتی ہیں۔

ان قوتوں کے اثر سے جو جماعتیں بنتی ہیں وہ اپنے لئے یا اپنی قدر مشترک کے لئے کوئی نہ کوئی نام تجویز کرتی ہیں۔ یہ نام رواج پکڑتے ہیں اور بہتیرے انہیں بے سمجھے استعمال کرتے اور انکو طبقوں پر لکھ لکھ کر اپنی پیشانیوں پر لگا لیتے ہیں۔ بہت کم ہوتے ہیں جو ان ناموں کی تہ میں جو قوت کا اثر یا تیر اُسے تلاش کریں اور سمجھنے کی تکلیف اُٹھائیں۔ نادانی سے اچھے اور نادانی سے بُرے بنجانیوالوں کی تعداد دنیا میں بہت ہے۔ بے سمجھی سے ان ناموں کو استعمال کرنیوالے، اُن کے لئے جینے اور اُن کے لئے مرنیوالے، ان ناموں میں متضاد معانی کو اسطرح یکجا کر دیتے ہیں کہ اگر کوئی طالب علم ان کے مفہوم کو سمجھنے کی کوشش بھی کرے تو بڑی دشواری ہوتی ہے۔ انسانوں کے سینے خیر و شر دونوں کے جولانگاہ ہیں۔ ان کے اعمال و افکار بُرے ناموں میں اچھے معانی اور اچھے ناموں میں بُرے معانی پیدا کر دیتے ہیں۔ اُسی نام کو اچھے بھی لیتے ہیں بُرے بھی۔ اور وہ لوگ جنہوں نے ابھی اس نام کی چٹھی اپنے ماتھے پر نہیں چپکائی ہے حیرت سے منہ تکتے ہیں کہ یہ ہے کیا؟

"سوشلزم" اسی قسم کا ایک نام ہے۔

یہ نام یوں تو نیا ہے۔ شاید سب سے پہلے اٹلی کے ایک مصنف گیو لیانی نے اسے ۱۸۰۳ء میں استعمال کیا تھا۔ لیکن اس سے مفہوم تھا پروٹسٹنٹ مذہب کے مقابلہ میں کیتھولک مذہب۔ پھر شاید سین سیموں کے ایک مقلد ترانسیٹر نے ۱۸۳۲ء میں اسے استعمال کیا۔ لیکن نام نیا ہو، اسکا اطلاق تو پُرانی چیزوں، پرانی شخصیتوں اور تحریکوں پر بھی ہوتا ہے۔ کوئی "سوشلزم" کی اس نیم سرکاری تاریخ

کو اٹھا کر دیکھے جو کاؤٹسکی اور برن شٹائن نے شائع کی ہے تو حیرت میں رہجائے کہ آخر اس نام میں کیا کیا شامل ہے؟ اگر اس میں سماجی زندگی کے ابتدائی اشتراک املاک کا ذکر ہے تو فلاطون کی "ریاست" کا بھی۔ اسپارٹا کے دستور اساسی پر بھی نظر کی گئی ہے تو قدیم مسیحی جماعتوں کے 'اشتراک' پر بھی۔ رہبانوں کے اشتراک کا بھی ذکر ہے اور پیراگوئے میں جیسوئٹوں کی ریاست کا بھی۔ پھر اُس سب کی داستان بھی ہے جو انیسویں صدی میں اس نام سے دنیا میں ہوا۔ ان مختلف النوع مظاہر کو اس نام میں کیسے جمع کر دیا گیا ہے؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ محبت کا پیام لانیوالا مسیح اور نفرت کا دین پھیلانے والا کارل مارکس دونوں 'اشتراکی'، 'سوشلسٹ' ہوں؟ فلاطون اور بکارین دونوں پر ایک ہی نام کا اطلاق کیسے ہو گیا؟

سوشلزم کے مطالعہ کرنے والے کو سب سے پہلے یہی دشواری پیش آتی ہے۔ اس نام میں اسے خیر بھی ملتی ہے، شر بھی، نور بھی، تاریکی بھی، محبت بھی، نفرت بھی۔ اور متضاد طبائع کے انسان انہیں متضاد عناصر کی موجودگی کے دھوکہ میں اس نام کی چیپی اپنے ماتھے پر لگا لیتے ہیں۔ کوئی یہ چیپی لگا کر اپنے کو مسیح، اور فلاطون کے ساتھیوں میں سمجھتا ہے کوئی مارکس اور لینن کے ہمرکابوں میں۔

اس دشواری کو سوشلزم کے مستند مورخوں نے محسوس کیا ہے اور بڑے بڑے علما نے اس کی ایک تعریف بتانے سے اپنے کو قاصر بتلایا ہے مثلاً مشہور جرمن مصنف اسٹاملر اس سے معذوری ظاہر کرتا ہے کہ ان متعدد اور مختلف مظاہر ذہنی و جماعتی کے لئے جنہوں نے اپنے لئے اس نام کا استعمال کیا ہے کسی ایک تصور کا تعین کر سکے۔

اس میں شک نہیں کہ اگر مختلف سوشلسٹ نظریوں اور نظاموں کے تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھا جائے تو اسٹاملر کا یہ خیال بالکل صحیح ہے۔ لیکن اگر ہم اُن مادی نتائج اور خارجی مقاصد کو پیش نظر رکھیں جو سوشلزم اور اسکی متعدد اقسام کی امتیازی خصوصیت ہیں تو شاید ہم کوئی تصور قائم کر سکیں۔

دنیا میں لوگوں نے جب سے سیاسیات پر لکھنا شروع کیا ہے اُسی وقت سے یہ مسئلہ پیش پیش

ہے کہ انسانوں کی سماجی زندگی کے لئے سب سے اچھی اور سب سے مفید شکل کیا ہے۔ انہیں سے اکثر کا یہ خیال رہا ہے کہ ہر معقول سماجی نظام کے لئے کسی نہ کسی قسم کی طاقت بالادست لازمی ہے۔ بلا کسی قسم کے آئینی جبر کے ان لوگوں کے نزدیک سماج کا منظم ہو سکنا ممکن ہی نہیں۔ اس کے مقابلہ میں ایک مذہب اور ہے جس کے نزدیک سماجی زندگی کی بہترین صورت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب کسی قسم کا جبر آئینی نہ ہو نہ کوئی طاقت بالادست۔ آدمی بس اپنی مرضی سے باہم ملیں اور جب چاہیں سماج سے باہر ہو جائیں۔ اس مذہب کو نراج کہہ سکتے ہیں۔ اس طرح سماجی زندگی کی دو ممکن بنیادی شکلیں ہوئیں: ایک وہ جس میں جبر ہو، ایک وہ جس میں کسی قسم کا جبر نہ ہو۔

سماج کے جن نظاموں میں جبر کی جگہ ہے اُن کی بھی بہت سی قسمیں ہو سکتی ہیں۔ لیکن ہم نے چونکہ مادی نتائج اور خارجی مقاصد کو پیش نظر رکھنے کا فیصلہ کیا ہے اس لئے ان قسموں پر بھی اس نقطۂ نظر سے غور کرنا چاہیئے۔ مادی اشیاء کی فراہمی اور تقسیم کے لحاظ سے یعنی معاشی زندگی کے اعتبار سے ان جبری نظامہائے جماعت میں تفریق و تقسیم کی سب سے اہم وجہ مسئلہ املاک ہی۔ مختلف نظاموں نے بھی مختلف حل پیش کئے ہیں لیکن اصولاً دو قسمیں ہو سکتی ہیں: ایک تو وہ جبری نظام جنہیں املاک شخصی و انفرادی ہو، دوسرے وہ جنہیں املاک اجتماعی اور سماجی ہو۔

آج دنیا کے بڑے حصہ میں سماج کا جو نظام مقبول ہے وہ وہ ہے جس میں جبر آئینی کو تسلیم کیا جاتا ہے اور شخصی و انفرادی املاک کو سماج کی معاشی زندگی کی بہترین اساس مانا جاتا ہے۔ جبری نظام کی دوسری قسم یعنی وہ جسمیں ملکیت شخصی نہیں بلکہ اجتماعی ہو یا تو چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں پائی جاتی ہے یا اب روسی انقلاب کے بعد سے بڑے پیمانہ پر روس میں اس کا تجربہ کیا گیا ہی۔ لیکن روس کے تجربہ ہی کو اجتماعی نظام کی ایک ممکن شکل سمجھنا غلطی ہوگی۔ اصولاً و تاریخاً ایسے نظاموں کی جنہیں معاشی زندگی کی بنیاد مشترک جماعتی ملکیت ہے تین قسمیں کہی جا سکتی ہیں۔ جن لوگوں نے وقتاً فوقتاً رائج الوقت انفرادی و شخصی ملکیت کے نظام کے خلاف آواز اٹھائی ہے انہوں نے مندرجہ ذیل تین شکلوں میں سے ہی ایک شکل کو اسکی قائم مقامی کے لئے پیش کیا ہے۔ وہ

تین قسمیں ان ناموں سے معروف ہیں : (۱) سوشلزم (۲) کمیونزم (۳) زرعی سوشلزم۔ ذیل کی سطور میں ہم انکی مختصر سی تعریف کریں گے۔[1]

(۱) سوشلزم تو وہ مذہب ہے جس کے نزدیک پیدائش دولت و ثروت کے ذرائع و وسائل پر کسی شخص کی انفرادی ملکیت کا حق تسلیم نہیں کرنا چاہئے! اس لئے کہ ایک تو یہ پسندیدہ نہیں اور دوسرے سماجی زندگی جس طرز اور رفتار سے ارتقار کے منازل طے کر رہی ہے اُس کا لازمی نتیجہ بھی یہی ہے کہ ان وسائل دولت آفرینی پر سے شخصی املاک کا حق مٹ جائے۔ ہر شخص جانتا ہوگا کہ وسائل و ذرائع دولت آفرینی سے مراد وہ مادی چیزیں ہیں جنسے انسانی ضروریات کو پورا کرنے کی دوسری مادی چیزیں تیار کرنے میں مدد ملے۔ اسمیں تمام زمین آجاتی ہے، تمام صنعتی اوزار۔ اور کلیں آجاتی ہیں، کارخانے، مشینیں، اجناس خام، اجناس نیم خام سب اس کے تحت میں آتے ہیں۔ ہمارے رائج الوقت نظام معاشی میں ان چیزوں پر افراد کا تصرف ہے۔ سوشلزم چاہتا ہے کہ یہ تصرف افراد سے لیکر جماعت کے سپرد کر دیا جائے۔ جماعت میں کوئی فرد ایسا نہ ہونا چاہئے جو کہہ سکے کہ یہ کھیت میرا، وہ کارخانہ میرا۔ ان تمام وسائل دولت آفرینی پر ملکیت کا حق ہیئت اجتماعی کو منتقل ہو جانا چاہیئے اس کا نام ریاست ہو یا اور کچھ۔ لیکن سوشلزم انفرادی و شخصی ملکیت کو صرف وسائل دولت آفرینی پر سے ہٹانا چاہتا ہے۔ شخصی صرف کی چیزوں پر سے نہیں۔ سوشلزم کے متعلق یہ سمجھنا غلطی ہے کہ اس میں کسی قسم کی شخصی آمدنی کو روا نہ رکھا جائے گا۔ ہاں سوشلزم یہ نہیں گوارا کرتا کہ صرف بعض مادی اشیاء پر حق ملکیت رکھنے کی وجہ سے کسی فرد کو کوئی آمدنی حاصل ہو۔ لیکن وہ کام کے ذریعہ آمدنی حاصل کرنے اور اُسے اپنی مرضی کے مطابق اپنی ضروریات رفع کرنے کے لئے صرف کرنے کا مخالف نہیں۔

(۲) کمیونزم سوشلزم سے ایک قدم آگے جاتا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ شخصی ملکیت

---

[1] ان تصورات کو جدا جدا پیش کرنے اور واضح کرنے کی خدمت علم المعیشت کے لئے جرمنی کے مشہور راستاد کارل ڈیل نے انجام دی ہے۔

صرف وسائل دولت آفرینی ہی پر سے نہ ہٹ جائے بلکہ اشیاء استعمال و صرف پر بھی کسی کو شخصی و انفرادی ملک حاصل نہ ہو۔ سوشلزم کی رو سے تو ایک فرد اپنے کام کے معاوضہ میں جو آمدنی حاصل کرے اسپر خود تصرف رکھتا ہے اور اُسے اپنی حاجتیں رفع کرنے میں جسطرح چاہے استعمال کر سکتا ہے۔ دن میں آٹھ گھنٹے کام کرنے کے معاوضہ میں اُسے جو مزدوری ملی ہے اُس سے وہ چاہے تو معمولی کھانا کھا کر اچھے اچھے کپڑے پہن سکتا ہے، یا زردہ پلاؤ کھا کر پھٹے پرانے کپڑوں پر اکتفا کر سکتا ہے۔ جو کچھ بچے اُس سے چاہے تو کتابیں خریدے، چاہے سگریٹ؛ اُس کا جی چاہے تو ٹکٹ خرید کر کسی بڑے عالم کا لکچر سنے چاہے ٹکٹ خرید کر بڑے سے بڑے سینما اور تھیٹر میں جا بیٹھے۔ غرض اپنی محنت کے معاوضہ کو جن چیزوں سے چاہے بدل لے۔ لیکن کمیونزم اس کو روا نہیں رکھتا۔ اس کے یہاں صرف کارخانے اور زمین مشینیں اور اوزار ہی شخصی تصرف سے نکالکر جماعت کے سپرد نہیں کئے جاتے بلکہ جماعت ہی کو یہ طے کرنے کا حق بھی ہے کہ افراد کو کھانے کے لئے کیا اور کتنا پہننے کو کیا ملے، تفریح کے کیا سامان ہوں وغیرہ وغیرہ۔ یعنی سوشلزم اگر ذرائع کار پر سے شخصی ملکیت کو ہٹاتا ہے تو کمیونزم اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ "نتائج کار" پر سے بھی اسکو ہٹانا چاہتا ہے۔

(۳) زرعی اشتراک۔ جہاں کمیونزم شخصی ملکیت کو مٹانے کے بارے میں سوشلزم سے ایک قدم آگے جاتا ہے وہاں زرعی اشتراک سوشلزم سے ایک قدم پیچھے رہنا چاہتا ہے۔ سوشلزم اگر تمام ذرائع دولت آفرینی کو جماعت کے ہاتھ میں دینا اور افراد سے چھین لینے کا طالب ہے تو زرعی اشتراک تمام ذرائع دولت آفرینی میں سے صرف ایک کو یعنی زمین کو اس غرض کے لئے علیحدہ کر لیتا ہے اور چاہتا ہے کہ زمین پر کسی فرد کو شخصی ملکیت کا حق تسلیم نہ کیا جائے۔ باقی دوسرے ذرائع دولت آفرینی خوشی سے شخصی ملکیت میں آ سکتے ہیں۔

خارجی نتائج اور مادی مقاصد کے اعتبار سے تو ہم نے ہیئت اجتماعی تعمیر نو کے مندکرہ بالا تین نظریوں کو پیش کر دیا۔ لیکن جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں انمیں سے ہر ایک کے عالم وجود میں آنے اور فروغ پانے کے وجوہ ایک سے نہیں ہیں۔ یہ نہیں کہ اگر ہم نے سوشلزم کی ایک تعریف کر دی،

تو ہر اشتراکی نظام کی تہ میں ایک ہی سے فلسفیانہ تخیلات ' ایک ہی سی روح کارفرما ہے۔ نتیجہ ایک سہی لیکن نیت ایک نہیں۔ مختلف الخیال، مختلف المزاج لوگ اگر اس مقصد کے لئے ساعی نظر آتے ہیں تو مختلف محرکات ہیں جو انہیں اس پر آمادہ کرتے ہیں۔ لہذا ان نظریوں کے فہم کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم ان مختلف خیالات اور محرکات میں بھی اپنے لئے کوئی ترتیب پیدا کرلیں جن سے اشتراک 'کمیونزم' یا نراج وغیرہ پیدا ہوتے ہیں۔ ذیل کی سطور میں ہم سوشلزم کی بابتہ یہ کوشش کریں گے۔

اپنے بنیادی محرکات اور فلسفیانہ اساس کے اعتبار سے ہم تمام اشتراکی نظاموں کو دو انواع میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ (۱) تصوری اشتراک (۲) ارتقائی اشتراک۔

'تصوری' اشتراک والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو کسی 'تصور' کسی مطمح نظر' کی خاطر مشترک ملکیت کے خواہاں ہیں۔ اس خیال سے کہ اس 'تصور' اس 'عین' کی تکمیل ان کے نزدیک ' اشتراکی جماعت ہی میں ممکن ہے۔ یہ اشتراک کے طالب مثلاً اس لئے ہیں کہ عدل کا تصور دنیا میں مکمل طور پر پورا ہو' یا مساوات عین کی فرمانروائی ہوجائے ' یا 'اخوت' کا دور دورہ ہو۔ یا اسی قسم کے کسی اور تصور کی تکمیل ممکن بنائی جاسکے۔ چنانچہ یہ اشتراکی اپنے مخصوص مطمح نظر کو سامنے رکھکر ایک نظام بناتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ جماعت اس نظام کو منوائیں۔

ارتقائی اشتراک والے کسی تصور کے قائل نہیں' کسی عین کے دلدادہ نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم چاہتے کچھ نہیں، ہمارا مطالبہ کچھ نہیں' ہم تو جو جانتے ہیں وہ بتاتے ہیں۔ ہم یہ کچھ نہیں کہتے کہ کیا کرو' ہم یہ سناتے ہیں کہ کیا ہوگا۔ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ خواہش اور رائے کا معاملہ نہیں۔ تم چاہو نہ چاہو اشتراکی نظام جماعت آکر رہے گا۔ جسطرح ہمارے گردو پیش کی مادی اشیار پر قدرت کے قوانین عمل پیرا ہیں اسی طرح جماعتی زندگی بھی قوانین نشو و ارتقا کی پابند ہے اور ان کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اشتراکی نظام قائم ہو۔

تصوری اشتراک کی اگر دو بڑی بڑی تقسیمیں کریں تو ایک مذہبی کہلائیگی دوسری اخلاقی۔ اوّل الذکر اپنے تصورات مذہبی دنیا سے لیتا ہے اور ایک اشتراکی نظام کا مطالبہ اس لئے کرتا ہے کہ

بلا اس کے خاص قسم کی مذہبی زندگی ناممکن ہے۔ اسکے حامیوں کا خیال ہے کہ مذہبی زندگی کے کامل نشو و نما کے لئے ایسا نظام جماعتی ہی کام دے سکتا ہے جسمیں شخصی املاک نہ ہو۔ خصوصاً عیسائی مذہب میں اس قسم کے بہت سے عناصر ہیں جو اشتراکی زندگی کی طرف لیجاتے ہیں۔ تاریخ میں متعدد مثالیں ایسے عیسائی فرقوں کی موجود ہیں جنہوں نے چھوٹے یا بڑے پیمانہ پر اشتراکی زندگی کا نظام قائم کیا۔ آج بھی امریکہ میں متعدد نوآبادیاں بعض عیسائی فرقوں کی موجود ہیں جنمیں اشتراک املاک پر عمل ہوتا ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ اشتراکی تجربوں میں اگر کامیابی ہوئی ہے تو انہیں مذہبی جماعتوں کو۔

اخلاقی اشتراک وہ ہے جو کسی نہ کسی اخلاقی قدر کو دنیا میں مکمل اور رائج کرنے کے لئے اشتراک املاک کا نظام پیش کرے۔ یہ اخلاقی قدریں بہت مختلف ہوسکتی ہیں اور اس اعتبار سے اخلاقی اشتراک کی بہت سی قسمیں ہیں لیکن اصولاً یہ انہیں دو قسموں میں رکھہ سکتے ہیں۔ ایک وہ جسمیں جماعتی اصول پیش نظر ہو ایک وہ جسمیں انفرادی اصول کو سامنے رکھا جائے۔

جماعتی اصول سے مراد یہ ہے کہ نظام جماعت کی ترتیب میں فرد کو کل میں جزو کی، جسم میں عضو کی حیثیت دیجائے۔ مقصود کل کی فلاح ہو اور جسم کی صحت نہ کہ کسی فرد کی بہبودی یا کسی عضو کی ترقی۔ یہاں افراد کو بہت سے 'حقوق' دیکر خوش کرنا مقصود نہیں ہوتا بلکہ افراد سے بالاتر 'جماعت' یا 'ریاست' کے نشو و نما اور ارتقا کو پیش نظر رکھنا ہوتا ہے۔ اسی اصول کے ماتحت فلاطون نے اپنی مشہور کتاب 'ریاست' لکھی ہے۔ یہی اصول اسکی دوسری تصنیف 'قوانین' میں اسکی سامنے ہے۔ ان تصانیف نیز دیگر یونانی فلسفہ کی تعلیمات کے اثر سے 'ریاست' یا 'جماعت' کو کائنات مفصل اور اور افراد کو کائنات مجمل سمجھا جانے لگا۔ افراد کی طرح 'ریاست' کی بھی ایک 'شخصیت' تسلیم کیگئی اور افراد کو اس شخصیت کا خادم مانا گیا۔ اس نظریہ میں انسان کے حقوق کی جگہ اس کے فرائض سے پر ہوتی ہے اور یہ فرائض تمامتر جماعت کی خدمت گزاری سے عبارت ہوتے ہیں۔ ہر وہ چیز جو فرد کو اس خدمتگزاری سے روکے اس نظریہ کی رو سے عیب ہے اس لئے یہ ایسی چیزوں کو مٹانا چاہتا ہے۔ شخصی ملکیت چونکہ اس خدمت گزاری کی راہ میں سب سے بڑا پتھر ہے اس لئے اسکا ہٹانا بھی ضروری ہے۔

اسی مذہب کے ماننے والے لوگوں نے اشتراک ازدواج وغیرہ کی تجویزیں بھی پیش کی ہیں۔ متاخرین میں اس مذہب کا مشہور پیامبر جرمن اشتراکی راڈبرٹس ہے۔

اس کے بالکل مخالف انفرادی اصول ہے۔ اسکی بنیاد افراد کے حقوق پر ہے۔ جماعت یہاں افراد کی بنائی ہوئی اور ان کے فائدہ کے لئے ہے۔ ان سے افضل اور اعلیٰ نہیں۔ یوں تو یہ اصول بھی شاید اتنا ہی پُرانا ہو جتنا خود انسان لیکن اسکو ترقی ہوئی۔ جدید آئین فطری کے نظریہ سے جسکی بنیادیں سب سے پہلے گروٹئس نے ۱۶۲۵ء میں استوار کیں۔ اسی نے انسان کے ازلی اور فطری حقوق کی صدا اُٹھائی۔ روسو نے اس آئین فطری اور حقوق ازلی کے نظریہ کو اور آگے بڑھایا۔ اور جماعت کو افراد کے معاہدہ پر مبنی بتلایا۔ روسو نے انسانی حریت اور مساوات کے اس نظریہ سے مساوات سیاسی کے مطالبہ کو تقویت دی۔ اور بعد کو انفرادی اصول والے اشتراکیوں نے اسی کی بنا پر مساوات املاک کا مطالبہ پیش کیا۔ اس مذہب کے اشتراکی شخصی املاک کو اس لئے مٹانا چاہتے ہیں کہ ہر فرد کو املاک پر اپنا اپنا مساوی حق حاصل ہو جائے۔ اور تقسیم دولت کی موجودہ عدم مساوات مٹ جائے۔

اخلاقی اصولوں کی بنیاد پر اشتراکی نظام کے مؤیدین کے مقابلہ میں ایک ارتقائی مذہب ہے۔ جو کسی قدر جماعتی کا دلدادہ نہیں۔ کسی اصول کا شیدائی نہیں۔ یہ 'حکما' کا گروہ ہے جو دنیا کی رفتار اور جماعت کے ارتقاء کو سمجھنے کا مدعی ہے۔ اور سمجھتا ہے کہ وہ "آرزوؤں" کے سراب سے نکلکر "حکمت اور علم" کی محکم چٹان پر پہونچ گیا ہے۔ یہ صرف یہ پیشین گوئی کرتا ہے کہ جماعتی نشو و ارتقا کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ نظام اشتراکی قائم ہو جائے۔

اس مذہب میں بھی دو فرقے ہیں ایک ڈارونی فرقہ اور دوسرا مارکس اور انگلس کا۔ ڈارونی فرقہ تو جماعت انسانی پر ماحول فطری کے تمام قوانین کو عاید کر دیتا ہے۔ اور مدعی ہے کہ تمدن انسانی بھی اپنے ارتقا میں تطبیق، توارث، اور تنازع للبقا کے حیاتیاتی قوانین کا اتنا ہی پابند ہے جتنی کہ غیر انسانی دنیا۔ سرمایہ داری کا نظام دراصل اس کشمکش حیات میں رکاوٹ ڈالتا ہے جو

ترقی انسانی کے لئے ضروری ہے۔ یہ صرف تجارتی مقابلہ کا موقع دیکر بجائے ترقی کے جماعتی تنزل پیدا کر رہا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ پیدائش دولت میں مقابلہ کے مواقع پیدا کئے جائیں اور یہ اسی طرح ممکن ہے کہ ہر کام کرنیوالے کے پاس پیدائش دولت کے ذرائع بھی موجود ہوں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ذرائع دولت آفرینی چند اشخاص کی ملکیت نہ ہوں بلکہ جماعت کے تصرف میں ہوں جو سب افراد کو ان کے استعمال کا موقع دیسکے۔ اس مذہب کا ممتاز معلم دو لتمان ہے۔

دوسرا ارتقائی فرقہ مارکس اور انگلس کا ہے۔ یہ لوگ ڈارون کے حیاتیاتی نظریہ ارتقا کو تو جماعتی زندگی پر نہیں لگاتے، لیکن انہوں نے تمدن انسانی کے نشوو ارتقا کے بعض قوانین خود بنائے ہیں۔ جو ان کے مادیاتی نظریہ تاریخ کی شکل میں علمی دنیا کے سامنے ہیں۔ عملی دنیا میں سب سے زیادہ فروغ اسی آخری فرقہ کو ہوا ہے۔ اس کے اشتراکی اسی فرقہ کے لوگ ہیں۔ یورپ کے ہر ملک میں مارکس کی ملت موجود ہے اور بڑھ رہی ہے۔ خود ہندوستان میں مارکس روشی کے نام لیوا پیدا ہونے لگے ہیں۔ اس مذہب کے پیدا ہونے کے اسباب، اس کی نشوونما، اس کے فلسفہ کے پیچ، اس کی حکمت کے فریب، انکی تاثیر کا راز یہ سب ایسے مباحث ہیں جنپر اسوقت بحث و نظر ہمارے ملک کے لئے بہت ضروری ہے لیکن یہ تفصیل کے طالب ہیں اسلئے ہم اس مضمون میں اس فرقہ پر زیادہ نہیں لکھتے۔ انشاءاللہ آیندہ مفصل بحث کرینگے۔

ذیل میں قارئین کرام کی سہولت کے لئے اس مضمون کے مطالب کا خلاصہ ایک نقشہ کی شکل میں پیش کر دینا غالباً مفید ہوگا:۔

نظامہائے جماعت
- مع جبر آئینی
  - انفرادیت
  - اجتماعیت
    - سوشلزم
    - کمیونزم
    - زرعی اشتراک
- بلا جبر آئینی
  - نراج

سوشلزم
تصوری سوشلزم
ارتقائی سوشلزم
مذہبی سوشلزم
اخلاقی سوشلزم
ڈارونی سوشلزم
مارکس اور انگلز کا سوشلزم
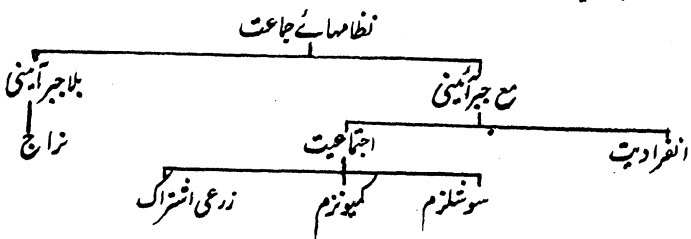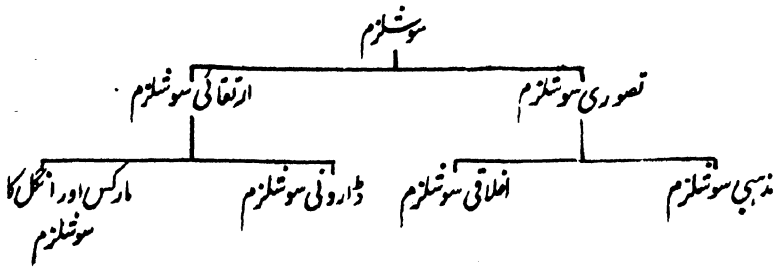
عراق عرب

مسٹر جے' ایم' بالفور نے جو دولتِ ایران کے نائب مشیر مالیات رہ چکے ہیں اپنے قیام ایران کے زمانے کے مشاہدات' تجربات اور دیگر معلومات پر ایک کتاب (" تازہ شیون ایران") لکھی ہے۔ مسٹر موصوف کا زمانۂ ملازمت جنگ عظیم کے اواخر سے شروع ہوتا ہے۔ کتاب سنہ ۱۹۲۱ء کے اختتام کے ساتھ ختم ہوتی ہے اسلئے کہ اُس کا دیباچہ مسٹر بالفور کے قلم سے فروری سنہ ۱۹۲۲ء میں نکلا ہے۔ مسٹر بالفور لارڈ بالفور کا ہمقوم ہے لیکن غالباً آخر الذکر بالفور کے نقطۂ نظر سے اول الذکر بالفور اپنے ملک و ملت کا ایک ناخلف فرزند ہوگا جسکی " اولین جنبش قلم " سے ایسی کتاب نکلی۔ بیچارے مسٹر بالفور کو خود بھی اپنے اس " ننگ قومی " کا احساس واعتراف ہے' چنانچہ دیباچہ کے صفحات میں اس کا علانیہ اظہار ہے۔ لکھتا ہے:

ملک کے اندر اس عقیدۂ سیاسی کا ایک " مکتب' موجود ہے جس کا یہ خیال ہے کہ ارکانِ حکومت واکابر سیاست کی غلطیوں کا اعلان کرنا ارتداد و الحاد سے کچھ ہی کم ہے۔ بڑے لوگوں کی غلطیاں اگرچہ " محفل خاص " کے اندر افسانۂ بزم و انجمن ہوا کرتی ہیں لیکن عوام الناس کے سامنے ان کو بے نقاب کرنا سخت مخدوش بات ہے۔ وہ واقفکار لوگوں کے درمیان ایک رازِ سربستہ کا احترام رکھتی ہیں' اوران پر بے لاگ تنقید مفاد عامہ کے خلاف ہے اور مصالح سلطنت کے منافی۔ لیکن میں اس " دستور زبان بندی " کا قائل نہیں ہوں۔ بخلاف ازیں میرا خیال یہ ہے کہ غلط کار لوگوں سے تعرض نہ کرنا ان کی ہمت افزائی کرنا ہے اور مزید مفاسد کی دعوت دینا۔ نہایت ضروری ہے کہ کلمۂ حق بلند کیا جائے تاکہ جو لوگ حکومت کی مسندوں پر قابض ہیں وہ ایک فریب خوردہ پبلک کی غلط بخشت پناہی سے محروم ہوجائیں اور ملک کو ان

خطرناک ارباب حل و عقد سے نجات لے۔ سیاست خارجہ کے بہت سے میدانوں میں اس تلافی مافات سے آخری و انقطاعی حوادث کا سد باب ہوجائیگا۔ محاربہ عظیم نے اس تعاقب جمہور کو فرائض مؤکدہ بنا دیا ہے۔ ان ایام میں بڑے بڑے ناخدایان کشتی سلطنت نے خطرناک چٹانوں سے تصادم کرائے ہیں اور مشکل سے اُن کے ہاتھ اب اس قابل رہے ہیں کہ زمام حکومت سوزان کی انگلیوں میں رکھی جائے۔ ایران کے اندر اس بے راہ روی سے جو نقصان پہونچا ہے اس کا کوئی نعم البدل اور علاج اب ممکن نہیں۔ ہندوستان، مصر، عراق عرب اور فلسطین اسی تیز خرامی سے پامال ہو رہے ہیں اور جلد یا بدیر یہاں بھی کم و بیش ایسا ہی حشر ہونیوالا ہے۔ پس ان حالات نے مجھکو لب کشائی پر مجبور کیا اور میرا یہ مضبوط اعتقاد ہے کہ ان معاملات میں خاموش رہنا ایک مجرمانہ سکوت ہوگا اور ملت و سلطنت کی خیانت!"

اس احساس ذمہ داری و فرض شناسی کے ساتھ مسٹر بالفور نے یہ کتاب لکھی ہے اِتّا رئین کرام کے لئے یہ توقع کرنا بالکل قدرتی ہوگا کہ مصنف موصوف نے برطانوی و دیگر دول متعلقہ کے خداوندان سیاست کی بڑی بڑی دسیسہ کاریوں کے ورق کھولے ہونگے اور نیز ایران کے متعلق ایک عینی شاہد اور بالغ نظر ناظر کی حیثیت سے جو حالات سپرد قلم کئے ہوں گے وہ اس تقریباً مجہول الحال ملک پر درجہ اول کی روشنی ڈالتے ہوں گے۔ بلاشبہ ایسا ہی ہے اور بدرجۂ نہایت ایسا۔ چنانچہ اپنی صاف گوئی اور حق بیانی کے اقتضا سے اُن کو خود اہل ایران کے متعلق بعض تلخ حقائق کا اظہار کرنا پڑا ہے جس کے لئے وہ بجا طور سے اُس درگذر کے مستحق ہیں جس کی التماس انہوں نے اپنے ان ایشیائی میزبانوں سے کی ہے۔

مسٹر بالفور کی کتاب جو بقول اُن کے "اُنکی پہلی اور شاید آخری تصنیف" ہے اور جو انہوں نے محض مصنفانہ شوق رقمطرازی کے داعیات کے ماتحت نہیں لکھی ہے بلکہ صرف عرض حقیقت کی خاطر (بلا شائبہ عرض ہنر)، تین سو صفحے کی کافی ضخیم کتاب ہے جس میں انہوں نے ملک ایران

کی تاریخ سیاسیات اور بالخصوص مسائل مالیات کے تمام ضروری عنوانات سے بحث کی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس صحبت میں اس کے آخری باب کے مطالب کا ایک حصہ ناظرین کے سامنے پیش کریں جس میں مشرق وسطیٰ کے بعض ممالک خصوصاً عراق عرب کے مطلع سیاسی کا "نظارۂ طائرہ" آگیا ہے۔ ہم نے بجائے لفظی "ترجمہ" کے مصنف کے مفہوم کی "ترجمانی" کا اصول پیش نظر رکھا ہے۔

عراق میں قدم رکھتے ہی میرا پہلا احساس یہ تحیر تھا! اور جیسا کہ واقعہ ہے کہ یہ احساس ہر ناظر کے ساتھ مشترک رہا ہے، کہ کسی سلطنت کو عراق جیسے ملک میں قدم رنجہ فرمانیکی روئے زمین پر کونسی چیز دعوت دےسکتی ہے! دوسری بات جس نے میرے تخیل کو مس کیا اُس نظر باز سپاہی کا قول تھا جس نے عراق کے منظر وحشت وہلاکت کا مشاہدہ کرکے کہدیا تھا کہ "انگریزوں کو اُن کے اس مقبوضہ سے نکال باہر کرنیکے لئے کسی جوابی حملہ آور کی شمشیر آتشیں کی ضرورت نہ ہوگی!" عجیب تر یہ ہے کہ برطانیہ اس فضولکاری اور تباہ کاری پر بُری طرح مُصر ہے اور اس حماقت آمیز اور ناعاقبت اندیشانہ فعل کو شرف مُداومت عطا کرنے پر تُلی ہوئی ہے!

اوائل جنگ عظیم میں جن مقاصد نے عراق عرب کی پہلی فوجی مہم کو ضروری بنایا تھا اُن کی معقولیت کو بآسانی تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ایرانی چشمہاے روغن گل کی حفاظت اشد ضروری تھی، نیز خلیج فارس کی بحری کمینگاہ سے جرمنوں اور ترکوں کو محروم کردینا بھی ایک اہم جنگی پیش بینی پر مبنی تھا۔ مگر بصرہ اور اُس کے حوالی کے قبضہ نے ان ہر دو معلوم ومشہور مصالح کی کافی ضمانت کردی تھی۔ لیکن اس کے بعد "بڑھاؤ تام جام" کے اصول پر بغداد کی تسخیر اور سارے ملک کی فتح اور تصرف کی جو غایت اور مصلحت تھی وہ ایک راز سربستہ ہے! کہا گیا تھا کہ بصرہ کے قبضہ نے دشمن کو چھیڑ دیا تھا اور اُسکی جوابی یورشوں کے سد باب کے لئے ضروری تھا کہ ہم ساحل سے ذرا آگے بڑھکر کسی ایسے عسکری مرکز پر گرفت حاصل کرلیں جہاں سے غنیم کے خطرات سے مامون ہوجائیں لیکن دنیا جانتی ہے اور برطانوی افواج کے ذاتی تلخ تجارب ہیں کہ ہم نے اس "علاج بالمثل" سے اپنے مصائب وافکار کو المضاعف کرلیا! اس راز کا اصلی حل میری تشخیص میں یہ ہے کہ ہمارے بعض نوآمیز اور شوقین اہل حرب اس بات کے بہت مشتاق تھے کہ اصل مرکز جنگ سے ہٹکر غیر اہم اطراف میں اپنے ہتھیاروں کی یکہ نظر فریب نمائش کردیں تاکہ قلب رزمگاہ میں ہمارے

سینہ پر جو ضربیں پڑی ہیں اُن کی قدرے اشک شوئی ہو جائے! پس بغداد کی فتح محض ایک "انعطاف توجہ" والی حرکت سے زیادہ کوئی وقعت نہ رکھتی تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہمارے دفتر جنگ کے ناآشنائے جغرافیہ وتاریخ ارکان کی اُن حسین خوابوں کے اندر عراقی مہم کا خاکہ کھینچا گیا ہو جنہیں بغداد کا مرقع الف لیلہ کے افسانوں کو سنکر چشم تصور کے سامنے آیا ہو اور لندن کے رہنے والے، ہارون الرشید اعظم کی عروس البلاد (بغداد) کا فاتحانہ نظارہ کرنا چاہتے ہوں اور اس حقیقت کو بالکل فراموش کر گئے ہوں کہ بغداد اور "بہشت شداد" کی بہاروں کو دست برد زمانہ کی خزانی ہواؤں نے ایک "عالم ہو" میں تبدیل کر دیا ہے!

سامراجی مقاصد کو اس معاملے سے کوئی تعلق نہ ہو سکتا تھا، اس لئے کہ اس سلسلہ میں جو کچھ ضروری تحفظات تھے وہ بصرہ کے قبضے سے حاصل ہو گئے تھے۔ اس نواح میں زیادہ پانوں پھیلانیکا ایک ہی نتیجہ ہو سکتا تھا اور وہ یہ کہ اس سے ہمارے لئے ایک آیندہ "فصل مشکلات" کی تخم ریزی ہو جائے۔ عراق عرب پر ہمارا دخل ترکی اور عرب باشندوں دونوں کے لئے ایک وجہ اشتعال تھا۔ اسمیں ایک مذہبی اہانت کا پہلو نکلتا تھا اور یہ چیز وسطی اور مغربی ایشیا کے ممالک میں جہاں مذہبی حسیات و جذبات بہت اہم عنصر ہیں ایک مخدوش مادہ آتشگیر ہو سکتی تھی۔

اس سمت میں برطانوی مصالح کبھی رونما نہیں ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عراق مسٹر ونسٹن چرچل کی سیاسی تفریح بازیوں کے لئے ایک دلچسپ بساط ہے! کم ازکم وزیر ممدوح کی جدت طبع اور ندرت تخیل کا ثبوت یہ اسکیم ضرور ہے، لیکن جہاں اُس کی اس قابل داد خوبی سے انکار نہیں وہیں کچھ غیر مشتبہ علامات اس حقیقت مخفی کے بھی پائی جاتی ہیں کہ ان خوابوں کی "نقشہ بندی" میں مسٹر ہیتھ راٹمسن کے دل و دماغ کو بھی کافی دخل رہا ہے!

ہم کو یہ تاریخی حقیقت بتائی گئی ہے کہ دجلہ و فرات کا دوآبہ ایکوقت میں دنیا کا غلہ کا گودام تھا اور یہ کہ وہ بہت آسانی سے اپنی یہی عالمگیر اقتصادی حیثیت دوبارہ اختیار کر سکتا ہے۔ پہلی بات کے تسلیم کرنے سے کسی کو انکار نہیں لیکن دوسرے جملے میں جو بیباکانہ اعلان کر دیا گیا ہے وہ ہمارے ارباب حل و عقد کی طفلانہ آسان پسندی کا ایک دلچسپ مظہر ہے۔ بیشک عراق دنیا کے رزق کا مخزن پھر بن

سکتا ہے لیکن یاد رہے کہ ساتھ ہی وہ ایک "کان زر" کا مطالبہ بھی کریگا! معلوم ہونا چاہئے کہ اقوام عالم میں برطانیہ ہی تنہا وہ ملک نہیں ہے جو عراق عرب کے زرعی امکانات کا "عرفان" رکھنے کا مدعی ہو۔ شاید لوگوں کو یہ سنکر کسی قدر غیر مطبوع قسم کا استعجاب لاحق ہو کہ ترک بھی اس مسئلہ میں پوری بیداری کا ثبوت دیکھچکے ہیں! چنانچہ قبل ازیں ترکی حکومت نے ایک ممتاز ماہر و انجنیر کا تقرر اسی غرض سے کیا تھا کہ وہ عراق کے "احیاء ثانیہ" کے بارہیں اپنی آراء و سفارشات پیش کرے۔ چنانچہ جو رپورٹ گذری وہ یہی تھی کہ یہ مہم بالکل معقول اور ممکن العمل ہے، بشرطیکہ اس کام کے لئے وہ زر خطیر پہلے سے فراہم کرلیا جائے جو ناگزیر ہوگا۔ اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی تو جو تخمینہ تیار کیا گیا تھا وہ قریب قریب چالیس ملین تھا اور اگر ان غیر متوقع ضروریات و اخراجات کو بھی محسوب کرلیا جائے جو ایسی عظیم الشان عزائم میں ہمیشہ پیش آیا کرتی ہیں تو اصلی مصارف کی میزان کل پچاس ملین سے کم نہوگی۔ ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ کیا ضرور ہے کہ کل کام کو بدفعۃ واحدہ ہاتھ میں لے لیا جائے۔ ایسا کیوں نہ ہو کہ بالاقساط اسی خاکہ کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کام کی عملی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ وہ اس تقسیم کے اصول کو قبول نہیں کریگا۔ ملک کے طول و عرض میں ریگستان اور دلدلیں پائی جاتی ہیں اس لئے آبپاشی اور اخراج آب کے مسائل کی بنا پر کام کا جزو اعظم بیک گردش عمل ہی انجام دینا پڑے گا۔ پھر آج جو تخمینہ اخراجات نبیگا اس کے اعداد و شمار دیکھنا چاہئے کہ کیا ہونگے! کم از کم ترکونکے تخمینہ کو دوچند تو کردینا چاہئے! اور اس اندازمیں قطعاً کسی مبالغہ کا شائبہ نہ سمجھنا چاہئے۔ تو اب سو ملین کی رقم وہ رقم ہے جسکی اس جیسے یکسوئی طبع اور فراغت معاش والے کام کیلئے بہم رسانی حکومت عراق اور انگلستان ہر دو کیلئے کالے دارد کا مضمون ہے، بظاہر حالات اس مجموعی تعداد کی ایک کسر کی دستیابی کی بھی مستقبل قریب میں دور تک کوئی امید نظر نہیں آتی۔

بفرض محال اگر اس کو مان بھی لیا جائے کہ مالی مسئلہ حل ہوجائیگا تو آگے بڑھکر پھر یہ کام مشکلات کی بہت سی لاعلاج منزلیں رکھتا ہے مثلاً مصارف کے بعد مزدوری کا مرحلہ آتا ہے۔ عراق کے اندر وہ آدمی کہاں مل سکینگے جو نئی برآوردہ شدہ آراضیات کا تردد کریں گے! ملک کی کل مردم شماری تین ملین نفوس پر مشتمل ہے اور اس آبادی کا وہ حصہ جو زراعت پر بسر اوقات کرتا ہے پورا کا پورا اسی پیشہ میں مشغول ہے۔ میرے کان اس تجویز سے بھی آشنا ہوئے ہیں کہ مذکورہ بالا مشکل کا یہ علاج کیا جاسکتا ہے کہ جزیرۃ العرب کے مختلف اقطاع کے خانہ بدوش اور بادیہ نشین قبائل کو

عراق جدید میں اقامت گزیں ہونے اور آیندہ فلاحین کی سی زندگی اختیار کرنے کی دعوت دیجائے جسکو ممکن ہے
کہ وہ لبیک کہیں۔ لیکن میں صرف یہ کہوں گا کہ علی مہمات شیخ چلی کی ان خوابوں پر مبنی نہیں کیجاسکتیں!
قرینہ غالب ہے کہ آخری جواب میں ہندوستان کے فراہم شدہ قلیوں کی طرف دعوت نظر دیجائے لیکن اول
تو عراق کے اندر ہندوستانی عنصر روز بروز تقلیل کی طرف مائل ہے جس کے اسباب کا آئندہ بھی سد باب
نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ایک بڑے پیمانہ پر ہندی مزدوروں کی درآمد کی کوشش کی بھی گئی تو اول تو
خود عراق کی عرب آبادی اُن کو خوش آمدید کہنے میں سخت متامل ہو گی اور اس اقدام کو "بین النہرین"
کے اندر گنگا اور جمنا کے دوآبہ والے ایک نئے "وطن الہنود" کی بنیاد ڈالنے سے تعبیر کریگی اور ان
قومی خدشات کے ماتحت ہندوستانی تارکان وطن کیلئے اپنے ملک کی زمین حتی المقدور گرم کردیگی۔ دوسری
طرف خود ہندوستان میں اس کو پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھا جائیگا اور یقیناً ایک شدید احتجاج کی لہر اٹھیگی۔
اس نکتہ کو محسوس کرنا چاہئے کہ ہندوستان کے ارباب سیاست اور اصحاب حرفت جو بیرون ہند میں
اقامت رکھنے والے ہندی مزدوروں کی مظلومانہ حالت پر اس قدر شور و غوغا مچاتے ہیں اسمیں حبّ وطن
اور ہمدردی نوع بشری کی گلبانگوں کے ساتھ غرض پرستی کے جذبات کی بھی کچھ صداہائے بازگشت ہوتی
ہیں! ہندوستانی کارخانہ داروں کے لئے یہ سوچنا بالکل قدرتی ہے کہ اس طرح ملکی بازار مزدوری کو
روز بروز خشک کرتے رہنے کا ان پر براہ راست یہ اثر پڑیگا کہ یہ جنس پھر خود ہندوستان کے اندر نسبتہً
کم رہجائیگی اور مزدوروں کا یہ قحط خواہ مخواہ اُن کو گراں نرخ بنادیگا! ان گوناگوں مشکلات و معاملات
کی بنا پر عراق کے اندر کوئی ایسی مہم سر نہیں کیجاسکتی جسکی امید پر برطانیہ اپنے دخل عراق عرب کو جاری
رکھے ہوئے ہے، نیز جسکو وہ اپنی اس پُر خار اور گرانبار مصارف پالیسی کی تائید اور نعم البدل کے طور پر
پیش کیا کرتی ہے۔

عراق عرب کی زرعی "حیات بعد ممات" کی اسکیموں کے بعد اس ملک کے وہ چشمہائے روغن گل
ہیں جنکے اندر انگلستان پاگل ہو رہا ہے اور جو پورے عراق کی قربانیوں کی قیمت سمجھا جاتا ہے لیکن اس
ضمن میں اول تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ پرشین آئل کمپنی کی معرفت جو مراعات ہمکو حاصل ہیں وہ ہم کو شکم سیر

کرنے کیلئے کافی ہیں اور برطانوی بیڑہ ابھی سالہا سال تک اُس پر اپنی اوقات بسری کر سکتا ہے۔ اب اگر عراق میں بھی تیل کے لئے "کوہ کندن" کیا جائے گا تو مصارف کی کثرت کے عدم تناسب کی وجہ سے اُس کا نتیجہ بھی "کاہ برآوردن" سے زیادہ نہ ہوگا۔ مزید برآں یہ بھی معلوم ہے کہ یہ خزینۂ روغن تنہا برطانیہ کا اجارہ نہ ہوگا لیکن کچھ ہو سارے اخراجات و خطرات کے لئے تو انگلستان بلا شرکت غیرے ماشاءاللہ سینہ سپر ہو گیا ہے۔ دیکھنا چاہیئے کہ یہ "نیلا تیل" کتنے زیادہ "سرخ انسانی خون" کے معاوضہ میں خریدا جائیگا اور ابھی کتنے اور "دینار سُرخ" خرچنے ہوں گے جو بیعنامہ پر حق برطانیہ مہر تصدیق و توثیق ثبت کر سکیں گے!

اصل یہ ہے کہ انگریزی سرمایہ داروں کی اندرونی ریشہ دوانیاں اور فرمانفرمائیاں اس پالیسی کے اختیار کرنے میں حقیقی کارفرما عنصر ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ جنگ عظیم سے قبل ہی ایک برٹش سنڈیکیٹ نے ترکی حکومت سے نواح موصل کے "چاہات روغن" کا ٹھیکہ لیا تھا۔ یہ سب حلقے اسوقت خاموش نہیں بیٹھ سکتے!

تیل کی یہ حقیقت، زرعی فتوحات کی وہ سرگزشت، اور امپیریل مقاصد کی وہ دور رازکاری، سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر سرزمین عراق میں بجز خرمے کے درختوں اور نینوا و بابل کے تاریخی آثار کے اور کیا رہجاتا ہے جس کے لئے انگلستان فوج دخل اور ایک دوعملی انگریزی عربی حکومت کے گراں مصارف کو برداشت کر رہا ہے۔ وہمی و فرضی اغراض و مصالح کیلئے کسی سلطنت نے کبھی اپنے کو اس طرح کی خود طلبیدہ مصائب و افکار کے لئے وقف نہ کیا ہوگا۔

اس راز سربستہ کے حل کی جستجو میں سارے گوشوں سے ناکام پھرنے کے بعد آؤ ہم ذرا ان لوگوں پر تو ایک متجسسانہ اور مفتشانہ نظر ڈالیں جو بغداد کی سڑکوں پر سفید عبائیں اور سرخ طربوش پہنے ہوئے ادھر اُدھر ہشاش بشاش چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں اور جنکی آنکھوں سے عیاری اور سارے سراپا سے مرفہ الحالی ٹپکتی ہے! یہ عراق کے یہودیوں کا حلیہ ہے۔ بنی اسرائیل کے مسئلہ نے آج بہت سے ارباب سیاست کو اس سے زیادہ پریشان بنا رکھا ہے جتنا کہ اُس قوم نے ماضی بعید میں انبیا و رسل کو

بنایا تھا! میرے لئے یہ امر بہت معنی خیز تھا کہ یہودی جوق جوق ملحقہ و بیرونی ممالک سے ترکِ اقامت کر کر کے عراق میں آ رہے تھے اور اس ملک میں روز بروز اپنے عنصر کو تقویت پہنچاتے معلوم ہوتے تھے۔ یہ بات خالی از علت نہ تھی۔ صرف بغداد شہر کے اندر یہ لوگ آبادی کے پورے ایک ثلث حصہ پر قابض ہیں اور ان کے تمول کا تناسب اُنکے تعدادی شمار سے کہیں زیادہ ہے۔

اگر یہودیوں سے متعلق ہم نے اپنے کسی قسم کے مصالح کو عراق عرب کے قبضہ کے ساتھ منسلک کیا ہے تو ان منصوبوں کی لایعنیت محتاجِ تصریح نہیں۔ میں اس بارے میں پورا متیقن نہیں ہوں اور مجھے یہ خیال ہے کہ ممکن ہے کہ ان خبروں اور افواہوں کے پیچھے کچھ بھی نہ ہو لیکن پھر بہت سی علامات و قرائن ایسے ہیں جن کو نظر انداز کرنا مشکل ہے۔ موجودہ برطانوی وزارت کے ساتھ یہودی عمائد و اعیان کا جو خلا ملا رہا ہے اُس کے متعلق ایک سے زیادہ موقعوں پر افشائے رازِ عشق ہو چکا ہے۔ یہ تعلقات ہنوز روز افزوں ہیں اور پھر ان کی وسعت و نفوذ کا یہ حال ہے کہ مسٹر لائڈ جارج اور شاہ فیصل دونوں کی سیاسی خلوتگاہیں بنی اسرائیل کے "مالی مشیروں" کے راز و نیاز سے معمور ہیں!

یہودی ریشہ دوانیوں کے جال میں پورا فلسطین پھنس گیا ہے اور اس دامِ سخت کے حلقوں میں مرغِ بسمل کی طرح پھڑک رہا ہے۔ فلسطین کے قبضہ کے وجوہات اُس سے کم نامعقول نہ تھے جتنے کہ عراقی دخل کے اسباب تھے اور اب اس قبضہ کے تسلسل کے جو تجارب و نتائج پیش آئے ہیں وہ عالم آشکارا ہو چکے ہیں اور ہمارے لئے کسی فریبِ نظر کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔ تجویز یہ ہے کہ ارضِ مقدس کو یہودیوں کا "قومی نشیمن" بنایا جائے گا اور اس سلسلے میں انگلستان کو یہ شرف حاصل ہوگا کہ اس یہودی وطن کی تعمیر کے اخراجات کے ایک معتدبہ حصہ کی فراہمی میں برطانوی ٹیکس دہندوں کو شرکت کی سعادت نصیب ہوگی! سوال یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی یہ ہدایت یافتہ امت بیت المقدس کی طرف اس ہجرۂ عظمیٰ کا ثواب آخر کیوں کمانا چاہتی ہے؟ نہایت معقول جواب یہ ہے کہ قومِ یہود کی یہ متفقہ اور عالمگیر تمنا ہے کہ ارضِ یہودیہ کے اُجڑے گھر کو پھر بسائیں! لیکن

غرض یہ ہے کہ اس لستی کے ساتھ موجودہ اہل خانہ کی جو خانہ ویرانی لازم و ملزوم نظر آتی ہے اُس کے لئے کیا سند جواز ہے؟ کسی ملک میں توطن پذیرانہ حیثیت سے قدم رنجہ فرمانیکی صرف آرزو اُس ملک کا "تملیک نامہ" تحریر نہیں کر سکتی! دنیا پوچھنا چاہتی ہے کہ اس عظیم الشان تحریک کی دعوت کو حق بجانب قرار دینے کے لئے کونسے دلائل و براہین ہیں؟

قریباً تین ہزار برس ہوتے ہیں کہ ایک ایسے موقع پر جبکہ اپنی داخلی کمزوری سے معذور ہو کر سلطنت مصر نے اپنی قلعہ نشین افواج کو فلسطین سے ہٹا لیا تھا یہودیوں نے دریائے یردان کو عبور کیا اور ملک کے ایک حصہ پر قابض ہو گئے۔ جس بربریت وسبعیت کا ثبوت انہوں نے ان معرکہ آرائیوں میں دیا اُس کے سامنے جرمنی کا حربی اسٹاف بھی اپنا سر نیاز جھکا دیگا اور کبھی ہمسری کی ہمت نہ کریگا! فلسطین دو قدیم عظیم الشان تمدنوں کی باہمی شاہراہ کی ایک منزل تھا اس لئے اس خطہ پر یہودیوں کا عرصہ دراز تک کوئی دخل ممکن نہ تھا، چنانچہ ایک وقت آیا کہ وہ یہاں سے نکالدئے گئے اور مختلف اقطاع و دیار میں جلاوطن کر دئے گئے۔ اور بعد ازاں جب سائرس اعظم کے عہد میں انکو واپسی کی اجازت دیگئی تو اس دعوت پر ان کے ایک قدر قلیل جزو نے لبیک کہی۔ ایرانیوں، سکندر اعظم کے جانشینوں اور رومیوں کے دور میں یہ لوگ عموماً ایک قسم کی غلامی اور مقہوریت کی حالت میں رہے اور موخرالذکر تاجداروں کے زمانہ میں تو انہوں نے شام و فلسطین کے اندر ایک گونہ آئرش مسئلہ کی حیثیت اختیار کرلی اور اپنے مسلسل فسادات اور آتش افروزیوں سے شاہ وقت کو مجبور کر دیا کہ وہ ان سب کو بیک بینی و دوگوش اس نواح سے خارج البلد کر دے!

یہ ہے یہود کی شاندار تاریخ فلسطین! ان یادگار تاریخی نظائر کو پیش کر کے وہ ارض مقدس کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز کرنا چاہتے ہیں اور بعض دیگر دول بھی ان کی تائید و لپشت پناہی میں برطانیہ کی ہمنوائی پر آمادہ کر لئے گئے ہیں۔ لیکن اگر اہل مغرب کو خدا نے ایسی ہی توفیق دی ہے تو "حق بحقدار رسانیدن" کی اس مہم کو کسی دوسری جگہ سے شروع ہونا چاہئے۔ قبل اس کے کہ یہودی باب بیت المقدس میں داخل ہوں، مراکش کے مورثی عربوں کو قرطبہ و غرناطہ میں اور امریکہ کے سرخ

ہندوستانیوں کو واشنگٹن میں :-

قدم نما دفر ود آکہ خانہ خانۂ تست

کی صلا دینی چاہئے! لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ انگریزوں اور امریکیوں کے جذبات معدلت گستری ومظلوم نوازی کی رگ یہاں حرکت میں نہیں آتی! آہ! بیچارے مورش عرب اور ریڈ انڈینس، یہودیوں کی طرح دنیا کے صرافہ پر تو قابض نہیں ہیں جس کے زور پر وہ سلطنتوں اور حکومتوں کی نظارتہائے خارجیہ کے ایوانوں میں بیٹھکر ملکوں اور قوموں کے کاتبانِ تقدیر بنیں!

برطانیہ ماشاء اللہ اس بات کا پورا مسکن قلب اطمینان دلاتی ہے کہ وہ فلسطین میں عدل نوشیروانی کا سکہ چلائیگی! لیکن ابھی تک تو یہ تمام اعلانات "دروغ مصلحت آمیز" سے زیادہ ثابت نہیں ہوئے ہیں۔ فلسطین کے عربوں پر اس نئے دور حکومت میں جو بیت رہی ہے وہ ایک طویل اور دردناک داستان ہے۔ ہم فلسطین کے عربی وفد کے اظہارات ومعروضات کے بعض اہم نقاط کو یہاں نقل کرنا چاہتے ہیں۔ ارکانِ سفارت نے کہا تھا کہ (ملخصاً):

"واضح رہے کہ ہم اعراب فلسطین اپنے قلوب میں کسی قسم کے منافی "سامیت" جذبات نہیں رکھتے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم یہودیوں کے لئے اس وقت مامن وملجا رہے ہیں جبکہ مغرب کے مسیحی ممالک کے اندر وہ کشتنی وسوختنی سمجھے جاتے تھے! ہمارے لئے جو چیز ناقابل برداشت ہے وہ یہودیت کے بجائے صیہونیت ہے جو فلسطین کے اندر مہمان بنکر آنا نہیں چاہتی بلکہ مالکانہ اور فاتحانہ حیثیت سے داخلہ چاہتی ہے!

عبرانی زبان جو مشکل سے ملک کی ایک فیصدی آبادی کی بولی ہوگی فلسطین کی سرکاری زبان بنائی جاتی ہے! صیہونی نووارد مزدور عرب غربا کو اُن کے قوتِ لایموت سے محروم کرتا ہوا آتا ہے۔ وہ عرب کے مقابلہ میں نصف کام کرتا ہے اور ڈبل اجرت پاتا ہے! تعمیرات عامہ کے قریباً سارے ٹھیکے یہودی سرمایہ داروں کی اجارہ داریاں ہیں جنکے سامنے غریب عرب "نرخ بالا کن" کی مبارزت میں ٹھہر نہیں سکتا! فلسطین کا ہائی کمشنر، معتمد قانونی ،

خزینہ دار ذخائر ملکی، ڈائرکٹر تجارت و حرفت، اور صیغۂ ہجرت کا افسر اعلیٰ سب یہودی ہیں اور صیہونی مشرب و مسلک کے یہودی! اسی طرح تمام دفاتر و محاکم میں نوآموز اور ناتجربہ کار یہودیوں کی یورش ہے! سارا دفتر تشریعی عرب کُشی اور یہود نوازی کی روح سے معمور ہے! خشگو صحائف و جرائد کی ناطقہ بندی کیجاتی ہے۔ حب وطن اور دلسوزی ملک کا نعرہ بلند کرنیوالے عرب قائدین ملت کو اس عذر پر طوق و سلاسل میں جکڑ بند کیا جاتا ہے کہ انکی سرگرمیاں امن عامہ کے لئے خطرہ ہیں! اُن مزارعین و فلاحین سے جو صحیح معنوں میں نسلاً بعد نسل، قرناً قرن سے "فرزندان زمین" بنے ہوئے ہیں، یہ مطالبہ کیاجاتا ہے کہ وہ اپنی آراضیات کا بیعنامہ حکومت کے نام کر دیں اس لئے کہ ترکی سلطنت کے جائز وارث کی حیثیت سے تمام حقوق زمین نئی حکومت کے حق میں منتقل ہو گئے ہیں! یہ بیع نما ضبطی زمین بعد میں یہودی کاشتکاروں اور زمینداروں کے لئے عطیۂ جاگیرات بننے والی ہے!

شریعت اسلامیہ کے مسلمہ و اعلان کردہ آئین کو پامال کرکے صیہونیت آب یہودی حکومت، فلسطین کے اسلامی اوقاف کے نظم و نسق میں بیباکانہ مداخلت کے درپئے ہے! یونانی راسخ الاعتقاد (تقلید مسلک) کلیسا کے وہ تمام اوقاف جنکو ترکوں نے ملک خدا سمجھکر کبھی ہاتھ نہ لگایا، آج بحق حکومت ایک ضبط شدہ جائداد قرار پاتے ہیں اور ایک سرکاری کمیشن کے زیر اہتمام عمداً اتنی بڑی بڑی مقداروں میں دائر نیلام کئے جاتے ہیں کہ بجز یہودی قارونوں کے کوئی دوسرا اُن سے عہدہ برا نہ ہو سکے!

اور یہ محض ایک مشتے نمونہ از خروارے ہے۔ عرب روزانہ اپنی آنکھوں کے سامنے ایسی ایسی بے شمار کارستانیاں اور ریشہ دوانیاں دیکھتا ہے جس سے اُس کے قلب کے اندر خون اُبال کھاتا ہے!

عرب لوگ انگلستان اور ساری مہذب دنیا سے سوال کرنا چاہتے ہیں کہ آیا انکی یہ ساری تلخ نوائیاں شکوہ ہائے بیجا ہی ہیں؟"

باوجود کیطرفہ ہونے کے یہ سب بیانات حق بجانب ہیں۔ برطانوی پبلک کو بالکل تاریکی میں رکھا گیاہے ورنہ سیاہ وسفید کے مختار لوگ ایسا اندھیر کرنے میں کچھ متامل ہوتے۔ لیکن ڈاؤننگ اسٹریٹ (برطانوی دارالوزارت عظمیٰ) میں یہودیوں کو جو رسوخ حاصل ہے وہ اب بھی اس اپیل کو بیہودہ رکھیگا۔ متمدن دنیا کے دارالعدل میں جو استغاثہ کیا گیاہے یقیناً وہ بھی صدا بصحرا ثابت ہوگا۔ بیشتر مغربی ممالک بظاہر اس "کارنیک" کے سلسلے میں درحقیقت اپنے اپنے ہاں کی آبادی کے اُس عنصر سے گلوخلاصی کی فکروں میں ہیں جو اُن کے لئے صدیوں سے ایک عذاب و لعنت بن رہا ہے! پھر اس سے بڑھکر کیا بات ہوگی کہ برطانیہ تنہا "خون دوعالم" اپنی گردن پر لینے کو تیار ہے۔ لیکن "کشتوں" کا یہ خون مستقبل قریب میں بڑے ہولناک طریقے سے رنگ لائیگا اور اُس وقت برطانوی حکومت کے موجودہ کارپردازوں کو معلوم ہوگا کہ وہ کونسی مہلک راہ پر گامزن تھے!

کیسی بوالعجبی ہے کہ یہ سلوک عربوں کو جنگ عظیم کی اُن فتوحات کا انعام ہے جنکے حصول میں اصل فاتح کار آلہ عربوں کی "جان و ایمان" کی وہ قربانیاں تھیں جو اس فریب خوردہ قوم نے اتحادیوں کو عموماً اور برطانیہ کو خصوصاً پیش کی تھیں:

انگریزی وزارت جو پالیسی اختیار کئے ہوئے ہے وہ یقیناً بہت ہی اندوہناک ہے بیت المقدس کے ایک برطانوی افسر سے جب میں نے اس بارہ میں تبادلۂ خیالات کیا تو اُس نے فی الفور کہا کہ "یہ نہ سمجھئے کہ فلسطین کے ، لاکھ عرب غیر معین زمانہ تک ، ہزار یہودیوں کے مظالم و مفاسد کا اپنے کو تختۂ مشق بنائے رکھیں گے۔ اُن کی یہ قومی مصیبت بلاشبہ ناقابل برداشت ہے اور جلد یا بدیر اُن کی تلوار سے ضرور ایک قتل عام کا فوارۂ خونی بہہ نکلیگا! بدقسمتی یہ ہے کہ یہ آفت یہیں تک محدود نہ رہیگی۔ جواب میں یقیناً برطانوی جنگی بیڑہ حرکت میں آئیگا اور انگریزی سنگینیں فلسطین کے تمام عربوں کو ذبح کرڈالینگی ملحقہ ممالک اور تیز اسلامی ہندوستان کے مطلع پر ان خونچکاں حوادث کا جو عکس پڑیگا اُس کو چشم تخیل سے دیکھا جاسکتا ہے!

برطانیہ میں جتنے لوگ ماہرین مشرق کہلائے جانیکی اہلیت رکھتے ہیں ان کا بیشتر حصہ اس روش

کو سخت مخدوش کہتا ہے۔ لارڈ سنڈنہم نے اُس تقریر یا اسپیچ کے دوران میں جو فلسطینی وفد کی آمد کے وقت انہوں نے ارشاد فرمائی تھی کہا تھا کہ: "لارڈ بالفور نے صیہونی یہودیوں کے لئے اپنے مشہور اعلان میں جو گلدستہ پیش کیا ہے وہ اس جماعت کے لئے ایک ڈائنامیٹ کا گولہ ثابت ہوگا! فلسطین کے خرمن امن میں اس حرکت سے ہم جو شرارہ لگائیں گے وہ تمام مشرق میں اتنی وسیع آتش جدال و قتال کو مشتعل کریگا کہ ہمارے سارے وسائل اُس کو سرد کرنے میں سوخت ہو جائیں گے!"

میں اسی قول فیصل پر فلسطینی مسئلہ کی بحث کو ختم کرتا ہوں، اور عراق کی طرف پھر بازگشت کرتا ہوں۔

عراق عرب کے اندر ۱۹۲۰ء میں جو بغاوت ظہور پذیر ہوئی اُس نے دو طرفہ اپنا زبردست خراج خون و زر وصول کرنے کے علاوہ اگر اور کچھ نہیں کیا تو کم از کم زبان آتشیں سے یہ اعلان تو کر دیا کہ ملک کی عام آبادی برطانوی دخل کو کسی طرح خوش آمدید کہنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ لطف یہ ہے، جیسا کہ مجھکو نہایت معتبر ذرائع سے معلوم ہوا، کہ اس ناکامیاب انقلاب کے اصل داعی شاہ فیصل کے عین ہوا خواہوں میں سے ہیں! نیز یہ کہ اس مہم کے تغذیہ کیلئے جو روپیہ ملا تھا وہ اُس رقم نذرانہ کا ایک حصہ تھا جو برطانوی خزانہ ملک الحجاز کو پیش کیا کرتا ہے! انگلستان کو دیکھنا چاہیئے کہ کہاں تک وہ اپنی کمائی "بجائے حرام رفت" کی قربانگاہ پر چڑھاتا رہے گا!

عراق اور شاہ عراق کیساتھ جو دوستانہ معاہدات اور خوشگوار تعلقات ہیں وہ دراصل ایک سوانگ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔ فیصل کے تخت شاہی کے پائے برٹش سنگینیں ہیں، اور اگر انگریزی فوجی طاقت عراق سے مراجعت کر آئے تو برطانوی ہائی کمشنر کے نقوش قدم پر ہی جناب فیصل بھی زمین ناپتے ہوئے نظر آئیں گے!

فیصل کی تخت نشینی فی الحقیقۃ اُس "بل" کی ادائگی کی ایک قسط تھی جو دوران جنگ میں شریفی خاندان کی خدمات کی بنا پر برطانیہ کے ذمہ واجب الادا سمجھا جاتا تھا! ورنہ باستثنائے نوجوان عرب پارٹی کے عراق عرب کے تمام علما، تجار، کُرد، اور وادی فرات کے جملہ قبائل فیصل کو اپنا سرتاج بنانے

کے لئے ہرگز آمادہ نہ تھے۔

فیصل کی تائید میں عراق عرب کے اندر جو مصنوعی استصواب عامہ کرایا گیا وہ بھی ایک ناقابل رشک انتخاب تھا۔ عالم بالا سے تمام ہدایات پیشگی صادر ہو چکی تھیں! اگر کسی نے کوئی کلمہ "حق برزبان جاری" کیا تو سخت مؤاخذہ ومحاسبہ کے شکنجے میں کسا گیا۔ انہی گناہوں کی پاداش کے سلسلے میں مشہور زعیم طالب پاشا کی جلاوطنی سیلون کافی تشہیر حاصل کر چکی ہے۔

اپنی محرومیٔ قسمت سے میں شاہ فیصل کی تاجپوشی کی تقریب سعید میں شریک ہونے کے لئے وقت پر بغداد نہ پہنچ سکا، حالانکہ تمام لوازم کے اعتبار سے یہ موقع قابل دید وقابل داد تھا۔ ادنیٰ کمال یہ ہے کہ اتنے عظیم الشان قومی جشن کو منانے کے لئے کوئی قومی ترانہ بجز "God save the King" کے نہ تھا!

عراقی حکومت کے اخراجات اپنی گرانباری کی بنا پر ضرب المثل ہو رہے ہیں، اس پر طرہ یہ ہے کہ ملک کے سرچشمہائے آمدنی کے بعض صیغے ابھی سے اغیار کے ہاتھوں میں جا پڑے ہیں۔ عراقی ریلویجات اور بندرگاہ بصرہ (جو ملک کا تنہا بحری تجارت کا دروازہ ہے) ایک برطانوی کمپنی کے اجارے میں ہے جو اپنے حلقے کے اندر سیاہ وسفید کی مختار کل ہے اور حکومت کا اس پر کوئی اقتدار نہیں۔ حکومت کی جیب میں اتنے ٹکے نہیں جو وہ ریلوے کمپنی کی کل متاع وحقوق کو خرید سکے اور کمپنی سے یہ توقع نہیں کیجا سکتی کہ وہ اپنی ذاتی اغراض ومصالح کو ملک کے مفاد کی خاطر قدرے نظر انداز کریگی!

برطانوی کابینۂ وزارت کی اُن تمام حرکات مذبوحی پر جن پر وہ مشرق قریبہ اور ایشیائے وسطیٰ میں عمل پیرا ہے ہم ایک عمومی ومجمل نظر ڈالتے ہیں:

ہندوستان اور مصر کے اندر وہ انتہاپسندوں کو مہمیز لگا رہی ہے، عراق عرب اور فلسطین میں باشندگان ملک کی پامالیٔ جذبات اور اغماض حسیات کی ابتدائی مہم جاری ہے، افغانستان کے متعلق اُس کی روش کو شاید صورت حالات کا جائز فتویٰ کہا جائے لیکن ٹرکی کے معاملے میں وہ اپنی شاہراہ عمل سے نہایت افسوسناک طریقے سے پیچھے کھڑی ہے۔ روس کے بارہ میں اُس کی حکمت عملی کسی واضح

اصول پر مبنی نہیں۔ علاقہ قفقاز کی نوزائیدہ جماہیر کو ہم اس لئے درخور اعتنا نہیں سمجھتے کہ ہمارا خیال ہے کہ یہ حشرات الارض جیسی حکومتیں جلد یا بدیر روسی پارٹی میں جذب ہو جائینگی۔

برطانوی حکومت کی پالیسی پر ایک اصولی تنقید ان الفاظ میں کیجا سکتی ہے کہ جس جگہ مضبوط بننے کی ضرورت ہے وہاں وہ نہایت مضرت رساں نامردی کی نمائش کرتی ہے اور جس جگہ "سپر باید انداختن" کا مقتضا ہوتا ہے وہاں وہ ناعاقبت اندیشانہ مظاہرات طاقت برپا کر دیتی ہے۔ ایک دوسری لغویت یہ ہے کہ دنیا کے جس خطے میں سے ہو کر سلطنت کے مقاصد کے نکلنے کی کبھی کوئی بعید ترین توقع بھی نہیں ہو سکتی وہاں وہ آدمیوں اور روپیہ کا دریا بہا دیتی ہے! سلطنت کے طول و عرض کے اندر مختلف و گوناگوں اقدامات کے مابین کوئی یکسوئی و یکجہتی اور مقصد واحد و مشترک نظر نہیں آتا! مخفی معاہدات اور خفیہ سیاست بازی ایک دوسرا بے سود اور مضر مشغلہ ہے جو برطانوی وزارت کو بہت مرغوب معلوم ہوتا ہے!

سائل

"حضور ..... سرکار ..... بندہ پرور ..... تین دن ہو گئے ہیں ..... فاقہ ہے ..... کھیل اڑ کر جو منہ کو گئی ہو - برف پڑ رہی ہے - دوانی بھی نہیں کہ جا کر چھت تلے رات بسر کروں - اللہ سب جانتا ہے - اس کی مرضی ..... آٹھ برس ایک دیہاتی مدرسہ میں پڑھا چکا ہوں - نہ کچھ خطا نہ قصور - انسپکٹر نے معائنہ بُرا لکھ دیا - اب سال بھر سے دھکے کھاتا پھرتا ہوں ..... "

وکیل صاحب، اسکورزو نے سائل کے پرانے نیلے کوٹ پر نظر ڈالی، اس کی گدلی گدلی مخمور اور غمگین آنکھوں کو دیکھا، گالوں پر لال لال ٹیکے دیکھے اور نہ جانے کیوں اُسے یہ یقین سا ہو گیا کہ ہو نہ ہو اس آدمی سے میں پہلے ضرور کہیں مل چکا ہوں -

"اور حضور - ابھی جو پہونچ سکوں تو کلسنگا کے ضلع میں ابھی آج مجھے ملازمت ملجائے - لیکن کرایہ کے لئے بھی تو کوڑی پاس نہیں - سرکار - اللہ آپ کا بھلا کرے گا - مسیحؑ کے نام پر میری کچھ مدد کیجئے - مجھے مانگتے شرم آتی ہے مگر کیا کروں - مصیبت بری بلا ہے -"

وکیل صاحب نے سائل کے ربر کے جوتوں کی طرف ایک نگاہ ڈالی - ایک جوتا اونچا تھا، ایک نیچا - نگاہ پڑنا تھی کہ کچھ یاد آ گیا -

"سنئے ہو جی، میاں صاحب، مجھے ایسا لگتا ہے کہ ہم تم پرسوں کہیں مل چکے ہیں - اُدھر بازار میں - مگر اس وقت تم دیہاتی مدرس نہیں تھے - بلکہ مدرسہ سے نکالے ہوئے طالب علم تھے - کیوں، ٹھیک ہے نہ ؟"

"نہ ..... نہیں - یہ کیسے ہو سکتا ہے - ناممکن ہے" سائل نے دبی دبی آواز سے کہا "میں تو مدرس ہوں - آپ کہئے تو اپنے کاغذات دکھلا دوں -"

"بس ان فضول کی جھوٹی باتوں کو رہنے دو - تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تم طالب علم تھے، یہ تک

بتایا تھا کہ کس وجہ سے مدرسہ سے علیحدہ کئے گئے۔ کیوں، یاد آیا کہ نہیں؟"

مخاطب نے سر ہلایا۔ وکیل کو کچھ غصہ سا آیا اور اُس نے اظہار نفرت کے طور پر اس مفلوک الحال سائل کی طرف سے اپنا منہ پھیر لیا۔ اور غصہ سے کہا: "یہ تو پتلے درجہ کا کمینہ پن ہے۔ کیوں جی تمہیں شرم نہیں آتی؟ تمہارا علاج تو بس یہ ہے کہ تمہیں گرفتار کرا دیا جائے۔ لاحول ولا۔ مانا کہ غریب ہو، بھوکے ہو لیکن اس وجہ سے یہ تھوڑی ہے کہ بیشرمی سے جو جا ہو جھوٹ بک دو۔"

سائل کچھ گھبرا کر اور پریشان ہو کر ذرا پیچھے کو ہٹا اور دروازہ میں جو موٹھ لگی تھی اُسے ہاتھ سے پکڑ لیا اور آہستہ سے کہا "میں نے...... میں نے جھوٹ نہیں بولا۔ آپ کہئے تو اپنے کاغذ دکھا دوں۔"

"تم کہے جاؤ، یقین کون کرتا ہے۔ لوگوں کو طالبعلموں اور دیہاتی مدرّسوں سے جو ہمدردی ہے اس سے اس طرح بیجا فائدہ اٹھانا سخت کمینہ پن ہے۔ ذلیل، قابل نفرت۔ شرماؤ جی شرماؤ۔"

اسکورزو کو غصہ آ گیا اور اُس نے نہایت بے رحمی سے سائل کو جھڑک کر نیچے اُتار دیا۔ جھوٹ کی وجہ سے اسکورزو کے اندر اس سے نفرت اور حقارت پیدا ہو گئی تھی۔ اس کو انسانیت پر جو یقین تھا اُسے صدمہ پہنچا تھا اور وہ چڑھ سا گیا تھا کہ انسانی ہمدردی کے جذبہ سے اس طرح کمینہ پن کے ساتھ فائدہ اٹھا کر یہ شخص اس خیرات کو آلودہ کرنا چاہتا ہے جو یہ نہایت صدق دل اور خلوص کے ساتھ کیا کرتا تھا۔ سائل نے اپنی بریت میں کچھ اور کہنا چاہا۔ قسمیں کھائیں۔ لیکن بالآخر خاموش ہو گیا، شرما کر گردن نیچی کر لی۔ اور سینہ پر ہاتھ رکھکر کہنے لگا۔ "ہاں، حضور، سچ ہے۔ میں نے واقعی...... واقعی جھوٹ بولا۔ میں نہ طالب علم ہوں نہ دیہاتی مدرس۔ یہ سب غلط تھا۔ میں گرجا میں گایا کرتا تھا۔ پھر پینے کی لت لگ گئی اس لئے مجھے نکالدیا گیا۔ لیکن میں کروں تو کیا کروں؟ بے جھوٹ کے کام بھی تو نہیں چلتا۔ سچ کہتا ہوں تو کام نہیں چلتا۔ سچ بولوں تو کوئی ایک دمڑی نہ دے۔ سچ بولوں تو بھوکوں مر جاؤں۔ آپ کا کہنا ٹھیک ہے۔ بالکل درست ہے لیکن آخر کروں کیا؟"

"کروں کیا؟ مردِ آدمی، پھر مجھسے پوچھتے ہو کہ کروں کیا؟" اسکورزو نے بہت نزدیک آکر کہا، "کرو کیا، کام کرو، کام۔"

"کام کروں ــــ بہت ٹھیک - مگر کام پاؤں کہاں؟ مجھے کوئی کام نہیں دیتا۔"

"بکواس کرتے ہو - تم ابھی نوجوان ہو، تگڑے ہو، تندرست ہو - کام کرنا چاہو تو کام کیوں نہ ملے - مگر نہیں - تم تو سست ہو گئے بیکار بن گئے ہو - عادت بگڑ گئی ہے - شراب میں مست رہتے ہو، شراب میں - دس قدم پر کھڑے ہو تو شراب کی بو آتی ہے - جھوٹ تمہارے گوشت پوست میں داخل ہو گیا ہے - اور تم بس اب جھوٹ بول سکتے ہو اور بھیک مانگ سکتے ہو - اور اگر کبھی کام پر آمادہ بھی ہوتے ہو گے تو ضرور ہے کہ کام ہلکا ہو اور مزدوری بھاری - کیوں ہے نہ؟ کسی گھر میں خدمتگاری یا کارخانہ میں مزدوری تو آپ کو پسند نہ ہوگی؟ ٹھیک ہے، آخر اپنا اپنا مزاج بھی تو ہوتا ہے اور اپنی اپنی پسند!"

سائل کے لبوں پر نہایت تلخ تبسم رونما ہوا اور اُس نے کہا "آپ آخر ایسی باتیں کیوں فرماتے ہیں ...... مجھے کام کہاں مل سکتا ہے؟ Kommis کے لئے میری عمر زیادہ ہو گئی ہے، ایسے تو لڑکپن ہی میں شروع کرنے کی ضرورت ہوتی ہے - صحیح عرض کرتا ہوں نہ؟ گھر میں خدمتگار مجھے کوئی بناتا نہیں - اس لئے کہ شکل صورت ایسی ہے کہ لوگ 'تو' 'تو' کہتے ذرا رکتے ہیں - یہی حال کارخانہ میں مزدوری کا ہے - اس کے لئے آدمی کو کوئی دستکاری آنی چاہئے - سو میں اس سے بھی نابلد ہوں ...... لیکن۔"

"جی - جی - عذروں کی تو تمہارے پاس کبھی کمی نہ ہوگی - لیکن یہ تو کہو لکڑیاں چیرنے کا کام کیسا ہے؟" "میں اس کے لئے بھی تیار ہوں - خوشی سے - لیکن آجکل تو خود پیشہ ور لکڑہاروں تک کے لئے کام نہیں ہے۔"

"اچکے اور نکمے ہمیشہ یہی کہتے ہیں - ابھی اگر میں تمہیں یہ کام دوں تو ظاہر ہے انکار کر دوگے - یا نہیں، لکڑی چیرنے پر تیار ہو؟"

"جی ہاں - خوشی سے۔"

"بہت اچھا - پھر کیا ہے۔"

اسکورزو نے کچھ شرارت آمیز طریقہ سے اپنے ہاتھ ملے اور گھر میں سے ماما کو بلایا -

ماؤ لگا۔ انکو باورچی خانہ میں لے جاؤ۔ یہ وہاں لکڑیاں چیریں گے"۔

سائل نے کندھے اچکائے۔ اُس کے چہرے سے شبہ سا ظاہر ہوتا تھا کہ کروں کیا۔ اسی شبہ کی حالت میں باورچی خانہ کی طرف چلا۔ ظاہر تھا کہ اُس نے یہ کام صرف اس لئے قبول کر لیا تھا کہ پھر سے وکیل صاحب اسے جھوٹا، کذاب نہ کہہ سکیں۔ ورنہ نہ کام کا شوق تھا، نہ بھوک کی وجہ سے وہ اس پر آمادہ ہوا تھا۔ اس پر اسوقت شراب کا اسقدر اثر تھا اور اُس کے اعصاب اسقدر کمزور تھے کہ کام کی طرف تو اسمیں ذرا بھی رغبت نہ تھی۔

اسکورزو جلدی جلدی اپنے کمرہ میں گیا۔ کھڑکی میں سے لکڑی کا گودام اور نیچے صحن کی تمام کارروائیاں اُسے اچھی طرح دکھائی دیتی تھیں۔ یہاں کھڑے کھڑے اس نے دیکھا کہ ماما اور سائل صحن میں آئے اور میلے میلے برف پرسے چلکر باورچی خانہ کی طرف گئے۔ اولگا اپنے ساتھی پر عجیب بُری نظریں ڈال رہی تھی اور اظہار نفرت کے لئے مُڑ مُڑ کر تھوکتی جاتی تھی۔ ماما نے گودام کا دروازہ کھولا اور پھر زور سے کواڑ بند کئے۔ اسکورزو نے دل ہی دل میں کہا "شاید ماما بیگم چا پی رہی تھیں۔ سلوک مخل ہوئے۔ اسپر بگڑی ہوئی ہیں۔ یہ بھی عجیب مخلوق ہے"۔

پھر اُس نے دیکھا کہ یہ سائل، جھوٹ موٹ کا طالبعلم اور مدرس، لکڑی کے ایک بوٹے پر بیٹھ گیا، اپنا سر دونوں ہاتھوں میں لیا اور نہ معلوم بیٹھ کر کیا سوچنے لگا۔ ماما نے زور سے لا کر کلہاڑی اس کے پیروں کے پاس دے ماری اور پھر کچھ منہ بنا کر تھو تھو کرنے لگی۔ سائل نے لکڑی کا ایک ٹکڑا بڑی بے دلی سے اپنی طرف گھسیٹا اور پاؤں سے دبا کر اُس پر کلہاڑی چلائی۔ کلہاڑی پھسل گئی اور لکڑی ایک طرف اچھل کر گری۔ سائل نے اسے پھر ٹھیک ٹھیک رکھا اور پھر کلہاڑی چلائی لیکن وار بھرپور انہ پڑا اور لکڑی اچھل کر ایک طرف کو گری۔

اسکورزو کا غصہ فرو ہو چکا تھا۔ بلکہ اُسے اب اپنے طرز عمل پر کچھ شرم سی آنے لگی تھی۔ بھلا یہ کونسی انسانیت ہے کہ ایک تعلیمیافتہ، آرام طلب، اور شاید بیمار آدمی کو اس کڑاکے کی سردی میں اور ایسے سخت کام پر مجبور کیا جائے۔ لیکن اُس نے سوچا "کہ خیر، یہ سب اسکے فائدہ ہی کے لئے ہے"۔

کوئی آدھ گھنٹہ میں لوٹ آئی اور وکیل صاحب کو اطلاع دی کہ لکڑی سب چر گئی۔ "اچھا تو اسے ایک روپیہ دیدو اور اس سے کہدو کہ جی چاہے تو ہر مہینہ کی پہلی کو یہاں آکر لکڑیاں چیر جایا کرے۔ دنیا میں کام کی کمی نہیں ہے۔"

دوسرے مہینہ کی پہلی تاریخ کو سائل پھر موجود تھا۔ پیر لڑکھڑاتے تھے اور کھڑا ہونا مشکل تھا۔ مگر اس دفعہ بھی وہ ایک روپیہ کما کرلے گیا۔ اب تو یہ اکثر آنے لگا اور ہر مرتبہ اسے کچھ نہ کچھ کام مل ہی جاتا۔ کبھی راستہ سے برف ہٹانی ہوتی، کبھی صحن اور گودام میں جھاڑو دینی ہوتی، کبھی قالین اور دریاں جھاڑنی ہوتیں، اور ہر دفعہ اسے روپیہ بارہ آنے مل ہی جایا کرتے۔ اور ایک دفعہ تو کچھ پرانے کپڑے بھی مل گئے تھے۔

وکیل صاحب نے جب اپنا مکان بدلا تو اسی سے تمام سامان ٹھیک کرا کے بھجوایا۔ اس دفعہ تو اس کے حواس بھی درست تھے۔ یہ پئے نہ تھا لیکن ذرا چپ چاپ اور کھنچا کھنچا ضرور تھا۔ جب سامان گاڑی پر لد گیا تو یہ سر جھکائے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ گاڑی والوں نے اسکی کمزوری، اسکی سستی، اور اس کے پیوند لگے ہوئے کوٹ پر فقرے کسنے شروع کئے تو بیچارہ چپ رہا اور سردی میں سی سی کرتا سر جھکائے چلا گیا۔ جب اسکورزو دوسرے مکان میں پہونچ گیا تو اُس نے اسے اپنے کمرہ میں بُلایا اور اُس سے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ میرے الفاظ کا تم پر اثر ہوا ہے یہ لو، یہ پانچ روپیہ کا نوٹ ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ تم اب پیتے نہیں اور کام سے بھی جی نہیں چُراتے۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

"لُشکو"

"ٹھیک، میں اب تمہارے لئے ایک دوسرا بہتر کام تجویز کرتا ہوں۔ کیا تم لکھنا جانتے ہو؟"

"جی ہاں"

"تو یہ خط لیکر کل میرے دوست ــــ کے پاس جانا۔ وہ تمہیں نقل کے لئے کاغذات دیں گے۔ خوب جی لگا کر کام کرنا۔ پینا چھوڑ دو۔ اور میں نے تم سے جو کچھ کہا ہے اس کا خیال رکھو۔ اچھا۔ خدا حافظ۔"

اس بات سے دل میں خوش ہوکر کہ اس نے ایک انسان کو کام کا خوگر بنایا، اسکورزو نے سائل کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور رخصت کے وقت اس سے ہاتھ تک ملایا۔ لشکو خط لیکر رخصت ہوا اور پھر وکیل صاحب کے یہاں کبھی دکھائی نہ دیا۔

دو برس گزر گئے۔ ایک روز شام کے وقت اسکورزو ایک تھیٹر کے سامنے ٹکٹ خرید رہا تھا۔ اس کے بازو میں ایک شخص بالوں کا کوٹ پہنے اچھی سی ٹوپی لگائے کھڑا تھا۔ یہ آخری درجہ کا ٹکٹ مانگ رہا تھا اور قیمت میں تانبے کے ادھنّے دے رہا تھا۔

اسکورزو نے اپنے پُرانے لکڑی چیرنے والے کو پہچان لیا اور بول اٹھا "لشکو! کیا تم ہو؟ کہو، کیا کرتے ہو؟ کیا شغل ہے؟ کیا حال چال ہیں؟"

"شکریہ۔ بس گزرتی ہے۔ میں آجکل ایک مختار کے یہاں ملازم ہوں اور مہینہ میں ۳۵ روپیہ پاتا ہوں۔"

"اچھا۔ اچھا۔ بڑی خوشی کی بات ہے۔ یہ تو بہت ہی اچھا ہوا۔ لشکو! سچ کہتا ہوں مجھے یہ سنکر بہت ہی خوشی ہوئی کیونکہ میں نے ہی تمہیں کام سے لگایا۔ تمہیں یاد ہے کہ مَیں کیسا بگڑا تھا۔ تم مارے شرم کے زمین میں گڑے جاتے تھے۔ خیر، خدا کا شکر ہے کہ میری باتوں کا اثر ہوا۔"

لشکو نے کہا "میں آپ کا بہت ہی شکر گزار ہوں۔ اگر میں اس وقت آپ کے پاس نہ آیا ہوتا تو شاید اس وقت بھی اپنے کو طالب علم یا مدرس بتاتا ہوتا۔ جی ہاں۔ آپ ہی نے میری اصلاح کی۔"

"میں سچ کہتا ہوں مجھے بہت ہی خوشی ہے۔"

"میں پھر آپ کے الفاظ اور آپ کی مہربانیوں کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ نے اسوقت خوب کہا تھا۔ میں آپ کا بہت ہی شکرگزار ہوں۔ لیکن آپ سے زیادہ آپ کی ماما کا۔ خدا اس نیک اور ایماندار عورت پر اپنی رحمتیں بھیجے۔ آپ نے اس وقت خوب باتیں کہیں اور میں مرتے مرتے آپکا ممنون رہونگا لیکن نجات دلائی مجھے اُسی آپ کی ماما اولگا نے۔"

"میری ماں او لگانے؟ وہ کیسے؟"

"بہت معمولی طریقہ سے۔ جب میں آپ کے یہاں لکڑی پھاڑنے آتا، تو وہ شروع کرتی "اے شرابی۔ بدقسمت آدمی۔ چلتا کیسے ہے، ابھی تک ختم کیوں نہیں ہو گیا؟" پھر وہ میرے سامنے بیٹھ جاتی، نہایت غمگین آنکھوں سے مجھے دیکھتی، روتی اور کہتی: "بدنصیب کمبخت! تیرے لئے اس دنیا میں کوئی آرام نہیں کوئی خوشی نہیں اور شرابی ہے، اُس دنیا میں بھی جہنم میں جلیگا۔ ہے ہے غریب گنہگار"۔ غرض ہمیشہ اسی قسم کی باتیں کیا کرتی۔ اس نے میری وجہ سے کتنی کوفت نہیں اُٹھائی۔ کتنے آنسو میری ہمدردی میں نہیں بہائے۔ میں آپ سے کیا بیان کروں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس نے ہمیشہ میری جگہ آپ کی لکڑیاں پھاڑیں۔ آپ کو معلوم بھی ہے، میں نے آپ کے مکان میں ایک چیپ لکڑی کی نہیں پھاڑی۔ وہ یہ سب کیوں کرتی تھی اور اُس کے اثر سے میں کیسے بالکل بدل گیا اور پینا کیسے چھوڑ دیا۔ میں خود نہیں بتا سکتا۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ اس کی باتوں سے اور اس کے شریفانہ برتاؤ سے میری روح میں ایک انقلاب ہو گیا۔ میری اصلاح اُسی نے کی اور میں اُسے کبھی نہ بھولوں گا..... لیکن معاف فرمائیے۔ اب وقت ہو گیا ہے، وہ گھنٹی بج رہی ہے۔"

لشکو نے سلام کیا اور اپنے درجہ میں جا داخل ہوا۔

غزل

(از مولانا محویؔ صدیقی)

اک ذرا بجلی سی چمکی تھی نقابِ یار سے
جگمگا اُٹھی ہے دنیا تابشِ انوار سے

بے خبر تھی بزم حسن و عشق کے اسرار سے
ہو گئیں سرگوشیاں دل اور نگاہِ یار سے

دلکی رنگیں حسرتیں تھیں خونکی بوندیں نہ تھیں
رات بالیں پر جو ٹپکیں دیدۂ بیدار سے

بیخودیٔ شوق کی اللہ رے سادہ دلی!
آرزوئے التفات اور وہ بھی چشمِ یار سے!

لڑکھڑا کر جب گرا تو پائے ساقی پر گرا
یہ ہوا ہے کام اک دیوانۂ ہشیار سے

اِس قفس کی زندگی نے کر دیا ایسا اُداس
جی نہ بہلا پھر کبھی نظارۂ گلزار سے

ہیں وہی نا آشنائے لذّتِ دیوانگی
جو نظر آتے ہیں اِس محفل میں کچھ ہشیار سے

اِک نظر میں ہو گیا دل بے نیازِ کائنات
نعمتِ دارین کیا پائی نگاہِ یار سے

تھا کچھ ایسے درد سے لبریز سوزِ دل کا حال
چھا گیا محشر میں سناٹا مری گفتار سے

دیدنی ہیں دستِ قدرت کی ستم آرائیاں
پھول ہم آغوش گلشن میں ہوئے ہیں خار سے

بن گیا ناسور وہ زخم جگر اے ضبطِ غم
آج تک جسکو چھپایا اپنے ہر غمخوار سے

جی بھر آیا آ گئی محویؔ جوانی اپنی یاد
جھوم کر اُٹھی گھٹا جب دامنِ کہسار سے

دوشیزۂ سحر

(از حضرت درد کاکوروی)

دوشیزۂ سحر تو محبوبۂ فلک ہے
تیری جبینِ روشن فطرت کی اک جھلک ہے

آمد کے تیری ہر سو سب راگ گا رہے ہیں
جنگل کے بسنے والے تانیں اڑا رہے ہیں

کیفِ مجسم ایسا رقصاں طیور میں ہے
ہر طائرِ خوش الحاں گویا سرور میں ہے

اسدرجہ خامشی سے دریا جو بہہ رہے ہیں
فطرت کے چپکے چپکے سب راز کہہ رہے ہیں

دوشیزۂ سحر کی آنے کو ہے سواری
کیوں چھوڑ دیں نہ رستہ تاریکیاں فضا کی

کرنی چلی تھی فطرت ہر ایک شے پہ پالش
اک دم ہوئی ہوا کو پھر غیب سی جو جنبش

اتنے میں اک حسینہ رقصاں ہوئی فضا میں
خورشید کی کرن تھی ٹانکے ہوئے ردا میں

وہ دیکھو ظلمتوں کو پُر نور کر رہی ہے
عالم میں نام اپنا مشہور کر رہی ہے

ہر پتہ رقص میں ہے ہر ڈالی جھومتی ہے
دوشیزۂ سحر کے قدموں کو چومتی ہے

دوشیزۂ سحر تو جلوے دکھا رہی ہے
فطرت کی جلبنوں سے یا مسکرا رہی ہے

یہ تیری مسکراہٹ رنگینیوں کی ہیکل
عالم کا کھولتی ہے دروازۂ مقفل

وہ دیکھو لے رہی ہے دل میں نسیم موجیں
آغوش میں لئے ہے نور سحر کی فوجیں

شبنم کے برگِ گل پر قطرے پڑے ہوئے ہیں
فطرت کے یا چمن میں موتی جڑے ہوئے ہیں

کیا مست کر رہے ہیں طائر چہک چہک کر
کیا نغمے گا رہی ہیں چڑیاں پھدک پھدک کر

اے دردؔ ہو گیا ہوں دیوانۂ سحر میں
ایلائے رنگ و بو ہے عالم مری نظر میں

*

"ہندو کُش" عالمگیر کے عہد

کی

دو عجیب ہندو کتابیں

(کتبخانۂ جامعہ میں)

جامعہ ملیہ کی پُراصرار دعوت پر مجھے ایک ہفتہ کے لئے جامعہ آنا پڑا' اور اسی تقریب سے اُس کے کتبخانہ کی سیر کرنی پڑی۔ ارباب جامعہ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے آٹھ برس کی مختصر مدت میں اپنے دوسرے شعبوں کے ساتھ اپنے کتبخانہ کو بھی قابل قدر حد تک وسعت دی۔ اس وقت اُس کے کتبخانہ میں کم وبیش آٹھ ہزار کتابیں ہیں جن میں عربی' فارسی' انگریزی اور اُردو کی کتابیں داخل ہیں' جو قرینہ کے ساتھ الماریوں میں رکھی ہیں اور مرتب ہیں۔ ان میں ڈھائی سو کے قریب عربی اور فارسی کی قلمی کتابیں ہیں جنکی ہنوز ترتیب کی نوبت نہیں آئی تھی میں نے اپنے مختصر قیام میں ان کتابوں کو دیکھا اور ان میں بعض ایسی کتابیں پائیں جو مختلف حیثیتوں سے قدر کے قابل تھیں منجملہ ان کے دو کتابیں مجھے نہایت عجیب معلوم ہوئیں کہ ان کا کوئی نسخہ اب تک میری نظر سے نہیں گزرا تھا۔

اِن دونوں کتابوں کی ندرت اور قدر کا سبب یہ ہے کہ یہ دونوں کتابیں اُس اورنگ زیب عالمگیر کے عہد کی تصنیف ہیں جس کو اُس کے دشمن اور مخالف' ہندو کش' ہند وعلوم وفنون کا برباد کرنے والا' ہندو مذہب کو تباہ کرنے والا' ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنانے والا مشہور کرتے رہے ہیں' لیکن دوسری شہادتوں اور دلیلوں کے ساتھ آج یہ دو مردہ خاموش کتابیں زندہ اور گویا شاہد ہیں جو علی الاعلان یہ گواہی دیتی ہیں کہ اُس مرحوم بادشاہ پر یہ تمام الزام تہمت ہیں۔

ان میں سے ایک کتاب کا نام "مت اچھرا" اور دوسری کا نام "ردّ کفر" ہے۔ یہ دونوں کتابیں اپنے عہد کی دو مخالف اور متضاد منظروں کو پیش کرتی ہیں۔ پہلی کتاب ایک پکے ہندو کی تالیف ہے اور دوسری

ایک نومسلم ہندو کی پہلی کتاب کا مقصد سنسکرت نہ جاننے والے ہندوؤں کو اُن کے مذہب سے آگاہ کرنا ہے، اور دوسری کا بت پرست ہندوؤں کو اسلام کا راستہ دکھانا ہے۔ ان دونوں کتابوں کی زبان فارسی ہے، جو اُس زمانہ میں تمام ہندوستان کی ادبی اور علمی زبان تھی۔

۱۔ مت اچھرا

یہ کتاب بڑی تقطیع کے ۲۱۴ صفحوں میں ہے۔ کتاب کا یہ نسخہ فرخ آباد میں ۱۴ فروری ۱۸۴۸ء مطابق ۹ ربیع الاول ۱۲۶۴ھ کو اختتام کو پہنچایا ہے۔ کاتب کا نام سید کلام الدین شاہ قادری ساکن فرخ آباد ہے، کاتب مذکور نے یہ نسخہ قاضی محمد غلام محی الدین خاں "سررشتہ دار محکمہ کچہری صدر امین اعلیٰ" کے لئے لکھا ہے، جیساکہ اس کے آخر میں بیان ہے۔

کتاب کی فارسی زبان خاصی ہے، جا بجا اصطلاحات ہندی اور سنسکرت کے استعمال کئے ہیں، افسوس ہے کہ نسخہ بیحد غلط ہے۔ دیباچہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جاک بلک (اور خاتمہ میں جاگ ولگ ہے) نام ایک رکھیسر (؟) نے بکرماجیت کے زمانہ میں اس کتاب کو اشلوک میں لکھا تھا۔ اس کا نام "سمرت جاک بلک" مشہور ہوگیا تھا۔ چونکہ وہ بہت مشکل کتاب تھی، اس لئے گوسائیں بکیانیر (؟) نے اس کو نئے سرے سے مرتب کیا اور اس کا خلاصہ کیا، اور "مت اچھرا" نام رکھا۔ اسی خلاصہ کا سلطان اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ میں لعل بہاری دلدرائے کاہید سنگھ نے جو بھوجپور ضلع شاہ آباد قنوج کا رہنے والا تھا، اور جو اورنگ زیب کے درباری امیر اللہ وردی خاں کا متوسل تھا، ۱۰۶۵ھ میں سوبھا سکر پنڈت کی مدد سے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا، تاکہ سنسکرت سے ناواقف اس کو سمجھ سکیں اور فائدہ اٹھائیں۔ یہ سوبھا سکر پنڈت سنسکرت کے بڑے ماہر تھے، اسلام آباد عرف منچھولی واقع سرکار گورکھپور کے باشندہ تھے۔

کتاب کا موضوع جیساکہ دیباچہ میں ہے "احکام و مذاہب و اوامر و مناہی (نواہی؟) ہنود" ہے۔

کتاب تین مقالوں پر منقسم ہے اور ہر مقالہ میں متعدد فصلیں ہیں۔

مقالہ اول "در آچار دھیائے کہ آنرا بزبان عرب عبادت گویند"، اسمیں ۹ فصلیں ہیں۔

مقالہ دوم " در بیوپار ادھیائے کہ عبادت از معاملات باشد" اسمیں ۵۴ فصلیں ہیں۔
مقالہ سوم " در پرائشچت ادھیائے کہ آں را کفارت (کفارہ ؟) خوانند" اسمیں ۰۰ فصلیں ہیں۔
فصلوں کی تفصیل تو مشکل ہے مگر اس ترتیب و تعبیر سے صاف نظر آتا ہے کہ اس زمانہ کے "روشن خیال" ہندوؤں کی یہ کوشش تھی کہ وہ اپنے شاستر کو اسلامی فقہ کے نمونہ پر تیار کریں، جس طرح آج ہمارے محکوم روشن خیال اپنی اسلامی فقہ کو انگریزی قانون کی صورت میں ڈھالنے کے لئے بیقرار ہیں۔
اس کتاب کے دیباچہ میں "ہندوکش عالمگیر" کو جن آداب و القاب سے یاد کیا گیا ہے، وہ آج ہمارے ہندو بھائیوں کے پڑھنے کے لائق ہے۔

"اکنوں کہ دریں عہد بادشاہ، خلافت پناہ، عادل، مظفر، مؤید، ظل اللہ، سلیماں بارگاہ، مظہر الطاف الٰہی، مطلع انوار بادشاہی، مجسم داد و کرم، قامع آثار جفا و ستم، برداشتۂ حضرت منان، گماشتۂ ایزد سبحان، خورشید برج خلافت، مشتری آسمان سلطنت، ظل ظلیل سبحانی، واسطہ انتظام انسی و جانی، شیرازۂ نسخۂ اسلام، ماحی بدعت کفر و ظلام، مالک ہفت اقلیم، زینت افزائے تخت و دیہیم، وارث ملک سلیمانی، فروغ دودمان صاحب قرانی، خسرو فلک اقتدار، بادشاہ خورشید اشتہار سلطان بن سلطان، خاقان زمین و زماں، مجیب ؟ فرمانروایان حال و ماضی ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب بہادر عالمگیر بادشاہ غازی، خلد اللہ ملکہٗ و سلطانہٗ، کہ دورش چوں دور قدح پر نشاط، و زمانش مانند ایام شباب پر سرور و انبساط، روز بازار فضل و دانش است، ہندی نژادان فارسی دولت دانظم و نثر از حد بیشتر است۔"

غور کیجئے کہ یہ کتاب سرکاری حیثیت سے نہیں لکھی جارہی تھی اور نہ بادشاہ کے دربار میں پیش کئے جانے کی غرض سے ترجمہ کی جارہی تھی، مگر بایں ہمہ ان جذبات کا ادا ہونا یہ ظاہر کررہا ہے کہ اُس عہد کے ہندو اُسکو کیا سمجھ رہے تھے، اور آج اُس کو کیا سمجھ رہے ہیں۔
آگے چلکر وہ اپنا اور اپنے آقا کا کس محبت اور منت شناسی کے جذبہ کے ساتھ ذکر کرتا ہے:۔
" پیش نہاد خاطر احقر العباد لعل بہاری ولد رای برای کاہیدسنگھ متوطن بیوجیو رمن

مضافات سرکار شاہ آباد عرف قنوج متعلق بصوبہ اکبرآباد کہ رگ و پے این تربیت یافتہ یک خاندان والا دودمانِ عزو علا نواب سپہر جناب، خورشید القاب، عالمیان تاب، رکن السلطنۃ العظمیٰ اعتقاد الخلافۃ الکبریٰ، سزاوار است آں عیوقی، چراغ دودمانِ سلجوقی، بسط الطاف بادشاہی، منظور انظار خلیفۂ الٰہی نواب اللہ وردی خاں عالمگیر شاہی است "

کیا یہ سطریں آج انقلاب روزگار کی تصویریں نہیں ؟

۲ - ردّ الکفر

دوسری کتاب کا نام " ردّ الکفر بحجّت القوی " ہے۔ اس کتاب پر قاضی محمد ولد قاضی محمد باقر کی ملکیت کی مہر ہے۔ اور معلوم نہیں کہاں سے جامعہ میں آگئی ہے۔ اس کا مصنف نو مسلم ہندو ہے۔ اس کا پہلا نام ہر کشن تھا اور اسلامی نام عبد القوی ہے۔ وہ سامانہ کا رہنے والا تھا، جو پنجاب میں ایک مقام ہے، مقدمہ میں وہ عالمگیر کا ذکر اور اس کتاب کی کیفیت اس طرح لکھتا ہے:۔

" بندہ فقیر حقیر عبد القوی ساکن سامانہ بخدمت اہلِ اسلام التماس می دارد کہ قبل ازیں نام فقیر ہر کشن بود، ایمان آورد بر دین حضرت رسالت پناہ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کہ حق است، وکفر باطل، کفر را رد ساختہ، اسلام را حق شناختہ، نام خود را عبد القوی نہاد.... شوال ۱۱۰۱ھ از دورِ خلافت ظل سبحانی خلیفۃ الرحمانی ابو المظفر محی الدین محمد اورنگ زیب بہادر عالمگیر بادشاہِ غازی، صدقہ کہ صدق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عدلہ کہ عدل حضرت عمر خطاب رضی اللہ عنہ، علمہ کہ علم حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، وشجاعتہ کہ شجاعت حضرت شاہ مرتضیٰ علی کرم اللہ وجہہ، خلد اللہ ملکہٗ و عمرہٗ وسلطنتہ در خاطر رسید مردمان کہ در کفر اند...... (عبارت غلط ہے) رد کفر در قلم باید آورد و تا کذب کفر و صدق اسلام معلوم گردد۔ و اگر مسلمان بخوانند سلامتی ایمان است، اگر کافر بخواند در باب ایماں خدائے تعالیٰ خوب خواستہ باشد مسلمان شود، نام این کتاب ردالکفر بحجت القوی (مصنف کے نام کی تلمیح ہے) نہادہ شد، امید کہ این نسخہ کمترین

بندگان بدست مسلمان کہ برسد کیفیت ایں رسالہ منتشر گرداند سعادت دارین یابد بطرف دلائل وعقاید نظر کنند نہ بطرف املا وانشا نظر کنند، اگر خطا شدہ باشد اصلاح بدہد ایں نیز ثواب ایماں باشد۔"

اس رسالہ کی زبان معمولی ہے۔ ۲۹ حقیقتوں پر یہ کتاب مشتمل ہے۔ آخر سے کچھ ناتمام ہے۔ ہر حقیقت کے تحت میں ہندوؤں کے مختلف عقائد و رسوم کو لیکر اس کی تفصیل کی ہے اور اسکی خرابیاں دکھائی ہیں اور اس کے مقابل میں اسلام کی خوبیاں بتائی ہیں۔

بہرحال اگر اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں ایسے نومسلم ہندو ہوتے تھے تو کون کہہ سکتا ہے کہ عالمگیر کے زمانہ میں دلائل کے زور کے بجائے تلوار کے زور سے ہندوؤں کو مسلمان بنایا جاتا تھا۔

سید سلیمان ندوی

فاؤسٹ کے چند ورق

فاؤسٹ جرمنی کے بادشاہ سخن گوئٹے کا مشہور ڈراما ہے۔ میں جناب مولوی عبدالحق صاحب قبلہ کی فرمائش سے اس کا ترجمہ کر رہا ہوں جو انشاء اللہ اکتوبر تک انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع ہو جائے گا۔ اس کا ایک ٹکڑا نمونہ کے طور پر ناظرین جامعہ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

یہ ایک دیباچہ ہے جس میں گوئٹے نے دکھایا ہے کہ ڈراما لکھنے والے کو کس طرح مختلف مذاق کے لوگوں کی خوشنودی کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔

(عابد)

تماشاگاہ کا تمہیدی سین

نیجر، شاعر، مسخرا۔

نیجر۔ تم دونوں نے بارہا مصیبت اور پریشانی میں میری مدد کی ہے، اب یہ تو کہو، تمہارے خیال میں ہمارا کام جرمنی کی سرزمین میں چلے گا یا نہیں؟ مجھے تو عوام کو خوش کرنے کی فکر ہے کیونکہ اُن کا عمل اس پر ہے "جیو اور جینے دو"۔ کھمبے کھڑے ہو چکے ہیں، تختے جڑے جا چکے ہیں۔ اب ہر شخص ہم سے روحانی ضیافت کی توقع رکھتا ہے۔ وہ دیکھو تماشائی پالتی مارے، بھویں چڑھائے بیٹھے ہیں اور ایسی چیز دیکھنا چاہتے ہیں جس سے وہ حیران رہ جائیں۔ میں اُن کے مذاق کو خوب سمجھتا ہوں، لیکن اس بار میں ایسا پریشان ہوں کہ کبھی نہ تھا۔ یہ مانا کہ وہ اعلیٰ درجے کے تماشے دیکھنے کے عادی نہیں، لیکن کمبخت ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ آخر انہیں کیا چیز دکھائیں جو نئی اور انوکھی ہو، معنی خیز ہو، مگر ساتھ ہی دلچسپ بھی ہو؟ کیونکہ سچ پوچھو تو مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ میرے چھوٹے سے تھیٹر میں تماشائیوں کا ہجوم ہے۔ اور وہ چیختے چلاتے، داخلے کے تنگ دروازے پر یوں پلے پڑتے ہیں گویا وہ جنت کا دروازہ ہے۔ چار بجے دن ہی سے ٹکٹ گھر کے سامنے ان میں دھکم دھکا

ہونے لگتی ہے، اور ہر شخص ٹکٹ کے لئے جان لڑا دیتا ہے جیسے قحط کے زمانہ میں نان بائی کی دوکان پر۔ یہ معجزہ بس شاعر ہی دکھا سکتا ہے، تم بھی آج یہ دکھا دو تو کیا بات ہے۔

شاعر۔ میرے سامنے اس رنگ برنگ مجمع کا نام نہ لو، جسے دیکھ کر رحمت خیال رخصت ہو جاتی ہے۔ مجھے اٹھتی ہوئی لہروں کا یہ سیلاب نہ دکھاؤ جو ہمیں زبردستی اپنے ساتھ بہالے جاتا ہے۔ مجھے تو اس گوشۂ تنہائی میں لیجاؤ جہاں بہشت کا سا سکون ہے۔ جہاں اس خالص مسرت کے پھول کھلتے ہیں جس کا لطف بس شاعر ہی اٹھا سکتا ہو جہاں دل کو محبت اور دوستی کی سعادت نصیب ہوتی ہے۔ وہ باغ جسے خدا نے اپنے ہاتھ سے لگایا اور سنوارا ہو۔ ہائے کیا غضب ہے کہ وہ اچھوتے مضامین جو شاعر کے قلب کی گہرائی میں پیدا ہوتے ہیں، اور جنہیں اسکی زبان ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں، بُرے بھلے انداز سے بیان کرتی ہے، موجودہ لمحے کی اشتہا کا لقمہ بن جاتے ہیں حالانکہ اکثر شاعر کی افکار برسوں کی ریاضت کے بعد مکمل صورت میں ظاہر ہوا کرتی ہیں۔ ملمع کی چیزیں موجودہ لمحے کی لئے ہیں، اور کھرا سونا آئندہ نسلوں کے لئے امانت رہتا ہے۔

مسخرا۔ آئندہ نسلیں! بخشئے حضرت، اگر میں آئندہ نسلوں کی فکر میں رہوں تو موجودہ نسلوں کو کون ہنسائے؟ یہ بھی تو ہنسنا چاہتی ہیں اور کیوں نہ ہنسیں؟ مانا کہ یہ لوگ بچے ہیں مگر بچے بھی تو آخر انسان ہیں، جسے اپنے خیالات دلچسپ پیرائے میں بیان کرنا آتا ہے وہ عوام کے تلون کا رونا نہیں روتا، اس کے لئے تو جتنا بڑا دائرہ ہو اتنا ہی اچھا۔ اس میں اُس کی اور بھی جیت ہے۔ تو سمجھے بھائی ذرا ہمت کر ڈالو، ہمیں وہ گیت بناؤ جس میں تخیل اپنے پورے طائفے کے ساتھ ہو اور حکمت بھی ہو، عقل سلیم بھی ہو، جذبات بھی ہوں، جوش بھی ہو، مگر یہ یاد رہے، مسخرا پن بھی ضرور ہو۔

منیجر۔ خصوصاً واقعات بہت سے ہوں۔ لوگ اس لئے آتے ہیں کہ کچھ ہوتا ہوا دیکھیں۔ اگر قصے میں بہت سے دلچسپ سین ہوں، کہ لوگ حیرت سے منہ پھیلائے دیکھا کریں تو بس سمجھ لو کہ تمہاری شہرت پھیل گئی، اور تم ہر دلعزیز ہو گئے۔ بہت لوگوں کو رجھانے کے لئے بہت سی چیزیں چاہئیں تاکہ ہر شخص کو کوئی چیز اپنے ڈھب کی مل جائے۔ جو بہت کچھ دیتا ہے وہ بہتوں کو کچھ دیتا ہے اور ہر شخص خوش خوش گھر جاتا ہے۔ اگر تم قصہ دکھاتے ہو تو ٹکڑے ٹکڑے کر کے دکھاؤ۔ ایسے پسندے لوگوں کو پسند آئیں گے۔ ایسا قصہ لکھنا بھی آسان ہے اور دکھانا

بھی آسان، اگر مسلسل تماشا دکھایا بھی تو کیا فائدہ، دیکھنے والے سلسلے کو توڑ ہی کے دیکھیں گے۔

شاعر - اور تماشا جو مٹی میں ملجائے گا! اگر تمہیں اس کا کیا احساس، تم کیا جانو اس میں شاعر کی کیسی ذلت ہے۔ تم تو بازی گر شاعروں کی تک بندی کا کلمہ پڑھتے ہو۔

منیجر - تم خوب اعتراض کرو میں برا نہیں مانتا۔ جو کوئی اپنے کام میں کامیابی چاہتا ہے، وہ مناسب اوزار استعمال کرنے پر مجبور ہے۔ اتنا تو سوچو تمہیں کن خامکاروں سے سابقہ ہے، جن کیلئے تم لکھتے ہو ذرا ان کو بھی تو دیکھو۔ کوئی (تماشے میں) بے شغلی سے اکتا کر آیا ہے، کوئی الوانِ نعمت سے سیر ہو کر، اور قیامت تو یہ ہے کہ اکثر لوگ اخبار چھوڑ کر آئے ہیں۔ بہتوں کو سوانگ دیکھنے کی امید، شوق کے پروں پر اڑا کر لائی ہے۔ خواتین بناؤ سنگار کیے ہوئے (بالانشین تماشائیوں کو) مفت کا تماشا دکھاتی ہیں۔ تم تو اپنے شاعری کی چوٹی پر تخیل کے مزے لیتے ہو، تمہاری بلا سے تھیٹر بھرا ہو یا خالی ہو۔ ذرا اپنے قدردانوں کو قریب سے دیکھو، آدھے بھیس ہیں اور آدھے بے تمیز۔ ایک تو تماشے سے جا کر تاش کھیلے گا، اور دوسرا کسی بیوہ کے آغوش میں رات گزاریگا۔ ان بیچارے سادہ لوحوں کو کیوں ستاتے ہو، کہاں یہ اور کہاں آرٹ کی دیویاں! بس تم تو لکھتے جاؤ، لکھتے جاؤ، اور لکھو، اور لکھو، پھر تمہاری کامیابی یقینی ہے، ایسی ترکیب کرو کہ لوگ چکر میں آجائیں، ان کو خوش کرنا تو بہت مشکل ہے۔ ہائیں یہ تمہیں کیا ہوا۔ خوش ہو گئے یا خفا ہو گئے؟

شاعر - جاؤ دور ہو یہاں سے، کسی اور غلام کو ڈھونڈ! کیا خوب! شاعر تیری خاطر اپنے عزیز ترین حق کو، فطرت کے عطا کیے ہوئے حقِ انسانیت کو، مسخرے پن میں برباد کر دے! اُس کے پاس کیا چیز ہے جس سے وہ دلوں کو ہلا دیتا ہے، اور سارے عناصر پر حکمرانی کرتا ہے، بجز اُس ہم آہنگی کے جو اُس کے دل کو ساری کائنات سے متحد کر دیتی ہے؟ جب فطرت ابدی رشتۂ تقدیر کو بے پروائی سے کات کر بل پر بل دیے جاتی ہے اور ربابِ زندگی کے اُلجھے ہوئے تاروں سے بے سُری صدائیں نکلکر سامعہ خراشی کرتی ہیں تو کون دیدہ ریزی سے ان تاروں کو سلجھاتا ہے اور اُن کو کس کر نغمۂ حیات میں روانی پیدا کرتا ہے؟ کون انفرادی روح کا سُر کائنات کے مہا سُر سے ملا کر ہم آہنگ، دلکش راگ سناتا ہے؟ کون جذباتِ قلب کی شورشوں سے طوفان کا منظر دکھاتا ہے؟ کون سنجیدہ تفکر سے شفق شام کا سماں باندھتا ہے؟ کون بہار کے سارے خوش رنگ پھولوں کو محبوب

کی رہ گزر میں بچھا دیتا ہے؟ کون بے حقیقت سبز پتوں سے عزت کے ہار بنا کر سورما کے گلے میں ڈالتا ہے؟ کون کوہ اولمپس[1] کی حفاظت کرتا ہے اور دیوتاؤں میں میل کراتا ہے؟ وہی قوتِ انسانی کا اعلیٰ مظہر جسے شاعر کہتے ہیں۔

مسخرا اچھا اب مجھ سے سنئے یہ قوت کیونکر ظاہر ہوتی ہے، شاعری کا دھندا اسی طرح چلتا ہے جیسے عاشقی کا سودا ہوا کرتا ہے۔ کوئی اچھی صورت نظر آئی دل پر چوٹ لگی، قدم رُک گئے اور رفتہ رفتہ ہم دام الفت میں اسیر ہو گئے، پہلے تو قسمت یاوری کرتی ہے پھر اُس سے لڑائی ٹھن جاتی ہے پہلے زمانے کے مسرت کی ایک جھلک دکھائی پھر ستم ظریفی شروع کر دی۔ بس چشم زدن میں ایک رومان تیار ہو گئی۔ آؤ ہم بھی ایک تماشا دکھائیں بس اپنا موضوع انسانی زندگی کو بنا لو، اسے بسر سب کرتے ہیں مگر سمجھتے کم ہیں، اُس کا جو رخ لیلو وہی دلچسپ ہے۔ گوناگوں تصویریں ہوں مگر روشنی کم، غلطیوں کا انبار اور حقیقت کی ایک ذراسی چنگاری اس نسخے سے وہ نادر شراب بنتی ہے جس سے ساری دنیا کو سُرور اور تقویت حاصل ہو۔ پھر دیکھنا تمہارے تماشہ میں کیسے کیسے حسین جوان آتے ہیں اور تمہاری لن ترانیوں کو کس شوق سے سنتے ہیں۔ پھر ہر درد آشنا دل تمہارے کلام سے حسرت واندوہ کا لطف اُٹھائے گا، کوئی بات ایک کو تڑپائے گی، کوئی دوسرے کو اور ہر شخص کو وہی چیز نظر آئیگی جو اُس کے دل میں ہے۔ یہ نوجوان اب تک ذراسی بات میں ہنسنے اور رونے لگتے ہیں۔ اب تک زورِ کلام کی قدر کرتے ہیں اور ظاہری خوبیوں پر سر دُھنتے ہیں۔ پختہ مغزوں سے بیشک کوئی امید نہیں لیکن خام کار نوجوان تمہیں ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

شاعر اچھا تو مجھے بھی وہ دن واپس لا دو جب میں انکی طرح جوان تھا، جب میرے سرچشمۂ فکر سے لگاتار نئے نئے نغمے اُبلتے تھے، جب دنیا میری نظروں میں ایک طلسم اسرار تھی اور ہر کلی ایک رازِ سربستہ۔ آہ اُس زمانے میں سب وادیاں پھولوں سے مالا مال تھیں اور یہ سب پھول میرے دامن میں تھے۔ میرے پاس کچھ نہ تھا اور سب کچھ تھا۔ یعنی ایک دل جس میں حقیقت کی طلب تھی اور مجاز کا عشق لاؤ مجھے وہ من

---

[1] یونانی علم الاصنام میں اولمپس اُس پہاڑ کا نام ہے جہاں دیوتا رہتے ہیں۔

کی موجیں اسی اگلی سی وحشت کے ساتھ واپس دے دو۔ وہ گھری پُر درد لذتیں، وہ نفرت کی قوت اور محبت کی طاقت، لاؤ پھر مجھے جوانی بھیر دو۔

مسخرا۔ میرے پیارے دوست تمہیں جوانی کی ضرورت جب ہوتی کہ تم میدانِ جنگ میں دشمنوں کے نرغے میں گھرے ہوتے یا کوئی خوبصورت نازنین تمہارے گلے میں بانہیں ڈالکر زور سے بھینچ لیتی، یا تم دوڑ میں مقابلہ کرتے اور انتہا تک پہونچنے کی قوت نہ پاکر انعامی ہار کو دور سے دیکھ کر للچاتے، یا دیوانہ وار رقص کرنے کے بعد رنگ رلیاں مناتے اور شراب وکباب میں رات بسر کرنے کے قصد سے بیٹھتے۔ مگر بڑے میاں، تمہارا کام تو یہ ہے کہ ساز زندگی کے جانے بوجھے تاروں کو ہمت اور خوش اسلوبی کے ساتھ بجاؤ اور جو منزل تمہارے پیش نظر ہے وہاں تک بھٹکتے بھٹکتے پہنچ جاؤ۔ یقین جانو کہ اس سے ہمارے دل میں تمہارا احترام کم نہیں ہوتا۔ یہ غلط ہے کہ بڑھاپے میں بچپن لوٹ آتا ہے بلکہ بڑھاپے میں بھی بچپن نہیں جاتا۔

منیجر۔ بس باتیں بہت ہوچکیں اب عمل کی باری ہے۔ جتنا وقت اس چنین وچناں میں ضائع ہوا اسمیں کوئی مفید کام ہوسکتا تھا۔ یہ بیکار عذر ہے کہ طبیعت موزوں نہیں۔ جو ہچکچاتا ہے اُس کی طبیعت کبھی موزوں نہیں ہوتی۔ جب تم شاعر بنتے ہو تو شاعری کی باگیں سنبھالو۔ تم جانتے ہو کہ ہمیں کس چیز کی ضرورت ہے، ہمیں زوردار شراب معنوی چاہیئے، بس دیر نہ کر وجھٹ پٹ تیار کردو۔ جو کام آج نہ ہوا وہ کل بھی نہ ہوگا۔ کوئی دن بیکار نہ کھونا چاہیئے۔ ہمت مردانہ وقت کو ایسا مضبوط پکڑتی ہے کہ وہ نکل کر جا نہیں سکتا تب اُسے چار ناچار کام کرنا پڑتا ہے۔

تم جانتے ہو کہ ہماری جرمن اسٹیج پر جس کا جو جی چاہے دکھا سکتا ہے اس لئے تم بھی پردوں اور مشینوں سے دل کھول کر کام لو، ہلکی اور تیز روشنی دونوں کو استعمال کرو اور ستاروں کی بھرمار کردو۔ ہمارے یہاں پانی، آگ، پہاڑ، چرند، پرند کی کمی نہیں۔ بس اسی لکڑی کے تنگ گھروندے کے اندر ساری کائنات کا نقشہ دکھادو، آسمان سے زمین، زمین سے پاتال تک سیر کرو، تیزی سے مگر سنبھلے ہوئے۔

اِقتباسات

"یورپ کا فرض"

جو لوگ یورپ کو مذہب اور روح کا دشمن سمجھتے ہیں اور جن کیلئے روس اور امریکہ بھی اسیطرح 'یورپ' ہیں جیسے خود یورپ' وہ جرمنی کے مشہور فلسفی کاؤنٹ کیزرلنگ کی نئی کتاب 'یورپ' کو بڑی حیرت آمیز دلچسپی سے پڑھینگے ۔ وہ اس کتاب میں ایک جگہ کہتا ہے: "آج یورپ کے ذمہ جو فرض عاید ہوتا ہے اس سے بڑا فرض اِسپر کبھی عاید نہیں ہوا تھا۔ روح کی جو تاریک اور طولانی رات اس وقت انسانیت کے سامنے نظر آتی ہے اسمیں روح کے مقدس شعلہ کی حفاظت کرنا اور اسے بجھنے سے بچانا یورپ کے اور صرف یورپ کے سپرد کیا گیا ہے۔" جدید یورپ کے اہلِ نظر میں اس وقت دو متضاد مذاہب کا پتہ چلتا ہے' ایک وہ ہیں جو وضاحت اور عقلیت پر اصرار کرتے ہیں' دوسرے وہ جو انسان کے وجدانِ ابتدائی پر مصر ہیں اور چاہتے ہیں کہ عقل کو جبلت و وجدان کے تاریک لیکن صحت بخش اور روح پرور چشمۂ حیات کے پانی سے بپتسمہ دیں۔

جرمن مورخ اشپنگلر بتا چکا ہے کہ بربریت سے چلکر انحطاط تمدن تک کا چکر جو ہر تمدنی زندگی کو پورا کرنا ہوتا ہے وہ یورپ کیلئے بھی قریب الختم ہے۔ اور اب کیزرلنگ بتاتا ہے کہ بالشوزم ایک نئے دور کا بربری آغاز ہے جس کا پہلا کام یہ ہے کہ مشرق کے انسانوں کو مادی تہذیب کی بلند ترسطح پر پہنچا دے۔ امریکہ میں بھی اسے یہی چیز دکھائی دیتی ہے یعنی تمامتر توجہ کا مادی اور جماعتی مقاصد پر مرکوز ہونا اور شخصیت و امارت کی طرف سے ہٹا ہونا۔ اس طرح امریکہ بھی اس کے نزدیک ایک نئے دورِ تہذیب کا بربری آغاز ہے اور یورپ ان دو عظیم الشان زنبوں کے درمیان آپھنسا ہے جن میں صدیوں تک روحانی مقاصد اور قدریں نظر انداز کیجائیں گی۔ بعض جدید ماہرین نفسیات کا خصوصاً آدلر کا ذکر کرکے کیزرلنگ کہتا ہے کہ اس نئے فلسفہ اور اس نئی امریکی حقیقت دونوں کا

مطمح نظر دراصل وہی ہے جو روسی اشتراکیت کا ہے یعنی " انسان اپنی انفرادی شخصیت کو جماعت . میں ' گروہ میں " پھر گم کردے۔

لیکن اگر امریکہ اور روس اس مقدس شعلہ کے صحیح وارث بننا چاہیں اور ایک نئی اور عظیم الشان تہذیب پیدا کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں تو ان کے لئے لازمی ہے کہ وہ ابھی جماعتی جذبہ اور مادی تنظیم ہی پر توجہ کریں اور اس عرصہ میں بقول کیزرلنگ یورپ پر اس مقدس شعلہ کی حفاظت کا فرض عاید ہوتا ہے مگر یہ یاد رہے کہ اگر اس شعلہ کے بجھنے کا اندیشہ اس وجہ سے ہے کہ کہیں یورپ بھی محض مادی قدروں کا بندہ نہ ہو جائے تو اس کا خطرہ یوں بھی ہے کہ کہیں یورپ اپنی خشک عقلیت اور ذہن پرستی سے اپنے کو تباہ نہ کرے۔ عقل و عشق تخلیق کے لئے دونوں لازمی ہیں۔ کوئی چیز بغیر ان دو متضاد عناصر کا صحیح توازن نہ ہو مؤثر نہیں ہو سکتی - لہذا یورپ کا کام یہی نہیں ہے کہ اس شعلہ کو جذبات اور مادیت کے سیلاب سے نہ بجھنے دے بلکہ یہ بھی ہے کہ اس شعلہ کو عقلیت کے صحرا میں جلکر خاکستر مردہ نہ بن جانے دے۔

اگر یورپ ان جدید بربری قدروں کی مخالفت میں اپنی منطق اور عقلیت ہی پر زور دیتا رہا تو روح کا شعلہ یورپ میں بھی افسردہ ہو جائیگا اور روس اور امریکہ میں بھی روشن ہو نہ پائیگا - یورپ والوں کو بھی ضرورت ہے کہ وہ اس زمین سے تعلق پیدا کریں اور جبلت و جذبات کے حیات بخش چشمہ سے سیراب ہوں - جب وہ ان دونوں میں توازن پیدا کرلیں تب ہی اس مقدس شعلہ کے محافظ بن سکتے ہیں۔ رچارڈ ریس درایدلفی ، لندن

حکومت ہند کی طرف سے ہر سال ہندوستان کے متعلق ایک رپورٹ پارلیمنٹ کے سامنے پیش کیجاتی ہے جسمیں سال کے تمام اہم معاملات کا ذکر اور ان پر تنقید و تبصرہ ہوتا ہے ۲۷-۱۹۲۶ء کی رپورٹ جسے مسٹر کوٹ مین نے مرتب کیا ہے ابھی ابھی شائع ہوئی ہے - اس میں تعلیم پر جو حصہ ہے اس کا ایک اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے :-

تازہ ترین اطلاعات مظہر ہیں کہ کُل ملک میں ابتدائی تعلیم ۱۱۴ بلدیوں میں اور ۱۵۲۷ دیہی علاقوں میں جبری ہے۔ ذیل میں جو نقشہ درج ہے اِس سے ظاہر ہوگا کہ مختلف صوبوں میں جبریہ ابتدائی تعلیم کی تقسیم کیا ہے۔ اس تحریک میں پنجاب کا حصہ خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ ٹھیک نصف تعداد بلدیوں کی اور ۲۸ چھوڑ کر سب کے سب دہ دیہی علاقے اس صوبہ میں ہیں جہاں ابتدائی تعلیم جبری ہے۔ نقشہ درج ذیل ہے:-

صوبہ	بلدیہ	دیہی علاقے	صوبہ	بلدیہ	دیہی علاقے
مدراس	۲۱	۳	برما	۰	۰
بمبئی	۷	۰	بہار و اڑیسہ	۱	۴
بنگال	۷	۰	صوبہ متوسط	۳	۲۱
صوبہ متحدہ	۲۵	۰	اسام		
پنجاب	۵۷	۱۴۹۹	میزان کل	۱۱۴	۱۵۲۷

پنچ ذاتوں کی تعلیم کے متعلق رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ برما اور آسام کو چھوڑ کر باقی ۷ صوبوں میں پنچ ذات کے طلبہ کی تعداد چھ لاکھ سرسٹھ ہزار ہے۔ یعنی پنچ ذات کی کل آبادی میں سے ۲٫۳ فی صدی۔ ان طلبہ کی زیادہ تر تعداد ابھی ابتدائی مدارج میں ہے اور ثانوی اور اعلیٰ تعلیم میں بہت ہی کم۔ مثلاً ۲۶-۱۹۲۵ء میں مدراس میں کل ۲۳ ایسے طلبہ کالجوں میں پڑھ رہے تھے، بمبئی میں کل ۱۴، صوبجات متحدہ میں صرف ۱۱، صوبہ متوسط میں ۸، بہار و اڑیسہ میں صرف ۱ اور پنجاب میں ایک بھی نہیں۔

" یہ احساس عام ہے کہ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی حالت کمیت کے لحاظ سے چاہے کتنی ہی اطمینان بخش ہو، کیفیت کے اعتبار سے اس میں بہت ہی کمیاں ہیں۔ یہ خیال خاص طور پر ثانوی

تعلیم کی بابتہ درست ہے جو بہ حیثیت مجموعی مغربی معیار کے اعتبار سے بہت گھٹیا ہے اور بعض حصوں میں غیر منظم۔ طریق تعلیم ناقص ہے؛ اساتذہ اپنے کام میں دلچسپی نہیں لیتے؛ اور طلبہ کا مطمح نظر بس روپیہ کمانا ہے۔ گزشتہ زمانہ میں تعلیم کے اخلاقی، جماعتی اور جسمانی پہلو پر بہت کم توجہ کیگئی ہے اور ذہنی پہلو سب کچھ رہا ہے۔

ہر تعلیمی کام کرنے والا جانتا ہے کہ تعلیم عمر بھر کا دھندا ہے اور اگر ملک میں جمہوری اداروں کو چلانا ہے تو عام بالغ لوگوں کی تعلیم کا انتظام لازمی ہے تاکہ وہ اپنے حق رائے کو مناسب طور پر استعمال کرسکیں۔ تعلیم گاہوں کے کام کو شہروں میں وسعت دینا تو دشوار نہیں البتہ دیہی آبادی کا معاملہ بہت نازک ہے۔ پچھلے زمانہ میں اس آبادی کے لئے مختلف تدبیریں ہندوستان میں اختیار کیگئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ صحت اور عام مفید باتوں پر تقریروں کا انتظام کیا گیا۔ دوسری تدبیر مدارس شبینہ کا قیام ہے۔ ایک اور صورت یہ کیگئی کہ طبی پیشہ کے لوگوں کو گانوں میں رہنے کی ترغیب دیجائے۔ کہیں یہ کیا گیا کہ گانوں میں کتب خانہ یا ابتدائی ادبی اور علمی انجمنیں قائم کی گئیں۔ ذیل میں ہم وہ اعداد نقل کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ مختلف صوبوں میں مدارس شبینہ کی تعداد اور انمیں طلبہ کی تعداد کیا ہے۔ اسمیں بمبئی، پنجاب، برما اور صوبجات متوسط کے اعداد میں تو صرف بالغ شامل ہیں لیکن دوسرے اعداد میں بالغ اور نابالغ دونوں ہیں۔

صوبہ	تعداد مدارس شبینہ	تعداد طلبہ	صوبہ	تعداد مدارس شبینہ	تعداد طلبہ
مدراس	۵۲۸۷	۱۳۶۶۲۶	برما	۱۹	۱۰۶۵
بمبئی	۱۹۱	۷۷۳۰	بہار واوڑلیسہ	۱۰۳۶	۲۲۷۰۱
بنگال	۱۴۴۵	۲۷۷۷۳	صوبجات متوسط	۴۱	۱۰۶۷
پنجاب	۳۲۰۸	۸۵۴۲۲	میزان کل	۱۱،۲۲۷	۲۸۲،۳۸۴

ذیل میں ہم اس رپورٹ سے چار نقشے نقل کرتے ہیں جو یقین ہے کہ ناظرین کے لئے دلچسپی کا باعث ہوں گے۔

برطانوی ہند میں خواندہ اور ناخواندہ لوگوں کا تناسب

خواندہ

(ایک کروڑ ۸۶ لاکھ!)

ناخواندہ

(۲۲ کروڑ ۹۰ لاکھ!)

ہر مردم شماری پر نیز ۱۳ مارچ ۱۹۲۶ء و ۳۱ مارچ ۱۹۲۷ء کی تخمینی آبادی میں مرد اور عورتوں کا تناسب اور خواندہ و ناخواندہ مرد اور عورتوں کی تعداد

آبادی (ملین میں: ملین = ۱۰ لاکھ)

۱۸۷۲

مرد ۱۰۶ عورتیں ۱۰۰ کل ۲۰۶

خواندہ: مرد ۹ ملین۔ عورتیں ۲ر۔ کل ۹ر۲

آبادی (ملین میں)

۱۸۸۱

مرد ۱۳۰ عورتیں ۱۲۴ کل ۲۵۴

خواندہ: مرد ۱۰ر۵۔ عورتیں ۴ر۔ کل ۱۰ر۹
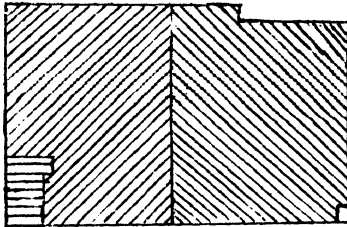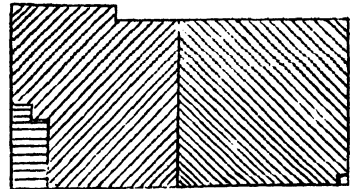
آبادی (ملین میں)

۱۸۹۱

مرد ۱۴۷ عورتیں ۱۴۰ کل ۲۸۷
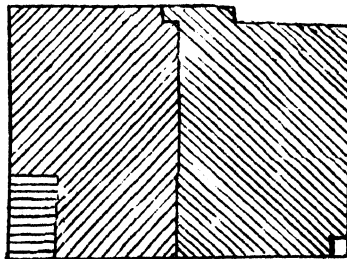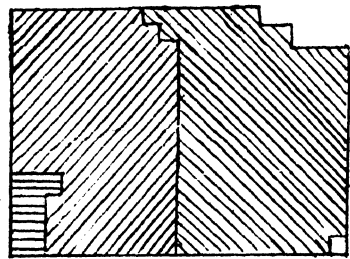
خواندہ: مرد ۱۱ر۵۔ عورتیں ۵ر۔ کل ۱۲

آبادی (ملین میں)

مرد ۱۴۹ عورتیں ۱۴۴ کل ۲۹۳

خواندہ: مرد ۱۴ر۷۔ عورتیں ۱۔ کل ۱۵ر۷

آبادی (ملین میں)
۱۹۱۱
مرد ۱۶۱ عورتیں ۱۵۴ کل ۳۱۵
خواندہ مرد ۱۶٫۹ - عورتیں ۱٫۶ - کل ۱۸٫۵
آبادی (ملین میں)
۱۹۲۱
مرد ۱۶۴ عورتیں ۱۵۵ کل ۳۱۹
خواندہ مرد ۱۹٫۸ - عورتیں ۲٫۸ - کل ۲۲٫۶
آبادی (ملیں میں)
۳۱ مارچ ۱۹۲۶ء
مرد ۱۶۸ عورتیں ۱۵۸ کل ۳۲۶
خواندہ مرد ۲۲ - عورتیں ۳٫۳ - کل ۲۵٫۳
آبادی (ملین میں)
۳۱ مارچ ۱۹۲۷ء
مرد ۱۶۹ عورتیں ۱۵۹ کل ۳۲۸
خواندہ مرد ۲۲٫۷ - عورتیں ۳٫۵ - کل ۲۶٫۲
مردوں کی آبادی
عورتوں کی آبادی
خواندہ مرد
خواندہ عورتیں
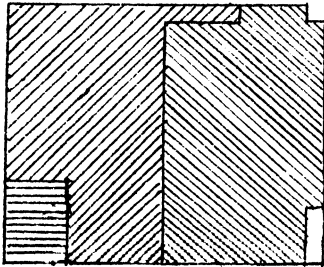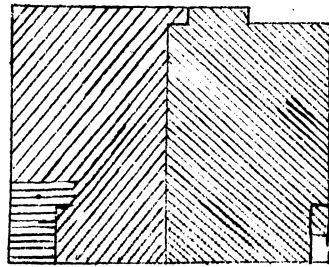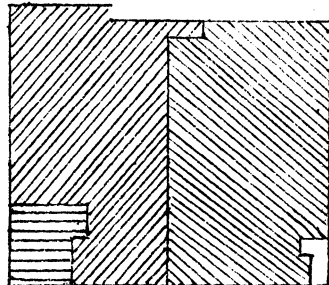
تعلیم پر کل ہندوستان کا خرچ اور اسکی تقسیم
۱۸-۱۹۱۷ء تک ہر پانچویں سال کی رقم اور اس کے
بعد سے سالانہ
کل خرچ
سرکاری ریونیو سے خرچ
فیسوں سے
ڈسٹرکٹ اور لوکل بورڈوں سے
میونسپلٹیوں سے
۲۴۰۰
۲۲۰۰
۲۰۰۰
۱۸۰۰
۱۶۰۰
۱۴۰۰
۱۲۰۰
۱۰۰۰
۸۰۰
۶۰۰
۴۰۰
۲۰۰
۱۸۷۶-۷۷
۱۸۸۱-۸۲
۱۸۸۶-۸۷
۱۸۹۱-۹۲
۱۸۹۶-۹۷
۱۹۰۱-۰۲
۱۹۰۶-۰۷
۱۹۱۱-۱۲
۱۹۱۶-۱۷
۱۹۱۸-۱۹
۱۹۱۹-۲۰
۱۹۲۰-۲۱
۱۹۲۱-۲۲
۱۹۲۲-۲۳
۱۹۲۳-۲۴
۱۹۲۴-۲۵
۱۹۲۵-۲۶
۱۹۲۶-۲۷
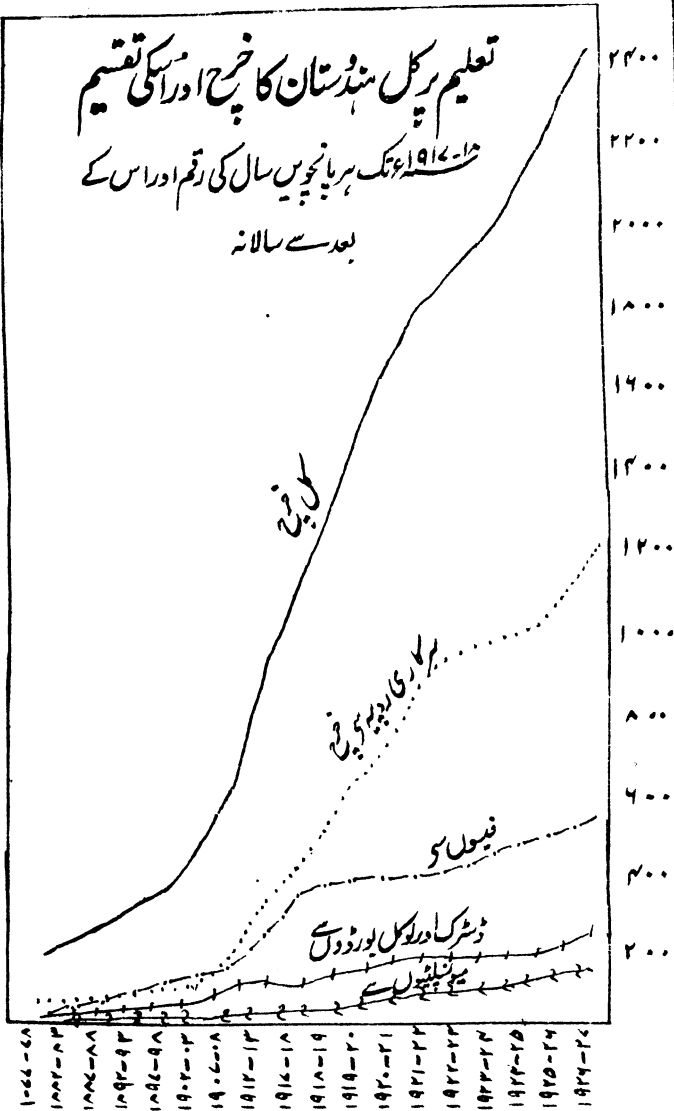
"گڑیا کا گھر"

قومی زندگی اور قومی مسائل کے مقابلۃً تنگ دائرہ سے گذرنا، دوسری سرزمین، دوسرے ماحول میں انسانی زندگی کا مشاہدہ کرنا ذہنیت کی صحیح تربیت کے لئے لازم ہے۔ اسی طرح جیسے آب وہوا کی تبدیلی جسمانی صحت کی شرط ہے۔ ناواقفیت، جہالت اور محدود تجربہ تعصب اور بیہودہ خودستائی پیدا کرتے ہیں، اور جس قوم کو اپنی عظمت کا مغالطہ ہو جائے اُس کی نشوونما سمجھنا چاہئے ختم ہوگئی۔ ہندوستانی ذہنیت اس مہلک مرض میں مبتلا معلوم ہوتی ہے، اور اس وقت ہر روشن خیال ہندوستانی کا فرض ہے کہ وہ دوسرے ملکوں کی اخلاقی حالت پر غور کرکے اپنی قوم کی اصلاح کے لئے معیار اور نصب العین مقرر کرے۔ دوسروں کے تجربہ سے فائدہ اٹھائے۔ اُنکی آرزوؤں کا امتحان لے۔

یورپین تہذیب کے ہندوستان میں بہت سے دوست ہیں اور بہت سے دشمن، اُسے سمجھنے والے کم ہیں۔ یہ اندیشہ مگر سب کو ہے کہ ہم اس کے اثرات سے بالکل بچ نہیں سکتے، اور اسی وجہ سے دوستی اور دشمنی دونوں میں مبالغہ کیا جاتا ہے۔ اگر اس کا بھی لحاظ رکھا جائے کہ ہم یوروپین تہذیب کی اصل صورت دیکھنے سے عموماً محروم رہتے ہیں۔ تو ہم اکثر غلط فہمیاں معاف بھی کرسکتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ ہمارا فرض بھی ہو جاتا ہے کہ جس حد تک ہو سکے یوروپین تہذیب کی سیرت کو سمجھیں اور سمجھائیں اور نظر کے فریبوں سے گزر کر اس کی اصلیت تک پہونچیں۔

مشرقی زندگی ہمیشہ سے ایسے تخیلات کے ماتحت رہی ہے جو عام طور سے تسلیم کئے جاتے تھے، جن کے مطابق زندگی کے ہر پہلو کے لئے معیار اور قوانین مقرر ہوتے تھے۔ مغربی زندگی کا مشاہدہ کرتے ہوئے ہمیں سب سے پہلا دھکا اس بات سے پہنچتا ہے کہ وہ کوئی عام اخلاقی

اصول تسلیم نہیں کرتی، اور ریاست کے قانون کے حدود میں فرد کو کامل آزادی دیتی ہے۔ ہمارے یہاں عورتوں کے لباس تک کو مذہبی تعلیم کے نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ یورپ میں لباس کیا اخلاق تک ہر عورت اپنے لئے طے کر سکتی ہے اور جب تک وہ کوئی ایسی حرکت نہ کرے جس کی قانوناً سزا مقرر ہے عام رائے بھی اُس کی زندگی میں دخل نہیں دیتی۔ اس آزادی کے نتائج برے بھی ہوئے ہیں اور اچھے بھی، مگر برے ہوں یا بھلے، وہ انسانی تجربہ کا ایک ذخیرہ ہیں جس سے مستفید نہ ہونا سخت حماقت ہوگی۔ ہمارے پاس اپنے معیار موجود ہیں۔ ہماری تاریخ کا سلسلہ قائم ہے، پھر یوروپین تہذیب کے فیض سے ہمیں کیا اندیشہ، اُس کے تجربہ کو کام میں لانے سے کیا نقصان ہو سکتا ہے۔

افراد کی آزادی کے بارے میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن جس تنقید اور نکتہ چینی اور انصاف پسند سماجی ضمیر نے یہ آزادی رفتہ رفتہ قائم کی ہے اُس کی اہمیت اور ضرورت کو ہمیں بلا تکلف تسلیم کر لینا چاہئے۔ افراد کی موجودہ آزادی کی عمارت کلیسا کے کھنڈروں پر تعمیر کی گئی ہے، اور یہ تخریب اور تعمیر دونوں اسی تنقید اور انصاف پسند سماجی ضمیر کے کارنامے ہیں۔ بیچ کی صدیوں میں مذہب اور خدا دونوں کلیسا کے ہاتھ میں تھے۔ اس نے گویا انسان کی فلاح کا ٹھیکہ لے لیا تھا۔ مارٹن لوتر نے یہ ٹھیکہ اُس کے قبضہ سے چھین کر ریاست اور ملکی کلیسا کے سپرد کیا۔ اس لئے کہ اُس کا ضمیر کیتھلک کلیسا کی تعلیم اور اس کے طرز عمل کی درستی کو نہیں تسلیم کر سکا دو تین صدیوں بعد جو آگ لوتر نے جلائی تھی، بجھنے لگی۔ تو پھر یوروپین ضمیر نے تنقید کے ذریعہ سے اُس تخیل کی جڑ کاٹ دی جو لوتر کے زمانے سے اس وقت تک غالب رہا تھا۔ کیتھلک کلیسا کا اصول "ایک خدا، ایک کلیسا، ایک قانون" تھا۔ لوتر نے خدا کی وحدت تو قائم رکھی مگر کلیسا اور قانون میں اختلاف اور رنگا رنگی کے لئے راستہ صاف کر دیا۔ اٹھارہویں صدی کے انقلاب نے اس انتشار کو ایک درجہ اور بڑھا دیا، اور خدا کی وحدت بھی قائم نہ رہنے دی۔ ایک لحاظ سے تو یہ انقلاب برحق تھا، اس لئے کہ پرانے مذہبی اور اخلاقی اصول بالکل مردہ ہو گئے تھے، اور

اُنکے محافظوں میں اتنی ہمت نہ تھی کہ ان میں دوبارہ جان پھونکنے کا حوصلہ کریں۔ مذہب اور اخلاق کی حفاظت یوں ہی ہوسکتی تھی کہ ہر شخص اپنے عقیدے کا ذمہ دار کردیا جائے اور اُن کی درستی یا غلطی کا خود فیصلہ کرے۔ اس انقلاب سے پہلے رہناؤں کی امیدیں کچھ بھی رہی ہوں، فتح اس میں عقل کو حاصل ہوئی، اور سب سے زیادہ نقصان مذہب کو پہنچا، اس لئے کہ اُسکی سماجی حیثیت بالکل جاتی رہی اور افراد کی ذہنیت پر عقل اور تجربہ کی خواہش اور مادی رجحان اس قدر غالب آگئے کہ مذہب کے لئے نہ دماغ میں گنجائش رہی نہ دلوں میں۔

مذہب کے ساتھ لازم تھا کہ اخلاقی معیار بھی شک اور تجربہ پر قربان کئے جائیں، اور ہر فرد اپنے لئے بہترین اخلاقی اصول دریافت کرنے کا بار اٹھائے۔ قانون نے شرط لگائی کہ جرم نہ سرزد ہوں، عام رائے نے شرط لگائی کہ کامیابی ہو، باقی افراد کو خود مختاری دیدی گئی۔ ہر انسان اپنی فلاح ہی چاہتا ہے، خواہ روحانی ہو یا جسمانی، موت سے پہلے یا موت کے بعد، اور چونکہ تجربہ کا میدان اسقدر وسیع تھا، اس لئے جو لگام مذہب نے چھوڑی وہ تنقید کے ہاتھ میں پہنچ گئی، اور یورپ میں تمام روشن خیال لوگ رہبری کے لئے اُن شخصیتوں کی طرف مڑے جو اُن کی زندگی میں نکتہ چینی کرسکتی تھیں، اور عوام کے ضمیر کے سامنے فیصلہ کرنے کے لئے مختلف اصول اور انکی عملی صورتیں پیش کرسکتی تھیں۔ ان نقادوں کے مشورے پر عمل کرنا کسی شخص پر لازم نہیں رہا ہے۔ لیکن یورپ کی موجودہ اخلاقی حالت بڑی حد تک انہیں کی بنائی اور بگاڑی ہوئی ہے۔

یورپ میں کوئی عام مذہبی یا اخلاقی نصب العین باقی نہیں رہا ہے لیکن اُس کی بجائے تہذیب اور تاریخ نے کامل انسانیت کی ایک آرزو پیدا کردی ہے جو مذہب اور اخلاق کی جگہ پر محرک کا کام دیتی ہے۔ اسی انسانیت اور اسی کمال کی تمنا نے کیتھلک کلیسا کی بنیاد اکھاڑی مذہب سے جبر کی تعلیم اور تاثیر نکالدی اگرچہ اس کے ساتھ مذہب کے اڑجانے کا بھی اندیشہ تھا اور اب یہی انسانیت یورپ کی جدید تہذیب کا مایۂ ناز ہے۔ اُس کی تلاش میں ہزارہا زندگیاں تباہ

ہوئی ہیں، اور ہو رہی ہیں، اور اس پر بھی جو کچھ حاصل ہوا ہے وہ ممکن ہے بہت تھوڑا نظر آئے، لیکن کچھ نہ کچھ حاصل ضرور ہوا ہے۔ اور ہر انسان کو اُس کی قدر کرنا چاہیئے

ہم کو بہر حال اس حوصلہ اور ایثار کا مشاہدہ کر کے اپنی غلامی اور غفلت یاد کرنی چاہیئے، ہمارے مذہب میں بے شمار خوبیاں ہیں، ہمارے اخلاقی اصول نہایت صحیح ہیں لیکن ہم نہ اپنے مذہب کے اہل رہے ہیں نہ اپنی اخلاقی تعلیم کے۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ ہم نے ہمیشہ سرِ تسلیم خم کیا ہے۔ بے سمجھ اور بے زبان جانوروں کی طرح جس طرف منہ موڑا گیا اُدھر چل دیئے، اور کبھی یہ نہ سوچا کہ انسانیت کے فرائض کیا ہیں۔ مذہب کن صورتوں میں قومی زندگی کا محرک ہوتا ہے، کن صورتوں میں نہیں۔ ہمارے ضمیروں پر غفلت طاری ہوگئی، دل بے حس ہوگئے اور اخلاقی پستی نے ہم کو غلام بنا کر چھوڑا۔ اس پر طرفہ یہ ہے کہ ہم اُن لوگوں کی بداخلاقی پر افسوس کرتے ہیں جو اس وقت آسانی اور بے فکری سے ہمارے ملک اور ہماری ذہنیت پر حکومت کر رہے ہیں۔ اب اگر ہمارے لئے انسانیت کے اہل بننے کی کوئی صورت باقی ہے تو وہ یہی کہ ہم یورپ سے تنقید اور ذاتی تجربہ کی وقعت کرنا سیکھیں۔ اپنے ضمیروں کو بیدار اور ذی حس بنائیں۔ قومی زندگی سے کنارہ کش اور بیگانہ ہونے کی بجائے قوم کی ہر دشواری اپنی مصیبت سمجھیں، بُروں سے لڑیں، اچھوں کی مدد کریں۔ اور اپنے ماحول کی حالت پر غور کر کے اپنی اور اپنے عقیدوں کی خامیاں معلوم کرتے رہیں۔

ہم میں سے جو کوئی قومی اصلاح کی آرزو رکھتا ہے اُسے اِبسن کا کچھ دنوں شاگرد رہنا چاہیئے۔ اِبسن صرف ایک ایسا نقاد نہیں تھا جو قومی زندگی کے ہر پہلو سے واقف ہو۔ اور ایسی باتیں بتاسکے جو اخبار اور پولیس کی زد سے باہر ہوں۔ وہ انسان کی فطرت سے اس قدر واقف تھا کہ نظر اُسے کبھی کوئی فریب نہ دے سکی۔ اور وہ مبالغہ اور مغالطہ دونو سے بچا رہا۔ اُس نے صرف عام زندگی کو اپنا منظر بنایا ہے، مگر جن مسائل پر اُس نے بحث

کی ہے وہ ہر انسان اور ہر ماحول کے لئے یکساں اہمیت رکھتے ہیں۔ اسکا تصور بھی ایسا وسیع تھا کہ اس نے چند ڈراموں میں یورپین زندگی کے تقریبًا تمام اہم مسائل پر رائے زنی کی ہے، اور ساتھ ہی فطرت انسانی کی بہت سی دلچسپ اور عبرت آموز خصوصیات ظاہر کی ہیں۔ وہ صرف ڈراما نویسی میں ایک نئے طرز کا موجد نہیں تھا، نہ آرام پسند اور مطمئن انسانوں کی بغل میں ایک نیا کانٹا۔ وہ ایک نئی زندگی کا پیغام بھی لایا، ایسی زندگی جس میں ایثار اور بلند اخلاقی حوصلہ قومی اور انفرادی زندگی کی سب سے عزیز دولت ہوں۔ جس میں ساری جماعت ہر فرد کی تکلیفیں محسوس کرے، اور ہر فرد اپنے فرض کو اپنا حق سمجھے۔ اس کے ہر ڈراما میں کسی نہ کسی شکل میں یہ پیغام سنایا گیا ہے، اور یہ پیغام ایسا ہی جسے سن کر ایشیا اور یورپ کا ہر باشندہ اپنے دل میں جوش پیدا کر سکتا ہے۔

تمدنوں کی ترقی اور تنزل، اُن کی زندگی اور موت ایسے قوانین کے ماتحت ہوتی ہے جو انسانوں کے قابو میں نہیں ہیں۔ لیکن جہانتک انسان کو اختیار ہے اُس اختیار میں مرد اور عورت یکساں شریک ہیں، اور شاعر نے اگر عورتوں کو آئین حیات کا محافظ تصور کیا تو بجا نہیں۔ ایک نسل سے دوسری کا تعلق انہیں کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ اور وہ اس تعلق کو جو حیثیت چاہیں دے سکتی ہیں۔ قوم کی اصلاح بھی اسی وجہ سے عورتوں کی اصلاح پر منحصر ہے کیوں کہ جو اثر وہ قبول کریں مشکل سے قوم میں دیرپا ہو سکتا ہی۔ اُنکی طبیعت میں قرار اور استقلال بھی مردوں سے زیادہ ہوتا ہے، اور برے اثرات اُن تک سرایت کر جائیں تو اُنکا دور کرنا بھی نسبتًا دشوار ہوتا ہے۔ یورپ میں مردوں اور عورتوں کی باہمی زندگی کی جو صورت ہے وہ کسی ڈراما نویس کے لئے عورتوں سے قطع نظر کرنا ناممکن بنا دیتی ہے، مگر ابسن نے انہیں اپنی تصانیف میں خاص اہمیت دی ہے، اور زندگی کے ان پہلوؤں پر جو عورتوں سے متعلق ہیں، بہت روشنی ڈالی ہے۔ ”گڑیا کا گھر“ ہمارے نزدیک ابسن کے سب سے کامیاب ڈراموں میں سے ہے، اور جو شخص اس کی تعلیم کو ذہن نشین نہ کری وہ عورتوں کی کبھی عزت نہیں کر سکتا۔ اور اس سے اُنکا حق کبھی ادا نہ ہوگا۔

عورت کو گڑیا تصور کرنا ابسن کے زمانہ یا یوروپین زندگی کی خصوصیت نہیں ہی ”عورت“

کے کئی مفہوم ہیں، جن میں سے "گڑیا" بھی ایک ہے اور ابسن نے اُس کی طرف توجہ اس وجہ سے دلائی ہے کہ بہت سی عورتیں خود گڑیا بننا اور گڑیا کی زندگی بسر کرنا اپنی ہستی کا اصل مقصد سمجھتی ہیں، اور جو مرد اُن کی طبیعت پر تسلط کرنا چاہتے ہیں وہ انہیں بڑی آسانی سے اس وہم میں مبتلا رکھ سکتے ہیں۔ مگر انسانیت کا تقاضہ کچھ اور ہے، اور جس عورت نے اپنے فرائض محسوس نہ کئے وہ محض ایک گڑیا ہے اور اس کی ساری زندگی انسانیت کی تباہی کا ایک دردناک منظر۔ ابسن نے "گڑیا کے گھر" میں ایک ایسی عورت کی تصویر کھینچی ہے جو گڑیا بننے کے لئے بچپن سے تیار کی گئی تھی۔ شادی کے بعد وہ آٹھ برس تک گڑیا بنی رہی اور خوب شاد و آباد رہی۔ پھر کچھ ایسے واقعات ہوئے کہ اُسے تھوڑی دیر کے لئے انسان بننا اور انسانی فرائض ادا کرنے ہوئے مگر یہ قلب ماہیت اُس کے شوہر کو بہت ناگوار گذری، دونوں نے اپنا فلسفۂ زندگی واضح کر دیا، جس کا یہ انجام ہوا کہ گڑیا نے انسان بننے کے لئے گھر بار عیش و آرام، شوہر اور بچوں کو خیرباد کہا، اور اندھیری رات میں اپنی گذشتہ زندگی پر دروازہ بند کر دیا۔

"گڑیا" کے شوہر پر اُسکا اس طرح سے چلا جانا بہت شاق گذرتا ہے، اور ڈراما کے پڑھنے والے کو بھی تعجب ہوتا ہے کہ خیالات کی تبدیلی "گڑیا" کو ایسے سخت رویہ پر مجبور کرتی ہے۔ ابسن کا مطلب اصل گڑیا اور عورت کا فرق دکھانا ہے۔ حضرت عیسٰی نے کسی زمانہ میں اپنے پیرووں سے کہا تھا کہ "جب تک تم دوبارہ پیدا نہ ہو، تم جنت میں داخل ہونے کے لائق نہیں بن سکتے" ابسن ہر گڑیا کو بتانا چاہتا ہے کہ جب تک وہ غربت اور تنہائی کے مرحلے طے نہ کرے، اور اپنی پچھلی زندگی کی یادگار، پرانی محبتیں، پرانے رشتے بالکل مٹا نہ دے، وہ گڑیا رہے گی اور عورت نہیں بن سکتی۔ اس لئے جب اسے قطعی احساس ہو کہ وہ ایک گڑیا سمجھی جاتی ہے تو اُسکا فرض ہے کہ عورت بننے کے لئے وہ ہر چیز قربان کر دے، کیونکہ انسانیت ایک ایسا بے بہا جوہر ہے کہ اس کے عوض میں جو دولت بھی قربان کیجائے کم ہے۔

ہماری زندگی میں عورتوں کا دخل اس قدر کم ہے کہ گڑیا اور عورت میں فرق کرنا، یا عورت کو انسان بننے کی ترغیب دینا کچھ سعی لا حاصل سا معلوم ہوتا ہے۔ اور اگر انسان بننے کی

شرط یہ ہے کہ عورت اپنے گھر بار کو چھوڑ کر تجربہ حاصل کرنے کے ارادہ سے نکل کھڑی ہو۔ تو "گڑیا" کے شوہر کی طرح ہم میں سے اکثر حیرت اور افسوس میں دیوانے ہو جائیں گے۔ اور عورتوں پر یہ الزام لگائیں گے کہ وہ انسان بننے کے بہانے سے اپنے فطری فرائض سے سبکدوش ہونا چاہتی ہیں۔ مگر ابسن کی یہ ہرگز تعلیم نہیں ہے کہ عورتوں کو امور خانہ داری یا اولاد کی پرورش سے کنارہ کش ہو جانا چاہئے۔ ان فرائض کا پورا کرنا مرد اور عورت کی باہمی زندگی کی شرط ہے۔ مگر عورت کو یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ اگر اُس نے گھر کا انتظام کر لیا اور بچے پیدا کر لئے تو اس نے اپنی انسانیت کا حق ادا کر دیا۔ انسانیت کا تقاضا ہے کہ مرد اور عورت کی باہمی زندگی کا ایک نصب العین ہو جس کی تمنا دونوں کے دلوں میں یکساں ہو۔ دونو ایک ہی کوشش میں مصروف ہوں اور ایک دوسرے کی ناگزیر ہونے کا اقرار کریں۔ دونو کو اپنا ضمیر بیدار رکھنا چاہئے۔ اس لئے کہ انسانیت ایسی دولت ہے جو بہت آسانی سے گم ہو جاتی ہے۔ اور اُسکا گم ہونا ہر مصیبت سے بدتر ہے۔ ابسن گڑیا کا گھر وندا صرف اس ارادہ سے توڑتا ہے کہ اس کی جگہ پر عورت اپنا گھر بنا سکے، اور اسے اپنی انسانیت کی رونق سے منور کرے۔

ابسن کے بلند حوصلہ کو دیکھ کر جب ہم اُس کے ہندوستانی قدردانوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ہمیں کچھ مایوسی ہوتی ہے "گڑیا کا گھر" ایسی تصنیف ہے جسے قومی اصلاح کا محرک بنایا جا سکتا ہے، عورتوں کے لئے ایک آئینہ جس میں وہ اپنے اصل اور لازوال حسن کا مشاہدہ کریں، مردوں کے لئے ایک حقیقت نما تصویر جس سے وہ ساری زندگی کے لئے عبرت اور سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ اُس کے ناشرین کو اس سے محض ادبی دلچسپی ہے، وہ اس کی اخلاقی تعلیم اور فلسفیانہ نظریوں میں نہیں الجھنا چاہتے۔ اسی خیال سے غالباً ڈراما کا "مشرقی چربا" بھی اتارا گیا یعنی اشخاص کے نام بدل دئے گئے کہ ہندوستانی پڑھنے والوں کو کسی طرح کی دشواری نہ ہو۔ اور وہ بحیثیت ڈراما اور ادبی کارنامے کے "گڑیا کے گھر" کا پورا لطف اٹھا سکیں۔ یہ طریقہ ہماری رائے میں غلط ہے۔ اگر ہندوستانی پبلک کی واقفیت بڑھانا مقصود ہے تو ہمیں چاہئے کہ یورپین ماحول کی خصوصیات سمجھائیں اُسے

کسی طرح سے بدلنے یا اپنانے کی کوشش نہ کریں، اس لئے کہ ایسی تبدیلیوں سے اُس کی شخصیت جاتی رہتی ہے۔ اور شخصیت کے ساتھ تاثیر بھی۔

بہر حال ”گڑیا کے گھر“ کے مترجم نے ہندوستانی پبلک اور ابسن کی جو خدمت کی ہے اُسکا ہمیں شکر گذار ہونا چاہئے۔ یوروپین ادب کے جو نمونے ہماری پبلک تک ترجموں کے ذریعہ سے پہونچتے ہیں اُن سے کسی صاحب ذوق کو تسلی نہیں ہو سکتی، اور یہ نہایت قابل تعریف بات ہے کہ عبدالشکور صاحب نے ہماری پبلک کو مغربی ادب کی ایک واقعی بلند پایہ تصنیف سے مستفید ہونیکا موقع دیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ انٹرمیڈیٹ کالج کی مجلس ادبیہ اس قسم کی مطبوعات کا سلسلہ جاری رکھے گی، اور اُن ہندوستانیوں کو جو یورپ نہیں جاسکتے ادبی تصانیف کے ذریعہ سے یوروپین زندگی کی سچی اور پرمعنی تصویریں دکھاتی رہے گی۔

ناشر: شیخ عبدالرشید صاحب ایم۔ اے۔ ال ال بی۔ علیگڈھ

شذرات

ایک سال سے کچھ ہی زیادہ ہوا ایک نوجوان بادشاہ ہمارے ملک سے گذرا تھا۔ وہ جس ملک کا تھا وہ کچھ بہت بڑا ملک نہیں بہت مالدار ملک بھی نہیں اور چند سال پہلے تک اس کی کوئی سیاسی حیثیت بھی نہ تھی۔ صرف دو بڑی اور رقیب سلطنتوں کے بیچ میں ہونیکی وجہ سے وہ کبھی ایک کا سہارا لیتا تھا کبھی دوسری کا۔ اسے اپنے پڑوسیوں سے روپیہ ملتا تھا۔ اور اس روپیہ کے عوض وہ اپنی سیاسی خودمختاری کے اعلان سے باز رہتا تھا، اس چھوٹے سے غریب کوہستانی ملک کے تخت پر ایک نوجوان متمکن ہوا، جس کا اس پر متمکن ہونا معمولی حالات میں ممکن نہ ہوتا۔ اس کے عہد میں اس غریب ملک نے دنیا کی سب سے بڑی سلطنت سے ایک چھوٹی سی جنگ کی اور اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ ملک میں جو تھوڑی بہت بے چینی پیدا ہوئی وہ بھی نہایت خوش سلوبی سے رفع کر دی گئی۔ اور بالآخر حالات میں اس قدر یکسوئی پیدا ہو گئی کہ اس نوجوان بادشاہ نے اپنے ملک کو چھوڑ کر ساری دنیا کے سفر کی ٹھانی۔ اس سفر میں وہ ہمارے ملک سے بھی گذرا۔ یہاں اسکا استقبال جس خلوص سے کیا گیا بہت کم کسی کا کیا گیا ہوگا۔ اس سے زیادہ شان وشوکت کے استقبال تو اس ملک نے بہت دیکھے تھے۔ ایسے پرخلوص بہت کم۔ اس لئے کہ یہ نوجوان صرف بادشاہ نہ تھا، آدمی بھی تھا۔ لوگوں نے اسے لاکھوں کے مجمع میں راہ نکالنے کو اپنی کہنیاں استعمال کرتے بھی دیکھا۔ ایک لڑکے کو قرآن پڑھتے سنکر زار زار روتے بھی دیکھا۔ لاکھوں کے بے ترتیب و بے نظم مجمع میں لوگوں کے ایسے تہنیت نامے بھی قبول کرتے دیکھا جن کے مفہوم کی اطلاع تک اس کے بے خبر سفیر نے اسے نہ دی تھی۔ اپنے ایک ہمراہی سے پنسل مانگ کر کاغذ کے ایک پرزہ پر سب تہنیت ناموں کے نوٹ لکھتے بھی دیکھا اور فی البدیہہ تقریر کرتے بھی سنا، ایک مجمع میں جہاں لوگ کچھ چپ چپ تھے اس نے تکبیر کے نعرے بھی لگوائے۔ بمبئی کی بیوپاٹی پر اس نے ہماتما گاندھی

کی بیوی سے باتیں بھی کریں اور رہا تاجی کو اپنا سلام بھی پہنچا دیا۔ اپنے ہموطنوں کے ایک مجمع میں گیا تو سب سے بغلگیر ہوا اور اکثر کی پیشانی پر بوسے دئے۔ لوگوں نے بادشاہوں میں یہ باتیں نہ دیکھی تھیں اس لئے اس نوجوان پر سب کے سب بلا تمیز مذہب وملت عاشق سے ہوگئے۔

اس نوجوان بادشاہ نے یہی نہیں کہ ہندوستانیوں کے دل اپنے قبضہ میں کر لئے۔ یہ ہندوستان سے زیادہ خوش نصیب، زیادہ مالدار، آزاد، بادشاہتوں اور جمہوریتوں میں گیا۔ استعماری اور اشترا کی دولتوں کا مہمان رہا اور ہر جگہ اس نے لوگوں کے دل مسخر کئے۔ یہ کیسے؟ اس لئے کہ یہ آدمی تھا اور اپنی آدمیت کے آگے اپنی بادشاہت کو بھول جاتا تھا۔ اس لئے کہ ایسی ملت کا بادشاہ تھا جس میں فضیلت کا معیار دولت اور تاج وتخت نہیں بلکہ نیکی ہے۔ جس کے شاہ وغلام دونوں ایک صف میں کھڑے ہو کر اپنے معبود کے آگے سربسجود ہوتے ہیں، اور جس میں "سروری" اور "خدمتگری" مترادف الفاظ ہیں۔ یہ آدمیت اس نے یورپ سے نہ سیکھی تھی، مغربی انجنیروں سیاست دانوں، تاجروں نے جن سے اسے کچھ نہ کچھ سابقہ پڑتا رہا تھا اسے اور کچھ سکھایا ہو لیکن آدمیوں میں آدمی بننا نہ سکھایا تھا۔ بیشک یہ یورپ میں مغربی وضع میں اور مغربی لباس پہنکر گیا تھا، لیکن اس کے استقبال کرنے والوں میں لاکھوں اس سے بہتر اور مغربی فیشن کے قریب تر وضع کا لباس پہنے تھے۔ ان میں کچھ نہیں تو لاکھوں ایسے تھے جو اپنی داڑھی کے مونڈنے میں اس سے زیادہ اہتمام کرتے تھے اس لئے اس کی عزت اس کے مغربی لباس اور مونڈی ہوئی داڑھی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی بے نفس خدمتگذاری، اس کی سیرت، اس کی انسانیت کی وجہ سے ہوئی۔ اور یہ جاہل قوم کا بادشاہ اپنی شخصیت کی وجہ سے بہت سے تعلیم یافتہ ملکوں کے بادشاہوں اور مدبروں پر بھاری پڑا۔

اس نوجوان بادشاہ کے گرد کچھ لوگ تھے جنہوں نے یورپ میں تعلیم پائی تھی۔ جن کے نزدیک یورپ کی ہر چیز مستحسن اور ایشیائی ہر چیز معیوب ہے۔ انھوں نے اپنے کو اپنی ملت اور

مذہب کی فضا سے علیحدہ کر لیا تھا اور ابھی کسی دوسری تمدنی سرزمین میں انکی جڑیں مضبوطی سے قائم نہ تھیں۔ اور کیسے ہوتیں؟ تمدنی روایات نہ ایک دن میں بنتی ہیں اور نہ ایک دن میں منتقل ہوتی ہیں۔ کچھ ان مصاحبوں، اور مشیروں کا اثر، کچھ آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی یورپ کی مادی مرفہ الحالی نے اس نیک دل اور اپنی قوم کے عاشق بادشاہ پر یہ اثر ڈالا کہ میری قوم بھی اگر دنیا میں بڑھنا چاہتی ہے تو اسے اس قسم کی مادی ترقی کرنی چاہئے۔ اس کی رگوں میں جوان خون تھا اس نے ان مشیروں کی بات مان لی خود اپنے تاثرات سے مغلوب ہو گیا اور اپنے ملک کو ایک جنبش قلم سے ایک جدید، اور متمدن ملک بنانے کی کوشش شروع کر دی۔ جدت کے اس شوق نے اس کی نظر کو قوموں کے عروج کی عمیق حقیقتوں اور اخلاقی و مذہبی قوتوں کی طرف سے ہٹا دیا اور ظاہری تبدیلیوں کو غیر ضروری اہمیت دلا دی۔ "تمنا" کی بے تابی، میں وہ، بھول گیا کہ "عاشقی" بہت "صبر طلب" چیز ہے۔ قوم میں قدامت پرستی کے جو عناصر تھے، اس میں بہت سے برے اور تھوڑے ہی سے اچھے سہی لیکن وہ سب مجتمع ہو گئے اور انہوں نے، جدت پسندی کی اس قوت کو ایک مرتبہ تو ضرور شکست دیدی اب یہ نوجوان بادشاہ اپنے پایۂ تخت سے دور پڑا ہے اور دوبارہ اقتدار حاصل کرنے کے لئے طرح طرح کی کوششیں کر رہا ہے۔

یہ ہمارے ہمسایہ ملک افغانستان کا قصہ ہے۔ قدامت پرست خوش ہیں کہ جدت پسندی نے منہ کی کھائی۔ لیکن ابھی یہ خوشی ذرا قبل از وقت ہو اس سے کچھ آگے ایک ملک ترکی بھی ہے اس میں قدامت پرستی ایسی ہی منہ کی کھا چکی ہے۔ اس لئے اس معرکہ کی فتح و شکست کو اتنی اہمیت اس وقت نہیں جتنی خود اس معرکہ کی حقیقت کو ہے۔ اس لئے کہ یہ معرکہ ترکی و افغانستان تک محدود نہیں۔ یہ تمام ایشیا اور افریقہ میں، نہیں ساری دنیا میں ہو رہا ہے اور آج ہی نہیں ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔ تعجب اس پر ہے کہ دنیا نے اپنی ساری تاریخ سے اس کے متعلق کوئی عملی سبق نہیں لیا۔ اور ہمیشہ پچھلی غلطیوں کی تکرار ہوئی۔

قوموں اور جماعتوں کی زندگی اور اجسام نامی کی حیات میں بڑی مشابہت ہے۔ باشعور نامی اجسام کی زندگی سے ہمیں جماعتی زندگی کے اس معرکہ کے متعلق کچھ بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ کوئی باشعور نامی جسم اپنی حالت پر ایک لمحہ بھی قائم نہیں رہتا۔ تغیرات کا جلوہ گاہ ہوتا ہے اور ہر لمحہ یہ جسم پہلے لمحہ سے مختلف ہوتا ہے لیکن کیا اس وجہ سے اس کی شعوری زندگی کا مسلسل اور اس کی توحید قائم نہیں رہتی۔ اس موخر الذکر تسلسل و توحید کے ختم ہوتے ہی زندگی ختم ہو جاتی ہے یا کم از کم صحت کی زندگی۔ ماضی کو حال سے مربوط رکھنے اور استقبال کے لئے ان دونوں سے کام لینے تک ہی صحیح زندگی کا قیام ہے۔ قومیں اور جماعتیں بھی اپنی زندگی کے لئے اس تسلسل کی دست نگر ہیں۔ یہ "نفسہائے رمیدہ" ہی سے زندہ اور حفظ ناموس کہن، سے باقی رہتی ہیں۔ یہ رشتہ ٹوٹا اور ان کا شیرازہ بکھرا۔

حیاتیات اور تاریخ دونوں کا سبق یہی ہے کہ جس طرح تغیر انفرادی اور قومی زندگی کا لازمہ ہے اسی طرح قدامت پسندی بھی اس کے لئے ضروری ہے۔ ان دونوں میں صحیح تناسب قائم رکھنا قاید کا کام ہے۔ جب قدامت پسندی پرانے اداروں، پرانے معیاروں، پرانی قدروں کو بے جان بنا دیتی ہے اور ان کو محض منوانے کی خاطر منواتی ہے اس وقت قاید کا کام یہی نہیں کہ وہ نئی قدریں، نئے معیار، نئے ادارے پیدا کر دے۔ اس لئے کہ نئی قدریں ہیں کہاں؟ کون معیار ہے جسے انسان نے استعمال نہ کیا ہو؟ کون ادارہ ہے جس کی آزمائش نہ ہو چکی ہو؟ قاید ان قدیم قدروں کو زندہ کر دیتا ہے۔ اپنے دل کی گرمی سے ان اداروں کے مردہ دل پجاریوں کے دل بھی گرما دیتا ہے اور اپنی سینہ کی آگ سے وہ روحانی اور اخلاقی عناصر تیار کرتا ہے جن کے بغیر قومی ترقی اور ملی فلاح کے خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتے

ترکی اور افغانستان دونوں کے بظاہر متضاد حالات میں ہمیں یہ مایوس کن حقیقت

دکھائی دیتی ہے کہ اگر ایک جگہ چند ظاہری تبدیلیاں کامیابی سے کر لینے کو حیات قومی کی تجدید سمجھا جارہا ہے تو دوسری جگہ دنیاوی اور دینی رہزنوں کی کامیابی کو دین و مذہب کی فتح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ نہ ترکی میں جدت پسندی کی فتح ہوئی ہے اور نہ افغانستان میں دین کی۔ نہ وہاں وہ ذہنی انقلاب ہوا ہے جس کے بغیر ساری جدت پسندی محض اٰعلی نقالی ہے، نہ یہاں دین کی وہ سچی تعبیر ہے جو دنیا کی زندگی کے لئے بھی کافی ہو اور حیات قومی کے نشو و ارتقا کی راہ بتائے۔ وہاں تعیش کی فتح ہے، یہاں تعصب کی۔

یہی قوتیں ہمارے دروازوں پر بھی معرکہ آرا ہیں۔ کیا یہاں بھی نتیجہ ایسا ہی یکطرفہ ہوگا جیسا ترکی میں ہوا، یا جیسا کہ افغانستان میں؟ ربنا! اہدنا الصراط المستقیم۔

مطبوعات مکتبہ جامعہ

تاریخ الامت مصنفہ حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری۔ تاریخ اسلام کا یہ سلسلہ صحیح تاریخی اصول اور تحقیق و تنقید کے ساتھ اردو میں پہلی بار شائع ہوا ہے، اس کے مطالعہ سے ہر شخص نہایت آسانی سے مسلمانوں کے تاریخی کارناموں سے واقف ہو سکتا ہے۔ جامعہ ملیہ اور صوبہ متوسط و برار کے محکمۂ تعلیم نے اسے اپنے مدارس کے لئے بھی پسند کیا ہے۔ اب تک ذیل کے چھ حصے شائع ہو چکے ہیں۔

(۱) حصہ اول سیرۃ الرسول . . . ۱۲؍
(۲) حصہ دوم خلافت راشدہ . . . ۱۰؍
(۳) حصہ سوم خلافت بنی امیہ . . . ۱۲؍
(۴) حصہ چہارم خلافت عباسیہ جلد اول . . ۱۰؍
(۵) حصہ پنجم " جلد دوم ۱۰؍
(۶) حصہ ششم عباسیہ مصر ۱۰؍

تاریخ فلسفۂ اسلام۔ از ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے، پی ایچ، ڈی (برلن)، ہالینڈ کے مشہور فلسفی اور مستشرق ٹی۔ جے۔ ڈی بوئر کی گرانقدر تصنیف کا براہ راست جرمن زبان سے ترجمہ تاریخ فلسفۂ اسلام پر اردو میں یہ پہلی قابل قدر کتاب ہے قیمت ۱؍

ذکریٰ۔ تفسیر پارہ عم۔ مصنفہ خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی استاذ تفسیر جامعہ سلسلۂ تفسیر "الفرقان فی معارف القرآن" کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ یہ کتاب بھی اسی مفید سلسلہ کی ایک کڑی ہے جسمیں پارہ عم کی تفسیر خواجہ صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں امت اسلام کے لئے پیش کی ہے قیمت ۸؍

عبرت۔ تفسیر سورۂ یوسف سلسلہ تفاسیر کی ایک اہم جلد جسمیں احسن القصص یعنی سورۂ یوسف کی تفسیر نہایت خوبی کے ساتھ بیان کی گئی ہے اور اس کے عبرت انگیز نتائج کو بہت موثر طریقہ پر پیش کیا گیا ہے قیمت عہ مجلد . . . . ۱۲؍

برہان۔ سورۂ نور کی مکمل اور مبسوط تفسیر نہایت پر زور اور دلکش طرز تحریر قیمت . . . عہ

تاریخ الدولتین۔ اس کتاب میں خلافت بنی امیہ و بنی عباس کے حالات پر ایک ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ مصر کے مشہور اہل قلم جرجی زیدان کی تصنیف ہے جسے مولانا نیاز فتحپوری نے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ قیمت . . . . عہ

ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ۔ دہلی

The Cultural Side of Islam

Madras Lectures on Islam

(NO. 2)

BY

Muhammad Marmaduke Pickthall

Delivered at Madras in January 1929

(CONTENTS)

Price 1/8-

Bound 2/-

TO BE HAD OF:—

National Muslim University Book Depot

KAROL BAGH,

DELHI.

رجسٹرڈ
نمبر ۱۰۹۲
جامعہ
جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ
جلد ۱۲
بابت ماہ مارچ سنہ ۱۹۲۹ء
نمبر ۳
"مجلہ مکتبہ"
مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
1927.

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی

نمبر ۳	بابتہ ماہ مارچ ۱۹۲۹ء	جلد ۱۲

فہرست مضامین

گیارہویں صدی عیسوی
کے نصف اوّل میں
علوم صحیحہ کی حالت

یہ عہد قرون وسطیٰ کی علمی ترقیوں کے لئے معراج کا زمانہ ہے۔ اس زمانے میں متعدد جیّد حکمار نظر آتے ہیں اور پہلے پہل مورخ کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ان میں سے کس کو افضل قرار دے' ابن یونس'، 'ابن سینا'، 'ابن الہیثم'، 'البیرونی'، 'علی ابن عیسےٰ الکرخی'، ابن جابر الاندلسی، یہ سب اپنے اپنے فن کے امام ہیں. مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام حکمار میں سب سے ممتاز، البیرونی، اور ابن سینا، ہیں، انہیں دونوں کی بدولت یہ عہد علمی تاریخ کا زرین عہد بن گیا۔ ان دونوں حکما میں باہم ملاقات تھی مگر انکی طبیعتوں میں بے حد فرق تھا، البیرونی، منچلا آدمی تھا اور نقادانہ انداز رکھتا تھا اور ابن سینا، ترکیب وامتزاج کا بادشاہ تھا۔ 'البیرونی' میں نئے حقائق کی دریافت کا مادہ زیادہ تھا، اس لئے وہ ہمارے زمانے کے سائنس داں کے نصب العین سے زیادہ قریب ہے، ابن سینا، کا نمایاں جوہر ترتیب وتنظیم، قاموس نگاری اور فلسفیانہ غور وفکر ہے۔ مگر دونوں سائنس کی دیوی کے سچے پجاری تھے اس لئے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کی کوئی کافی وجہ نہیں ہے۔ البتہ جس عہد کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس میں 'البیرونی، کی عمر کا زیادہ حصہ گذرا ہے اس لئے ہم اس دور کو اس کے نام سے منسوب کرسکتے ہیں۔ ابن سینا کی عمر گیارہویں صدی کے پہلے سال میں بیس برس کی تھی اور اس

نے ۱۰۳۷ء میں وفات پائی۔ مگر البیرونی ۱۰۰۰ء میں ۲۷ برس کا تھا۔ اس کی پہلی اہم تصنیف آثار الباقیہ، اسی سال تکمیل کو پہنچی اور وہ ۱۰۴۸ء تک زندہ رہا اس لئے گیارہویں صدی کے نصف اول کو "البیرونی" کا عہد کہنا ہر لحاظ سے مناسب ہے۔

فلسفیانہ بنیاد | اس زمانے میں علم کا مرکز لاطینی ممالک کے مغربی حصے سے ہٹ کر عرب اور اندلس، یا یوں کہئے کہ مسیحی دنیا سے سرک کر اسلامی دنیا میں قرار پا چکا تھا۔ اسکی صریح دلیل یہ ہے کہ ان حکما کے مقابلے میں جن کا ذکر اوپر آچکا ہے مسیحی دنیا میں صرف "نوٹکر لیبیو (Notkar Lābeo) نظر آتا ہے۔ یہ شخص "سینٹ گال" کے علمی مذہب کا سب سے ممتاز نمائندہ تھا اور اس نے فلسفے کی بہت سی کتابوں کا لاطینی سے جرمن میں ترجمہ کیا۔ اگرچہ جو علوم اس کی بدولت جرمن زبان میں منتقل ہوئے انکی کسی نے علمی مذاق کی کمی کے سبب سے قدردانی نہ کی لیکن اس کی خدمات بہرحال قابل ستائش ہیں۔

یہودیوں کا علمی معیار مسیحیوں سے بہت بلند تھا کیونکہ انہیں مسلم حکما کی جید تصانیف سے براہ راست فائدہ اٹھانے کا موقع حاصل تھا، سچ پوچھئے تو یہودیوں کے فلسفیانہ خیالات اس زمانے میں ہر لحاظ سے وہی تھے جو مسلمانوں کے، آزاد خیال یہودی معتزلہ کے اثر میں تھے اور قدامت پرست یہودی مسلم فقہا کی قدامت پرستی، سے استفادہ کرتے تھے۔ اس میں انہیں بڑی سہولت یہ تھی کہ انکا تعلیم یافتہ طبقہ عبرانی کے ساتھ عربی زبان سے بھی واقف تھا بلکہ وہ خود عموماً اپنی کتابیں عربی ہی میں لکھتے تھے۔ چنانچہ اس عہد کے سب سے بڑے یہودی فلسفی ابن جابر الاندلسی نے جو یہودیوں کا افلاطون کہلاتا ہے، اپنی مشہور کتابیں ینبع الحیات وغیرہ عربی میں تصنیف کیں مسیحی سواسطی جس حد تک اس اندلسی یہودی کے خیالات سے متاثر ہوئے خود اپنے ہم مذہبوں کے خیالات سے بھی نہیں ہوئے تھے۔ ابن جابر الاندلسی کی

تصانیف نے مخلوط یونانی اسلامی فلسفے کو مسیحی دنیا تک پہنچانے میں اہم ترین واسطے کا کام دیا ہے۔

ایران میں یہ دور ادبیات کی ترقی کا ہے۔ ۱۰۱۰ء میں فردوسی نے اپنا قومی رزمیہ 'شاہنامہ' مکمل کرلیا تھا۔ اس عظیم الشان نظم کی اشاعت تاریخ تمدن میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔

اس کا مطالعہ نہ صرف اس عہد کے ایران کے سمجھنے کے لئے بلکہ ایرانیوں کی آئندہ ذہنی نشو و نما کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے بھی ناگزیر ہے۔ بغیر شاہنامے کو پڑھے، ایران کی ذہنی زندگی کو سمجھنا اسی طرح ناممکن ہے جیسے بغیر 'ہومر' کی 'ایلیڈ' کو پڑھے ہوئے۔ یونانی تمدن کو سمجھنا یا بغیر ڈانٹے کی ڈوائن کامیڈی Divine Comedy کو پڑھے ہوئے اطالیہ کی تہذیب کو سمجھنا۔

اب تک ہم نے جن فلسفیانہ خیالات کا ذکر کیا ہے وہ بجائے خود کافی اہمیت رکھتے ہیں لیکن اسلامی فلسفے کے مقابلے میں ان کی حیثیت محض ایک دیباچے کی ہے۔ اسلامی ممالک میں فلسفے کا رواج ڈھائی سو سال سے تھا اور اب اس میں بڑی زبردست ترقی ہو چکی تھی۔

مسلمانوں میں اس عہد میں، چار حکیم تھے، جو وسعت معلومات کے لحاظ سے تمام دنیا میں اپنا مدمقابل نہ رکھتے تھے۔ مصر کا 'ابن الہیثم'، ایران کے 'البیرونی' اور 'ابن سینا'، اور اندلس کا 'ابن حزم'۔ 'ابن الہیثم' میں فلسفیانہ گہرائی ان سب سے کم تھی لیکن علمی تجربے میں جو سلیقہ اسے تھا، اس کی مثال سارے قرون وسطیٰ میں کہیں نہیں ملتی۔ 'البیرونی' اور 'ابن سینا' کی اہمیت کا ہم پہلے ہی ذکر کر چکے ہیں۔ 'البیرونی' کی وقعت قدر دانان سائنس کے دل میں اس کی بے تعصبی، اس کی علمی تلاش و جستجو اور اسکی ہمت کے سبب سے ہے۔ مثلاً وہ پہلا مسلمان تھا، جس نے

ہندو فلسفے کا گہرا مطالعہ کیا اور دنیا کے دو بڑے تمدنی خطوں یعنی دنیائے اسلام اور ہندوستان کے درمیان واسطہ بنا۔ ابن سینا، ذہانت میں اُس سے کم نہ تھا، البتہ اُس میں باہر کے خیالات کو قبول کرنے کی صلاحیت کم تھی، کیونکہ اُس کا اصلی کام نئی معلومات حاصل کرنا نہ تھا بلکہ پرانی معلومات کو ترتیب دینا اور نظام بنانا۔ اُس کی تصانیف میں اسلامی فلسفہ، جو ارسطو کی روایات کا افلاطونیت اور مذہب اسلام سے امتزاج کرنا چاہتا تھا، معراج کمال کو پہنچ گیا، یہ یاد رہے کہ ابن سینا محض فلسفی نہ تھا بلکہ سائنس میں بھی ذہن خلاق رکھتا تھا اور اُس کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ ایک جامع قاموس یا معلم مرتب کرے۔ برخلاف اس کے اندلسی ابن حزم، محض فلسفی بلکہ عالم دین تھا۔ اس کا ذکر سائنس کی تاریخ میں محض اس بنا پر کرتے ہیں کہ اس کے خیالات نے مغربی دنیا پر بہت وسیع اثر ڈالا ہے۔

لاطینی، انگریزی، اسلامی اور ہندو ریاضی اور ہیئت

اس زمانے میں ہمیں لاطینی کتابوں میں ریاضی خیالات کا ایک چھوٹا سا چشمہ نظر آتا ہے جو روز بروز بڑھتا جاتا ہے لیکن اس میں دریا کی وسعت عرب کے سحاب کرم سے دو سو سال تک فیضیاب ہونیکے بعد تیرہویں صدی میں جاکر پیدا ہوتی ہے۔ زیر بحث عہد میں سوئٹزرلینڈ کے نوتکر لیبیو، ہالینڈ کے اڈیبولڈ Adebold اطالیہ کے گوئیڈو Guido اور انگلستان، کے بائرٹ فرتھ Byrhtferth کی کوششوں کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ انہوں نے جربرٹ، کی روایات کو زندہ رکھا۔

اسکے مقابلے میں جب ہم اسلامی دنیا پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ شب تاریک سے روز روشن میں یا عالم خواب سے عالم بیداری میں پہنچ گئے۔ آسانی کے لئے ہم مسلم ریاضی دانوں کی تقسیم تین طبقوں میں کرتے ہیں:۔ اندلسی، مصری، مشرقی۔ نفس امر کے لحاظ سے بھی یہ تقسیم صحیح ہے، کیونکہ باوجود اس کے کہ اسلام کی عالمگیری نے

آمد و رفت میں سہولت پیدا کر دی تھی، مقامی حالات کے اثر سے ان خطوں کی ذہنی فضا میں اختلاف تھا۔

اندلس کے ریاضی دانوں میں کوئی اہم شخصیت نظر نہیں آتی۔ الکرمانی سے 'اخوان الصفا' کے ریاضی خیالات اندلس میں رائج کئے؛ 'ابن السمح' نے تجارتی ریاضی اور ہندسے وغیرہ پر رسائل لکھے۔ اُس نے اور 'ابن الصفا' نے 'اصطرلاب' کا استعمال سکھایا اور ہندی 'سدھانتا' کے اصول پر ہیئت کے نقشے ترتیب دئے۔ اس زمانے کا سب سے بڑا ہیئت داں اور ہندسہ مثلث کا سب سے بڑا ماہر قاہرہ کا 'ابن یونس' تھا، مجموعی حیثیت سے وہ مسلمان ہیئت دانوں میں سب سے ممتاز تھا اور فاطمیہ مصر کی قدردانی کی بدولت اُسے اپنے کام میں بڑی مدد ملی۔ دولت فاطمیہ کے چھٹے حکمراں 'الحاکم' کے زمانے میں قاہرہ میں ایک 'دار الحکمۃ' قائم ہوا تھا اور مامون کے عہد کی اکادمی طرح اس کے ساتھ ایک رصدگاہ بھی تھی۔ 'ابن یونس' نے ان سہولتوں سے بڑا فائدہ اٹھایا اور بعض ثوابت کی صحیح پیمائش کر کے بہت سے ہیئت کے نقشے ترتیب دئے جو اس کے مربی 'الحاکم' کی نسبت سے 'حاکمی نقشے' کہلاتے ہیں۔ اُس نے علم مثلث کی نشو و نما میں کافی حصہ لیا۔ کرّوی Spherical مسائل کے نئے حل دریافت کئے اور پہلا Posthah seretical ضابطہ قائم کیا۔ 'ابن الہیثم' جو 'الحاکم' کے 'دار الحکمۃ' میں اُس کا رفیق کار تھا ماہر طبعیات کی حیثیت سے شہرت رکھتا ہے لیکن اسی کے ساتھ ایک جید ریاضی داں اور ہیئت داں بھی تھا۔ اُس نے یہ عجیب و غریب کوشش کی کہ ہیئتی انحراف اور شفق کی شعاعوں کے طول کی بنا پر کرۂ ہوا کی پیمائش کرے۔ اس نے 'المانی' کی مساوات کو اور اُس مسئلے کو جو اُس کے نام سے مشہور ہے متقاطع مخروطات intersecting Conics کی مدد سے حل کیا۔

مشرق میں ریاضی دانوں کی بڑی کثرت تھی اور اگرچہ اُن میں ابن یونس

کے پائے کا کوئی شخص موجود نہ تھا لیکن اُن کی علمی خدمات کا عام معیار بہت بلند ہے اور جدت طبع کا ثبوت دیتا ہے۔ ابن لبان کو علم مثلث سے خاص دلچسپی تھی، اُس نے مماس کے وظیفے tangent function کا گہرا مطالعہ کیا اور ہیئت کے نقشے ترتیب دئے جن کا تھوڑے ہی دن بعد فارسی میں ترجمہ ہو گیا۔ اُس نے علم نجوم اور علم حساب پر بھی کئی کتابیں لکھیں۔ ابن الحسین، نے یونانی ہندسے کے قدیم مسائل پر غور کیا۔ (مثلاً مکعب کی تضعیف duplication of acube اور انہیں محض ہندسے کی مدد سے حل کرنے کی کوشش کی۔ ابوالجود، بھی ہندسہ داں تھا۔ اُس نے سالم مسبع اور متسع regular Pentagon and enneagon کا اور ان مسائل کا خاص طور سے مطالعہ کیا جو محض مسطر اور پرکار کی مدد سے حل نہیں ہو سکتے؛ اس نے قطوع المخروطات Conic sections کے لحاظ سے مساواتوں کی باقاعدہ تقسیم کی کوشش کی یہ شخص منجملہ ان ریاضی دانوں کے ہے جنہوں نے اس کام کی بنیاد رکھی جو آگے چل کر ،عمر خیام، نے انجام دیا۔ ان سب میں سربرآوردہ ،الکرخی، تھا جس کا خاص فن حساب اور جبر و مقابلہ تھا۔ اُس نے متعدد diophantine مسائل حل کئے اور اس کے نئے سلسلے دریافت کئے۔ اس کی تصانیف میں کئی خصوصیتیں ہیں لیکن سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُس نے ہندی ہندسوں کے استعمال سے جان بوجھ کر پرہیز کیا۔ جہاں ہندسوں کی ضرورت تھی وہاں اُس نے اعداد کے پورے نام حرفوں میں لکھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان کے ہندسے استعمال کرنا اہل علم کی شان کے خلاف سمجھتا تھا۔ ،النسوی، نے فارسی میں عملی حساب پر ایک کتاب لکھی اور کچھ دن کے بعد اسکا عربی میں ترجمہ کیا۔ اُس نے ہندی قاعدوں کی تشریح کی اور ان سے مشکل حسابی مسائل میں کام لیا؛ اس میں اس نے ستونی کسور کی جگہ جو ہیئت کی پیمائش میں استعمال ہوتی تھیں کسور اعشاریہ استعمال کیں۔ ،ابن طاہر، نے بھی عملی حساب پر کئی رسائل لکھے اور میراث کے

اُن پیچیدہ مسائل کے حل کرنے کا طریقہ بتایا جو اسلامی فقہ کی وقت پسندی کی بدولت پیدا ہوگئے تھے۔ البیرونی نے ہندوستان کے ہندسوں کی جو تشریح کی ہے وہ قرون وسطیٰ کی بہترین تشریح سمجھی جاتی ہے۔ اُس نے ہیئت کی ایک قاموس لکھی اور ریاضی ہیئت اور نجوم پر ایک عام رسالہ تصنیف کیا، وہ ریاضی کی پیچیدہ سے پیچیدہ شقوں سے ذرا بھی نہ گھبراتا تھا اور اس نے اپنے عہد کے سارے دقیق ہندسی مسئلے حل کر ڈالے جو اس کے نام پر "مسائل البیرونی" کہلاتے ہیں۔ اُس نے رسم الاجسام (Stereography) کا بہت سہل قاعدہ دریافت کیا، کہا جاتا ہے کہ ابن سینا کو ریاضی کے جزئیات سے ذوق نہ تھا، مگر اس کے فلسفیانہ پہلو سے بہت دلچسپی تھی۔ پھر بھی اُس نے بعض علمی مسائل کے متعلق مفید اشارات لکھے ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ اگر اُس کی تصانیف کا زیادہ گہرا مطالعہ کیا جائے تو ثابت ہوگا کہ اُس نے اور بھی قابل قدر باتیں دریافت کی ہیں۔ یہ عام قاعدہ ہے کہ قاموس نگاروں کی تالیف و ترتیب کی خدمات پر اتنا زور دیا جاتا ہے کہ خود انہوں نے جو تھوڑی بہت علمی تحقیق کی ہے اُس پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ بہرحال اتنا سب جانتے ہیں کہ ابن سینا نے باوجود کثیر مشاغل کے کسی طرح وقت نکال کر ہیئت کے متعلق متعدد مشاہدات کئے اور علم ہیئت کے فنی پہلو technique کی بہت کچھ اصلاح کی۔

ہم نے حتی الامکان ان مشرقی ریاضی دانوں کا ذکر ترتیب زمانی کے لحاظ سے کیا ہے۔ اس سبب سے انکی علمی جدوجہد کی وسعت اور گوناگونی کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔ مثلاً ہم نے کسی عالم نجوم کا ذکر نہیں کیا۔ علاوہ اس کے ہیئت کے عملی حصے میں ضروریات وغیرہ پورا کرنے کے لئے جو کام کیا گیا اُس کا بیان بھی ہم نے ترک کر دیا ہے۔ ان چیزوں سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو مشرقی ممالک میں ریاضی کے دو علیحدہ مذہب تھے:- ایک وہ جس پر نظری رنگ غالب تھا اور جس کے نمائندے

"ابن الحسین"، "ابوالجود"، اور "الکرخی" تھے۔ دوسرا وہ جو زیادہ تر علمی ذوق رکھتا تھا یعنی "النسوی"، اور "ابن طاہر" وغیرہ کا حلقہ۔ "البیرونی"، اور "ابن سینا" کو ہم ان میں سے کسی مذہب میں شامل نہیں کر سکتے اس لئے کہ انہیں دقیق سے دقیق نظری مسائل اور عملی چیزوں سے یکساں دلچسپی تھی اور وہ جزئیات کو نظر حقارت سے نہیں دیکھتے تھے کیوں کہ بڑے دماغ کسی بات کو چھوٹا نہیں سمجھتے۔

ہندوستان میں اس عہد میں صرف ایک ریاضی داں "سری دھر" کا نام ملتا ہے جس نے ریاضی پر ایک ابتدائی رسالہ لکھا۔ مگر اس میں صفر کے تمام حسابی قاعدوں کے متعلق ہندوستان کے ریاضی دانوں کے خیالات نہایت وضاحت سے لکھے ہیں۔ البتہ تقسیم کا ذکر نہیں۔ غالباً مساوات درجۂ ثانیہ **quadratic equations** کے حل کرنے کا ہندی طریقہ اُسی کا نکالا ہوا ہے۔

لاطینی، انگریزی، شامی، اسلامی چینی، طبیعیات کیمیا اور صنعتی علوم

اس عہد کے لاطینی مصنفوں کی کتابیں زیادہ تر موسیقی پر ہیں۔ مغرب میں اس زمانے میں موسیقی کی ترتیب کا بہت زور تھا۔ غالباً اس میں اسلامی اثر یا کم سے کم اسلامی تحریک کو بڑی حد تک دخل تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس عہد کی لاطینی کتابوں میں جو خیالات نظر آتے ہیں وہ اس سے پہلے مسلم حکماء مثلاً فارابی کے یہاں (دسویں صدی کے وسط میں) نظر آتے ہیں اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی سائنس کا اثر دسویں صدی سے مغربی ممالک پر موسیقی کے پردے میں پڑنا شروع ہو گیا تھا۔

غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ قدیم روایات کی بنا پر جو "فیثا غورث" کے زمانے سے چلی آتی تھیں موسیقی سائنس کا جزو سمجھی جاتی تھی اور جب آگے چل کر (پانچویں صدی کے نصف آخر میں) "مارٹیانس کاپیلا" نے اور (چھٹی صدی کے نصف اول میں) "بوئتھیس" نے اس فن کو علم اربعہ میں شامل کر لیا تو اس کو بڑی تعلیمی اہمیت حاصل

ہوگئی جو عہد جدید کے آغاز سے کچھ پہلے تک باقی رہی۔ اس لئے یہ مناسب بلکہ ضروری ہے کہ ہم اپنے تبصرے میں قرون وسطیٰ کی موسیقی پر بھی ایک سرسری نظر ڈالیں۔

زمانہ زیر بحث میں 'اڑیشٹ کے اڈیبولڈ' نے موسیقی پر ایک رسالہ لکھا لیکن اس عہد کی سب سے اہم اور سب سے مقبول تصانیف 'اریزو کے گوئیڈو' کے قلم سے نکلی ہیں۔ ممکن ہے کہ اس کی تعریف میں مبالغہ کیا گیا ہو لیکن اس کی کتابوں سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ گیارہویں صدی کے آغاز میں مغربی ممالک میں موسیقی خاص ترقی کر چکی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ اس عہد کے انگریز نجومی اور عالم جز تقیل 'ناسیبری' کے 'اولیور' نے ایک مینار کی بلندی پر سے مصنوعی پروں کی مدد سے اترنے کی کوشش کی تھی۔ خدا جانے یہ قصہ کہاں تک صحیح ہے مگر اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ پرواز کی خواہش انسانوں کے دل میں ابتدا سے چلی آتی ہے۔

مشہور شامی مورخ 'الیاس بار شینیا' نے عربی زبان میں ایک رسالہ ترازو پر لکھا۔ اس میں سکوں، وزنوں اور پیمانوں کا مفصل ذکر ہے اور مختلف قسم کی ترازوؤں اور کانٹوں کا استعمال بتایا ہے۔ مسلمانوں کے کارناموں کا ذکر 'ابن الہیثم' سے شروع کرنا چاہیے جو اس صدی کے آغاز میں قاہرہ میں رہتا تھا۔ وہ نہ صرف مسلمانوں میں سب سے بڑا عالم طبیعیات گزرا ہے بلکہ تمام قرون وسطیٰ میں اس علم میں کوئی اس کا ہمسر نہیں تھا۔ ہندسی اور عضویاتی بصریات میں اس نے جو تحقیقات کی ہے وہ عہد قدیم اور سولہویں صدی کے درمیان اپنا مثل نہیں رکھتی۔ اس نے آنکھ کی تشریح اور نظر کی توجیہ میں کمال کیا ہے۔ مسلم سائنس دانوں نے کثافت نوعی کی پیمائش کا خاص مذاق پیدا کر دیا تھا۔ البیرونی نے ان روایات کو قائم رکھا اور اس نے ۱۸ قسم کے جواہرات اور دھاتوں کا صحیح وزن نوعی معلوم کیا۔ اس نے مشاہدے سے یہ دریافت کیا کہ روشنی کی رفتار آواز کی رفتار سے بدرجہا زیادہ ہے۔ 'ابن سینا' نے طبیعیات کے اُن

تمام مسائل کی تحقیقات کی جو اُس کے زمانے میں چھڑے ہوئے تھے، وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ روشنی کی رفتار خواہ کتنی ہی زیادہ ہو مگر محدود ہے۔ اُس کا علم موسیقی کا مطالعہ خاص طور سے اہم ہے اور اُس زمانے کی لاطینی تحقیقات سے، جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، بہت آگے ہے۔

ماسویہ المارديني نے جو قاہرہ کے "دار الحکمة" میں "ابن الہیثم" کا رفیق کار تھا، اشیا کو آگ پر جوش دیکر تیل نکالنے کا طریقہ ایجاد کیا۔ "ابن سینا" کے خیالات علم کیمیا کے متعلق عام روش سے علحدہ تھے۔ مسلم کیمیا گروں میں یہ عقیدہ عام تھا کہ دھاتوں پر زنگ یا ملمع کرنے سے اُنکے خواص بدل جاتے ہیں لیکن "ابن سینا" اس کا قائل نہ تھا، اس کا خیال تھا کہ دھاتوں کی ماہیت میں اس قدر اختلاف ہے کہ ایک دھات سے دوسری دھات کا بننا ناممکن ہو۔ الکاشی نے ۱۰۳۴ء میں ایک رسالہ علم الکیمیا پر لکھا۔

چین میں ۱۰۴۰ء اور ۱۰۵۰ء کے درمیان پی شینگ نے ٹائپ کی چھپائی ایجاد کی۔ سب سے پہلے مٹی کے ٹائپ بنائے گئے لیکن وہ ناقابل اطمینان ثابت ہوئے۔ پی شینگ نے لکڑی کے ٹائپ سے بھی تجربہ کیا۔

اسی عہد میں ایک چینی حکیم ژونگ بھی تھا جس نے مختلف قسم کی شراب کشید کرنے کے متعلق ایک رسالہ لکھا۔ مگر ہمیں اس واقعے کے متعلق پوری تحقیق نہیں، جو حضرات بہتر معلومات رکھتے ہوں وہ اس کی تردید یا تائید فرمائیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو ثابت ہوگا کہ چین والوں کو شراب کشید کرنے کا طریقہ یورپ والوں سے پہلے معلوم تھا۔

اسلامی تاریخ مواليد | البیرونی کی کتابوں میں علوم فطرت کے متعلق بہت سی قابل قدر معلومات موجود ہے۔ مثلاً اس نے یہ مشاہدہ کیا کہ پھولوں کی پتیوں میں ایک حد تک باقاعدگی پائی جاتی ہے۔ نسطوری عالم طبیعیات "ابن الطیب" نے علم نباتات کے ایک رسالے کا عربی میں ترجمہ کیا جو "ارسطو" کی طرف منسوب ہے اور اس کے ساتھ اسی موضوع

کی بعض اور کتابوں کا خلاصہ بھی شامل کر دیا۔

آئس لینڈ والوں کا امریکہ کو دریافت کرنا، لاطینی جغرافیہ، اسلامی جغرافیہ، معدنیات اور طبقات الارض

اس زمانے کا سب سے اہم جغرافی واقعہ یہ ہے کہ آئس لینڈ کے جہازرانوں نے بحر اٹلانٹک کے بعض شمالی امریکی ساحلوں کو دریافت کیا۔

فرانس کے ایک سوانح نگار یعنی فلیوری کے ایموان (Aimoin) نے فرنیک قوم کی تاریخ لکھنا شروع کی جس کے ساتھ ایک جغرافی مقدمہ بھی تھا۔ یہ مقدمہ بجائے خود قابلِ ذکر نہیں لیکن اس کی اہمیت یہ ہے کہ اس عہد کے مغربی مسیحی ممالک کی جغرافی دلچسپی کا تنہا نمونہ ہے۔

مسلم جغرافیہ دانوں نے نویں صدی میں، اور اس سے بھی زیادہ دسویں صدی میں اس قدر جد و جہد کی تھی کہ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ گیارہویں صدی کے نصف اول میں جغرافی علوم کے بارے میں ان پر مقابلتاً جمود کی حالت طاری تھی۔ بیشک اس عہد میں البیرونی، موجود تھا، جس کا شمار دنیا کے سب سے بڑے جغرافیہ دانوں میں کیا جا سکتا ہے، لیکن سوائے اس کے اور کوئی نظر نہیں آتا۔ اس نے مختلف پہلوؤں سے جغرافی علوم کی بڑی بڑی خدمات کیں۔ اول تو اس نے اس کے ریاضی عنصر کی نشو و نما میں بڑی مدد دی، علم ہندسہ اور مساحت کی مدد سے پیمائشیں کیں اور بہت سے مقامات کے طول البلد اور عرض البلد معلوم کئے۔ دوسرے اس نے رسم الاجسام کا بہت سہل طریقہ دریافت کیا۔ ہندوستان کے متعلق اس نے جو معلومات جمع کیں وہ علم جغرافیہ کا عظیم الشان کارنامہ ہیں۔ اس نے علم سکون سیالات کے قوانین کے مطابق قدرتی چشموں اور کنوؤں کے محل وقوع کی توجیہ کی۔ اس کا خیال تھا کہ دریائے سندھ کی وادی غالباً پہلے سمندر کی ایک کھاڑی تھی جو رفتہ رفتہ دریا برآمد مٹی سے بھر کر زمین بن گئی۔

ابن سینا نے معدنیات پر جو رسالہ لکھا تھا وہ یورپ کے مغربی ممالک میں نشاۃ ثانیہ Renaissance کے زمانے تک علم طبقات الارض کی سب سے مستند کتاب سمجھی جاتی تھی۔

لاطینی، بازنطینی، اسلامی (یا عربی) اور چینی طب

اس عہد میں یورپ کے مسیحی ممالک میں سالیرنو کے طبی مذہب کا ظہور نہایت نتیجہ خیز واقعہ ہے۔ یہ اصل میں بہت پہلے قائم ہو چکا تھا لیکن محسوس نتائج گیارہویں صدی کے وسط کے قریب ظاہر ہوئے اس زمانے میں جو کتابیں لکھی گئیں وہ عربی کتابوں سے بہت کم درجے کی تھیں، لیکن اُنکی اہمیت یہ ہے کہ اُن سے فن طب کی ایک نئی ارتقاء کا آغاز ہوتا ہے۔

دو بازنطینی طبیب جن کا صحیح زمانہ معین نہیں کیا جا سکتا، غالباً اسی عہد میں تھے۔ ایک تو ڈیمیناسٹس جس نے حاملہ عورتوں اور بچوں کی حفاظت کے متعلق ایک رسالہ لکھا اور دوسرے اسٹیفانوس مگینیٹیس جو ایک قرابادین کا مصنف تھا۔

مگر طب کی اصلی ترقی دیکھنے کے لئے عالم اسلامی پر نظر ڈالنا چاہئے۔ اس عہد میں مسلم طبیب اس کثرت سے تھے کہ یہاں بھی ہمیں اندلسی، مصری اور مشرقی کی تقسیم سے کام لینا پڑے گا۔

اندلس "الکرمانی" کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے۔ وہ ریاضی داں بھی تھا اور جرّاحی میں بھی کمال رکھتا تھا۔ ابن الوافد نے ایک رسالہ مفردات پر لکھا جس کے ایک حصے کا ترجمہ لاطینی میں ابتک موجود ہے۔

مصر مصر میں چار طبیب خلفائے فاطمیہ کی قدر دانی کو دعائیں دیتے تھے۔ ماسویہ المارادینی نے ایک ضخیم قرابادین لکھی جس کی یورپ میں قرون وسطیٰ میں بہت اشاعت ہوئی۔ صدیوں تک یہ کتاب اس موضوع پر سند مانی جاتی تھی۔ آنکھ کا علاج کرنیوالے مسلم اطبا میں "عمار" جدت خیال کے لحاظ سے سب میں ممتاز تھا لیکن اُس کے

مشرقی ہم عصر علی ابن عیسیٰ، کی تصانیف نے اس کی کتابوں کو منسوخ کر دیا۔ عمار، نے آنکھ کے علاج پر جو رسالہ لکھا ہے۔ اسکا جراحیاتی حصہ خاص طور سے اہم ہے۔ تیسرے طبیب ابن الہثیم کا بار بار ذکر آچکا ہے، لیکن یہاں اسکا نام لینا اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس نے عضویاتی بصریات میں قابل قدر تحقیقات کی ہے۔ علی ابن رضوان، نے یونانی طب پر متعدد رسائل لکھے جن میں اسکا وہ رسالہ سب سے زیادہ مشہور ہے جو اس نے جالینوس کی کتاب Arsparva پر لکھا تھا۔ اس نے ایک رسالہ مصر کے حفظان صحت پر لکھا، جس کا نام ہے "دفع مضار الابدان بارض مصر" ان میں سے ماسویہ عیسائی تھا اور باقی سب مسلمان تھے۔

مشرق | اپنے عصر کا سب سے بڑا طبیب اور دنیا کے بڑے بڑے طبیبوں کا ہمسر ابن سینا تھا۔ اس کی عظیم الشان طبی قاموس یعنی قانون چھ صدی تک نہ صرف اسلامی ممالک بلکہ مسیحی ممالک میں بھی طب کی سب سے مستند کتاب مانی گئی۔ اسمیں بہت سے نئے مشاہدات بھی تھے، لیکن لوگوں پر اسکا اتنا اثر صرف اس کی ترتیب و تنظیم اور اذعانیت dog matism کے سبب سے تھا۔

ابن الطیب نے یونانی طب کی کتابوں کی شرحیں لکھیں۔ ابوسعید عبیداللہ نے جو بختیشوع کے مشہور خاندان سے تھا، مرض عشق پر ایک کتاب لکھی اور ان فلسفیانہ اصطلاحوں پر تبصرہ کیا جنہیں اطبا استعمال کرتے تھے۔ علی ابن عیسیٰ علم علاج العیون Opth almology کی کئی کتابوں کا مصنف تھا۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ اس عہد کے تین جید طبیب ابن الطیب، ابوسعید عبیداللہ اور ابن بُطلان عیسائی تھے اور بغداد میں رہتے تھے۔ اس سے بغداد کے عیسائیوں کی وفاداری اور مسلمانوں کی رواداری ثابت ہوتی ہے لیکن یہ یاد رہے کہ ان عیسائی طبیبوں سے مسلم طبیب کہیں زیادہ اہم تھے۔

چین میں ۱۰۲۷ء میں "وانگ وائی تے" نے جسم انسانی کے دو ڈھانچے تانبے سے تیار کئے تاکہ فن شوکۃ الابرۃ acupuncture یعنی سوئیاں چبھو کر علاج کرنے کا طریقہ سمجھائے۔

جرمن، عبرانی، شامی اور چینی لسانیات | نوٹکر نے لاطینی سے جرمن میں جو ترجمے کئے ہیں وہ لسانیات میں خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ ترجمے جرمن زبان میں علمی اور فلسفیانہ تصانیف کے قدیم ترین نمونے ہیں۔ نوٹکر نے اپنی مادری زبان کو ترقی دینے کی جو کوشش کی ہیں، اسکا مقابلہ شاہ "الفریڈ" کی انگریزی کو رواج دینے کی کوششوں سے کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اُسے اتنی کامیابی نہیں ہوئی جتنی الفریڈ کو ہوئی تھی۔ سراغوسہ کے "ابن جناح" نے جو قرون وسطیٰ میں عبرانی لسانیات کا سب سے بڑا ماہر تھا اُس کام کو انجام تک پہنچایا جو دسویں صدی کے نصف آخر میں اندلسی یہودیوں نے شروع کیا تھا۔ قرطبہ کے سموئیل نے بھی صرف و نحو پر کئی کتابیں لکھیں۔

"الیاس بار شینایا" نے، شامی زبان کی صرف و نحو اور ایک عربی شامی لغت لکھی، جو قرن وسطیٰ کی آخری شامی لغت ہے۔

اس دوران میں "چین میں، قاموس نگاری میں بہت ترقی ہوئی۔ چینگ نگ نین نے لوفائن کی صوتی لغت اور کو یہ وانگ کی مفصل لغت پر نظر ثانی کی۔ اب یہ کتابیں جدید تحقیق کا ماخذ ہیں۔ سنگ چی اُس عظیم الشان صوتی لغت "جی یون" کے مدیروں کا صدر تھا۔ جس میں پچاس ہزار سے زیادہ حروف تہجی جمع کئے گئے تھے۔ سنگ چی کے رفیقوں میں منگ ٹو نے اس قسم کی ایک چھوٹی لغت شائع کی۔ جس میں صرف دس ہزار حروف تہجی تھے۔ اس کتاب کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔

اختتامی تبصرہ | گیارہویں صدی کے نصف اول کی علمی جدوجہد کا جائزہ لیتے وقت پہلی ہی نظر میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس میں اہل جاپان نے کوئی حصہ نہیں لیا، ہندی

اور بازنطینی حصہ بھی قریب قریب صفر ہے، کیونکہ ہندوستان میں اس زمانے میں محض "سریدھر" تھا جو دوسرے درجے کا نحوی تھا اور بازنطینی ممالک میں صرف دو طبیب تھے۔ بلکہ انکا اس عہد میں ہونا بھی محقق نہیں۔ تاریخ علوم میں یہ ہوا ہی کرتا ہے کہ جب بعض قومیں کام کرتی ہیں تو اُس وقت دوسری آرام کرتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نوع انسانی اُس اہم کام کو جو اس کے سپرد کیا گیا ہے، باری باری سے انجام دیتی ہے۔

اس عہد کا اہم کام اصل میں مسلمانوں نے انجام دیا۔ کیسے کیسے جید حکما اس دور میں گذرے ہیں، ابن یونس، ابن الہیثم، الکرخی، البیرونی، ابن سینا، عمار، علی ابن علیٰی، ابن حزم۔ یہی اقلیم علم کے بادشاہ تھے اور یہ سب کے سب مسلم تھے۔ اس زمانہ کا سب سے بڑا شاعر اور ہر زمانے کے بڑے شاعروں کا ہمسر، انسانی زندگی کا جلیل القدر مفسر فردوسی تھا۔

مسلمانوں کے بعد فلسفہ اور سائنس کے سب سے بڑے دو عالم یہودی ابن جابر الاندلسی اور ابن جناح تھے۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ عربی زبان یہودیوں کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ بعض مسیحیوں نے بھی مسلمانوں کے علمی کاموں میں ہاتھ بٹایا ہے۔ یہ سب طبیب تھے۔ بغداد میں ابن الطیب، ابو سعید عبید اللہ اور ابن بلطان اور مصر میں ماسویہ المارد ینی۔

مسلم حکما میں سے دو یعنی ابن سینا اور البیرونی جو سب کے سرخیل تھے۔ ایران کے رہنے والے تھے۔ ابن طاہر، کوشیار ابن لبان، ابن الحسین (؟) ابوالجود اور النسوی بھی ایرانی تھے۔

فاطمیوں کی علم دوستی اور قدردانی کی بدولت قاہرہ اس عہد کا سب سے بڑا علمی مرکز بن گیا تھا۔ ابن یونس، ابن الہیثم، عمار اور علی ابن رضوان کی جد و جہد کا مرکز یہی شہر تھا۔ بغداد بھی آل بویہ کے زیر حکومت علوم کی ترقی میں کافی حصہ لے رہا

تھا۔ نصر ابن یعقوب، الباقلانی، ابن الحسین (؟) الکرخی، الکاتی، اور علی ابن عیسی عباسیوں کے دار الخلافہ کی رونق کو بڑھا رہے تھے۔ اندلس میں بھی بنو امیہ کی سلطنت اور چھوٹی اسلامی حکومتوں کے سایہ عاطفت میں علمی اور ادبی ترقیاں ہو رہی تھیں مگر یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اسلامی اندلس کے تین سب سے بڑے حکما میں سے دو، ابن جابر اور ابن جباح مسیحی تھے، اور صرف ایک ابن حزم مسلم تھا۔ سموئیل یہودی تھا لیکن اور متوسط درجے کے حکما، الکرمانی، ابن السمح، ابن ابی الرجال، ابن الصفار ابن الوافد، ابن الفراضی اور ابن حیان سب کے سب مسلم تھے

اسلامی دنیا کے مقابلے میں مسیحی دنیا کی علمی خدمات بادی النظر میں بالکل بے حقیقت معلوم ہوتی ہیں لیکن یہ صحیح نہیں۔ کیونکہ یہ کتابیں بجائے خود ادنٰے درجے کی ہوں لیکن انکے اثرات و نتائج بہت اہم تھے۔ ہم امریکہ کی دریافت اور وہاں نو آبادی قائم کرنے سے قطع نظر کرتے ہیں، کیونکہ یہ ایک اتفاقی اور عارضی چیز تھی۔ اور امریکہ کی آخری اور اصلی دریافت میں اس سے کوئی مدد نہیں ملی۔ لیکن سالیرنو کے طبی مذہب کا ظہور اور یورپ کی موسیقی کی ترتیب و تنظیم بہت اہم واقعات ہیں۔ یہ آغاز بالکل ادنے درجے کا تھا، جیسا ہر آغاز ہوتا ہے۔ لیکن سالیرنو کے مذہب کو اس طویل سلسلے کی پہلی کڑی سمجھنا چاہئے، جو پاسچیور Pasteur پر آکر ختم ہوا۔ اسی طرح حسابی موسیقی کی بے حقیقت ابتدا اُس مخصوص مسیحی اور مغربی ارتقائے موسیقی کا پہلا قدم تھا، جس سے آگے چل کر بیٹھوون Beethoven کے روح افسزا نغمے پیدا ہوئے۔

مغربی علمی جدوجہد کے اور پہلو مقابلۃً بہت کم اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن اس بات کا مشاہدہ دلچسپ ہے کہ یورپ کی تدریجی بیداری کسی ایک مرکز تک محدود نہ تھی، بلکہ بہت سے مقامات میں پھیلی ہوئی تھی۔ نوٹکر سوٹزرلینڈ کا رہنے والا تھا، ریگمبولڈ کولون کا، تھیٹما۔ میرسبرگ کا۔ یہ سب جرمن تھے۔ برینس پیرس کا تھا۔

ایمواں فلیوری کا۔ یہ فرانسیسی تھے۔ میمبری کا اولیور اور ریمزے کا بائرٹ فرٹ انگریز تھے۔ اٹرلیشٹ کا اڈیبولڈ اور لی ایج کا راڈولف دلنڈیزی تھے۔ ہر ملک میں متعدد علمی مرکز تھے۔ اصل میں ہر خانقاہ، ہر کلیسائی مدرسہ ایک مرکز علم تھا لیکن کوئی مرکز اسلامی مرکزوں بغداد، غزنہ، قاہرہ، قرطبہ کی شان کا نہ تھا۔ سالیرنو کو آگے چل کر زیادہ اہمیت حاصل ہوئی لیکن ایک صدی بعد تک، جب قرون وسطیٰ کی یونیورسٹیاں قائم ہوئیں، مسیحی ممالک میں یہی تنہا علمی مرکز تھا جو بین الاقوامی حیثیت رکھتا تھا۔

جاپان کے علمی نشوونما کے عارضی طور پر رک جانے کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔ برخلاف اس کے چین میں سنگ خاندان کے بادشاہ چین کے ایک نئے زریں عہد کا سنگ بنیاد رکھ رہے تھے۔ ہم نے متعدد چینی علمار کا ذکر کیا ہے۔ سنگ خاندان کی شان و شوکت کا اثر جاپان میں کچھ دن کے بعد ظاہر ہوا اور وہاں بھی بڑی زبردست علمی جدوجہد شروع ہوئی۔

اگر مختلف علوم کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اس زمانے میں سب سے زیادہ ترقی ریاضی علوم، ہندسہ، جبرو مقابلہ اور حساب کو ہوئی، جس کا سہرا تنہا مسلمانوں کے سر ہے۔ ہیئت میں ابن یونس کے مشاہدات، طبیعیات اور بصریات میں ابن الہیثم کی تحقیقات اور مسیحی ممالک میں حسابی موسیقی کا آغاز اہم ترین واقعات ہیں۔

اسی طرح صنعت میں چینی ٹائپ کی ایجاد، جغرافیے میں امریکہ کی دریافت طبقات الارض میں البیرونی اور ابن سینا کی تصانیف؛ طب میں سالیرنو کے طبی مذہب کا ظہور، عمار اور علی ابن عیسےٰ کے رسالے علاج العیون پر، اور ابن

سینا کا قانون۔ لسانیات میں عبرانی اور شامی صرف و نحو کی تکمیل اور چینی لغات۔
ان کے علاوہ تاریخ اور فلسفے پر بھی بہت سی کتابیں لکھی گئیں جن کی علمی قدر کا معین
کرنا مشکل ہے۔

یہ ہے گیارہویں صدی کے نصف اول یعنی' البیرونی' کے عہد کی علمی
جد و جہد کا ماحصل۔

نوٹ:۔ یہ مضمون پہلے رسالہ" سائنس" جلد ا نمبر ۴ میں شائع ہو چکا ہے۔

افسانہ نویسی

مشہور تو یہ ہے کہ انسان حقیقت سے روپوش ہو کر افسانہ میں پناہ لیتا ہے، جیسے شترمرغ خطرہ دیکھ کر بالو میں اپنا سر چھپاتا ہے، افسانہ جھوٹ مانا گیا ہے، اس لئے کہ وہ حقیقت کو جھٹلاتا ہے، اور شاعری کی طرح افسانہ نویسی بھی ایک فن ہے جس کی خوبیاں یا فوائد مشکوک ہیں، اور برائیاں ایسی واضح کہ انکار کی گنجائش نہیں۔ انسانی زندگی کا مقصد ترقی ہے ایک ایسی حالت ہے جب انسان میں غلط اور صحیح، سچ اور جھوٹ کا احساس کم یا کمزور ہو ایک فرضی ذہنی کیفیت کی طرف جو اس کی قوت ادراک اور عمل اور حقیقت بینی کو درجۂ کمال تک پہنچا دے۔ افسانوں کی تصنیف اُن خامیوں میں شمار ہوتی ہے جن پر مہذب انسانوں کو شرمانا چاہئے، جیسے سن رسیدہ لوگ شرماتے ہیں جب اُن سے کوئی بچپنے کی حرکت سرزد ہو۔ لیکن اگر ہم یہ فرض بھی کر لیں کہ آرٹ، اور اس کے ساتھ افسانہ نویسی بھی، انسان کو اپنی اصلیت سے جدا کرتی ہے، تو ہماری کوئی مشکل آسان نہیں ہوتی، جس طبیعت میں ذرا بھی شک یا تلون ہو اُس کے لئے مذہبی اختلافات، عام اخلاقی تعلیم کی کوتاہیاں اور مذہبی رہنماؤں کی تنگ نظری اور تعصب میں گمراہی کا سامان موجود ہے، مذہبی، اخلاقی، اور تخیلی دنیا کو عظیم الشان شخصیتوں نے نئے نئے رنگ اور نئی نئی شکلیں دی ہیں، ہم کو اپنی راست بینی پر اتنا بھروسہ نہیں کہ شکل اور رنگ کی پردہ کو ہٹا کر اصلیت کا مشاہدہ کریں، اور یوں حقیقت کی ہر جستجو مخصوص صورت اختیار کرتے ہی خود ایک افسانہ بن گئی ہے، کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ آرٹ کو بدنام کرنے والے خود اپنی نیک نامی نہیں ثابت کر سکتے۔

ہر تہذیب اپنی زندگی اور نشو و نما کے لئے اصول بناتی ہے جنہیں ہم مذہبی یا اخلاقی

تعلیم کہتے ہیں۔ یہ اصول اپنا مقصد پورا کرتے رہتے ہیں، مگر اس کا ہمیشہ اندیشہ رہتا ہے کہ وہ بجائے انسانیت کے مرکب ہونے کے خود اُس پر بار نہ ہو جائیں، اور بجائے انسان کو نفس پرستی اور وہم سے آزاد کرنے کے خود اُس کی ہتکڑیاں نہ بن جائیں آرٹ کا منشا یہ ہوتا ہے کہ تہذیب کی نسبتہً تنگ اور انفرادی ذہنیت میں وسعت اور عالم گیری پیدا کرے۔ اور مذہبی اور اخلاقی تعلیم کی تاثیر کا امتحان لیتا رہے۔ آرٹ سے امید رکھنا کہ وہ مذہب یا اخلاق کی قائم مقامی کر سکتا ہے بالکل غلط ہے۔ مذہب اور اخلاق سے یہ توقع رکھنا بھی عبث ہے کہ وہ زیادہ عرصہ تک انسان اور تہذیب کے محرک کا کام انجام دے سکتے ہیں اگر اُن میں آرٹ کا خمیر شامل نہ ہوتا رہے۔ مذہب اور آرٹ کے ادنےٰ شیدائیوں میں ہمیشہ عداوت رہی ہے اور رہے گی، لیکن اُنکے اعلیٰ نمائندے اُنکے باہمی تعلق کے راز کو سمجھتے ہیں، اور یہ بھی جانتے ہیں کہ ایک حد سے گذر کر دونوں میں امتیاز کرنا ناممکن ہے۔

آرٹسٹ کو عموماً گمراہ اس وجہ سے قرار دیا گیا ہے کہ وہ کسی خاص مذہبی یا اخلاقی تعلیم کا پابند نہیں رہ سکتا، اور وہ دوسروں کو بھی ترغیب دلاتا ہے کہ مذہب اور اخلاق کی جائے پناہ سے نکل کر دنیائے جذبات کی سیر کریں، اور اُس کے خطروں کا مقابلہ کریں۔ آرٹسٹ کے مشرب میں قطعی فیصلہ کی گنجائش نہیں، سچ اور جھوٹ، اچھے اور برے کا جو معیار مذہب اور اخلاق مقرر کرتے ہیں۔ اُسے وہ تسلیم نہیں کرتا، کیونکہ معیا مقرر کرنے کے لئے نظر کو محدود کرنا ہوتا ہے اور یہ اُسے کسی طرح سے منظور نہیں۔ اپنے اصول کی صحت وہ ہمارے سامنے ایسے محل اور موقعے پیش کر کے ثابت کرتا ہے جب ہم اپنے عقیدوں کے خلاف عمل کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، اور یہ بھی نہیں قبول کر سکتے کہ ہم نے غلط کیا یا برا کیا۔ عالم جذبات میں انسان کے لئے مذہب وہی کام دیتا ہے جو زمین پر اُسکا گھر: دونوں کے بغیر اُس کی ہستی قائم نہیں رہ سکتی، ہم میں سے

ہر ایک کو ایسے مرحلے نہیں طے کرنے ہوتے جہاں ایمان کی پختگی اور عقیدوں کی سچائی کا امتحان ہو، لیکن آرٹسٹ میں یہ قوت ہوتی کہ ہمیں اپنا امتحان لینے پر آمادہ کرے اور اکثر ہمیں اقرار بھی کرنا ہوتا ہے کہ جن عقیدوں میں ہم نے پناہ لی ہے، اس عالم بے پایاں میں جو اپنا گھر بنایا ہے اُس کے در و دیوار کمزور ہیں اور ہماری حفاظت نہیں کر سکتے۔

ضمیر کو بیدار، عقیدوں کو زندہ رکھنا آرٹ کا نصب العین ہے۔ اُسکے ہر شیدائی کا حوصلہ اس قدر بلند نہیں ہوتا لیکن آرٹ کے اعلیٰ اور ادنےٰ شیدائی میں فرق نہ کرنا گویا مذہبی معاملات میں پیغمبر اور مولوی کو ایک سا سمجھ لینا ہے، افسوس یہ ہے کہ آرٹ کے مخالفین ہمیشہ اسی بنا پر اپنی رائے قائم کرتے ہیں کہ آرٹسٹ خود گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ اس وجہ سے آرٹ کی طرف زیادہ توجہ کرنا اُسے اپنی زندگی میں اہمیت دینا مضر ہے، اگر کوئی مولوی تعویذ لکھے، کوئی پنڈت ٹونے ٹوٹکے کی رسمیں سکھائے، کوئی پادری گناہ معاف کر سکنے کا مدعی ہو تو کسی کو اندیشہ نہیں ہوتا کہ قوم کے مذہب یا اخلاق کو نقصان پہنچے گا، لیکن اگر کوئی مصور ایک ننگی عورت کی تصویر بنائے تو سب کو اُس میں تمدنی تباہی کے آثار نظر آتے ہیں۔ ایسے بہت سے آرٹسٹ ہیں جو آرٹ کے نام سے لوگوں میں ہوس پرستی اور شہوت کا چرچا کرتے ہیں، وہ بیشک گمراہ ہیں۔ مگر اُن سے خفا ہو کر ہم کو آرٹ سے بے تعلق یا بدگمان نہ ہونا چاہئے، نہ مولوی پنڈت پادری کی وہم پرستی اور تنگ نظری سے بیزار ہو کر ملحد اور بے دین، ہماری دنیا، ہماری زندگی، ہم خود اعلیٰ اور ادنےٰ کا مجموعہ ہیں، جو اعلیٰ اور ادنےٰ میں امتیاز نہ کر سکے وہ انسانیت اور انسانی زندگی کے راز کو نہیں سمجھ سکتا۔

قصہ کہانیاں سننا اور سنانا آرٹ کی دیرینہ شکلوں میں سے ہے۔ قدیم داستان گو عموناً اپنے سامعین کے اخلاقی رہنما بھی ہوا کرتے تھے، اور وہ اپنے قصہ اسی ارادے

سے سناتے تھے کہ اُن سے عبرت حاصل کیجائے، ادبی اور تمدنی نشوونما کے ساتھ اخلاقی تعلیم کو اس پیرایہ میں پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں رہتی، داستانوں میں دلچسپی اور لطف کا عنصر بڑھ جاتا ہے، لوگ انہیں اس وجہ سے سنتے ہیں کہ روزمرہ زندگی کی یکسانیت اور بے مزگی سے رہائی ملے۔ ایسی داستانوں کا کل سرمایہ عشق و عاشقی کے معاملات یا جواں مردی کے کارنامے ہیں، اور یہ منزل اسقدر دلفریب ہے کہ داستان گوئی کا قافلہ اکثر اس سے گذرنے کی آرزو نہیں کرتا۔ ایسی داستانوں سے لطف بھی حاصل ہوتا ہے اور ان میں فن بھی دکھایا جا سکتا ہے، لیکن وہ افسانے اور فن افسانہ نویسی جو یہاں زیر بحث ہیں بالکل اور ہی چیز ہیں، اگرچہ آرٹ کی اسی شاخ میں اُنکا بھی شمار ہوتا ہے۔

افسانہ ہو یا داستان یا ناول، اُسکا سنانے یا لکھنے والا زندگی کی ایک تصویر پیش کرتا ہے جس سے ہم سمجھ لیتے ہیں کہ اُسکا ارادہ عبرت دلانا، ہنسانا اور خوش کرنا یا غور و فکر میں مبتلا کرنا ہے۔ مشرقی ادب میں اس وقت تک ایسی تصویریں زمانہ تہذیب اور معاصر حالات سے بے نیاز رہی ہیں۔ یہانتک کہ اکثر دنیا کا نقشہ بھی بدل گیا ہے اور مشرقی مذاق نے اس بے تکے پن پر اعتراض نہیں کیا ہے، کیونکہ اُسے صرف دلچسپی مقصود رہی ہے اور دلچسپی کے لئے داستان کی تاریخی اور جغرافی صحت شرط نہیں، ہمارے یہاں اگر کسی کو روحانی غذا کی حاجت ہوتی ہے، یا ایسے فلسفۂ زندگی کی جو اُسے مہیا کرتا رہے تو وہ داستان اور افسانہ کیا خود آرٹ سے منہ پھیر کر مذہب یا تصوف کی طرف رُخ کرتا ہے اُسے بالکل توقع نہیں ہوتی کہ شاعر یا افسانہ نویس اُس کے دل میں وہ سکون یا اطمینان پیدا کر سکتا ہے، یا دوسری دنیا میں اُس کے لئے وہ انتظام کر سکتا ہے جس کا دعوے مولوی پنڈت فلسفی اور صوفی کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے بجز فن تعمیر کے ہماری تہذیب میں آرٹ کی

کسی شاخ نے وہ نشو و نما نہیں پائی جو اُسے اپنے تمدنی مقاصد پورے کرنے کے لئے درکار ہے۔ اور غالباً اسی وجہ سے کہ یورپ میں مذہب کا شعلہ جلد ٹھنڈا ہو گیا ہم وہاں فنون لطیفہ کو عروج پر دیکھتے ہیں، مغربی انسان اپنے مذہب سے بدگمان ہو گیا اس لئے کہ وہ اُسکا بنایا ہوا نہیں تھا، اور اُس نے تہیہ کر لیا کہ وہ اپنے دل سے اُن سوالوں کے جواب پوچھے گا جو دوسرے انسان اپنے مذہب سے پوچھتے رہے ہیں، مغربی آرٹ، اطالیہ کے پونر جنم سے اسوقت تک، یہی جواب دینے کی کوشش ہے۔

یورپ کے ناولوں اور افسانوں نے اس کوشش میں پوری طرح سے حصہ لیا ہے۔ عشق کا عنصر حکایت کو لذیذ بنانے کے لئے اکثر ناولوں میں پایا جاتا ہے، بہت سے اوچھے اور بازاری قسم کے ناول لکھے گئے ہیں اور لکھے جاتے ہیں جن میں کوئی ادبی یا اخلاقی خوبی نہیں، مگر باوجود اس کے ناول یورپ میں ایک آئینہ کا کام دیتا ہے جس میں سوسائٹی ہر وقت اپنی کیفیت دیکھ کر اصلاح کی جدوجہد کر سکتی ہے افراد بھی دوسرے کے تجربے سے سبق حاصل کر سکتے ہیں اور افسانہ ہستی کے مختلف بیانات سنکر اپنے انجام پر غور کر سکتے ہیں، جب تک افراد تلاش معاش میں مصروف رہیں اور اُنہیں ایسے لوگوں سے سابقہ نہ پڑے جن کی زندگی نے دوسرا رنگ اختیار کیا ہے، اُنہیں دوسروں کی تکلیفوں اور جذباتی اور اخلاقی کشمکش کا بھی کوئی احساس نہیں ہو سکتا۔ یورپ کے ناول، ڈراما اور افسانے ہر صاحب ادراک کو اُس کی سوسائٹی کی حالت سے آگاہ رکھتے ہیں، اُس کی طبیعت میں بیقراری اور آرزوئیں اُس کی روحانی زندگی میں وہ ہیجان پیدا کرتے رہتے ہیں جس کے بغیر صحیح معنول میں وہ نہ سوسائٹی کا ایک جزو بن سکتا ہے نہ ذی حس اور ذی روح انسان، انگلستان کے پہلے ناول نویس فیلڈنگ نے اپنی قوم کو اُس کے اسکولوں طالبعلموں اور استادوں کی طرف متوجہ کیا، اور اس کے بعد ناول نویسی کا جو سلسلہ شروع ہوا

اُس میں غریبوں کی مصیبتوں، امیروں کی بے پروائی اور ناانصافی، انسان کی اخلاقی و روحانی امنگوں کی کیفیتیں بیان کی گئیں۔ میدان بہت وسیع تھا، اس میں ہر حوصلہ مند نے اپنی صلاحیت کے مطابق مشق کی، اور کارنامے دکھائے، اور ہر تعلیم یافتہ اور سنجیدہ شخص نے اس ادبی ذخیرہ سے لطف اٹھایا، عبرت حاصل کی، تخیل اور عقیدے تعمیر کئے۔

افسانہ ناول کی ادبی اولاد کہا جاتا ہے، زیادہ تر اس لحاظ سے کہ ناول لکھتے لکھتے لوگ افسانے لکھنے لگے، اور دونوں میں کوئی ایسا فرق نہیں جو اُنکے ظاہری رشتہ کے منافی ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک اور ضرورت تھی جس نے افسانہ کی ایجاد لازم کر دی جب مصور ایک وسیع لوح پر متعدد شکلیں اور صورتیں بنانے لگے تو وہ ہر شکل کیطرف کافی توجہ نہیں کرسکتا اور اگر کرے بھی تو دیکھنے والے کی نظر میں تصویر کا مجموعی اثر مختلف شکلوں کی انفرادی حیثیت پر غالب آجاتا ہے۔ ناول نویسوں نے روسی مصنف چیخوف کی رہبری میں یہ جدت کی زندگی کے عام نقشہ کو دھندلا کر دیا اور افراد اور انفرادیت کو بہت زیادہ شوخ اور نمایاں رکھا۔ روس میں انفرادیت کا بہت چرچا ہے روسی مصنفوں نے جو طرز اختیار کیا وہ انکے ملکی حالات کا تقاضا تھا ان سے یورپ نے یہ معلوم کیا کہ سوسائٹی اور اُس کے مسائل کے علاوہ فرد اور انفرادی کیفیات بھی قابل غور ہیں، کیونکہ جماعت کی خوبیاں اور خرابیاں افراد ہی سے شروع ہوتی ہیں، مختصر ناول یا افسانہ کا منشا یہی ہے کہ افراد اور انفرادی جذبات، جو بڑے ناولوں میں گم ہوجاتے ہیں، یا صحیح رنگ میں نہیں نظر آتے، اپنی پوری اہمیت کے ساتھ دکھائے جائیں اُسکا موضوع عموماً ایک انسان کی طبیعت، ایک جذبہ کا کھیل ہوتا ہے۔ یا کسی واقعہ کا ایک شخص یا جماعت پر اثر، اگر ہم چیخوف کے معمول کو مستند قرار دیں، تو ہر افسانہ کو اپنے شخصی یا اشخاص کی زندگی کا سب سے پر معنی لمحہ ہونا چاہئے جس میں انکی ساری سرگذشت بغیر بتائے معلوم ہو جائے، یا ایک آدمی کی کہی ہوئی بات جو دل کا سارا راز افشا

کردے۔

یوں افسانہ نویسی کا فن ناول نویسی سے ہرگز آسان نہیں، جو فطرت انسانی کا راز داں نہ ہو اُسے اس فن کے پاس نہ پھٹکنا چاہئیے۔ ناولوں میں خیالات کا پرچار کیا جا سکتا ہے، اور یہ مقصد ایسی کیرکٹر ایجاد کر سکتا ہے جن میں مطلق تصنع نہ ہو۔ مگر وہ اپنی شخصیت انہیں خیالات کے بحث مباحثہ کے لئے وقف کر دیں جو مصنف کو پیش کرنا منظور ہوں۔ خیالات کا پرچار ناول کے مسلمہ مقاصد میں سے ہے اس طریقے پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ جو خیالات کا پرچار نہ کرنا چاہے اور صرف زندگی کی دلکش تصویریں بنانا چاہے، اُسے بھی ناول میں آسانیاں ہیں۔ اگر وہ کیرکٹر کا اعلیٰ مصور نہیں تو دلچسپ یا عبرت انگیز واقعات بیان کرے، یا ایک داستان جس کے اشخاص کی انفرادی ہستی قصہ میں اُسی طرح گم ہو جائے جیسے قطرہ دریا میں، افسانہ کے لئے اختصار لازم ہے۔ افسانہ نویس اپنے قلم یا تصویر کو وہ آزادی نہیں دے سکتا جو ناول نویس کو ہوتی ہے۔ اُس کے لئے پہلی شرط ضبط ہے، اُسے ایک پوری زندگی کے تجربات و تاثرات کو ایک مختصر بیان میں مجتمع کرنا ہوتا ہے، جو کچھ وہ لکھتا ہے اپنی سرگذشت بنا کر لکھتا ہے۔ اُس کا دل ہزار ہا جذبات کی جولانگاہ بن جاتا ہے۔ اُس کی زندگی ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے: اُسے اپنے فن میں کمال صرف کمال ایثار سے حاصل ہو سکتا ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ ہر افسانہ نویس اپنے لئے اتنا بلند معیار نہیں قائم کرتا، اور اسی وجہ سے اس فن میں ہر کس و ناکس کو ماہر یا کامل نہ سمجھ لینا چاہئیے۔ یورپ میں ادبی شہرت کے حوصلہ مند اکثر افسانہ نویسی سے ابتدا کرتے ہیں اور یوں یورپ کے ہر ملک کے ادب میں افسانوں کا ایک بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ لیکن اس فن میں کامل صرف دو مانے گئے ہیں، فرانسیسی مصنف موپساں اور روسی چیخوف، ان دونوں میں بھی موپساں کی عام مقبولیت اُس کی زبان اور ادبی اسلوب کی بنا پر ہے، جس سے افسانہ

دلچسپ ضرور ہو جاتا ہے، لیکن اُن خوبیوں سے محروم رہتا ہے جو بلند پایہ تصانیف کے لئے لازم ہیں، موپساں کے اکثر پلاٹ حقیر ہیں، اُس کے تصور میں کافی پاکیزگی نہیں، کبھی کبھی ہمیں ایسے افسانے ملتے ہیں جو صریحًا فحش ہیں، اور مہذب لوگوں کے پڑھنے کے لائق نہیں، چیخوف پر اگر کوئی الزام لگایا جا سکتا ہے تو صرف یہ کہ اُس نے ایسے افسانے بھی لکھے ہیں جن کا کوئی خاص مطلب نہیں، جو انسانی جذبات کے سمجھنے میں کوئی مدد نہیں کر سکتے، یا بالکل فضول ہیں، لیکن اچھے مصنف بھی ہمیشہ وجد کی حالت میں نہیں رہتے اُنکی طبیعت بھی کبھی موزوں ہوتی ہے اور کبھی نہیں، اور وہ فن کے احترام کے علاوہ اور فرائض کے بھی پابند ہوتے ہیں۔ چیخوف پر یہ الزام ضرور لگتا ہے، مگر اس کے ساتھ ہی ہم کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اُس کی نیت کسقدر پاک ہے، انسانی ہمدردی اُس کے دل میں کیسی موجیں مارتی ہے، اُس کی نگاہ کس قدر روشن اور تیز ہے۔ اگر ہم اُسے افسانہ نویسوں کا بادشاہ قرار دیتے ہیں تو اسی وجہ سے کہ اُس کی تصانیف کا بہت بڑا حصہ ہمارے بلند سے بلند نصب العین اور مشکل سے مشکل معیار کے تمام شرائط پورے کرتا ہے۔

چیخوف نے جس ادبی ماحول میں تربیت پائی اُس نے چند اور خصوصیات پیدا کی تھیں جو یورپ میں ایک ذہنی انقلاب کا باعث ہوئیں۔ ان میں سب سے نمایاں واقعیت کا وہ پہلو ہے جو انسانی فطرت سے متعلق ہے۔ روس کے باہر اور روسی مصنفین سے پہلے بھی یورپین ادب میں واقعیت کی تحریک شروع ہو گئی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ پرانا طرز چھوڑا جا رہا تھا جو "بھانڈے کو پھوڑا کہنے" کی اجازت نہیں دیتا تھا، جس کا عقیدہ تھا کہ اوہام زندگی کی ذہنی بنیاد ہیں، اسلئے انہیں قائم رکھنا چاہیئے، اور جو کوئی اُن کی اصلیت سے واقف ہو جائے اُسکا بھی فرض ہے کہ اپنے علم کو ایک بھید بنا کر دل میں چھپائے، کیونکہ یہ وہ علم ہے جو بنی نوع انسان کو راحت نہیں پہنچا سکتا۔ واقعیت کی

تحریک نے اوہام پرستوں کی چیخ پکار کے باوجود اوہام کا طلسم توڑ دیا، قومی اور انسانی زندگی، اخلاقی، تمدنی، روحانی، اپنے اصل رنگ و روپ میں نظر آنے لگی، اور جب لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں تو انہوں نے صرف اپنی ذہنیت کو اُن اوہام سے رہا نہیں کر لیا جو اُس پر ایک بار ہو گئے تھے بلکہ عام زندگی کو راہ راست پر لانے کی جدوجہد شروع کی۔ لیکن اس تحریک میں ایک کمی تھی۔ خارجی حالات سے واقف ہونا حقیقت بینی کے لئے کافی نہیں۔ انسان کو اپنی طبیعت اور فطرت سے بھی بخوبی آگاہ ہونا چاہئے واقعیت کی یہ کمی روسی مصنفوں نے پوری کی، روسی طبیعت کچھ ایسی "پُر خود پیچیدہ" اور مشاہدۂ نفس میں مشغول رہتی ہے کہ اُسے اپنے افعال کے اصل اسباب تلاش کرنے میں نہ دشواری ہوتی ہے اور نہ غلط فہمی، اور روسی مصنفوں نے خوش قسمتی سے فطرت اور جذبات کی مصوری میں وہ قدرتی استعداد پائی ہے کہ بہت جلد وہ گہری معلومات جو روسیوں نے اپنے غیر علمی طریقہ پر حاصل کی تھی تمام مہذب قوموں کی ملکیت بن گئی اور ہر طرف اس کی سچائی اور بصیرت افروزی کا اعتراف ہونے لگا۔ انسان حفاظت نفس کیلئے اکثر اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے، بہت سی خواہشیں ہوتی ہیں اور بہت سے افعال جن کی اصل نیت کی تعبیر وہ اپنے فائدے کے مطابق کرتا ہے، اور سچ اور جھوٹ کا خیال نہیں کرتا، یہ ایک فطری خاصیت ہے جو کم و بیش ہر انسان میں پائی جاتی ہے، لیکن اسکا وجود ہم ایک دوسرے پر الزام لگا کر نہیں ثابت کر سکتے، اسی لئے طبیعت کے اندرونی معاملات کا راز داں خدا ہی کو مانا گیا ہے۔ افشائے راز اسی حالت میں ممکن ہے جب انسان خود اس کی ہمت کرے، اپنا دل دوسروں کے سامنے کھول کر رکھدے، اور انہیں اپنی پیروی کرنے کی ترغیب دلائے" ادسط"

---

۵ برنارڈ شا اپنے پیر و مرشد اِبسن کی تقلید میں انہیں لوگوں کو idealists کہتا ہے

انسان عام نگاہوں کا مرکز بننے کی رسوائی برداشت نہیں کرسکتا، لیکن نفس انسانی کو پوری طرح سمجھنے کے لئے یہ ناگزیر ہے، روسی انسان یہ رسوائی برداشت کرگیا، اور اس کے ایثار سے فطرت انسانی کے جو راز معلوم ہوئے ہیں وہ ہمارے زمانہ کی واقعیت کی جان ہیں۔

روسی افسانوں اور ناولوں میں ہر طرف یہی بے باک پردہ دری نظر آتی ہے۔ یوں ممکن ہے یہ ہمیں ایک ادنئے سی بات معلوم ہو، لیکن جب ہم اس کے تمام نتائج پر غور کرتے ہیں تو اس کی پوری اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ یورپ میں ایک وہم تھا کہ انسان ہمیشہ منطق کے اصولوں پر چلتا ہے۔ اس سے اگر کوئی غلطی ہوتی ہے تو صرف اسوجہ سے کہ اس کی منطق میں کوئی خامی رہ جاتی ہے، یعنی اگر انسان کو اسقدر تعلیم دیجائے کہ وہ اپنے دماغ کو عقل و دانش سے پوری طرح روشن کرسکے، تو عقل اس کی کامل رہبری کرسکے گی اور وہ کبھی نہ ٹھوکر کھائے گا نہ گریگا۔ نفسیات کی سب سے جدید دریافت یہی ہے کہ انسان منطق کیا معمولی سمجھ سے بھی بہت کام لیتا ہے اور لے سکتا ہے، عادات، جذبات فطری رجحان، ضد، یہ سب مل کر اس کے اختیار کو بالکل محدود کردیتے ہیں اور اگر عقل نے کبھی دخل بھی دیا یا رہبر بننے کی آرزو کی تو انسان یا تو اپنی بے کسی پر ہنستا ہے، یا قوت ارادہ کے زور سے اپنے جذبات، عادات اور فطری رجحان پر غالب آنے کی کوشش کرتا ہے۔ نفسیات کی یہ جدید دریافت دستئفسکی اور چیخوف کی تصانیف میں ہو بہو پائی جاتی ہے بلکہ اکثر خیال ہوتا ہے کہ نفسیات کے عالموں نے اسے روسی مصنفوں کے یہاں سے اڑایا اور اسے علمی جامہ پہنا کر اپنی چیز بنائی۔ مشرق میں ہم عقل اور دل، قال اور حال کے مناظرے صدیوں سے سن رہے ہیں، اور ہم نے دونو طرف کی دلیلوں میں دل اور کی دلائل زیادہ قوی مانی ہیں نفسیات کی یہ دریافت یا فطرت انسانی کی یہ راز عقدہ کشائی ہمکو نئی یا عجیب نہ معلوم ہوگی، لیکن انسان کو منطق یا حساب لگانے کی مشین سمجھنے کے علاوہ

ایک اور زبردست وہم ہے جس میں مشرق اور مغرب یکساں مبتلا ہیں۔ یہ وہم جنسی جذبات نے پیدا کیا ہے اور اسے عشق کہتے ہیں، یورپ میں اسکی اور شکل تھی، مشرق میں اور، لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو دونوں شکلیں بہت ملتی جلتی ہیں۔ یورپ میں نوجوان مرد نوجوان عورتوں پر عاشق ہوتے تھے، اور عاشق ہونے کے بعد وہ اپنا حق سمجھتے تھے کہ اپنی اور دوسروں کی زندگی جس طرح سے چاہے بنائیں اور بگاڑیں، اپنا حق وہ اس بنا پر تسلیم کراتے تھے کہ عشق کا جذبہ بہت بلند ہے، جس کسی میں یہ جذبہ جلوہ افروز ہوا سے سوسائٹی میں ایک خاص امتیاز حاصل ہو جاتا ہے اور اس سے انکار کرنا انسانیت کے جوہر کی قیمت گرانا ہے۔ انیسویں صدی کے وسط تک ناولیں اور افسانے اس تخیل کی تبلیغ کرتے رہے، ہزارہا عشق کی داستانیں سنائیں، عاشق نوجوانوں کے دلوں کی کیفیتیں سنگدل والدین اور بے رحم آسمان کی شکایتیں بیان کیں۔ انیسویں صدی کے وسط سے جب واقعیت کی تحریک شروع ہوئی تو عشق کا طلسم بھی کچھ کمزور پڑا۔ تجربے اور عام زندگی کے مشاہدہ نے بتایا کہ عاشق ہو جانا محض رئیسوں اور خوش حال لوگوں کی ایک دلچسپی ہے اور عشق کا جذبہ محض شہوت یا ڈھکوسلا، اس احساس نے عشق کی داستانوں کی وقعت تو بہت کم کر دی، مگر ناول اور افسانے پھر بھی اُسی بنیاد پر تعمیر ہوتے رہے، عشق کو افسانہ کی لوازمات میں سے خارج کرنے کی جرأت بھی سب سے پہلے روسی مصنفوں نے کی، بجائے ایک جذبہ کے جس کی کوئی اصلیت نہ تھی انہوں نے فطرت انسانی کے اور رنگ نمایاں کئے جنہیں عشق کی شوخی نے دبا دیا تھا، اس جدت نے انہیں ناول اور افسانہ کے بہت سے قدردانوں کی توجہ اور تعریف سے محروم رکھا لیکن اس کے عوض میں سنجیدہ لوگوں کی ایک بڑی جماعت جو ناولوں اور افسانوں کو ادبی لغویات میں شمار کرتی تھی، اُن کی شیدائی بن گئی۔ ایک حد تک یہ تفرقہ ناگزیر بھی تھا، عشق کے عنصر کے بغیر ناول اور افسانوں میں داستان یا قصے کی خصوصیت نہیں رہتی اُنکے عام قدردان جنہیں انسانیت کے اعلیٰ

مئلوں سے کوئی نسبت نہیں ہوتی، جو صرف اپنے فرصت کے گھنٹوں میں ایک دلچسپ شغل یا بھونڈے مگر سچے الفاظ میں اپنے جنسی جذبات کے لئے گدگدی چاہتے ہیں، انہیں اس صورت میں کسی طرح سے نہیں پسند کر سکتے۔ پڑھنے والوں کی زیادہ تر تعداد ایسے ہی لوگوں کی ہوتی ہے، اور ناول اور افسانہ نویسوں کے لئے انکی سرپرستی سے بے نیاز ہونا بہت جرأت کا کام ہے۔ لیکن اگر ہم افسانوں میں واقعات کی دلچسپی پر زیادہ اصرار کریں تو انکی تہذیبی اور فلسفیانہ حیثیت بالکل مٹ جاتی ہے، اور اُن میں کچھ یک رنگی سی آجاتی ہے جو ہماری زندگی کا صحیح عکس نہیں ہم میں صرف شاذ و نادر ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں جن کی سرگذشت ایک داستان کی صورت اختیار کرتی ہے اگر ہم محض انکی زندگی کے واقعات پر نظر رکھیں عاشق بھی ہر شہر میں فقط دو چار ہوتے ہیں، وہ بھی مختلف ارادوں سے، اور عشق جو کیفیت انکے دلوں میں پیدا کرتا ہے وہ اُس حالت سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی جو شاعر اور پرانے طرز کے ناول اور افسانہ نویس تصور کرتے ہیں، لیکن اگر ہم ذرا اپنی نظر پاک کریں، اور ذاتی لطف اٹھانیکی خود غرضانہ نیت کو چھوڑ کر انسانی ہمدردی کو اپنا محرک بنائیں تو معمولی سے معمولی شخص کی زندگی ہمارے لئے ایک پرکیف داستان ہو جائیگی واقعیت کی تحریک کا جوہر یہی ہے کہ وہ عام انسانی زندگی سے گریز کرنا، بے معنی اور خلاف واقعہ یا غیر معمولی داستانوں میں پناہ لینا صرف بد مذاقی نہیں بلکہ بزدلی اور کفر قرار دیتی ہے زندگی نام ہے زندہ دلی کا، زندہ دل وہی ہے جو حقیقت کے نظارہ کی آرزو اور جرأت رکھتا ہو، اور دوسروں کی نظر بھی صحیح مرکز کیطرف مائل کر سکے، وہم اور ادنےٰ جذبات کا شکار بننے کی ہوس تو ان کے خمیر میں شامل ہے، رہبری کی شرط اُسے آزاد اور بلند حوصلہ بناتا ہے۔

سلطان سلیمان اعظم قانونی[۱]

سلیمان کی ولادت ۹۰۰ھ میں ہوئی تھی۔ اپنے باپ سلطان سلیم کی وفات کے وقت یہ مقام صاروخان میں تھا۔ ۱۷ر شوال ۹۲۶ھ کو قسطنطنیہ میں پہنچکر تخت پر بیٹھا۔ اس کے جلوس کے بعد ہی غزالی نے جو قانصوہ غوری کے امرا میں سے تھا اور جس کو سلطان سلیم نے شام کا والی مقرر کر دیا تھا بغاوت کر دی اور خیر بک والی مصر کو لکھا کہ ہم قسطنطنیہ سے بہت دور ہیں۔ سلطان کی دسترس یہانتک مشکل سے ہو سکتی ہے اس لئے تم بھی میرا ساتھ دو۔ اس نے جواب دیا کہ تم اگر حلب فتح کر لوگے تو میں بھی تمہارے ساتھ شامل ہو جاؤں گا۔

سلطان نے فرہاد پاشا کو نظامیہ فوج کے ساتھ بھیجا۔ غزالی اس وقت حلب کا محاصرہ کئے ہوئے تھا۔ فرہاد پاشا نے اس کو شکست دی اور اسکا سر کاٹکر سلطان کے پاس بھیجدیا۔

فتوحات دولت علیہ کیطرف سے شاہ ہنگری کے پاس جزیہ کے مطالبہ کے لیے سفیر بھیجا گیا۔ اس نے سفیر کو قتل کر ڈالا۔ اس وجہ سے سلطان نے فوجیں لیکر چڑھائی کی۔ اور ۲۵ر رمضان ۹۲۷ھ کو بلغراد فتح کر لیا۔

چونکہ سارے بلغان میں یہی ایک ایسا قلعہ تھا جو عثمانیوں کے قبضہ سے باہر تھا اور جنگی اہمیت کے لحاظ سے نہایت وقیع تھا۔ اس لئے اس کی فتح کی خوشخبری تمام ممالک میں پھیل گئی۔ بادشاہ روس اور رئیس جمہوریہ وینس نے سلطان کو اس کامیابی پر تہنیت کے پیغامات بھیجے۔

---

[۱] یہ مضمون تاریخ الامت حصہ ہفتم کا ایک ٹکڑا ہے جو اس وقت زیر تالیف ہے۔ اسلم

رودس یوحنا اور شلیبی کی جماعت جو بزور تیغ ارض مقدس سے نکالی گئی تھی رودس میں آکر مقیم ہو گئی تھی۔ اور مسلمانوں کے خلاف جنگ اور غارتگری کرتی تھی۔ سلاطین عثمانیہ مدت سے خواہشمند تھے کہ اس جزیرہ پر قبضہ کرلیں تاکہ انکا خطرہ مٹ جائے اور غنیم کے بیڑوں کو وہاں پناہ نہ مل سکے۔ فتح مصر کے بعد سے مصر کے ساتھ بحری سلسلہ مواصلات قائم کرنے کے لئے اس کی ضرورت اور زیادہ محسوس ہونے لگی۔ سلطان نے وہاں کے صلیبی جنگ آور رہبانیوں کو لکھا کہ جزیرہ خالی کرکے چلے جاؤ تمہارے جان و مال سے تعرض نہیں کیا جائے گا۔ لیکن وہ جنگ پر آمادہ ہوگئے۔ اس لئے بیڑہ لیکر سلطان نے چڑھائی کی۔ آخر میں مجبور ہوکر انہوں نے جزیرہ چھوڑنا منظور کیا۔ سلطان نے اپنی فوجیں قلعے کے دروازہ سے ایک میل دور ہٹالیں اور بارہ دن کی انکو مہلت دی کہ اپنا مال و اسباب لیکر چلے جائیں۔ شاہ شارلکان نے جزیرہ مالٹا انکے لئے خالی کردیا تھا۔ وہیں منتقل ہو گئے۔

کریمیا ۱۵۲۹ء میں کریمیا کے فرمانروا محمد کرائی خاں کو اس کے دونوں بیٹوں غازی اور بابا نے ملکر قتل کرڈالا جس کی وجہ سے وہاں فتنہ برپا ہوگیا۔ دولت علیہ نے جس کی سیادت اس پر برائے نام تھی! اس موقع سے فائدہ اٹھاکر قبضہ کرلیا اور اس کو ایک عثمانی ولایت بنالیا۔

ہنگری اس زمانہ میں شارلکان یورپ میں سب سے بڑا بادشاہ تھا جو اسپین کیساتھ جرمنی اور ہالینڈ کا بھی مالک تھا اور اطالیہ کے ایک بڑے حصہ پر قبضہ رکھتا تھا جمہوریہ فلارنس اور جنوا اس کی تابع تھیں اور جزائر سنارکا اور سسلی بھی۔ فرانس کے بادشاہ فرنسیس اول نے اطالیہ کے صوبہ میلان کے لئے اس کے ساتھ جنگ کی اور شکست کھائی۔ باوجود اس کے کہ یورپ کے دربار میں فرانس سب سے اہم کیتھولک سلطنت تھی۔ جس نے یورپ میں اسلامی پیش قدمی کو رد کرنے کا حلف اٹھایا تھا لیکن اس موقع

پر مجبوراً فرنسیس کو دولت علیہ سے مدد مانگنی پڑی۔

چونکہ شارلکان عثمانیوں کا بھی دشمن تھا اس وجہ سے سلطان سلیمان نے فرنسیس کی امداد کی درخواست منظور کی اور ایک لاکھ فوج اور تین سو توپیں لیکر شارلکان کی طرف چلا۔ اس حملہ میں ہنگری کو فتح کر کے سلطنت عثمانیہ میں شامل کیا۔

دیانا کا محاصرہ شارلکان نے اپنے بھائی فرڈیننڈ کو آسٹریا کا بادشاہ بنادیا تھا۔ اس نے ہنگری پر فوج کشی کر کے جاپولائے کو جو سلطان کیطرف سے وہاں کا فرمانروا تھا شکست دیدی اور اس کے پایہ تخت بودین (بودابست) پر قابض ہو گیا سلطان نے خود ڈیڑھ لاکھ فوج لیکر چڑھائی کی۔ بودین کو واپس لیکر پھر جاپولائے کو وہاں کا والی بنایا اور آسٹریا میں بڑھکر دیانا کا محاصرہ کیا۔ لیکن شدت سرما کی وجہ سے اس کو فتح نہ کرسکا اور واپس چلا آیا۔ یہی سب سے آخری نقطہ تھا جس پر ترک یورپ میں پہنچ سکے۔

تبریز و بغداد شاہ ایران طہماسپ پسر اسمٰعیل صفوی نے سلیمان کو یورپ کی جنگ میں مشغول پاکر شریف بک کو جو ترکی سرحد کا والی تھا اپنے ساتھ ملالیا اور عثمانی حدود میں دست درازی شروع کی۔ سلیمان نے سنہ ۹۴۰ھ میں لشکر کشی کی اور روان اور ارجیش کے قلعے لیتا ہوا تبریز میں داخل ہو گیا پھر عراق عرب کو بھی فتح کر کے بغداد لے لیا اور وہاں کچھ دنوں رہکر نجف اشرف اور کربلا وغیرہ کی زیارتیں کیں، امام ابوحنیفہؒ اور شیخ عبدالقادر گیلانیؒ کے مزارات تعمیر کرائے۔

الجزائر آستانہ میں واپس آنے پر باربروسہ[1] خیر الدین پاشا نے جو الجزائر کے ایک حصہ پر قابض تھا تحفے اور ہدیے لاکر پیش کئے اور اپنے مقبوضہ کو سلطنت عثمانیہ میں

---

[1] باربروسہ ترکوں کا سب سے نامور امیر البحر روم کے جزیرہ مدللی کا باشندہ تھا جس کا (باقی)

شامل کرنیکی درخواست کی۔ سلطان نے منظور فرمایا اور خیرالدین کو قپودان دریا کے نام سے عثمانی بیڑہ کا امیر بنا دیا۔

شارلکان نے اپنے مشہور امیرالبحر آندرہ دوریا کی ماتحتی میں ایک قوی بیڑہ بھیجا تھا جس نے تونس کو تاخت و تاراج کرکے وہاں کے مساجد و معابد کو منہدم کر ڈالا تھا۔ اس لئے سلطان نے باربروسہ کی قیادت میں عثمانی اسطول روانہ کیا جس نے اطالیہ کے ساحل پر پہنچکر اندرہ دوریا کے بیڑہ کو سخت شکست دی اور اترانتو اور اس کے حوالی سے بے شمار مال غنیمت لیکر واپس آیا۔

بحر ہند ۹۴۴ھ میں دہلی کے بادشاہ نے مغلوں (ہمایوں) کے مقابلہ میں اعانت چاہی نیز بہادر شاہ گجراتی کیطرف سے بھی سلطان کے پاس سفیر پہنچے اور پرتگالیوں کے استیصال کے لئے جن کی غارت گریوں اور دراز دستیوں سے سواحل ہند کے اسلامی علاقے ویران ہو رہے تھے امداد کے طالب ہوئے۔ سلطان کے حکم سے سلیمان پاشا والی مصر، جنگی کشتیاں جن میں بیس ہزار سپاہی اور بڑی بڑی توپیں تھیں لیکر آیا۔ اس بیڑہ نے بحر احمر سے نکل کر عدن پر قبضہ جمایا پھر سواحل گجرات پر آکر پرتگالی قزاقوں کے قلعے منہدم کئے۔ آخر میں انکے سب سے بڑے مرکز دیو (دیپ) کا محاصرہ کیا۔ لیکن بعض وجوہ سے اس کو فتح کئے بغیر اموال غنیمت لیکر واپس چلا گیا۔

(بقیہ) پیشہ بحری قزاقی تھا۔ کچھ دنوں تونس میں رہنے کے باعث یہ اور اسکا بھائی اوروج دونوں مسلمان ہوگئے۔ اس کے بعد رومی کشتیوں کو لوٹنے لگے۔ سلطان سلیم نے انکو دس کشتیاں دی تھیں انہوں نے اپنی قوت بڑھاکر الجزائر کے ایک حصہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ اندلس میں جب عیسائیوں کو غلبہ حاصل ہوگیا اور وہ مسلمانوں کو جبراً عیسائی بنانے لگے اس وقت اس نے وہاں کے لاکھوں مصیبت زدہ مسلمانوں کو الجزائر میں لاکر پہنچا دیا۔

سلیمان پاشا نے عدن کے بعد رفتہ رفتہ پورے یمن پر قبضہ کرکے اس کو عثمانی املاک میں شامل کر دیا۔

جزائر بحر روم

فرانس اور دولت علیہ میں فتح اطالیہ کے لئے باہم یہ معاہدہ ہوا کہ عثمانی بیڑہ نیپل سسلی اور اسپین کیطرف سے حملہ آور ہوا اور فرانس شمالی سمت سے۔ اس کے مطابق سلطان ایک لاکھ فوج لیکر بلاد ارناؤط کیطرف آیا اور اپنے بیڑہ کو بھی روانہ کیا۔ لیکن جمہوریہ وینس نے اس مخالفت کی مخالفت کی۔ نیز عام مسیحی رائے بھی فرنسیس اول کے خلاف ہوگئی کہ اس نے اپنے ہم مذہبوں سے لڑنے کے لئے اسلامی سلطنت کو اپنا حلیف و مددگار بنایا۔ اس وجہ سے فرنسیس رک گیا اور جو منصوبہ تھا وہ پورا نہ ہوسکا۔ ورنہ سارا اطالیہ دولت علیہ کے قبضہ میں آگیا ہوتا۔

باربروسہ نے جزیرہ کارفو کا محاصرہ کر رکھا تھا مگر سفیر فرانس نے جس کو سلطان کے دربار میں بہت در خور حاصل تھا بیچ میں پڑکر انکی طرف سے حربی ضمانت دیدی اس لئے محاصرہ اٹھالیا گیا۔ واپسی میں باربروسہ نے کریٹ وغیرہ بحر روم کے اکثر جزیرے فتح کرلئے۔ آندرہ دوریا ۱۶۷ جہاز لیکر اس کے مقابلہ میں آیا مگر ہزیمت اٹھاکر واپس گیا۔

ان فتوحات سے اسپینی بیڑہ کا اقتدار جاتا رہا اور بحری سیادت ترکی بیڑہ نے لیلی میں کی شہرت اقطاع عالم میں پھیل گئی۔

۹۴۲ھ میں فرانس کے ساتھ جدید عہدنامہ ہوا جس میں سلطان نے بوجہ حلیف ہونے کے فرنچ تاجروں کے لئے عثمانی قلمرو میں خاص مراعات منظور فرمائیں ٹھیک اسی زمانہ میں شاہ طہماسپ شارلکان کے ساتھ دوستی اور مخالفت کی کوشش کر رہا تھا لیکن کامیاب نہ ہوسکا

فرانس کی مدد

۹۵۲ھ میں فرنسیس اول اور شاہ شارلکان میں پھر جنگ شروع ہوئی اس وقت فرانس کیطرف سے موسیو بولان نامی سفیر سلطان کے پاس آکر امداد کا طالب ہوا۔ اس نے باربروسہ کو ایک بیڑہ کے ساتھ بھیجا جس نے پہنچکر نیس

کا محاصرہ کیا لیکن فرنچ اور ترکی فوجوں میں اختلاف ہو جانے کے باعث فتح نہ کر سکا۔ ادھر کلیسا نے فرنسیس کو اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے مسلمانوں کی مدد لینے پر مطعون کرنا شروع کیا جس سے عام عیسائیوں نے اس کو ملحد اور بے دین قرار دیا اس وجہ سے مجبور ہو کر اس نے عثمانی بیڑہ کو رخصت کر دیا۔ واپس آنے کے بعد سنہ ۹۵۵ھ میں بار بروسہ قسطنطنیہ میں انتقال کر گیا۔ اس کی جگہ پر طور غود پاشا عثمانی بیڑہ کا امیر مقرر ہوا۔

اسی سال شارلکان نے تحفے اور ہدیے بھیجکر سلطان سے مصالحت کی درخواست کی۔ سلطان نے منظور کیا۔ معاہدہ یہ ہوا کہ پانچ سال تک جنگ نہ ہوگی بشرطیکہ آسٹریا کیطرف سے سالانہ تیس ہزار اشرفی خراج موصول ہوتا رہے۔

سنہ ۹۶۰ھ میں شاہ طہماسپ نے پھر تعدی اختیار کی۔ سلطان نے فوج کشی کی اور قرہ باغ کے متصل اس کو شکست دی۔ شاہ مذکور نے آخر میں قلعہ قرص دولت علیہ کے حوالہ کر کے صلح کر لی۔

طور غود پاشا نے اس درمیان میں جزیرۂ مالطہ کا محاصرہ کیا۔ اسی میں اس نے شہادت پائی جس کے بعد عثمانی بیڑہ بے نیل مرام واپس آگیا۔

وفات

سنہ ۹۷۳ھ میں مکیلمین پسر فرڈیننڈ شاہ آسٹریا نے ہنگری کے شہر توکاے پر قبضہ کر لیا۔ سلیمان نے باوجود نقرس کی تکلیف کے خود فوج لیکر چڑھائی کی اور آسٹریا کے قلعہ سکتوار کا محاصرہ کیا۔ فتح سے چند روز پیشتر ۲۰ صفر سنہ ۹۷۴ھ میں انتقال کر گیا وفات کے وقت اس کی عمر ۷۴ سال کی تھی۔

سلطان سلیمان ۴۸ سال تک تخت خلافت و سلطنت پر متمکن رہا۔ اس کے زمانہ میں چونکہ حکومت کے قوانین نئے سرے سے وضع کئے گئے اور فوج کی تقسیم اور اس کے مناصب کی ترتیب ہوئی اس وجہ سے وہ قانونی کے لقب سے مشہور ہوا۔

اسکا عہد دولت عثمانیہ کی تاریخ میں منتہائے اقبال اور کمال کا عہد تھا جس میں

مشرق اور مغرب میں فتوحات ہوئیں اور دولت علیہ کا نفوذ اور اس کے اقتدار کا غلبہ دور دور تک پہنچ گیا یہاںتک کہ وہ اس زمانہ میں دنیا کی سب سے بڑی بحری و بری طاقت بن گئی تین لاکھ جنگ آور فوجیں تھیں جن میں پچاس ہزار نظامی تھی اور تین سو جنگی کشتیاں تھیں جو اسوقت کے بڑے بڑے بیڑہ کو شکست دے چکی تھیں اور مشرق سے لیکر مغرب تک سمندروں پر انکی سطوت قائم ہو گئی تھی۔

سلیمان کے بعد سے سلطنت عثمانیہ کا زوال شروع ہو گیا جو سلسلہ وار چلا آرہا ہے یہاںتک کہ وہ اس حالت کو پہنچ گئی جس میں اب ہے۔ اس زوال کے مختلف اسباب ہوئے۔

(۱) رتبۂ سلطنت اور فتوحات کی وسعت کے ساتھ دولت اور ثروت کی زیادتی ہوئی جس کی وجہ سے سادگی اور سپہگری کے بجائے عیش پرستی اور آرام طلبی آگئی جسکا لازمی نتیجہ زوال ہوتا ہے۔

(۲) انکشاریہ کا سپہ سالار اعظم خود سلطان ہوتا تھا۔ اس لئے انکا دستور یہ تھا کہ وہ بلا سلطان کے لئے ہوئے جنگ کیلئے نہیں نکلتے تھے۔ سلیمان کے عہد سے یہ قانون بن گیا کہ وہ اپنے امراء کے ماتحت جنگ کے لئے جایا کریں۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ زمانۂ مابعد میں اکثر سلاطین نے عیش پرستی کی وجہ سے جنگ وجہاد میں جانا چھوڑ دیا۔

علاوہ بریں انکشاریہ کو جو سلطنت کے عمود تھے شادیاں کرنے اور گھر بنا کر رہنے کی بھی اجازت دیدی گئی جس سے انکی جنگی حمیت میں فتور پڑ گیا۔

(۳) پہلے سلطنت کے تمام مہمات دیوان وزرا میں بریاست ومشورہ سلطانی انجام پاتے تھے۔ لیکن سلیمان نے اس دستور کو توڑ دیا اور یہ قاعدہ مقرر کیا کہ صدر اعظم کی ماتحتی میں جملہ امور طے ہوا کریں۔ اس وجہ سے خود سلطان اکثر معاملات کی حقیقت سے ناواقف رہنے لگا اور وزرا اپنے اغراض ومقاصد کی تکمیل کے لئے حرم اور بیگمات سے بھی امداد لینے لگے۔ اس طرح پر سلطان کے گرد دسیسہ کاریوں کا ایک جال بچھگیا جس میں وہ اکثر شکار ہونے لگا۔

اور سلطنت کے کام بگڑنے لگے۔ خاصکر اس وجہ سے اور بھی کہ وزرا قومیت میں بھی بالعموم مغایر ہوتے تھے۔ کیونکہ اکثر نومسلم نصاریٰ جو سلطان کے خادم یا مقرب ہوتے تھے وہی صدارت عظمیٰ کے منصب پر مقرر کر دیئے جاتے تھے۔

(۴) سب سے بڑا سبب یہ ہوا کہ ترکوں کا حریف یورپ دور جہالت اور وحشت سے نکلکر علم اور تمدن کیطرف آ رہا تھا۔ بجائے انتشار اور طوائف الملوکی کے ان میں وحدت اور ملوکیت کا اقتدار پیدا ہو رہا تھا۔ ملکی اور ملی مقاصد کے لئے بڑی بڑی قربانیاں اور مصائب برداشت کرنیکی قوت آ رہی تھی۔ اندلس کے مسلمانوں پر مکمل تسلط کر لینے کے بعد اس کے فاتحانہ جذبات بڑھ گئے تھے۔ مطابع کی ایجاد علوم وفنون کی اشاعت اور آتشیں اسلحہ کی ساخت اور انکے استعمال سے نوجوان یورپ اسی قدر دن بدن آگے بڑھ رہا تھا جس قدر پرانا ترک پیچھے ہٹ رہا تھا۔

سلطان سلیمان اعظم اپنی بے مثل شجاعت اور عالی حوصلگی اور بے نظیر تدبر اور فرزانگی کی بدولت دنیا کا نہایت ممتاز سلطان ہوتا اگر اس کی زندگی پر قتل اولاد کا بدنما دھبہ نہ پڑتا۔

صورت یہ ہوئی کہ اس کی ایک روسی بیوی روکسلان (فرحانہ) نامی تھی جو بوجہ اپنے حسن وجمال کے شروع سے آخر تک اس کے قلب کی مالک رہی۔ وہ چاہتی تھی کہ شاہزادہ سلیم جو اس کے بطن سے پیدا ہوا ہے ولیعہد ہو۔ اسلئے اس نے اپنے داماد رستم پاشا کو صدر بنوایا اور اس کے ساتھ ملکر اس کے لئے کوشش شروع کی۔ ان دونوں نے شاہزادہ مصطفےٰ کیطرف سے جو ولیعہد تھا سلطان کو بدظن کرانا شروع کیا۔

ایران کے آخری حملہ کے موقع پر مقام ارکلی میں ایک دن رستم پاشا نے سلطان کو مطلع کیا کہ مصطفےٰ نے انکشاریہ کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ وہ موقع دیکھ رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آپ کی زندگی ہی میں اس کو تخت پر بٹھا دیں۔ چونکہ مصطفےٰ بوجہ اپنی سپہگری اور شجاعت کے انکشاریہ میں بہت مقبول اور ہر دلعزیز تھا۔ اس وجہ سے سلطان کو یقین آ گیا۔ اس نے

کوئی تفتیش نہیں کی اور مصطفیٰ کو بلا کر حاجبوں سے قتل کرا دیا۔ انکشاریہ نے اس پر سخت شورش مچائی اور صدر اعظم کے قتل کے درپے ہوئے سلطان نے انکی تسکین خاطر کے لئے رستم پاشا کو معزول کر دیا۔ مصطفیٰ کے بھائی جہانگیر نے باپ کے سامنے جاکر اس قتل پر سخت جذبہ کا اظہار کیا سلطان نے اس کو توبیخ کی جس کی وجہ سے اس نے خودکشی کر لی۔ خرم نے اپنے ایک خاص آدمی کو بھیجکر مصطفیٰ کے شیر خوار بچہ کو بھی مروا ڈالا۔ اور اس فکر میں پڑی کہ شاہزادہ بایزید جو باقی رہگیا ہے اسکا بھی خاتمہ کرا دے تاکہ اس کے بیٹے سلیم کے سوا اور کوئی تخت و تاج کا وارث نہ رہجائے مگر اسی اثنا میں وہ خود مرگئی۔ اس کے بعد لالہ مصطفیٰ نے جس کو وہ سلیم کا مربی بنا گئی تھی اپنی پر فریب دراندازیوں سے سلیمان کو بایزید کا بھی مخالف بنا دیا۔ یہانتک کہ اس نے بایزید کی گرفتاری کے لئے فوج بھیجی۔ وہ مقابلہ میں شکست کھا کر بھاگا اور معہ اپنے چاروں بیٹوں کے والی ایران شاہ طہماسپ کے یہاں پناہگزیں ہوا۔ اس نے نہایت گرمجوشی سے لیکر اپنے پاس رکھا اور حمایت کا وعدہ کیا مگر درپردہ سلطان کو اطلاع دیدی اور جب اس کے آدمی آئے تو انکے حوالہ کر دیا۔ انہوں نے قزوین پہنچکر سلطان کے حکم سے بایزید کو معہ اسکے چاروں بیٹوں کے قتل کر ڈالا بروصہ میں اسکا ایک شیر خوار بچہ تھا اسکا بھی گلا گھونٹ دیا گیا۔ اس طرح پر بجز سلیم کے سلطان نے خود اپنی ساری اولاد کا خاتمہ کرا دیا۔

ترکی قوم پرستی اور اتحاد تورانی

کوئی دو سال ہوئے مشہور ترکی ادیب خالدہ خانم نے اپنے حالات زندگی لکھے تھے جو امریکہ میں شائع ہوئے ہیں۔ ہم ذیل میں اس کتاب کے ایک باب کا ترجمہ ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔ جس سے ترکی قوم پرستی کی تاریخ پر نہایت دلچسپ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

سنہ۱۹۱۰ء سے سنہ۱۹۱۲ء تک کا زمانہ میرے لئے اس قوم پرستی کے دریا میں جست کرنے کا پیش خیمہ تھا۔ اور اس قوم پرستی نے جنگ بلقان کی ہزیمت کے بعد بڑی شدید شکل اختیار کر لی تھی۔ جو قومی رجحانات پہلے کچھ بے شکل اور غیر متعین سے تھے انہیں طرابلس کی معرکہ آرائی اور اسکی شجاعانہ روح سے تقویت پہونچی تھی۔ اور سچ یہ ہے کہ اگر جنگ کے مصائب کے بعد پردیسیوں کے غیر منصفانہ برتاؤ سے ہمیں اتنا سخت دھکا نہ لگا ہوتا تو شاید ہم کبھی نہ چونکتے نہ اس درجہ جوشیلے قوم پرست بن سکتے۔

شروع شروع میں تو یوسف اکجورہ اور گیوک الپ ضیاء سے واقفیت نے مجھے اپنی نسلی ماضی سے قریب اور عثمانی ماضی سے دور کیا۔ مجھے ہمیشہ سے عوام کے قصہ کہانیوں اور عام ادب کے بسیط اور سادہ حسن سے لگاؤ تھا۔ اس لئے اپنی نسل کے قدیم ایام نے قوم کی ڈلکھی شاعری اور اس کے بے لکھے قصے کہانیوں کے ماخذ کی حیثیت سے مجھے اپنی طرف کھینچا۔ تمدنی تجسس اور واقعات خارجی کا ظلم یہ دونوں چیزیں اکثر ذہین ترکوں کو اپنی نسل کے ابتدائی حالات کے گہرے مطالعہ پر مجبور کر رہی تھیں۔

ترکی میں قوم پرستی کے مختلف دور رہے ہیں، مختلف نام اور مختلف تعریفیں۔ پھر مجموعی حیثیت سے یہی جدید ترکی تاریخ کے بہت سے اہم واقعات کے فہم کی کنجی ہے اس لئے اس

تحریک کے مختلف دوروں کا ذکر ضروری ہے۔

ترکی قوم پرستی کی ابتدا غیر شعوری تمدنی حیثیت سے ۱۹۰۸ء سے پہلے ہوئی اور وہ زبان کو سادہ بنانے کی شکل میں۔ لیکن یہ تحریک صاف طور پر عثمانی ترکوں کی تحریک تھی۔ رضا توفیق اور محمد ایمن نے پہلے پہل ترکی بحریں اور اناطولی ترکوں کی سادہ زبان استعمال کی اور انکی تحریروں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ عثمانی اور دوسرے ترکوں کے فرق کو صاف صاف محسوس کرتے تھے قومی حیثیت سے دیکھئے تو عثمانی ترک بالکل ہی مختلف معلوم ہوتا ہے۔ وہ مشرق قریب اور یورپ میں آیا اور وہاں اس نے اپنے خون اپنی زبان، بلکہ اپنے نفس کے ہر ہر ذرہ میں کوئی نہ کوئی مخصوص چیز حاصل کر لی۔ اس کی نسل کی ابتدائی قوت اور ماہیت پر کتنی ہی گہری نظر ڈالنے کی کوشش کیجئے لیکن آپ یہ ماننے پر مجبور ہوں گے کہ اس کی روح اور اس کے جسم میں ایسی چیزوں کا اضافہ ہوا ہے جنہوں نے اسے اس وقت سے بہت مختلف بنا دیا ہے جب وہ پہلے اس ملک میں آیا تھا جسے ترکی کہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ عثمانی ترک ہے اور اس پر اسی حیثیت سے نظر ڈالنی چاہیئے اور جاننا چاہیئے کہ ہر وہ چیز جو لسانی و تمدنی اعتبار سے اس کی اس مخصوص حیثیت کے خلاف ہوگی لازماً زیادہ پائدار نہیں ہو سکتی۔ اس کی زبان کو پھر ختیائی ملک میں واپس پہنچانے کیلئے مجبور کرنا ایسی ہی مصنوعی بات ہوگی جیسا اسے ایرانی یا فرانسیسی کے سانچے میں ڈھالنا، لہٰذا اسکی سادگی اور اسکی قوم پرستی خود اسکی قومی روح کے مطابق چلیگی دوسری طرح نہیں۔

گذشتہ پچیس سال میں عثمانی ترک برابر اپنی زبان پر نظر ثانی کرتا اور اسے زیادہ لطیف اور زیادہ وسیع بناتا رہا ہے، اس میں ایک ترقی یافتہ زبان کی اصطلاحیں اور امکانات پیدا کرتا رہا ہے اور ایسی زبان بنانے میں کوشاں رہا ہے جس میں سائنس اور فلسفہ پیدا ہو سکے اور انکی تلقین و اشاعت ممکن ہو۔ شمس الدین سیمع بے اور پروفیسر ناجی نے ترکی لغت کو اسی سے بالارادہ سادہ بنایا تھا۔ سنہ ۱۹۱۰ء سے ترکی اہل قلم نے بھی پھر اسی قسم کی ایک بالارادہ کوشش شروع کی، انہوں نے علمی اصطلاحات کو مقرر کرنے کی کوشش کی، ترکی قواعد کو سادہ بنایا

ادر اس سے عربی اور فارسی کو علٰحدہ کیا۔ علمی اور فلسفیانہ اصطلاحات معلوم کرنے والوں میں خاص طور پر کیوک الپ ضیا نعیم اور رضا توفیق بے کے نام لینے چاہئیں اور حسین جاہد نے وہ جدید ترکی قواعد لکھی جواب نمونہ سمجھی جاتی ہے۔ یہ سب کچھ ایک زبان کی تحقیق تھی۔ ایک قومی روح کا پیدا کرنا تھا اور عثمانی ترکوں کے تمدن کو سمجھنے کی کوشش تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اتحاد تورانی اس قوم پرستی کی وسیع تر تعبیر و تعریف تھی جس کا اظہار کیوک الپ ضیا اور بعض مشہور روسی ترک اہل قلم مثلاً احمد آغایف اور یوسف اکچورا بے نے کیا۔ پہلے تو یہ خالص تمدنی چیز تھی لیکن انجمن اتحاد و ترقی کے بعض رہنماؤں نے اسے ایک سیاسی مطمح نظر بنا دیا خصوصاً اس زمانہ میں جب جنگ عظیم کے وقت ترکی افواج قدیم روس کے علاقہ میں پہنچ گئی تھیں لیکن سیاسی اعتبار سے اتحاد تورانی کی نہ کبھی کوئی متعین حدود تھیں، نہ اس کی کوئی تشریح تھی نہ کوئی واضح اظہار اس پر جب کبھی کوئی اعتراض کرتا تو طلعت پاشا خوش مذاقی سے ہنسکر فرمایا کرتے "کیوں کیا ہے۔ ممکن ہو یہ ہمیں بحر اصفر تک پہنچا دے!" لیکن آخر اس اتحاد تورانی کی اصلی بنیاد کیا تھی؟ کیا یہ سب تورانیوں کا سیاسی اتحاد تھا؟ عثمانی ترک جس اتحاد تورانی کے خواہاں تھے کیا اس میں یکی ترک کے لئے بھی کوئی جگہ تھی؟ یا یہ صرف مسلمان ترکوں کے لئے تھا جو درحقیقت انور بے کے اتحاد اسلامی کی ایک شکل ہوتی جس میں اس اتحاد مذہب کے ساتھ اتحاد نسل کو بھی شامل کر دیا جاتا جس کے پیدا کرنے کا ایک دھندلا سا تخیل انور پاشا کے ذہن میں تھا لیکن جس کے قیام میں وہ ناکام رہے ــــ

میں ترکوں کو متحد کرنے کے سیاسی تخیل میں کیوک الپ ضیا کی مخالف تھی۔ مجھے یقین تھا اور اب بھی ہے کہ ترکی میں قوم پرستی تمدنی اور جغرافی ہے اور یہ ممکن نہیں کہ ہمیں اور روسی ترکوں کو اس طرح متحد کیا جا سکے جس طرح کہ اس وقت لوگ ممکن سمجھتے تھے۔ روسی ترک خود اپنی مخصوص قومی روش رکھتے ہیں اور ہم سے بہت کچھ مختلف ہیں۔ وہ ہمارے ادب کے کتنے ہی دلدادہ ہوں لیکن عثمانی ترکوں کی مداخلت وہ کبھی گوارا نہ کریں گے۔ جو عناصر اور اثرات ان کے تمدن کی تعمیر میں صرف ہو رہے ہیں وہ بالکل روسی ہیں۔ عثمانی ترکوں کے عناصر تمام تر مغربی ہیں۔ مستقبل بعید میں

عثمانی ترکوں اور بحر کیسپین تک کے ترکوں میں زیادہ سے زیادہ جو سیاسی تعلق ممکن ہے اور جو واقعی سب سے پسندیدہ بھی ہے وہ یہ خودمختار ریاستوں کا اتحاد ہے جن میں دونوں عناصر کو پورا پورا آزادانہ موقع ہو کہ وہ اپنی مخصوص تمدن اور اپنی مخصوص ترقی کو پیش نظر رکھ سکیں لیکن اگر ایسا وقت کبھی آیا تو میں توسمجھتی ہوں کہ اس وقت آرمینیا، جیارجیا، اور ایران بھی ترکی ریاستہائے متحدہ میں شامل ہونے کے لئے تیار ہو چکے ہونگے تاکہ روس اور یورپ کے حملوں اور انکے تسلط سے اپنے کو محفوظ رکھ سکیں۔

کیونکہ الپ ضیا دراصل اتحادی عہد کا ایک بڑا صاحب فکر تھا یہ بتلانا تو مشکل ہے کہ اتحاد تورانی کے تخیل کو پہلے کس نے سیاسی رنگ دیا، خود ضیا نے یا اس کی جماعت کے بڑے سیاست دانوں نے لیکن یہ بالکل ظاہر ہے کہ ضیا نے اسے شروع ایک خالص تمدنی حیثیت سے کیا تھا۔ وہ ایک نئی ترکی بنانا چاہتا تھا جو عثمانی ترکوں اور انکے تورانی اجداد کے درمیان کی خلیج کو پر کر سکے اس نے بچوں کے لئے بہت سی مزید نظمیں اور بہت سے قصے لکھے۔ اس نے ترکوں کی اصل کے متعلق اپنے علم کو اور زندگی کے اس تصور کو ہر دلعزیز کرنے کی بہت کوشش کی جسے یہ خود عالم وجود میں لانا چاہتا تھا۔ اپنے بعض ابتدائی تصنیفوں میں وہ اس غرض سے نہایت قدیم ترکی الفاظ استعمال کرتا ہے لیکن یہ بالکل مردہ اور بے جان معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس نے جلد ہی اپنی غلطی محسوس کر لی اور اپنی آخری تصانیف میں یہ ملک کی معمولی ترکی زبان لکھنے لگا۔ . . .

سنہ ۱۹۱۲ء کے اوائل میں ضیا سالونکا سے قسطنطنیہ آیا اور اپنے ساتھ اپنے ادبی و فلسفیانہ مشاغل بھی لایا۔ سالونکا میں اس نے ایک ذہنی تحریک کی ابتدا کی تھی۔ جس کا ایک رسالہ بھی تھا: "نوجوان قلم" اور اس کے ساتھ کام کرنے والوں کی نہایت قابل جماعت تھی۔ . . . یہ دیار بکر کے ایک مشہور خاندان سے تھا جس میں علماء اور شعرا، پیدا ہو چکے تھے۔ شروع جوانی میں اس نے کردی زبان کی اصل اور اس کی قواعد پر کام کیا تھا اور اس وجہ سے بعض حلقوں میں اسے کردی قوم پرست سمجھا جانے لگا تھا۔ لیکن یہ اعلی تعلیم کے لئے عبدالحمید کے زمانہ میں قسطنطنیہ آیا۔ جہاں وہ نہایت جوشیلا "نوجوان

ترک" نکلیا اور طالبعلمی کے زمانہ میں متعدد بار اس وجہ سے گرفتار ہوا کہ نامق کمال کی تصانیف پڑھا کرتا تھا! ۔ جب انجمن اتحاد و ترقی تنظیم ہوئی ہے تو یہ سالونکا میں تھا اور اس سیاسی انجمن کا نہایت معزز رکن بنا۔

یہ ایک پستہ قد، موٹا سا، سیاہ فام آدمی تھا، پیشانی پر صلیب کا سا ایک عجیب نشان تھا جس پر ہر ایک کی نظر پڑتی تھی۔ جب بیس برس کا تھا تو اس نے اپنے سر میں گولی ماری تھی، یہ نشان اسی گولی کا تھا۔ اس کے مزید اثر سے یہ جیسے تیسے بچ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں عجیب سی تھیں اور ہمیشہ معلوم ہوتا تھا کہ جو اشخاص اور جو چیزیں اس کے اردگرد ہیں ان سے دور دیکھتی ہیں اسکا انداز اس اجنبی کا سا تھا جو ایک غیر مانوس ماحول کو صبر کے ساتھ برداشت کر رہا ہو۔ لیکن پھر بھی یہ جلد متاثر ہوجاتا تھا۔ اور بات چیت یا مطالعہ سے اپنے خیالات ان لوگوں کی نسبت آسانی سے بدل دیتا تھا جو بظاہر اپنے ماحول میں بالکل منہمک نظر آتے ہیں۔ اسے فلسفہ اور اجتماعیات سے خاص دلچسپی تھی۔

یہ ترکوں کی جماعتی اصلاح کی رہنمائی کو سیاسی اصلاح سے زیادہ اپنا مقصد زندگی جانتا تھا جماعتی اصلاح اس مواد کی بنا پر کرنا چاہتا تھا جو اس نے ترکوں کے قبل اسلام سیاسی و جماعتی اداروں کے متعلق جمع کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ عربوں کا قائم کیا ہوا اسلام ہمارے مناسب حال نہیں ہوسکتا۔ اور اگر ہم اپنے عہد "جہالت" کیطرف رجعت نہ کریں تو پھر ہمیں ایک مذہبی اصلاح کی ضرورت ہے جو ہماری طبائع سے مطابقت رکھتی ہو۔ یہ پروٹسٹنٹ اصلاح مذہب کا بڑا مداح تھا کہ اسی سے یورپ میں صحیح قوم پرستی شروع ہوئی۔ یہ ایک ماہانہ رسالہ "اسلامک ریویو" شائع کرتا تھا جس میں قرآن کا نہایت اچھا ترکی ترجمہ نکلتا رہا۔ اس کے مذہبی خیالات پر کازان کے مشہور تاتار مسلم مصلح موسےٰ بیکیف کا بڑا اثر تھا۔

اس زمانہ میں اسکا سب سے دلچسپ کام ایک رسالہ تھا "بچوں کی دنیا"، جو یہ چھوٹے بچوں کے لئے نکالتا تھا۔ یہ اپنی قسم کی پہلی سیدھی سادی کوشش تھی۔ اس میں کامیابی کے ساتھ انگریزی سے جانوروں اور پریوں کے قصے ترجمہ ہوئے۔ اسی کے ساتھ اس نے اپنی سادہ

ترکی کہانیاں بھی شائع کیں جو قوم کی غیر نوشتہ روایات سے ماخوذ تھیں اور جنہیں اس نے بہت دلپسند ترکی نظم کا لباس دیدیا تھا۔

میں جب اس وقت کو یاد کرتی ہوں کہ وہ میرے ہرے لیمپ کی روشنی میں بیٹھا یوسف اکچورہ کی کٹیلی اور طعن آمیز باتوں پر نرمی اور مہربانی سے مسکرا رہا ہے، اور مذہب، ادب، اخلاق، ترکی عورتوں اور ترک بچوں کے لئے ایک بہتر حالت کا خواب دیکھ رہا ہے تو مجھے یقین نہیں آتا کہ اسی شخص نے جنگ عظیم کے آخر سالوں میں اتحاد و ترقی کے مادی فلسفہ کو مانا بلکہ اس کے نشو ونما میں مدد تک دی ......

اس پر جرمن فلسفہ کا بہت اثر تھا خصوصاً درکھائیم کا۔ لیکن اس کا آخری پیغمبر برگسان تھا البتہ ایک بات میں اسکا خیال ہمیشہ ایک تھا یعنی ترکوں کی ترقی کی سمت کیا ہو۔ اس کا یقین تھا کہ ترکوں میں کسی نہ کسی طرح مغربیت پیدا کرنی چاہئے .... اس کا قول ہے:۔
"میں نسل سے ترک ہوں، مذہب میں مسلمان ہوں، تہذیب و تمدن میں مغربی" اس کی کتاب "ترکیت، اسلامیت، مغربیت" میں اس کے فلسفیانہ اور جماعتی خیالات ہیں۔

کیوک الپ ضیا کے اتحاد تورانی کے ساتھ ساتھ انور پاشا اور انکے ساتھیوں کا اتحاد اسلامی تھا۔ جنگ کے آخری زمانہ میں اگر یہ لوگ بھی اتحاد تورانی کے حامی معلوم ہوتے تھے تو اس لئے کہ یہ تورانیوں کو ترکی سے متحد کرنا چاہتے تھے وہ مسلمان تھے۔ لیکن سیاسی اعتبار سے انکے اتحاد اسلامی کا بھی اتنا ہی خفیف اثر تھا جتنا اتحاد تورانی کا۔ مسلمان عربوں اور مسلمان البانیوں کیطرف سے علیحدگی کی کوششوں نے اس اتحاد اسلامی کا سارا کھیل بگاڑ دیا۔ علاوہ ازیں نوجوان اصلاحی عناصر، قدامت پسندی اور جنون مذہبی جانکر اس سے خائف تھے۔ اگر مسلمان اقلیتوں کے مقاصد اور انکی ضرورتوں کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کی کوشش ہوتی تو شاید انور پاشا کے اتحاد اسلامی کو حق بجانب ثابت کرنے میں مدد ملتی۔ لیکن کچھ ایسا ہوا کہ اس میں دلچسپی بس ترکی کے باہر والے مسلمانوں ہی نے لی۔ اتحاد اسلامی کی نسبت دول اتحادی کا خوف بالکل بے بنیاد تھا، اور اپنی

رعایا میں حقوق طلبی کی تمام تحریکوں کو ترکی اثر کا نتیجہ سمجھنا بالکل بے اصل تھا اور ہے۔ مجھے تو بڑی تفریح ہوئی جب میں نے لندن ٹائمس میں پڑھا کہ حجاز میں ابن سعود کی تحریک کو انگورا سے مدد مل رہی ہے! انور کی روح کو تو اس خبر سے یقیناً خوشی ہوگی لیکن موجودہ لا مذہب ترکی حکومت کے لئے تو یہ طعن سے زیادہ وقعت نہیں رکھ سکتی۔

قوم پرستی کی پہلی خارجی تنظیم 'ترک یوردو' میں ہوئی جو جنیوا کے ترک طلبہ نے بطور ایک ادبی و تمدنی کلب کے ۱۹۱۰ء میں قائم کیا تھا۔ اس میں چونکہ چند نہایت اچھے روسی ترک طالب علم شامل تھے اس لئے اس کی ذہنیت کم از کم تمدنی لحاظ سے تورانی تھی۔ اس کیطرف سے غیر موقت رسالے شائع ہوتے تھے اور اب بھی ہوتے ہیں جن میں سے بعض میں نہایت عمدہ ادبی مضامین اور ترکیات پر نئی تحقیق شائع ہوتی ہے۔ اس کلب نے ایک تجویز منظور کی جس میں مجھے "ام الاتراک" کا لقب دیا گیا تھا یہ ترک نوجوانوں کیطرف سے ایسی تحسین تھی جس نے میرے دل پر صرف اثر ہی نہیں کیا بلکہ مجھ میں اپنی قوم کی ماں ہونے کے فرائض کا احساس بھی پیدا کر دیا۔ مجھے بڑی خوشی ہے کہ آج میں اس نام کے دینے والوں کا پتہ دے رہی ہوں جو ترکی دنیا میں عام طور پر میرے ساتھ وابستہ ہوگیا ہے۔ یہی وہ بڑے سے بڑا معاوضہ ہے اور جو اگر مجھ سے پوچھا جاتا تو میں اپنی حقیر قومی خدمات کے لئے طلب کر سکتی۔

سال بھر بعد ذرا بڑی عمر کے محقق طلبہ نے ایک اور ترک یوردو قائم کیا جس میں مشہور مقنن و مدبر یوسف کمال بھی شریک تھے۔ دارالسلطنتہ نے بھی تقلید کی۔ استمبول میں ترک یوردو کا قیام منجملہ ان بہت سے ذہنی کاموں کے تھا جو انجمن اتحاد و ترقی نے شروع کئے تھے لیکن جو لوگ انجمن میں تھے وہ کہتے ہیں کہ اگرچہ ہم نے اس کی مالی مدد کی لیکن اسے کبھی اپنا سیاسی آلہ کار نہیں بنایا۔ اس کلب کیطرف سے ایک ہفتہ وار پرچہ شائع ہوتا تھا جو اب بھی نکلتا ہے۔ اسکا مدیر یوسف اکخورا تھا جو بالاعلان اتحاد و ترقی کا مخالف تھا اگرچہ بڑا پکا تورانی تھا۔ اس نے اس پرچہ کو بہت کامیاب بنایا اور غالباً ترکی سے زیادہ اس کے پڑھنے والے روسی ترکوں میں تھے۔ اکخورا عثمانی

ترکوں کے مقابلہ میں روسی ترک کی فضیلت کا قائل تھا اور اس لئے دونوں کے اتحاد کا بڑا حامی۔ اس نے اس موضوع پر بڑے دلچسپ مضامین لکھے اور یہ بڑا لطیفہ ہے کہ جو ترکی زبان استعمال کرتا تھا وہ قدیم زمانہ کے عثمانیوں کی زبان تھی نہ کہ جدید قوم پرست ترکوں کی۔ اس پرچہ میں کیوک الپ ضیا، محمد امین، احمد حکمت، رضا توفیق اور دوسرے نوجوان قوم پرست مضامین لکھتے تھے۔

قوم پرستی کے خارجی مظاہر ایک درجہ اور گہرے ہوئے اور نئی نسل میں خصوصاً طلبہ میں پھیلے پہلے یہ چیز طبی طلبہ میں شروع ہوئی۔ شعبہ طب کو تقریباً ہر جدید تحریک کے آغاز کا فخر حاصل ہے خصوصاً جب یہ تحریک استبداد شخصی یا استبداد جہل و قدامت پرستی کے خلاف ہو۔ عبدالحمید کے ظلم کو یہیں سے سب زیادہ سکارملے۔ لیکن اس ضمن میں یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ترک طالب علم اپنے کو سلطنت کے دوسرے عثمانی طلبہ سے مختلف اور علیحدہ کیوں سمجھتے تھے۔

۱۹۰۸ء کے بعد سے ترکی کے تمام غیر ترکی عناصر نے عیسائی ہوں یا مسلم اپنے اپنے قومی اور سیاسی کلب قائم کرلئے تھے۔ جب ترک طلبہ نے دیکھا کہ ہمارے ساتھی جنہیں ہم اب تک بالکل اپنا سمجھتے تھے علیحدہ علیحدہ نظاموں سے تعلق رکھتے ہیں جن کے نام جدا جدا جن کے مقاصد علیحدہ علیحدہ ہیں تو انہیں بڑی حیرت ہوئی۔ غیر ترکی نوجوانوں میں اپنے قومی معاملات کے متعلق بڑی سرگرمیاں تھیں اور وہ انہیں ترکوں کے معاملات سے جدا سمجھتے تھے۔

عثمانی ترک اب تک ایک مجموعی ہستی تھا۔ بس اوروں کی طرح عثمانی رعایا۔ اس کے بہترین مصنف سلطنت کے سب تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے لکھتے تھے۔ اس کے قصے کہانیاں اس کا عام ادب ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتا رہتا تھا۔ تعلیم یافتہ اسے لکھتے نہ تھے لیکن تمام سادے ترکی بولنے والے عثمانیوں کے ذہن اور حافظہ میں بڑی قوت رکھتا تھا اب پہلی مرتبہ عثمانی ترک اپنے عنصر میں آیا اور ترکی میں نسلوں کے مجموعہ سے علیحدہ ہوا اور اس نے اس امکان کو دھندلے طور پر محسوس کیا کہ وہ اپنے کو دوسرے سے مختلف حیثیت سے تلاش کرے، اور پائے۔ وہ اوروں سے مختلف کس طرح تھا؟ دوسروں کی آرزوؤں اور مقاصد کے انبوہ میں وہ کدھر چلا جارہا تھا؟ خود اس نے

اپنے ملک میں تنہا اور بے مونس نکر یہی نہیں دیکھا کہ وہ اوروں سے مختلف ہے بلکہ اس میں یہ خواہش بھی پیدا ہوئی کہ اس اختلاف کی نوعیت کا پتہ چلائے۔

اس معنی میں ترک نوجوانوں کی پہلی تنظیم "ترک اوجک" میں ہوئی۔ یعنی پہلا قومی کلب ۱۹۱۱ء میں قائم ہوا۔ اس کے بانی چند طبی طلبہ تھے جنہوں نے اپنے نام ظاہر نہیں کئے۔ مساوات واخوت کی روح "اوجک" میں مسلمہ روایت بن گئی۔ کوئی رکن دوسرے پر فوقیت نہ رکھتا تھا۔ اس کلب کی مدد بعض مشہور اہل قلم اور نامور ڈاکٹروں نے کی اور انجمن اتحاد و ترقی نے بھی۔

اس کے دستور کے دو اہم دفعات جنہیں عام کانگریس نے بھی کبھی نہ بدلا اور جن سے "اوجک" کی ذہنیت اور رجحانات کا پتہ چلتا ہے یہ تھے:- (۱) اوجک ترکوں کی تمدنی ترقی میں مدد دیگا (۲) اوجک کوئی سیاسی ادارہ نہیں ان دونوں دفعات پر اوجک کے پرانے رکن ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۲ء تک بڑی سختی سے قائم رہے۔ اتحاد و ترقی کے تسلط کے زمانہ میں نہ انتہا پسند اتحادی ان دفعات کو بدلوا سکے اور نہ ۱۹۱۸ء میں انکے تسلط کے مٹ جانے کے بعد انکے مخالف اسے فرقہ وارانہ سیاست میں گھسیٹ سکے۔

اوجک کا سب سے کارآمد زمانہ اس وقت شروع ہوا جب صمد اللہ صبحی بے اس کے صدر مقرر ہوئے۔ اپنی بے مثل خطابت سے انہوں نے نوجوانوں پر بہت گہرا اثر قائم کرلیا اور انکے استقلال اور ہوشیاری نے تمام بڑے آدمیوں اور سب حکومتوں کو اس پر آمادہ کردیا کہ اوجک کی مدد کریں، روپیہ سے یا اور کسی طرح۔ نوجوان طلبہ کے علاوہ ترکی اہل قلم اور اکابر کی بڑی تعداد اس میں شامل ہوگئی اور قابل تعریف شغف کے ساتھ ترکوں کی تمدنی ترقی میں کوشاں رہی۔ بڑے بڑے آدمی بلا معاوضہ عوام کے لئے لکچر اور سبق دیتے تھے جن میں خاص طور پر کیوک الپ ضیا قابل ذکر ہیں۔ ہر سیاسی مذہب کا آدمی اور مختلف مقاصد رکھنے والے سب اس کی چھت تلے خلوص کے ساتھ ایک دوسرے کو سمجھنے کے لئے جمع ہوتے تھے۔

یہ کلب ان طلبہ کی مدد کرتے تھے جو ساری ترکی دنیا سے تعلیم پانے کیلئے استنبول آتے

ہیں۔ ادجک میں تمدنی لحاظ سے اتحاد تورانی کا رجحان تھا اور یہ اتحاد اسلامی کے مخالف تھے کچھ سال بعد اتحاد تورانی کا خیال بھی مٹ گیا اور جغرافی قوم پرستی شروع ہوگئی جسکا حلقہ ترکی خاص اور اس کے باشندوں تک محدود ہے۔

میں پہلی عورت تھی جسے ۱۹۱۸ء میں انکی عام کانگریس نے اپنا رکن منتخب کیا۔ ۱۹۱۸ء میں عام کانگریس نے ۱۱ اشخاص کی ایک کمیٹی دستور اساسی کی ترمیم کے لئے مقرر کی۔ میں بھی اس کمیٹی میں تھی اور ہم نے دستور میں دوسری تبدیلیوں کے علاوہ اس دفعہ کا اضافہ بھی کیا کہ عورتیں رکن ہوسکتی ہیں۔ اس زمانہ میں متعدد ادجک تمام ملک میں قائم ہوگئے ہیں۔ آج کل خصوصاً ۱۹۲۴ء میں انگورا میں جو تغیر دستور ہوا اس کے بعد سے ان ادجکوں کی حالت پر علٰحدہ بحث کی ضرورت ہے۔

جن لوگوں کے پیش نظر کل انسانیت کی فلاح ہے اور جو اس کے ذریعہ بین الاقوامیت پیدا کرنا چاہتے ہیں انہیں قوم پرستی ایک تنگ سطح نظر معلوم ہوتا ہے۔ مجھے میرے بین الاقوامی دوست اکثر اس پر ملامت کرتے ہیں اور چونکہ میں نے اپنے بنی نوع کی خوشی کے لئے سعی کرنا چھوڑا نہیں ہے خصوصاً انکے لئے جو مجھ سے قریب تر ہیں اس لئے میں نے دیانت داری سے کوشش کی ہے کہ اپنی قوم پرستی کے حقیقی معنی کی جانچ کروں۔ آیا اس سے دوسروں کو جو ترک نہیں نقصان پہنچتا ہے اور آیا اس سے آگے چلکر قوموں کے اس خاندان کو نقصان پہنچتا ہے جس میں ترکی بھی شامل ہے۔

ہر فرد یا قوم اگر وہ اپنے بنی نوع یا دوسری قوموں کو سمجھنا چاہئے، اپنی انفرادی یا اجتماعی شخصیت کا اظہار کرنا چاہے، حسن وجمال کی تخلیق کی آرزومند ہو، تو اسے اپنے وجود کی جڑوں تک پہنچنا اور اپنے کو خلوص کے ساتھ دیکھنا چاہئے۔ مطالعہ ذات یہ عمیق عمل اور اس کے نتائج بس یہی قوم پرستی ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ اس قسم کا قومی مطالعہ ذات اور اس کے نتائج کا تبادلہ بین الاقوامی مفاہمت ومحبت کا پہلا اور صحیح قدم ہے۔ جب میں اپنی قوم سے محبت کرلوں اور انکی خوبیوں اور خامیوں کو کھلے دل سے سمجھنے کی کوشش کرلوں تب کہیں میں دوسروں کی خوشیوں اور تکلیفوں کو اور انکی قومی زندگی میں انکی قومی شخصیت کے مظاہر کو سمجھ سکتی ہوں۔

خاں صاحب

ہمارے محلہ میں ایک خانصاحب رہتے تھے۔ میں نے جب انہیں پہلی مرتبہ دیکھا تو اُن کی عمر قریب پینتالیس سال کے تھی۔ مگر روایات سے معلوم ہوا کہ اُنکے بال ہمیشہ سے ایسے ہی سیاہ و سپید کی آمیزش رہے ہیں، آنکھیں ایسی ہی خونی، مزاج ترش اور ٹوپی میلی۔ بواسیر کی شکایت بھی اُن کی ہستی سے وابستہ تھی، مدتوں سے وہ شہر کے تمام طبیبوں اور ہندوستان کی تمام درسگاہوں کی برائی کرتے چلے آئے تھے۔ ہمارے محلہ میں کسی کو بھی وہ دن یاد نہ تھے جب خانصاحب کی کریہہ اور دل لرزانے والی آواز گلی کوچہ میں نہیں گونجتی تھی۔ یا اُنکا سیاہ چہرہ قوی ہیکل جسم اور لمبا لٹھ خوف اور نفرت سے لوگوں کی نگاہیں نیچی نہیں کر دیتے تھے۔ خانصاحب کے پیشہ کا کسی کو علم نہ تھا، سوا اُن کمبختوں کے جنہیں کسی ناگہانی مصیبت میں روپیہ کی ضرورت ہوئی اور انہوں نے خانصاحب سے مدد مانگی۔ مگر انکی کیا مجال تھی کہ گالیاں سن کر اور سود در سود ادا کرکے بھی خانصاحب کے پیشہ کا کسی سے ذکر کریں۔ خاں صاحب سویرے جاکر مؤذن کو جگاتے تھے۔ مسجد کا امام اُن کے ڈر سے نماز میں لمبی لمبی سورتیں پڑہتا تھا۔ دیر تک دعا مانگتا۔ اور دعا مانگتے مانگتے کثرت گناہ کا احساس اُسے اکثر رلا بھی دیتا تھا۔ خانصاحب کی ذات نے اس مسجد کو جو علاوہ جمعہ کے ویران پڑی رہتی تھی اجتماع مسلمین کا مرکز بنا دیا تھا، جہاں پنج وقتہ نماز باجماعت ہوا کرتی تھی۔ خانصاحب کی داڑھی دیکھ کر شریفوں کیا گنڈوں میں بھی داڑھی مونڈنے کی ہمت نہ رہی۔ خانصاحب کا چہرہ سیاہ اور آنکھیں خونی تھیں تو کیا انہوں نے سینکڑوں مسلمانوں کی صورتیں منور کر دی تھیں، اُنکا مزاج ترش تھا تو کونسی شکایت کی بات، جب اس کی وجہ سے اتنے گمراہ بندے اپنے خدا کے قہر سے پناہ مانگنے لگے۔

ہمارے محلہ کے بنیے تو مستقل اختلاج کے مریض ہو گئے تھے۔ مگر بنیوں کا کیا۔ ان کا تو پیشہ یہی ہے۔ اگر دہلوتی میل سے کالی اور قلب میں اختلاج نہ ہو تو وہ سود کا نرخ کیسے

بڑائیں۔ خانصاحب شریعت کے ایسے عالم تھے کہ بغیر کفر کا الزام اپنے سر لئے دنیا دی معاملات میں بھی کوئی اُن کی مخالفت نہیں کر سکتا تھا۔ منطقی ایسے کہ جوش گفتار سے دوسرے کا دماغ پھرا دیں، اور فلسفی اس پایہ کے کہ جب بیان شروع کریں تو کسی سے بغیر ہاں میں ہاں ملائے نہ بن پڑے۔ خانصاحب نہایت فصاحت و بلاغت سے دین اسلام کی خوبیاں اپنے پست اندیشہ ہمجنسوں پر روشن کرتے تنگ نظروں کو خدا کی مصلحت سمجھاتے، اور مناظر کائنات کی تعریف میں سرد آہیں بھرتے تھے۔ ہمارا محلہ غریبوں کا تھا۔ کسی بیچارے کو اتنی مہلت کہاں ملتی تھی کہ شریعت، فلسفہ، منطق اور جمالیات میں یہ امتیاز حاصل کرے۔ خانصاحب نے اپنی عقل و دانش اور ہیبت شخصیت کے اثر سے محلہ والوں کے دل و دماغ اور قوت ارادہ کو معطل کر دیا تھا، اور محلے والے غلامی کے ایسی عادی ہو گئے تھے کہ انہیں اپنی آزادی کے دن یاد تک نہ رہے۔

خانصاحب جب ہمارے محلہ میں آکر بسے تو اپنی بیوی کو ساتھ لائے تھے۔ مدتوں تک نہ کسی نے اُنکی بیوی کی صورت دیکھی نہ کسی کو اُنکے گھر کا حال معلوم ہوا۔ بہت دن ہوئے ایک بچہ اُنکے دروازہ کے سامنے کھیلتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ سال دو سال بعد ایک بچی بھی اُس کے ساتھ کھیل میں شریک ہونے لگی مگر لوگ خانصاحب کے مکان کیطرف سے بغیر کسی ضرورت کے گذرنا پسند نہیں کرتے تھے اور جب بچہ کسی بیماری میں مرگیا تو لوگ بھول گئے کہ خانصاحب کے ایک لڑکی بھی ہے۔ میری خالہ کو یہ معلوم تھا، اس لئے کہ وہ بچہ کی تعزیت میں ہمت کرکے خاں صاحب کے یہاں جا پہونچی تھیں وہاں سے واپس آنیکے بعد وہ مہینہ بھر تک بخار میں مبتلا رہیں۔ مزاج پرسی کے سلسلہ میں خانصاحب کی بیوی کا بھی میری خالہ کے یہاں کئی دفعہ آنا ہوا، اور یوں دونوں بیویوں کے تعلقات بڑھ گئے مگر خانصاحب کی بیوی کی کیا مجال تھی کہ انسانیت کے فرائض ادا کریں اور میری خالہ کے گھر میں قدم رکھیں۔ اگر میری خالہ کو اُنکی سخاوت، دینداری اور غریب پروری نے محلہ کیا تمام شہر میں مشہور نہ کر دیا ہوتا۔ بیوہ ہونے کے بعد انہوں نے اپنے اکلوتے بیٹے کو اپنے سامنے مرتے دیکھا تھا اس صدمہ نے دنیا سے اُنکی طبیعت ایسی ہٹا دی کہ انہوں نے اپنی عمر عبادت کے لئے وقف کر دی، اور

جائداکی ساری آمدنی غریب بچوں کی تربیت اور حاجت مندوں کی امداد میں صرف کرتی تھیں، ہر مولوی، ملا، امام، حافظ، عالم کو انکے یہاں سے وظیفہ ملتا تھا جن لوگوں کو خانصاحب سود پر روپیہ دیتے تھے وہ انکے یہاں اکثر آچکے تھے اور خانصاحب کہ تھے اسوجہ سے چڑھے کہ مستقل وظیفوں میں میری خالہ کی آمدنی صرف ہو جاتی تھی اور وہ خود کبھی کبھی فاقہ سے رہتی تھیں۔ خانصاحب نے شریعت کی پابندی اور دینگے کے زور سے جو اقتدار حاصل کیا تھا وہ میری خالہ کے اثر سے مقابلہ نہیں کرسکتا تھا، اسی وجہ سے جب کبھی انکی بیوی میری خالہ سے ملنے آتیں تو وہ اپنا سلام بھی کہلا بھیجتے۔ میری خالہ کو یہ معلوم ہوگیا کہ خانصاحب کو ڈولی کا کرایہ دینا ناگوار گذرتا ہے، اور انہوں نے خانصاحب کی بیوی کو پیشگی کرایہ بھیجنے کا قاعدہ بنالیا۔ اس پر بھی خادمہ کو سخت تاکید تھی کہ خانصاحب اُسے دیکھ نہ پائیں ورنہ وہ کرایہ وصول کرلیتے، اور کہلا بھیجتے کہ بیوی کی طبیعت بہت خراب ہے۔

خانصاحب کی بیوی کو جب میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تو وہ ادھیڑ عمر کی تھیں۔ مگر اس سن پر بھی انہیں جوانی کے حسن کی جھلک نظر آتی تھی جسے دیکھ کر تعجب ہوتا تھا کہ وہ خاں صاحب کے پنجہ میں کیسے پھنسیں اونچا قد، سڈول جسم، بڑی بڑی پراسرار آنکھیں، لہجہ میں متانت، ہر شخص امیر ہو یا غریب جوان ہو یا بوڑھا، انہیں دیکھتے ہی اپنے دل میں انکی عزت کرنے لگتا۔ برتاؤ میں ایسی ہمدردی، ایسا خلوص کہ دل سے ہزار پریشانیوں کی کدورت دور کردے۔ طبعیت کی شریف ہونے کے علاوہ وہ اتنی تعلیم یافتہ اور مہذب تھیں کہ میری خالہ کو یقین ہوگیا کہ خانصاحب کے ساتھ انکی شادی سوچ سمجھ کر نہیں کی گئی۔ غالباً انکے ماں باپ پر کوئی ایسی مصیبت آئی کہ اُن بیچاروں کو ایسی لڑکی ایسے آدمی کے سپرد کردینا بھی غنیمت معلوم ہوا۔ اصل واقعہ میری خالہ باوجود کثرت ملاقات کے دریافت نہ کرسکیں ایک دو بار انہوں نے پوچھا تو ضرور لیکن خانصاحب کی بیوی نے سرد آہیں بھر کر ٹال دیا اور اُن کا تکلف دیکھ کر میری خالہ نے پوچھنا چھوڑ دیا، اس ناواقفیت سے ان دونوں کی گہری دوستی اور سچی محبت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اور جب خانصاحب کی بیوی نے ایکدن میری خالہ سے درخواست

کی کہ انکی بچی کی پرورش وہ اپنے ذمہ لیں تو انکی محبت اور پختہ ہوگئی۔

خانصاحب کی بچی سکینہ اس زمانہ میں دس بارہ برس کی تھی۔ میری خالہ کی بہت پہلے سے خواہش تھی کہ اُسے اپنے ساتھ رکھیں۔ لیکن ایک ستم زدہ ماں سے اُس کی اکلوتی بچی مانگنا انہیں کسی صورت سے گوارا نہ ہوا۔ خانصاحب کی بیوی نے شریفوں کے یہاں تربیت پائی تھی اور گو انہیں یقین تھا کہ میری خالہ کو انکی بچی سے بہت محبت ہے مگر انہوں نے اپنی طرف سے کبھی کوئی اشارہ نہیں کیا۔ سکینہ جب میری خالہ کے یہاں آتی تو بہت خوش ہوتی کھیلتی کودتی، خالہ کی خدمت بھی کرتی۔ جب جاتی تو ہمیشہ آنکھوں میں آنسو لیکر جاتی، اور خالہ سے وعدہ لیکر کہ وہ اسے پھر جلد یاد کریں گی۔ مگر دونوں بیویوں کے تکلف میں پانچ چھ سال گذر گئے۔ خالہ کے یہاں وہ مستقل طور پر یوں آگئی کہ وہ بڑی ہوگئی تھی، کہاروں نے اُسے ماں کے ساتھ نہیں بیٹھنے دیا، خانصاحب نے اعلان کیا کہ اگر انہوں نے کبھی اسے رستہ میں چلتے دیکھا تو اس کا گلا گھونٹ دیں گے۔ خالہ پر کہاروں کا کرایہ ویسے بھی بڑھ گیا تھا۔ ایک اور ڈولی کی درخواست اُن سے کیسے کیجاتی۔ پھر بھی یہ انتظام زیادہ تر سکینہ کی تحریک سے ہوا۔ وہ ابھی اپنی ماں کی مجبوریاں اور باپ کی فطرت نہیں سمجھی تھی۔ اس نے ایک دن کہا کہ وہ خالہ کے ساتھ رہنا چاہتی ہے، اور ماں نے خود ہمت کرکے اپنی طرف سے یہ درخواست کردی اس خوف سے کہ وہ کہیں واقعی کہہ نہ دے۔ اور میری خالہ کو گمان ہو کہ وہ براہ راست نہیں کہنا چاہتی تھیں اس لئے لڑکی سے کہلوایا۔ جب سکینہ کا میری خالہ کے ساتھ رہنا طے ہوگیا تو انہیں اور بھی مصلحتیں سوجھیں۔ خانصاحب سکینہ کو میلے چیتھڑوں میں رکھتے تھے اب وہ ایسی بچی نہیں رہی تھی کہ میلے ہونے کا الزام اُسی پر لگا دیا جائے۔ مگر وہ خانصاحب کو اپنی گرہ سے کچھ خرچ کرنے پر آمادہ نہ کرسکیں۔ خانصاحب سے یہ امید کرنا بھی فضول تھا کہ وہ اس کی آئندہ زندگی کے لئے سامان کریں گے۔ میری خالہ کے جو تعلقات تھے انہیں دیکھتے ہوئے سکینہ کے لئے ایک ہونہار شریف زادہ تلاش کرنا کوئی مشکل بات نہ تھی۔

یہ سب تدبیریں تھیں۔ پھر یکایک تقدیر نے اپنی صورت دکھائی۔ جب سکینہ میری خالہ

کے پاس ایک مہینہ کے قریب رہ چکی تھی تو خانصاحب نے اپنی بیوی سے پوچھا:

"کیوں ری، سکینہ کی تنخواہ تونے کاہے میں خرچ کرڈالی؟"

خانصاحب کی بیوی سہم گئیں۔

"کیسی تنخواہ؟"

"ہونہہ! کیا کوئی اپنی پلی پلائی لڑکی کسی کو مفت میں دیتا ہے؟"

خانصاحب کی بیوی نے بجائے جواب دینے کے اپنا منہ چادر میں لپیٹ لیا اور روتے روتے سوگئیں۔ اپنے شوہر کی بے حیائی پر انہیں ہر دوسرے تیسرے روز شرمندہ ہونا پڑتا تھا اس کی وہ عادی ہوگئی تھیں، لیکن اب تو انہیں خود بھی ذلیل کرنے کی ترکیبیں تھیں۔ اگر بچنے کی کوئی امید ہوتی تو وہ اُس کی فکر کرتیں۔ لیکن انہیں یقین تھا کہ خانصاحب بغیر اپنے ٹکے وصول کئے نہ مانیں گے۔ وہ اسی کشمکش میں تھیں کہ بات کیسے بنائی جائے کہ ایک روز جب وہ میری خالہ کی ڈیوڑھی میں ڈولی پر سے اتریں تو خانصاحب نکلتے ہوئے دکھائی دئے۔ اندر پہنچیں تو خالہ کو بہت برہم پایا، اور وہ بیچاری اپنا سا منہ لیکر ایک کونے میں بیٹھ گئیں۔ خالہ کو سلام کرنے کی بھی ہمت نہ ہوئی۔ جب مغرب کے بعد سکینہ کے ذریعہ سے معلوم ہوا کہ خالہ کا غصہ اتر گیا ہے تو روتی ہوئی انکے سامنے آئیں۔ خالہ نے اُنہیں گلے لگا یا۔ ہمدردی کے کچھ آنسو ٹپکائے۔ مگر بہت دیر تک خاموش بیٹھی رہیں، کہتیں تو کیا کہتیں؟ خانصاحب نے اپنے افلاس کا دکھڑا رویا تھا۔ نہایت عجز و انکسار کے ساتھ نوٹس دے گئے تھے کہ میری لڑکی مجھے واپس ملجائے یا میری بھی پرورش ہو "ماں بوڑھی ہے، اُس سے کچھ کام کاج ہوتا ہواتا نہیں، اُسے خود سہارے کی ضرورت ہے میں جو کچھ کرسکتا ہوں کرتا ہوں، لیکن میں روٹی تو نہیں بچا سکتا! اتنی میری حیثیت نہیں کہ کسی کو نوکر رکھوں۔ اب حضور خود ہی سمجھ لیں۔ آدمی اولاد کی پرورش اسی لئے کرتا ہے کہ بڑھاپے میں آرام ملے۔" میری خالہ سمجھ گئیں۔ اگر ہو سکتا تو وہ کچھ نقدی خانصاحب کے حوالے کرتیں، مگر انہیں خود اُن دنوں روپیہ کی بہت سخت ضرورت تھی۔ زیادہ غصہ انہیں اپنی بے بسی پر آیا۔ مگر جس طرح سے خانصاحب

نے اپنی بیوی کے ضعف پیری اور آنکی حاجتوں کو گفتگو میں پیش پیش رکھا وہ بھی انہیں بہت ناگوار گذرا۔ خانصاحب کی بیوی نہ بوڑھی تھیں نہ ضعیف، گھر کا کام کر کے وہ اکثر میری خالہ کے یہاں پکانے میں مدد کرتی تھیں۔ خانصاحب جس کفایت شعاری سے رہتے تھے اس کے لحاظ سے امورِ خانہ داری کوئی بار نہیں ہو سکتے تھے، نہ کسی کا قرض، نہ کہیں سے تقاضا، نہ کوئی بحث مباحثہ، اور پیٹ بھی کتنے بھرنے تھے۔ جب سے سکینہ چلی گئی تو چار روٹی، ذرا سی بھاجی، ہفتہ عشرہ دو چار بوٹی گوشت، اور جب وہ تھی تو بھی ماں اپنے حصہ میں سے اُسے کھلاتی تھی، خاں صاحب کو کبھی یہ محسوس تک نہ ہوا کہ وہ اولاد کی پرورش کر رہے ہیں۔

یہ سب ماجرا خانصاحب کی بیوی نے میری خالہ کو سنایا، مگر اس متانت اور ضبط سے کہ خاں صاحب پر کسی طرح کا صریحی الزام نہ آئے۔

"یہ تو سب کچھ ہے، مگر بیوی میں شکایت کس منہ سے کروں۔ خانصاحب ایسے متقی پرہیزگار روزہ نماز کے پابند ہیں جس کسی سے بھی پوچھو وہ بتا دے گا کہ انکی ذات سے کتنوں کو فائدہ پہونچا کتنے مسلمان اپنے فرائض سے آگاہ ہوے، مسجد ویران پڑی رہتی تھی، اب وہاں پنج وقتہ نماز باجماعت ہوتی ہے، ہزاروں کے لبوں پر اللہ کا نام ہے، سیکڑوں اُن کی دلیلوں سے قائل ہو کر شریعت کے احکام پورے کرنے لگے ہیں۔"

"ہاں بہن، اس میں تو کوئی کلام نہیں"

"اور پھر بیوی وہ معاملے کے ایسے صاف سچے ہیں، جھوٹے وعدے سے زیادہ انہیں کوئی بات ناگوار نہیں ہوتی، مجھ سے خود ہی کہہ رہے تھے کہ سکینہ کو اس طرح آپ کے متھے تھوپ دینا بیجا ہے۔"

"تم بھی بہن کیسی باتیں کرتی ہو . . . . سکینہ کو تو میں اپنی بیٹی سمجھتی ہوں"

"یہ تو بیوی میں جانتی ہوں، میرا دل جانتا ہے . . . . مگر ہم لوگ غریب ہیں، آپ کو چاہے جتنی محبت ہو، خانصاحب کو تو ہمیشہ یہ اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں اُس کا دماغ نہ پھر جائے . . .

اُسے آخر غریبوں ہی کے گھر میں زندگی بسر کرنا ہے "

" واہ بہن، تم نے بیٹھے بیٹھے مجھے رئیس خوب بنا دیا، میں بھلا اس کی کون سی خاطر کر سکتی ہوں کہ اُسکا دماغ پھر جائے۔ تم خود ہی روز دیکھتی ہو کہ میں کیسے رہتی ہوں اور وہ کیسے رہتی ہے "

" بیوی آپ کو تو سخاوت اور دینداری نے غریب کر دیا ہے، ہماری نظروں میں تو آپ رئیس ہی ہیں۔"

" اچھا بہن، اگر ایسا ہی ہے تو اپنی لڑکی لیجاؤ۔ میں کوئی اور سہارا ڈھونڈھ لوں گی، تمہاری بیٹی کی عادتیں تو نہ بگڑنے پائیں " میری خالہ نے ٹھنڈی سانس لی اور منہ پھیر لیا۔

خانصاحب کی بیوی چوکنی ہوگئیں۔ وہ خانصاحب کی صفائی تو ضرور کرنا چاہتی تھیں لیکن سکینہ کو اپنے گھر واپس بلا لینا بھی انہیں کسی صورت سے منظور نہ تھا۔

" بیوی آپ خفا نہ ہوں، خانصاحب تو بات کے دھنی ہیں، جو بات جی میں ٹھان لیتے ہیں اُسے چاہتے ہیں کہ فوراً کر بھی دکھائیں۔ میں نے انہیں سمجھایا تھا کہ ابھی آپ کے پاس نہ حاضر ہوں، مجھے پہلے آپ کو سارا ماجرا سنا لینے دیں۔ سکینہ آپ کی لونڈی ہے۔ بھلا ہمیں کب یہ گوارا ہوگا کہ اُس کی وجہ سے آپ کو کسی طرح کی تکلیف پہونچے۔ اُس کی پرورش منظور ہے تو بڑی خوشی سے اپنے پاس رکھئے۔ وہ بھی سدھر جائے گی، ہم بھی آپ کو دعا دیں گے۔ آپ جیسا سرپرست اس دنیا میں اُسے کہاں ملے گا . . . "

" مگر بہن " خالہ نے بات کاٹ کر کہا " میں اُسے تنخواہ تو نہیں دے سکتی۔ میرے پاس جو کچھ ہے اُس کا حساب کتاب تم خود جانتی ہو "

" بیوی خدا کا شکر ہے اُس نے ہم کو کھانے کو دیا ہے۔ خانصاحب کا تو یہ منشا بھی نہیں تھا کہ اُس کے نام سے ہماری پرورش کریں۔ ہاں وہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ سکینہ اپنی حیثیت نہ بھول جائے، وہ آپ کی لونڈی ہے کبھی اپنے آپ کو بیٹی نہ سمجھنے لگے۔ یہی انہیں اندیشہ تھا۔ مگر وہ بات کہنا نہیں جانتے، خدا جانے آپ سے کیا کہہ بیٹھے۔ آپ ناراض نہ ہوں۔ میں انہیں سمجھا لوں گی "

"ہاں بہن تم انہیں سمجھا دو۔ میرے پاس جو کچھ ہے وہ حاضر ہے۔ تنخواہ دینا میرے بس کی بات نہیں"

خانصاحب کی بیوی کچھ ادھر اُدھر کی باتیں کرکے گھر چلی گئیں، وہاں پہنچکر میاں بیوی میں کچھ جھگڑا ہوا، مگر رو پیٹ کر بھی خانصاحب کو انکی بیوی اس پر آمادہ نہ کرسکیں کہ وہ تنخواہ سے دست بردار ہوں۔ خالہ سے جو گفتگو ہوئی تھی اُسے سنکر انہیں ایک اور قوی دلیل مل گئی

"ہم غریب آدمی ہیں" انہوں نے اپنی بیوی سے کہا "اگر سکینہ کے سامنے ہر مہینہ اُسکی تنخواہ وصول نہ کی گئی تو وہ خود کو زمیں زادی سمجھنے لگے گی، ہماری صورتیں دیکھکر ناک بھوں چڑھانے لگے گی"

"ارے واہ" خانصاحب کی بیوی نے بگڑ کر کہا "تم میری لڑکی کو سمجھے کیا ہو۔ ایسی شریف طبیعت کی لڑکی شہر شہر تلاش کرو تو نہ ملے۔ تم اپنے ٹکے وصول کرنے کے لئے چاہے جو کچھ کہدو . . . "

خانصاحب نے اپنی بیوی کو گھور کر دیکھا۔ انکی آواز معمول سے زیادہ بلند ہوگئی تھی، اور خانصاحب کو اندیشہ ہوا کہ کہیں کوئی محلہ والا انکی باتیں نہ سن لے۔ خانصاحب کی بیوی نے جب خالہ کے سامنے بھی اپنے شوہر کی رسوائی منظور نہیں کی تھی تو اب کیسے بے لگام ہوجاتیں۔ برسوں نباہا تھا، ایک بار اور ضبط کرگئیں۔

"خیر کچھ بھی ہو" انہوں نے دبی آواز سے کہا "میں سکینہ کی تنخواہ نہ مانگونگی نہ تمہیں مانگنے دونگی"

"تو میری لڑکی واپس کردو"

"واپس بلالو۔ میرا کیا جاتا ہے۔ مگر روٹی کپڑا نہ ملا تو گھر گھر دکھڑا روتی پھروں گی"

اس دھمکی کا خانصاحب پر مطلق اثر نہیں ہوا۔ لیکن چاہے جتنی کفایت کیجائے، کچھ نہ کچھ تو سکینہ کیوجہ سے اخراجات میں اضافہ ہونا ضرور ہی تھا۔ خرچ کا نام سنکر انکے کان کھڑے ہوگئے۔

"اچھا ری، اگر تنخواہ نہیں لیتی تو کچھ غلہ، روٹی، کپڑا تو مانگ لایا کر،"

خانصاحب کی بیوی چپ ہوگئیں۔ خانصاحب سمجھے کہ وہ راضی ہیں۔

یہ گفتگو رات کے وقت مکان کے چھوٹے سے صحن میں ہوئی تھی۔ گرمی کا موسم تھا، خانصاحب شام ہی سے دو پلنگڑیاں صحن میں بچھوا لیتے تھے۔ مغرب کی نماز سے واپس آتے ہی وہ ٹانگیں پھیلا کر پیٹھ کے بل لیٹ جاتے، اللہ ہو اللہ ہو کرتے، یا حمد و نعت کی سنی سنائی غلط سلط نظمیں اپنے کریہہ لہجے میں گاتے۔ یہ عبادت کا سلسلہ کھانے تک جاری رہتا، اگر کھانے کے بعد نیند فوراً نہ آئی تو پھر اسے شروع کر دیتے، یا بیوی کو اپنا فلسفہ سناتے اس روز کے بحث و مباحثہ کے غبار سے اپنی اور اپنی بیوی کی طبعیت صاف کرنے کے لئے انہوں نے مناسب سمجھا کہ کچھ بیان کیا جائے۔ اُنکی بیوی کئی بار پلنگ سے اُٹھ کر اندر چلی گئیں، یا چادر میں منہ لپیٹ لیا اور کہا کہ اُنکو نیند لگی ہے۔ لیکن خانصاحب کی تقریر کی طوالت میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ اطاعت اور تابعداری کی خو بیان کر رہے تھے، اور یہ باب لا انتہا ہے۔

خانصاحب نے سوچا تھا کہ اُنکی بیوی تنخواہ کی بجائے روٹی دال چاول مانگ لائیں گی اور اولاد کی "پرورش" پر اُنکا جو خرچ ہوا تھا اُس کی یوں تلافی ہو جائیگی۔ مگر اُنکی بیوی نے کچھ بھی مانگنے سے صاف انکار کر دیا۔ تھوڑے دن خانصاحب نے انتظار کیا، اور جب اُنکو یقین ہو گیا کہ بیوی کے ذریعہ سے ایک دانہ چاول تک نہ ملیگا، تو انہوں نے دوسری ترکیبیں اختیار کیں۔ کبھی بے بلائے خالہ کے یہاں مہمان ہو جاتے، کبھی کہتے کہ بازار میں بہت اچھا کپڑا دیکھ آیا ہوں اگر اجازت ہو تو سکینہ کے لئے دو چار گز خرید لاؤں، اور معمولی کپڑا خرید کر اچھے کپڑے کے دام وصول کرتے۔ ہر دوسرے تیسرے دن خالہ سے ایک مختار رکھنے کی درخواست کرتے، اور گھنٹوں وہ دشواریاں بیان کرتے جو ایک مختار کے نہ ہونے سے پیش آ سکتی تھیں۔ میری خالہ سمجھ گئیں کہ یہ سب سکینہ کی تنخواہ منظور نہ کرنے کی سزا ہے۔ اور ممکن ہے وہ تنگ آ کر سکینہ کو اُس کے گھر واپس روانہ کر دیتیں۔ اس مصیبت سے سکینہ کو اُس کی ماں نے بچایا، وہ بیچاری ہر طرح سے خالہ کو

خوش رکھنے کی تدبیریں سوچتی رہتیں۔ جس دن خانصاحب خالہ کے یہاں مہمان ہوتے وہ آکر کھانا پکا جاتیں۔ اگر کبھی موقعہ ملتا تو خانصاحب کی آنکھ بچا کر خیرات کے لئے کچھ نہ کچھ خالہ کے پاس سے آتیں۔ خالہ اگر اُن سے کسی بات پر خوش ہوتیں تو وہ یہ کوشش کرتیں کہ خانصاحب کے بارے میں انہیں جو بدگمانی ہے وہ کم ہو جائے۔ یا کوئی عملی صورت نہ اختیار کرے۔ خالہ کو خانصاحب کی سیرت پسند تو کبھی بھی نہ ہو سکتی تھی۔ لیکن ان کی بیوی کے ایثار اور جانفشانی سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ وہ خانصاحب کی بے تمیزیوں اور کمینی حرکتوں سے درگذر کرتی رہیں۔

یوں ہی دو سال گزر گئے۔ خانصاحب کی بیوی نے جس امید میں پچھلے دو تین سال کاٹے تھے اُس کے پورے ہونے کا وقت آگیا۔ سکینہ جوان ہو گئی تھی۔ اور خالہ یہ دیکھکر اُس کے لئے شوہر تلاش کرنے لگیں۔ اسی سلسلہ میں انہیں میرے بچپن کا ایک ساتھی یاد آیا جو صورت اور سیرت کے لحاظ سے خوبیوں اور نیکیوں کا مجموعہ تھا۔ لیکن ابھی تک افلاس کی وجہ سے اس کی شادی نہیں ہو سکی تھی۔ خالہ نے اسے اپنے یہاں بلوایا۔ بڑی جد و جہد سے اُسے کسی دفتر میں نوکر رکھایا اور شادی کے لئے سامان جمع کرنے لگیں۔ انہوں نے ابھی اپنا ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا۔ لیکن سکینہ کو وہ اس نوجوان سے پردہ کراتی تھیں۔ اور کوئی رشتہ کی لڑکی نہیں تھی جس کی شادی کا سامان مہیا کرنا ضروری تھا اور یوں خانصاحب کی بیوی سمجھ گئیں کہ یہ سب سکینہ کے لئے ہو رہا ہے۔ لڑکا بھی انہیں بہت پسند تھا، اور وہ دل ہی دل میں یہ سوچ کر خوش ہونے لگیں کہ اب انکی تقدیر پلٹی ہے اور برسوں کی جفاکشی کا اب کچھ اجر ملیگا۔

خالہ نے اُن سے ابھی تک شادی کے معاملہ میں کوئی گفتگو نہیں کی تھی۔ وہ اس انتظار میں تھیں کہ لڑکے کی آمدنی کا کوئی ذریعہ ہو جائے اور جب اس میں کامیابی ہوئی تو جہیز کی فکر میں پڑ گئیں۔ اسی وجہ سے خانصاحب کی بیوی نے خانصاحب سے بھی کچھ نہیں کہا۔ لیکن خانصاحب کی نظر بہت تیز تھی۔ ایک مرتبہ رات کو جب انکی بیوی لیٹی محبت کے خواب دیکھ رہی تھیں اُنہوں نے کہا:-

"کیوں ری، یہ بی بی کہیں اس لڑکے سے سکینہ کی شادی تو نہ کر بیٹھیں گی ؟"

خانصاحب کی بیوی چونک پڑیں۔

"کیوں ؟"

"میں تو اپنی لڑکی ایسی سستی دینے والا نہیں ... اُس کنگال کے پاس ہے کیا"

"سکینہ کے پاس کیا ہے"

"سکینہ کے پاس کچھ نہ سہی، ہمیں تو حوصلہ ہے"

"کاہے کا حوصلہ ؟"

"وہ حوصلہ جو ہر ماں باپ کو ہوتا ہے، کچھ نقدے، کچھ جہیز لے، ہمارے پاس بھی بڑھا پا کاٹنے کے لئے کچھ روپیہ ہو، لڑکی کا کیا، وہ اپنے گھر جا کر بیٹھ رہے گی، ہم کو پوچھے گی بھی نہیں، اُس کی شادی کر کے کیا ہم فاقے کریں گے ؟"

خانصاحب نے اپنی بیوی کو عمر بھر یہ بتایا تھا کہ اُنکی گذر اوقات کا ذریعہ کیا ہے، خرچ کے لئے روز کے روز اپنی گرہ سے نکال کر کچھ دیدیتے، یا بازار سے خود خرید لاتے، اس لئے جب وہ فاقہ کی دھمکی سناتے تو اُنکی بیوی کچھ جواب نہ دے سکتیں۔ اب بھی وہ خاموش ہو گئیں، اور یہ دیکھا تو دل کو بھی امیدوں سے خالی پایا۔

انہیں یقین تھا کہ خانصاحب نے اپنے حوصلے پورے کرنے چاہے تو سکینہ کی زندگی برباد ہو گی، اور اسے بچانے کی یہی صورت تھی کہ خانصاحب کا منہ روپیہ سے بند کیا جائے۔ روپیہ نہ اُنکے پاس تھا نہ میری خالہ کے پاس اور خانصاحب سے جھوٹے وعدے کرنا خطرناک بھی تھا اور مشکل بھی، مگر جو ڈوب رہا ہو وہ تنکے کا بھی سہارا لیتا ہے۔ انہوں نے دوسرے دن میری خالہ سے آکر کہا :-

"بیوی سکینہ اب ماشاءاللہ جوان ہو گئی ہے۔ آپ ہی کی عنایت سے اُس نے پرورش پائی، اب خدا کا نام لیکر ایک اور احسان بھی اُس پر کر دیجئے"

میری خالہ سمجھ گئیں۔

"بہن میں اسی فکر میں مبتلا ہوں۔ لڑکا ڈھونڈھا ہے، اُسے نوکری دلوائی ہے۔ اب جہیز کی فکر میں ہوں۔ دیکھو کب تک شادی کی نوبت آتی ہے۔"

"ہاں بی بی لڑکا تو آپنے بہت اچھا پسند کیا ہے۔ خانصاحب نے اُسے اس نظر سے تو نہیں دیکھا، مگر تعریف بہت کر رہے تھے۔ یہ بھی کہا تھا کہ سکینہ کی اس سے نسبت ٹھہر جائے تو بہت اچھا ہوگا" پھر سوچ کر۔" مگر بی بی نوکری کِتّے کی ہے"۔

"ابھی تو تیس روپیہ ملیں گے، سال دو سال بعد شاید کچھ ترقی ہو جائے"

"بی بی میں تو دل و جان سے آپ کی شکر گزار ہوں ....."

"بہن میرے بس کی کیا بات تھی، یہ تو سب خدا کی دین ہے۔"

"ہاں بی بی یہ سب ٹھیک ہے، جو کچھ کرتا ہے خدا ہی کرتا ہے"

میری خالہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"مگر بی بی اب ہم بھی بوڑھے ہو چلے ہیں، ہمارے پاس کوئی اور سہارا نہیں .... خانصاحب تو کہتے ہیں کہ خدا کی مرضی ہے تو ہم کو کہیں نہ کہیں سے کھانے کو ملتا رہے گا۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تیس روپیہ میں ہمارا گذر کیسے ہوگا۔"

"اچھا بہن" میری خالہ نے کچھ طنز سے کہا "تم نے ابھی سے پورا حساب بھی لگا لیا"

"بی بی حاجت ہوتی ہے تو آدمی ہر وقت اپنے ٹکے گنتا رہتا ہے"

میری خالہ سے خانصاحب کی بیوی نے کبھی ایسی باتیں نہیں کی تھیں، انہیں یہ تو کسی صورت سے معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ خانصاحب کی بیوی اپنے شوہر کی بے حیائی چھپانے کے لئے آئندہ کے اخلاقی جرموں کا الزام ابھی سے اپنے سر لے رہی ہیں، اور وہ بہت خفا ہوئیں۔

"سنو بہن میرے بس کا جو کچھ ہے وہ میں کر رہی ہوں۔ اگر تمہاری ہوس اسے کم سمجھتی ہے تو جو جی چاہے کرو، میں اس سے دست بردار ہوتی ہوں۔"

خانصاحب کی بیوی تھوڑی دیر تک روتی رہیں اُس کے بعد اُٹھ کر چلی گئیں۔ رات کو اُنہوں نے خانصاحب سے کہا:۔

"بی بی سو روپیہ نقد دیئے اور ایکہزار کا مہر باندھنے پر تیار ہیں۔ مگر نکاح کے بعد"

خانصاحب نے سر ہلاکر جواب دیا۔

"شادی پر سو روپیہ دے تو کیا دے۔ اور ہزار کا مہر کون شریف زادی قبول کرے گی"

خانصاحب کی بیوی نے ہمت کرکے جھوٹ بولا تھا، سو وہ بھی بے سود رہا۔ اب وہ چادر میں منہ لپیٹ کر رونے لگیں اور روتے روتے سو گئیں۔

دوسرے دن انہوں نے میری خالہ سے جاکر کہا کہ خانصاحب نے انہیں قائل کر دیا ہے، اور جو خالہ مناسب سمجھیں وہی کریں۔ میری خالہ کو بہت تعجب ہوا کہ خانصاحب ایکبارگی اس قدر راضی برضا ہوگئے اور بیوی ہوس کے پھیر میں پڑ گئیں۔ لیکن انہوں نے اس مسئلے پر زیادہ غور نہیں کیا، خالہ سے گفتگو میں خانصاحب کی بیوی نے بہت دنوں تک سکینہ کی شادی کا سوال نہیں چھیڑا، مگر خانصاحب سے اُنکی روزمرہ لڑائی ہوتی رہی۔ خانصاحب خوشی سے تو کبھی اپنی لڑکی تیس روپیہ کے نوکر سے نہ بیاہتے۔ لیکن یہ ممکن تھا کہ اُنکی ہاتھ بندھ جائیں اور عین موقعہ پر وہ کچھ نہ کرسکیں۔ اسی کی خانصاحب کی بیوی کوشش کر رہی تھیں ایک دن انہوں نے خانصاحب سے کہدیا کہ وہ سب کچھ طے کر چکی ہیں اور عنقریب شادی کی تاریخ مقرر ہونے والی ہے۔ اب اگر خانصاحب نے دخل دیا تو بڑا فضیحتا ہوگی۔ خانصاحب نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ وہ بھی غافل نہیں بیٹھے رہے تھے۔ انہیں ایک نواب کی خبر ملی تھی جو عیاشی کرتے تھے اور قرض بھی لیتے تھے خانصاحب اُنکے مصاحب بن گئے۔ موقعہ پاکر بہت اچھے نرخ پر کچھ قرض بھی دیدیا۔ جب بیوی سے یہ اطلاع ملی کہ سکینہ کی شادی ہونیوالی ہے تو اُس بیچاری کا بھی انہوں نے فیصلہ کر دیا۔ ایک روز شام کو جب اُنکی بیوی گھر پر مصروف تھیں تو وہ میری خالہ کے یہاں پہونچے، سکینہ کو رات بھر کے لئے گھر لیجانے کی اجازت چاہی اور اُسے یکہ پر بٹھاکر لے گئے۔

رات کو وہ اکیلے گھر پہنچے تو کھانے میں کچھ دیر ہوگئی تھی ۔ بیوی نے انہیں دیکھتے ہی جلدی جلدی کھانا نکالنا شروع کیا ، مگر بجائے کھانے کے لئے بیٹھنے کے وہ دیا اندر اٹھالے گئے ، اور گرہ سے نوٹ نکال کر گننے لگے ۔ جب گن چکے تو بیوی سے کہا ۔

" دیکھ تو کہہ رہی تھی کہ سکینہ کی شادی سے ہم کو کیا مل سکتا ہے ۔ پانسو روپیہ نقد اور دس ہزار کا مہر لکھوالایا ہوں ۔ اور کسی کی کیا مجال ہے کہ کچھ کہے ۔ اپنے سامنے نکاح کرایا ، اور چار گواہوں کے دستخط ہیں "

بیوی کے ہاتھ سے کفگیر گر پڑا ۔ انکا سر چکر کھانے لگا ، اور وہ وہیں پتیلیوں کے بیچ میں لیٹ گئیں ۔ خانصاحب نے نہایت اطمینان سے کھانا نکالا ، کھایا اور حسب معمول ٹانگیں پھیلا کر پیٹھ کے بل لیٹ گئے اور حمد و نعت کی نظمیں پڑھنے لگے ۔ آج وہ معمول سے زیادہ مطمئن تھے ۔ خدا کی نعمتوں کا بہت شکریہ ادا کیا ، کائنات کی گل کاریوں کی بہت تعریف کی ، اور جب نیند نے انکی آنکھیں بند کیں تو ان کی زبان پر یہ شعر تھا ؎

ترا نام تہار و جبار ہے ؛ مرا نام خاکی گنہگار ہے

مجھے یہ نہیں معلوم کہ انکی بیوی کا اس کے بعد کیا انجام ہوا ۔ میری خالہ کو انہوں نے پھر کبھی اپنی صورت نہیں دکھائی ، اور اس کے تھوڑے دن بعد ہی میری خالہ کا انتقال بھی ہو گیا ۔ مگر خانصاحب اسی طرح سے محلہ پر حاوی رہے ۔ انکے آخری کارنامے نے انکے وقار کو بہت بڑھا دیا تھا ، لوگ انہیں زیادہ جھک کر سلام کرتے تھے ، مسجد میں اور زیادہ پابندی سے نماز ہوتی تھی ۔

اقتباسات

جرمن مستشرقین کی ایک کانفرنس ہر دو سال بعد اپنا اجلاس کرتی ہے۔ چنانچہ پانچواں اجلاس گذشتہ سال اواخر اگست میں شہر بان میں منعقد ہوا جس کی کارروائی کی مفصل رپورٹ انجمن مستشرقین المانی کے رسالہ (Z.D.M.G.) کے نمبر ۲ و ۳ جلد ۷ میں شائع ہوئی ہے۔

شہر بان مشہور جرمن ماہر موسیقی بے تھوون کا مولد ہے۔ اسی رعایت سے کانفرنس کا اجلاس بے تھوون کی موسیقی سے کیا گیا۔ ہز ایکسلنسی فریڈرش روزن نے صدارتی تقریر فرمائی اور بان یونیورسٹی کے شیخ نے حاضرین کا خیر مقدم کیا۔ پردیسی علما میں سے پروفیسر مارگن اسٹرن (سنسناٹی) پروفیسر لان من (ہارورڈ یونیورسٹی)؛ اور پروفیسر اونک موجود تھے۔ انگلستان کی طرف سے گلاسگو کے پروفیسر اسٹی ونسن نے تقریر کی۔ اس روز خاص مقالہ برلن یونیورسٹی کے پروفیسر لوڈرس نے پڑھا جو حال میں ہندوستان کا دورہ کر کے واپس گئے ہیں۔ انکا موضوع تھا "ہندوستان میں لسانیات، تاریخ اور اثریات"

دوسرے روز بلدیہ بان نے مستشرقین کی دعوت کی اور اپنے شہریوں کی طرف سے خیر مقدم کیا۔ اسی دن جرمن فلسطینی انجمن نے اپنے ۵۰ سال ختم کرنے کی تقریب میں ایک جلسہ کیا جس میں پروفیسر آلٹ نے "فلسطین کے متعلق تحقیقات کی موجودہ حالت اور اس کے حل طلب مسائل" پر نہایت محققانہ مضمون سنایا۔ اسی سلسلہ میں دوسرے دلچسپ مضامین بھی سنائے گئے۔

تیسرے روز مسٹر ہرتس فلڈ (طہران) نے جدید ایرانی تحقیقات، پر ایک عالمانہ مقالہ سنایا! رات میں پروفیسر شیفر نے "مصری فن لطیف" پر ایک مضمون پڑھا۔ اور اس کے بعد ڈاکٹر راٹ ہنس (ہامبرگ) نے پہلی مرتبہ وہ دو فلم دکھائے جو انہوں نے عرب کے متعلق تیار کئے ہیں۔ ایک کا نام ہے "مقدس عرب" جس میں حج کے مراسم دکھائے گئے ہیں اور دوسری کا نام ہے

"جنگ آزما عرب"، اس میں یمن اور سفر صنعار کی تصویریں ہیں ۔

اس موقع پر یونیورسٹی کیطرف سے شعبہ مشرقیات نے تین نمائشیں کی تھیں۔ ایک تو مشرقی مسیحی کلیساؤں کی دعاؤں کی اور دوسری مذہبی کتابوں کی نمائش تھی جس میں بڑا حصہ پروفیسر گوسین آنجہانی کے نادر مجموعہ کتب سے حاصل کیا گیا تھا۔ دوسری نمائش نہایت قدیم عبرانی کتابوں کی تصاویر عکسی پر مشتمل تھی ۔

تیسری نمائش میں مصر، چین، جاوا، ترکی اور شمالی افریقہ کی پرچھائیں کی تصویریں دکھائی گئی تھیں جن میں علاوہ علماء کے دوسرے لوگوں نے بھی بہت دلچسپی لی ۔

کانفرنس کے مختلف شعبوں نے اس سال کے اجلاس میں کل چار قرار دادیں منظور کیں جنہیں پھر کل کانفرنس نے بھی منظور کرلیا۔ ان تجاویز میں سے دو ہندی۔ ایرانی شعبہ نے پیش کی تھیں یعنی یہ کہ جرمن یونیورسٹیوں میں جدید ہندوستانی زبانوں خصوصاً غیر آری زبانوں کی تعلیم اپنی علمی حیثیت نیز عملی وجوہ سے بہت ضروری ہے چنانچہ کانفرنس توقع کرتی ہے کہ مختلف علاقوں کی حکومتیں اپنی اعلیٰ تعلیم گاہوں میں انکی تعلیم و تحقیق کا انتظام کریں گی۔ دوسری یہ کہ اس کانفرنس کی رائے میں ہندوستانی اور اس سے وابستہ دوسری تہذیبوں کو سمجھنے کے لئے بدھ مت کا سمجھنا بہت ضروری ہے اس لئے اس کے مطالعہ کے لئے ایک تحقیقی ادارہ کا قیام ضروری ہے۔

تیسری تجویز ترکی۔ اسلامی شعبہ کی طرف سے تھی یعنی یہ کہ فریڈرک بول کی مشہور کتاب "سیرت محمدی"، کا ترجمہ جسے عرصہ ہوا ڈاکٹر شیڈر نے تیار کیا تھا جلد سے جلد طبع کرا دیا جائے چوتھی تجویز جارجیا کے متعلق تحقیقات کی ضرورت اور اہمیت پر تھی یہ چار قرار دادیں اس کانفرنس نے منظور کیں جس کے مختلف شعبوں میں ۸۰ علماء نے تحقیقاتی مضامین پڑھے !

ترکی اسلامی شعبہ میں بھی بہت سے دلچسپ اور مفید مضامین پڑھے گئے۔ جن میں سے بعض غالبًا انجمن کے رسالہ کی آئندہ اشاعتوں میں طبع ہو جائیں گے بعض کے خلاصے اسی پرچہ میں درج کر دئے گئے ہیں۔ بعض عنوانات درج ذیل ہیں ۔

۱۔ بارم استارک : پیغمبر اسلام اور عیسائیت۔
۲۔ برتھولڈ : مصر میں بازنطینی۔ عربی معیشت اور انتظام ملکی۔
۳۔ فشر : اسم محمد۔
۴۔ گوتیس : ہندی اسلامی تاریخ تمدن کے لئے نیا مواد۔
۵۔ مٹ دونخ : جنوبی عرب کے نئے کتبے
۶۔ رسکا : جابر کے متعلق تحقیقات کی تاریخ

گوتیس کا مضمون بہت دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ اس نے ہندوستانی تصویروں کی تشریح و توضیح کرکے مسلمانوں کے زمانہ کے ہندوستانی تمدن کے متعلق مفید باتیں معلوم کی ہیں۔
جرمن مستشرقین کا آئندہ اجلاس ۱۹۳۰ء میں شہر ویَن (اسٹریا) میں منعقد ہوگا۔

انگلستان میں ۱۹۲۸ء کے اندر جو کتابیں شائع ہوئیں انکی مضمون وار تقسیم سے پڑھنے والوں کے مذاق کا پتہ چلتا ہے اس سال کے اعداد بھی گذشتہ اعداد کی تصدیق کرتے ہیں۔ قصے اور ناول سب سے زیادہ طبع ہوئے یعنی کل ۳۵۲۹ کتابیں۔ اس مضمون میں گذشتہ سال کے مقابلہ میں ۱۶۱ کتابوں کا اضافہ ہوا۔ دوسرا نمبر بچوں کی کتابوں کا ہے۔ اس میں ۹۴۳ یعنی گذشتہ سال ۴۰ کتابیں زیادہ شائع ہوئیں، مذہب پر ۸۰۹ یعنی گذشتہ سال سے ۱۹ کتابیں کم شائع ہوئیں، اسکا نمبر تیسرا ہے۔ اس کے بعد سوانح عمریاں آتی ہیں جن کی تعداد ۷۶۶ ہے، پھر سفرنامے ۶۱۸؛ اس کے بعد فلسفہ ۳۱۷، پھر کھیل پر کتابیں ۲۱۷۔ پچھلے سال میں جو کتابیں شائع ہوئی ہیں انکی تعداد کا اندازہ ذیل کے نقشہ سے ہوسکتا ہے:۔

سال	نئی کتابیں	نئے ایڈیشن	کل
۱۹۲۲ء	۸۷۵۴	۲۰۸۸	۱۰۸۴۲
۱۹۲۳ء	۹۲۴۶	۳۰۲۸	۱۲۲۷۴

سال	نئی کتابیں	نئے ایڈیشن	کل
۱۹۲۴ء	۹۰۱۳	۳۱۹۳	۱۲۷۰۶
۱۹۲۵ء	۹۹۷۷	۳۲۲۵	۱۳۲۰۲
۱۹۲۶ء	۹۹۸۹	۲۸۱۰	۱۲۷۹۹
۱۹۲۷ء	۱۰۳۳۴	۳۴۷۶	۱۳۸۱۰
۱۹۲۸ء	۱۰۶۱۲	۳۷۸۷	۱۴۳۹۹

پچھلے دنوں تعلیمی انجمنوں کی ایک کانفرنس لندن میں منعقد ہوئی۔ کانفرنس کے صدر لارڈ لٹن تھے۔
لارڈ لٹن نے اپنے خطبہ صدارت میں ہندوستان میں تعلیم کے بعض پہلوؤں پر نظر ڈالی۔ آپ نے فرمایا کہ "میرا ہندوستانی تجربہ صرف ایک صوبہ یعنی بنگال تک محدود ہے کیونکہ میں اسی صوبہ میں ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۷ء تک گورنر رہا۔ اس لئے قبل اس کے کہ میرے ملاحظات تمام ہندوستان پر عائد کئے جائیں ان میں تبدیلی کی ضرورت ہوگی۔ تعلیم کا مقصد جس معنی میں میں اس لفظ کو استعمال کرتا ہوں یہ ہے کہ آدمی زندگی کو سمجھے، اس کو پہچانے اور اس سے پورا پورا فائدہ اٹھائے۔ مختصراً اس کا مقصد ہے فرد کی مکمل نشو و نما ہندوستانی تعلیم کے متعلق سب سے پہلی چیز جو اپنی طرف توجہ کو جذب کرتی ہے وہ مسئلہ کی وسعت ہے اور اس میدان کی بے پایانی جس میں ابھی کام کرنا باقی ہے۔ عام تعلیم یعنی مدارس میں سب کی لازمی تعلیم تو ابھی شروع ہی نہیں ہوئی ہے۔ ۳۵ کروڑ کی آبادی میں صرف ۲ فیصدی ادنیٰ تعلیم کے اس معیار کو پہنچے ہیں جہاں لکھنا پڑھنا ممکن ہو۔ ہندوستان میں مدارس کی تعلیم ان لوگوں کے لئے ہے جو اس کا صرف برداشت کرنے کے لائق ہیں۔ مزید ترقی اس وقت تک ممکن نہیں جبتک لوگ فرنڈکس دینے پر آمادہ نہ ہوں جس سے غریبوں کے مدرسہ کھولے جاسکیں۔"

آپ نے آگے چلکر فرمایا کہ "ہندوستان میں عورتوں کی تعلیم کیطرف سے کامل غفلت برتی جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ مردوں کی تعلیم نے جماعتی زندگی، رسم و رواج اور ملک کے عام خیالات پر اس کم اثر

کیا ہے۔ ہندوستانی اب کوئی دو تین نسل سے ہماری تعلیم گاہوں میں پڑھنے آرہے ہیں۔ باقی ہندوستان میں کچھ نہ کچھ تعلیم پاتے ہی ہیں، اس کا کچھ تو اثر ہونا چاہئے تھا لیکن کیا ہوا؟ آپ میں سے اکثر نے مس میو کی کتاب "مادر ہند" پڑھی ہوگی جس سے مغربی پڑھنے والے رنجیدہ ہوئے اور ہندوستانی غضبناک۔ اس کتاب میں بہت سی اختلافی باتیں ہیں اور میں انپر بحث کرنا نہیں چاہتا لیکن ایک بات اس میں ہے جس سے ہندوستان کا ہر جاننے والا اتفاق کرے گا اور وہ بات یہ ہے کہ جن واقعات سے اس کتاب میں بحث کی گئی ہے، چاہے اچھی طرح یا بری طرح صحت کے ساتھ یا غلط طریق پر، وہ واقعات عورتوں کی تعلیم کی ضرورت کی نہایت قوی شہادت ہیں۔" آگے چلکر آپنے فرمایا! "اگر شمالی ہند کی آبادی میں پردہ لازمی چیز ہے اور جہاں یہ موجود ہے وہاں اسے قائم رکھنا ہے تو قدامت پسند جماعت کا فرض ہے کہ پس پردہ تعلیم دینے کے موثر ذرائع نکالے ...... ہندوستانی گھروں میں عورت کا اثر بیحد ہے۔ اس سے کہیں زیادہ جتنا کہ ہمارے گھروں میں ہماری عورتوں کا۔ یہ اثر ہندوستان کے بچوں ہی تک محدود نہیں، گھروں میں مردوں پر بھی انکا بہت اثر ہے۔ ہم لوگ اکثر ہندوستان کے متعلق ان لوگوں سے ملکر رائے قائم کرتے ہیں جو ہمارے ملک میں آتے ہیں، جن سے ہم طالب علم، عہدہ دار، یا مہمان کی حیثیت سے ملتے ہیں اور جن کی واپسی کے بعد انکی تقریریں اخباروں میں شائع ہوتی ہیں لیکن جو ہندوستان میں رہ چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان لوگوں نے اپنے گھروں پر بہت ہی کم اثر ڈالا ہے اور اس سے بھی کم اپنے ملک کے رسم و رواج اور جماعتی زندگی پر۔ یہ چیزیں ابھی اس حال میں ہیں جس میں عورتیں انہیں رکھنا چاہتی ہیں۔ جسم جماعتی میں عورتوں کا اثر ایسا ہی ہے جیسا جسم انسانی میں خون کا۔ یہ دکھائی نہیں دیتا، لیکن جسم کا کوئی حصہ، کوئی عضو، اس کا کوئی عمل اس کے اثر سے باہر نہیں۔ کل جسم کی صحت کا مدار اسی پر ہے۔ یہی حال ہندوستانی گھروں میں عورتوں کے اثر کا ہے۔"

گذشتہ مہینہ کے جامعہ میں ہم نے ہندوستان کے بعض تعلیمی اعداد و شائع کئے تھے۔ ان

سے معلوم ہوتا تھا کہ دیہی تعلیم کے باب میں پنجاب دوسرے صوبوں سے کتنا آگے ہے۔ پنجاب نے اپنے دیہاتی علاقوں میں تعلیمی جدوجہد کی اسکیم بنانے کے لئے دو ماہرین تعلیم کو مقرر کیا تھا۔ اس اسکیم کی تیاری سے قبل یہ دونوں تعلیمی عہدہ دار انگلستان گئے تھے تاکہ وہاں دیہی تعلیم کے نظام کا مطالعہ کریں۔ وہاں انہوں نے مشہور تعلیمی ماہر سر میکائیل سیڈلر سے مشورہ کیا۔ سر میکائیل نے ان سے کہا کہ انگلستان کی دیہی تعلیم میں عورتوں کے کلب سب سے اہم چیز ہیں، ان دونوں عہدہ داروں نے معائنہ کے بعد جو رائے قائم کی وہ یہ تھی کہ برطانیہ میں اس صدی کی سب سے اہم جماعتی اور تعلیمی تحریک ہے!

ایک بنگالی خاتون مسز سروج نلینی دت آنجہانی نے آج سے کوئی ۱۶ سال قبل بنگال میں اس قسم کے کلب قائم کرنیکا کام شروع کیا تھا۔ انہوں نے بھی انگلستان کے نسائی کلب دیکھے تھے اور انکا خیال تھا کہ باوجود اہم جماعتی اختلافات کے اس طریقہ سے ہندوستان کے دیہاتوں میں بھی کام لیا جا سکتا ہے۔ انکا عقیدہ تھا کہ انکی جاہل ہم وطن عورتوں کو ابھارنے کی بہترین تدبیر یہی ہے کہ خود ان عورتوں کو منظم کیا جائے چنانچہ انہوں نے محل سمیتیوں کے قیام کی کوشش کی۔ آج ۴ سال کی کوشش سے بنگال کے دیہاتوں اور قصبوں میں ۲۵۰ کے قریب سمیتیاں قائم ہو چکی ہیں۔ جس میں ہر طبقہ، مذہب اور ذات کی عورتیں شامل ہیں۔

اس کی مرکزی جماعت نئی سمیتیوں کے قیام کے لئے کوشش کرتی ہے۔ انکے کام میں ربط و تعلق پیدا کرتی ہے، گھر میں صنعتیں سکھانے کے لئے استانیاں بھیجتی ہے، ایک ماہوار رسالہ شائع کرتی ہے، کلکتہ میں ایک مرکزی صنعتی اسکول چلاتی ہے، اور عورتوں کی تعلیم و ترقی کے سلسلہ میں تقریروں کا انتظام کرتی ہے۔ سمیتیوں کی خاص غرض یہ ہے کہ اراکین میں باہمی ربط پیدا کریں، اور امداد باہمی کے جذبہ کو تقویت پہنچائیں۔ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے بہت سی تدابیر اختیار کیجاتی ہیں جیسا کہ گذشتہ سال کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً عوام کی درستی کے لئے بہت کچھ کام کیا گیا۔ بچوں اور زچوں کے لئے علیحدہ شفاخانہ کھولے گئے۔ دائیاں تیار

کی گئیں، تقریروں، تعلیمی حلقوں اور عام تبلیغ کے ذریعہ صفائی اور صحت کے متعلق معلومات کی اشاعت کی گئی۔ بیوہ اور غریب عورتوں کی مدد کے لئے گھریلو صنعتوں کو رواج دیا گیا اور ان صنعتوں کو امداد باہمی کے اصول پر چلایا گیا۔ اس رپورٹ کا مطالعہ تعلیمی کام کرنے والوں کے لئے دلچسپی اور فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خلوص اور محنت دشوار کاموں کو کس طرح آسان کر دیتے ہیں۔

لندن ٹائمس تعلیمی ضمیمہ

تنقید و تبصرہ

کتب :-

الصلوۃ للّٰہ و الصیام للرحمٰن - مقابلہ اسلام و یورپ

الصلوۃ للّٰہ و الصیام للرحمٰن | یہ کتاب مولوی سید محمد رفیع الدین صاحب نے مقام کالا باغ ضلع میانوالی سے ہمارے پاس رائے زنی کے لئے ارسال کی ہے۔ اس میں انہوں نے اپنے خیال کے مطابق قرآنی نماز و روزہ کی تشریح فرمائی ہے اور اپنا مذہبی نام "مسلم اہل البیت" لکھا ہے جس کے متعلق ہم کو یہ نہ معلوم ہو سکا کہ بوجہ سید ہونے کے اختیار کیا گیا ہے۔ یا جملہ مسلمانوں کو اہل بیت رسول سمجھکر۔

غالباً یہ مسلم اہل البیت اہل قرآن کی چوتھی قسم ہے۔ پہلا فرقہ "اہل قرآن" مولوی عبداللہ صاحب چکڑالوی والا لاہور میں تھا جس میں کچھ شائبہ حدیث کا بھی تھا۔ کیونکہ مولوی صاحب مذکور ایک مدت تک اہل حدیث رہ چکے تھے۔ دوسرا فرقہ گوجرانوالہ کا "اہل الذکر" نامی ہے۔ تیسرا امرتسر کا "امت مسلمہ" لیکن یہ چوتھا فرقہ سب پر فوقیت رکھتا ہے جس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اس کی قرآن فہمی اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ بلا مبالغہ جس آیت سے جو مطلب چاہتا ہے سمجھ لیتا ہے۔

ابھی فرقہائے اہل قرآن میں یہی بحث تھی کہ نماز پانچ وقت کی ہے یا تین وقت کی۔ مسلم اہل البیت کہتا ہے کہ نہ تین نہ پانچ بلکہ متوسطاً نہ چار وقت کی فرض ہے جس میں تہجد بھی داخل ہے۔ ان چاروں میں سے تہجد اور فجر کے لئے قبلہ مشرق ہے اور ظہر اور غسق اللیل کے لئے مغرب یعنی سمت قبلہ کے واسطے سورج کے رخ کا زیادہ لحاظ ہے۔

ہر نماز کے لئے رکعتوں کی تعداد دو ہی دو رکھی ہے۔ رکعت کا نام بھی بدلکر قصر اولی اور قصر آخر ے کر دیا ہے۔ اور آیت "سبعًا من المثانی" سے دونوں رکعتوں یعنی قصروں کے لئے سات سات ارکان نکالے ہیں۔ انکی ادائیگی کے جو طریقے لکھے ہیں وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ ہر ہر قصر میں دو دو قیام ہیں اور دو دو قعدے، جن کے نام الگ الگ ہیں۔

روزوں کی فرضیت بخلاف اپنے ہمنام عرف خالو دہلی کے مشہور اہل قران کے جو "ایامًا معدودات" سے صرف تین دن مانتے ہیں تیس دن کی رکھی ہے۔ مگر قمری مہینہ کے قائل نہیں۔ شمسی حساب سے ہر سال ۲۲ اکتوبر سے ۲۰ نومبر تک رمضان قرار دیتے ہیں۔

اس نماز اور روزے کے بیان میں جابجا جزئیات کی تفصیل کے لئے قرانی آیات سے جو دلیلیں پیش کی ہیں انکے متعلق وہی کہا جا سکتا ہے جو جنت کے وصف میں کہا گیا ہے "مالاعین رأت ۔ ولا اُذن سَمِعَتْ ولا خَطَر عَلٰی قلبِ بشر"

آخر میں مجھے نہایت افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ اہل قرآن نے جو اپنا کل دینی سرمایہ اور راس المال صرف قرآن ہی کو گردانتے ہیں آجتک اس کی کوئی صحیح خدمت نہیں کی۔ بلکہ بیشتر اس کی روشن آیات کو اپنی جدت طرازی اور تاریک نظری سے چیستان کی طرح حل کر کرکے دین الہی کو ملعبہ اور اپنے آپ کو مستوجب عقاب اور اضحوکۂ دہر ہی بناتے رہے۔ حافظ محب الحق عظیم آبادی نے شرعۃ الحق اور منہاج الحق لکھکر پھر بھی ایک کام کیا۔ لیکن اس جماعت نے اپنے علم۔ دین۔ دماغ اور عقل اور قرآن فہمی اور مسلمانوں کی دینی رہبری کے ادعا کا ابھی تک کوئی ثبوت نہیں دیا۔

مقابلۂ اسلام و یورپ۔ اسلام و یورپ کی تہذیب و تمدن کا تاریخی موازنہ۔ (مرتبہ ظفر تاباں ایچ پی) جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے مؤلف نے اس میں اسلام اور یورپ کی تہذیب و تمدن کا تاریخی موازنہ کرنے کی کوشش کی ہے آج کل یہ موضوع اس قدر مرغوب ہو گیا ہے کہ جس کا جی چاہتا ہے بلاپس و پیش اس پر خامہ فرسائی کرنے لگتا ہے۔ عباسیوں کے کچھ علمی کارنامے۔ اندلس کی تہذیب کے دو چار مرثیے۔ یورپ کے عہد ظلمہ کی جہالت کے دو ایک واقعات لکھ دئے گئے اور تاریخی موازنہ مکمل ہو گیا، اسلامی تہذیب کی برتری ثابت ہو گئی یورپ کی بہیمیت اور بربریت مسلم ہو گئی اور مؤلف نے اسلام اور علم کی وہ خدمت کر دی جس کا جواب ملنا مشکل ہے۔ کاش حضرات مؤلفین علمی مباحث پر اس قدر غیر ذمہ داری سے قلم نہ اٹھاتے۔ اس رسالے کے مؤلف سے معلوم ہوتا ہے کہ محنت بہت کی ہے لیکن ہم کسی طرح اس کوشش کو کامیاب نہیں کہہ سکتے۔ مباحث ایک دوسرے سے اس قدر دست و گریباں ہیں کہ انکو الگ کرنا ناممکن نہیں تو از حد دشوار ضرور ہے، انداز بیان تاریخی نہیں بلکہ بیشتر تبلیغی ہے۔ زبان میں بھی الجھاؤ بہت ہے۔ نادر ترکیبوں کے استعمال کا شوق بہت غالب نظر آتا ہے۔ زبان کی غلطیاں بھی شاذ نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر بعض فقرے درج کئے جاتے ہیں:-

صفحہ ۱ (پہلا جملہ) "مذہب اس تجلی روحانی کا نام ہے جو اپنی تنویر نوازیوں سے انسانی قلب کو شمع زار بنا دے"

صفحہ ۳ (سطر ۱) "اُن کا دار و مدار محض وہم پرستی پر موقوف تھا"

صفحہ ۱۱ (سطر ۶) اول اول قرآن ادب و انشا۔ حکمت و فلسفہ کا مزاحم تھا۔ آنحضرت نے اسے تمام تصانیف کا گل سرسبد ظاہر کر کے اس کی بے مثل فصاحت و بلاغت کو اپنی مامور من اللہی کے نبوت میں پیش کیا" کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

صفحہ ۲۰ (سطر ۹) "یورپ کی فضا پر جہالت کی تاریکیاں ظلمت بار تھیں اور شاید اس کا انتظا

تھا کہ افق مشرق سے ایک نور برساتا ہوا آفتاب طلوع ہو "

صفحہ ۳۹ (سطر ۹) "عیسائیت کو تعلیم مسیح نے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا "

صفحہ ۶۰ (سطر ۱۶) " اسپین میں مسلمانوں کے خانگی طریقے " غالبًا طرز بود و باش مراد ہے۔

صفحہ ۷۰ (سطر ۱۹) " معتصم ایک جانسوز جوش میں ڈوب گیا "

صفحہ ۷۲ (سطر ۷) ایک عالمگیر ہنگامہ زاری میں حق کی سچی صدا نے عرب کے کھنڈرات میں جب سامعہ نوازی کی تو کسی کو کیا خبر تھی کہ یہی دھیمی صدا دشکدہ عالم پر محیط ہوجائیگی "

یہ نمونہ مشتے از خروارے ہے ورنہ کتاب کے ہر صفحہ میں دو چار ایسے سامحات ضرور ہیں۔ کتاب کے مطالعے سے معلومات میں کچھ اضافہ ضرور ہوتا ہے لیکن ترتیب و استدلال کا جہانتک تعلق ہے وہ سرے سے ناپید ہے۔ بہت ممکن ہے کہ عام طور پر یہ کتاب مقبول ہو اس لئے کہ یورپ اور اس کے تمدن کو جا و بیجا خوب گالیاں دی گئی ہیں لیکن اسے کسی طرح موازنہ نہیں کہہ سکتے۔ اسلامی تہذیب و تمدن کی برتری معلوم یورپ کا اندلس سے کسب کمال مسلم لیکن اسے جس طرح بیان کیا گیا ہے وہ علمی شان کے منافی ہے۔

بہرحال مولف کی کوشش اور انکے جذبے کی داد ضرور دینی چاہئے۔ حجم اس رسالہ کا ۱۰۴ صفحہ ہے اور قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ غالبًا بزم اخلاق مچھلی والان دہلی ہے۔

شذرات

ہمارے رسالے کا یہ نمبر مقررہ وقت کے بہت بعد شائع ہو رہا ہے۔ اسکا بڑا سبب یہ ہے کہ ایک مدیر طویل رخصت پر گیا ہوا تھا۔ اب وہ واپس آگیا ہے۔ اس لئے انشاءاللہ دو تین مہینے میں رفتہ رفتہ اشاعت وقت پر آجائے گی۔

رسالے کی ادارت غور کر رہی ہے کہ اسے زیادہ مفید اور دلچسپ بنانے کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔ اس معاملے میں قارئین کرام کا مشورہ بہت ضروری ہے۔ مشورہ میں اسکا لحاظ رکھنا مناسب ہے کہ رسالے کا علمی معیار کسی طرح کم نہ ہونے پائے بلکہ جہانتک ممکن ہو اور بڑھے۔

اکادمی کیطرف سے جو کتابیں شائع ہو رہی ہیں اُنکے بارے میں بھی یہ کوشش ہے کہ اب کی سال گذشتہ سال سے بہتر کتابیں قارئین کرام کی خدمت میں بھیجی جا سکیں۔

علمی پودوں کا سرسبز ہونا یوں بھی مدتوں کا کام ہے اور ہمارے ملک میں تو اب تک آب و ہوا اس قدر ناموافق ہے کہ نمو کی رفتار اور بھی کم ہے۔ پھر بھی محنت اور استقلال شرط ہے۔ جو بیج بویا جا چکا ہے اور بونے والے جفاکشی اور عرقریزی سے کام لے کر اس کی آبیاری کرتے رہتے ہیں وہ کسی دن ضرور پَیل کر اور بڑھ کر مضبوط درخت بنے گا اور پھول پھل سے مالا مال ہو جائے گا۔

یہ سال جامعہ ملیہ کے کارکنوں کے لئے بڑی آزمائش اور ابتلاء کا سال تھا۔ اس کے آغاز میں انہیں پریشانی اور مایوسی نے ہر طرف سے گھیر لیا تھا۔ اگر اُنکے قدم ذرا بھی ڈگمگاتے تو جس بوجھ کو برسوں سے اٹھائے ہوئے تھے وہ سر سے گر جاتا اور پھر شاید اٹھائے نہ اٹھتا۔ مگر خدا نے انہیں اتنی توفیق دی کہ انکے پائے استقلال کو جنبش نہ ہوئی اور وہ ساری کڑیاں جھیل لے گئے۔ ملت اسلامی کے چند سچے حامیوں نے فیاضی سے کام لیکر اس کی فوری مشکلات کو دور کر دیا اور آئندہ کے لئے بھی بہت کچھ اطمینان دلا دیا۔ اب وثوق کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انشاءاللہ چند سال میں جامعہ اپنی مالی ضروریات کی طرف سے، جن کے لئے اسے فی الحال نسبتاً تھوڑی رقم درکار ہے، مطمئن ہو جائے گی اور زیادہ یکسوئی سے مسلمانوں کی علمی اور تعلیمی خدمت انجام دے سکے گی۔

آجکل مسلمانوں کا سیاسی انتشار انتہا کو پہنچا ہوا ہے اور اس کے اثر سے ساری قومی زندگی منتشر ہو گئی ہے۔ شاید ہی کوئی دو آدمی ایسے ہوں جو اصولاً متفق ہوں اور عملاً مل کر کام بھی کر سکتے ہوں۔ اُس پر طرہ یہ ہے کہ باہمی اختلاف اکثر مخالفت بلکہ عداوت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ذاتی مناقشات کے مقابلے میں ہمارے ذمہ دار افراد قومی مفاد کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔

آخر اس بدبختی کا سبب کیا ہے؟ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان خود پرستی میں مبتلا ہیں، اور اُنکے دل مذہب و ملت اور ملک و قوم کی محبت سے خالی ہیں لیکن غور کیجئے تو یہ خیال صحیح نہیں ٹھہرتا۔ واقعات ثابت کرتے ہیں کہ بہت سے مسلمانوں نے انہیں چند سال کے عرصہ میں مذہب کے نام پر جان و مال کی قربانی کی، ملک کی

آزادی کے لئے دولت اور ثروت سے منہ نہ موڑا اور قید فرنگ کی سختیاں جھیلیں۔ پھر ہم یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ انکے دل میں اسلام کا اور ہندوستان کا درد نہیں۔

بات یہ ہے کہ صرف جوش اور محبت کسی کام کو انجام تک پہنچانے کے لئے کافی نہیں۔ جوش ناپائدار چیز ہے اور محبت اندھی ہوتی ہے۔ جوش کی تکمیل کے لئے استقلال ضروری ہے اور محبت کی پختگی کے لئے علم و بصیرت ناگزیر ہے۔

ہمارے سامنے جو نصب العین ہے وہ بدقسمتی سے تاروں کی طرح روشن نہیں ہے بلکہ شہاب ثاقب کی طرح ایک چمک دکھا کر چھپ جاتا ہے۔ ہمیں ایسی شمع ہدایت چاہیئے جو ہر قدم پر ہمیں راستہ دکھائے اور ہمیشہ منزل کو ہمارے پیش نظر رکھے۔ یہ چیز سوائے علم، مطالعے، تجربے، غور و فکر کے اور کچھ نہیں۔ جب تک ہم اپنے ماضی کے محرم نہ ہوں گے اپنے عہد کے حالات سے آشنا نہ ہوں گے اور آنے والے زمانے کو دور سے دیکھنے کی قابلیت نہ رکھتے ہوں گے، ہمیشہ اسی طرح بھٹکتے رہیں گے۔

ہمارے دل میں جو درد ہے اس میں کبھی کبھی ٹیس اٹھتی ہے اور ہمیں تڑپا دیتی ہے مگر پھر بے حسی کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ذوق درد کے لئے بھی تربیت کی ضرورت ہے، جوش جنوں بھی پرداخت کا محتاج ہے، قومی خدمت کے لئے قومی جذبے کو اس طرح نشو و نما دینا ضروری ہے کہ وہ ہماری سیرت کا جزو ہو جائے۔ ہمارے رگ و پے میں سرایت کر جائے۔

مختصر یہ کہ ہمیں اعلیٰ اور بلند تعلیم، گہری اور راسخ تربیت کی ضرورت ہے۔ مگر

ان دونوں چیزوں کے علاوہ ایک تیسری چیز بھی ہے جس کی اہمیت ہیں نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔ مالی فراغت اور خوش حالی جس سے ہم من حیث القوم محروم ہیں، بام ترقی پر پہنچنے کے لئے پہلا زینہ ہے۔ مسلمانوں کی پچھلی نصف صدی کی ساری اصلاحی کوشش اسی لئے ناکام رہیں کہ انہوں نے اقتصادی مسئلے کا کوئی معقول حل تلاش نہیں کیا افلاس کے سبب سے جو مایوسی اور افسردگی پیدا ہوتی ہے وہ قوت عمل اور قوت فکر کو بیکار کر دیتی ہے بلکہ اخلاق کو بھی بگاڑ دیتی ہے۔

افلاس کا بڑا سبب یہ ہے کہ ہم کسب معاش کو کوئی ضروری فرض نہیں سمجھتے اور اس کے ذرائع تلاش کرنے میں کما حقہ کوشش نہیں کرتے۔ ہم میں صاحبان ثروت بھی ہیں مگر بہت تھوڑے۔ ہمارے اکثر افراد دوسروں کے دست نگر ہیں اور اسے قابل شرم نہیں سمجھتے۔ البتہ مزدوری، دستکاری کرنا انکے خیال میں بڑی ذلت کی بات ہے۔ ہماری ترقی بلکہ ہماری زندگی کے لئے یہ ناگزیر ہے کہ یہ خیال ہمارے دل سے نکلے ہم سرکاری نوکری، وکالت اور گداگری کے تنگ دائرے سے نکل کر کسب معاش کے کھلے میدان میں ہاتھ پیر ماریں اور مجموعی حیثیت سے اپنی مالی حالت کو درست کریں۔

صحیح تعلیم، صحیح تربیت اور کسب معاش کیلئے نئے راستے تلاش کرنا۔ یہی مقاصد جامعہ ملیہ کے پیش نظر ہیں۔ حیات قومی کی شیرازہ بندی اور استحکام کی یہی ایک صورت نظر آتی ہے کہ یہ درسگاہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو اور دوسرے مدارس کے لئے ایک نمونہ بنے۔ ہماری قوم کے اکثر سر برآوردہ افراد اس وقت سیاست حاضرہ کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں اور غالباً کبھی اس سے نکل نہ سکیں گے لیکن

The Cultural Side of Islam

Madras lectures on Islam

(NO. 2)

BY

Muhammad Marmaduke Pickthall

Delivered at Madras in January 1927

(CONTENTS)

Price 1/8/-
Bound 2/-

TO BE HAD OF:—

National Muslim University Book Depot

KAROL BAGH,

DEHLI.

رجسٹرڈ
جامعہ
جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ
جلد ۱۲
بابت ماہ اپریل سنہ ۱۹۲۹ ع
نمبر ۴
"مجلہ مکتبہ"
مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
1927

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

زیرِ ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری　　ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی

نمبر ۴	ماہ اپریل سنہ ۱۹۲۹ء	جلد ۱۲

فہرست مضامین

سیرتِ نبوی اور مستشرقین

مقدمہ

الحمد للہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ کتاب جسکا یہ مقدمہ ہے مشہور مستشرق ولہاوزن کے اس مضمون کا ترجمہ ہے جو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کی طبع نہم میں محمڈنزم کے عنوان سے چھپا ہے۔ اس مضمون میں سے بھی صرف اس حصہ کا ترجمہ کیا گیا ہے جو رسول اللہ صلعم سے متعلق ہے۔ مستشرقین نے اسلام اور ہادی اسلام سے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے اردو داں طبقہ اور خصوصًا علمائے کرام بہت کم واقف ہیں۔ یہ زہر انگریزی کے ذریعہ سے جدید تعلیمیافتہ جماعت میں پھیلتا جاتا ہے اور جن لوگوں پر دینی ہدایت کی ذمہ داری ہے ان کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مستشرقین کے صحیح خیالات سے اور انکی حقیقت سے لوگ واقف ہوجائیں تاکہ ایک طرف تو علماء کو مسئلے کی اہمیت کا احساس ہو اور دوسری طرف جو لوگ اس قسم کے مضامین پڑھتے ہیں انہیں حقیقت حال کا علم ہوجائے۔ بعض حضرات کا ممکن ہے یہ خیال ہو کہ مستشرقین کے اعتراضات ابتک اردو داں طبقہ تک نہیں پہنچے ہیں اور ان اعتراضات کا اردو زبان میں ترجمہ کرنا قرین مصلحت نہیں۔ اسمیں تو شک نہیں کہ ابتک اس قسم کے خیالات کا مرکز صرف انگریزی داں طبقہ رہا ہے لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ جدید ماحول کے اثر سے یہ زہر تجاوز کرکے نیم انگریزی داں طبقہ تک پہنچ گیا ہے اور یہاں پہنچکر اس کی نزاکت اور بڑھ جاتی ہے۔ اول تو یہ کہ وہ اعتراضات کی حقیقت سے واقف

نہیں ہوتے بلکہ سنی سنائی باتوں سے انکی طبعیت میں ایک ہیجان پیدا ہو جاتا ہے اور دوسرے اگر شاذ و نادر کبھی انگریزی میں ان اعتراضات کے رد کرنیکی کوشش بھی کیجاتی ہے تو یہ لوگ اس سے بھی ناواقف رہتے ہیں۔ لہٰذا ان لوگوں کے لئے اور خصوصاً علمائے کرام کے لئے جن میں سے بیشتر السنہ مغربیہ سے نابلد ہیں اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ اُردو زبان میں پہلے ان اعتراضات کو صحیح طور پر بلا کسی مبالغے کے پیش کیا جائے اور پھر انکی حقیقت بے نقاب کیجائے اس طرح ممکن ہے ہمارے علماء محسوس کریں کہ وقت کی ضرورت اب کیا ہے۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ طہارت کے طویل الذیل مسائل اور آمین و رفع یدین پر مناظرہ، دینی خدمت تسلیم کیا جائے بلکہ آجکل تو اصول اسلام اور خود شارع اسلام پر ہر طرف سے اعتراضات کی بارش ہو رہی ہے اور اہل نظر کا فرض اور شدید ہو جاتا ہے کہ وہ اسلام کو دنیا کے سامنے پھر اسی رنگ میں پیش کریں جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا تھا۔ یہ ترجمہ اسی ضرورت کو پیش نظر رکھ کر کیا گیا ہے اور حواشی میں اعتراضات کا جواب دینے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ مترجم کو اپنی خامیوں کا کامل احساس ہے اور یہ واقعہ ہے کہ جواب کا پورا حق ادا نہ ہو سکا لیکن اسکا یہ مقصد بھی نہ تھا کہ ہر مسئلے پر آخری فیصلہ صادر کر دے۔ اس تالیف کی غرض تو یہ تھی کہ اعتراضات بہ تمام و کمال سامنے آجائیں اور جو لوگ جواب دینے کے اہل ہیں لیکن خواب غفلت میں یا کسی غیر ضروری کام میں پڑے ہوئے ہیں ذرا چونکیں۔ اگر یہ تالیف علماء کرام کے جمود کو توڑ سکے اور جدید تعلیم یافتہ حضرات کو جن کے قلوب تشکیک کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں غور و فکر کے لئے کچھ مسالہ فراہم کر سکے تو اسکا مقصد حاصل ہو گیا۔ واٹ وزن کے اس مضمون کا انتخاب اس لئے کیا گیا کہ اس نے اس میں نہایت اختصار کے ساتھ ان تمام اعتراضات کو جمع کر دیا ہے جو مستشرقین عام طور پر سیرت نبوی پر وارد کرتے ہیں اور اس کے مطالعہ کے بعد شاید ہی کوئی اعتراض چھوٹ جائے۔ ایسا مضمون کوئی اور نظر سے نہیں گذرا جس میں مستشرقین کے تمام نظریات بیک وقت موجود ہوں۔ انکے خیالات کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے یہ مضمون بہت موزوں ہے۔ اس کے علاوہ واٹ وزن کا شمار مستشرقین کے طبقہ اولی میں ہوتا ہے

اور اس نے جو کچھ لکھا ہے اسے یورپ کے اہل علم بہت مستند اور قابل وثوق سمجھتے ہیں اس لئے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے لئے خاص طور پر اس سے یہ مضمون لکھوایا گیا تھا اور غالباً جرمن سے ترجمہ کرا کے اس میں شائع کیا گیا۔

مستشرقین کے اعتراضات سے بحث کرنے سے پہلے اگر ہم ایک سرسری نظر ان خیالات پر ڈالیں جو اہل یورپ کے رسول اللہ صلعم سے متعلق ابتدائے اسلام سے لیکر عہد حاضر تک رہے ہیں تو ہمیں اسکا اندازہ ہوگا کہ آہستہ آہستہ انکے خیالات میں تبدیلی ہو رہی ہے اور وہ لوگ رسول اللہ صلعم کی ذات اور اصول اسلام کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگے ہیں۔ باسورتھ اسمتھ نے اپنی کتاب "محمڈ اینڈ محمڈنزم" میں جو پہلی دفعہ ۱۸۷۴ء میں شائع ہوئی تھی ایک خاکہ اس وقت تک کی خیالات کا کھینچا ہے۔ اسکا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔ لفظی ترجمہ طوالت کے خیال سے نہیں کیا گیا۔ اس کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ "اسلام کی ابتدائی چند صدیوں میں دنیائے عیسائیت کو اتنی مہلت نہ ملی کہ وہ تنقید یا توضیح کر سکتی اس کا کام تو صرف لرزنا اور اطاعت کرنا تھا لیکن جب وسط فرانس میں پہلی دفعہ مسلمانوں کا قدم رکا تو ان قوموں نے جو بھاگ رہی تھیں مڑ کر دیکھا۔ اب بھی اگرچہ انکی ہمت جنگ کرنیکی نہ تھی لیکن وہ پیچھے ہٹنے والے دشمن کو گالیاں تو دے سکتی تھیں۔ ٹرپن کے رومان میں محمد (صلعم) کو جو بت پرستی کے شدید ترین مخالف تھے، خود ایک سونے کا بت کہا گیا ہے جس کی پرستش کاڈز میں ہوتی تھی اور جس کا نام ماہامٹ تھا۔ رولان کے گیت میں جو فرانس کا قومی رزمیہ گیت ہے دکھایا گیا ہے کہ قرطبہ کا خلیفہ مارشل اسی بت کی پرستش کرتا ہے اور اس کی مرغوب قسم یہ ہے "عطارد کی قسم، محمد (صلعم) کی قسم اور اپولو کی قسم"[۱]۔ عجیب قلب ماہیت اور عجیب افترا! اس بت کے سامنے انسانی قربانیاں کیجاتی ہیں اگر اور کہیں نہیں تو کم از کم دسویں

---

[۱] رولان کے گیت کے متعلق تفصیلی معلومات کے لئے ملاحظہ ہو رسالہ جامعہ جلد نمبر ۹ جس میں یوسف حسین خانصاحب کا ایک سلسلہ مضامین "عرب فرانسیسی ادبیات میں" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔

اور گیارہویں صدی کے مصنفین کے تخیل ہی میں سہی اور اسکا نام کبھی بافوم ہوتا ہے اور کبھی مانومٹ۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ انگریزی اور فرانسیسی دونوں زبانیں اتبک عام غلط فہمی کی حامل ہیں۔ فرانسیسی میں لفظ Mahometie اور انگریزی میں Mummery اتبک لغو اور مہمل رسوم کے لئے استعمال ہوتا ہے بارہویں صدی میں بجائے معبود کے محمد (صلعم) کو ایک مرتد اور بے دین کہا جاتا ہے اور اسی وجہ سے دانتے نے انہیں جہنم کے نویں حلقے میں ان لوگوں کے ساتھ رکھا ہے جو مذہبی تفرقے کے بانی ہیں۔ بانیاں اصلاح (Reformation) نے بھی محمد (صلعم) کی طرف جو سب سے بڑے مصلح تھے کوئی توجہ نہ کی اور انکی نفرت بھی انکے علم کی مقدار کے ساتھ ساتھ قائم رہی مصلحین غالباً یہ نہ سمجھے تھے کہ پاپائی جماعت دونوں کو عیسائیت کا دشمن ٹھہرائے گی اس لئے کہ پادریت اور رسوم پرستی کی مخالفت میں اسلام اور پروٹسٹنٹزم دونوں مشترک ہیں۔ اسی زمانے میں یہ حکایت بھی ایجاد ہوئی کہ ایک کبوتر کو محمد (صلعم) نے سکھایا تھا کہ انکے کان میں سے دانے چنے اس سے موجدین کے خبث سے زیادہ ان کی حماقت کا ثبوت ملتا ہے مگر یہ روایت بھی عام طور پر صحیح تسلیم کیجاتی تھی۔ اس وقت بھی حالت کچھ بہتر نہیں ہوئی جب یہ محسوس کیا گیا کہ رائے قائم کرنے سے قبل جہانتک ممکن ہو سرچشمے کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ چنانچہ فرانسیسی زبان میں قرآن کا پہلا ترجمہ ۱۶۴۹ء میں اور دوسرا ۱۶۹۵ء میں ہوا اسی کے بعد ایک شخص الکزنڈر راس نے فرانسیسی سے انگریزی میں اسکا ترجمہ کیا۔ ان ترجموں کے ساتھ جو مقدمے درج تھے ان میں طرح طرح کی غلط بیانیوں سے کام لیا گیا تھا اس لئے اس کا بھی کوئی اچھا اثر نہ پڑا پھر بھی باوجود ان غلط فہمیوں کے جو اتبک عوام میں رائج ہیں انگلستان اور فرانس ہی کے سر عربی ادب اور عربی تاریخ کو تاریخی نقطہ نظر سے مطالعہ کرنیکی ابتدا کا سہرا ہے اور اسی ابتدا کی وجہ سے گبن اور میور، کاسین دی پرسیوال اور سینٹ ہلیر، واٗل اور اشپرنگر کے ہاتھوں اب ایسا مسالہ فراہم ہوگیا ہے کہ ہر شخص معقول اور غیر جانبدارانہ رائے قائم کرسکتا ہے۔ اس تحریک کا بانی گیگنیر ہے جو پیدائش کے لحاظ سے تو فرانسیسی تھا لیکن انگلستان کو اس نے اپنا وطن بنالیا تھا۔ آکسفورڈ میں عربی کا پروفسر مقرر ہونے کے بعد اس نے محمد (صلعم) کی تاریخ لکھنی شروع کی جس کی

بنیاد ابو الفدا کی تصنیف پر تھی۔ اسکے بعد ہی سیل اور سیواری نے دو مختلف یورپی زبانوں میں قرآن کا ترجمہ کیا۔ انہی تصانیف سے اور خصوصاً سیل کے "تمہیدی مباحث" سے گبن کو جو خود عربی نہ جانتا تھا وہ مسالہ ملا جس سے اس نے وہ باب محمد کی زندگی پر باندھا جس کا جواب سیرت نگاری میں نہیں ملتا۔ لیکن انگریزوں کے خیالات میں جو کچھ بھی تبدیلی ہوئی وہ گبن کی وجہ سے نہیں بلکہ کارلائل کی وجہ سے۔ ہم میں سے کتنے اس تعجب انگیز اور علمی و مذہبی زندگی کے اس یادگار واقعے کو بھول سکتے ہیں کہ کارلائل نے "ہیرو بصورت رسول" کے لئے نہ موسٰے کا انتخاب کیا نہ ایلیا کیا اور نہ عیسیٰ کا بلکہ محمد (صلعم) کو لیا جنہیں عام طور پر لوگ فریبی سمجھتے تھے۔"

یہ تھا باسورتھ اسمتھ کی تحریر کا خلاصہ جس سے اس زمانے تک کے خیالات کا ایک دھندلا سا خاکہ دماغ میں قائم ہوسکتا ہے اس میں بہت سے خیالات ایسے ہیں جنہیں نقل کرتے وقت ایک مسلمان کا قلم کانپ اٹھتا ہے مگر تسکین اس حقیقت سے ہوتی ہے کہ "نقل کفر کفر نہ باشد" اس کے بعد مستشرقین کا دور شروع ہوتا ہے جن کا ایک نمائندہ ہمارا مضمون نگار رولینا وزن ہے اور جس کے خیالات اگلے صفحات میں مرقوم ہیں۔ مستشرقین نے بھی باوجود کوشش کے رسول صلعم کی شخصیت اور انکی تعلیمات کو کما حقہ نہیں سمجھا، یا اگر سمجھا تو اسے تحریر میں لانے سے گریز کرتے ہیں۔ اس مقدمہ میں بعض ان اصولی مسائل سے بحث کی گئی ہے جن کے سمجھنے کے بعد اعتراضات کی حقیقت کھل جائیگی اور جنہیں یا تو مستشرقین سمجھے نہیں ہیں یا دیدہ دانستہ ان سے چشم پوشی کرتے ہیں۔

سب سے پہلا مسئلہ وحی کا ہے۔ مستشرقین اسے تسلیم نہیں کرتے کہ رسول اللہ صلعم حامل وحی خداوندی تھے اور خود رسول اللہ صلعم نے صاحب وحی ہونیکا جو دعوے کیا ہے اس کی طرح طرح سے تاویل کرتے ہیں بعض کا خیال ہے کہ یہ سراسر فریب ہے اور انہیں خود بھی یہ یقین نہ تھا کہ انپر نزول وحی ہوتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ انہیں صرع کی قسم کا ایک دماغی دورہ ہوتا تھا اور اس دورے کی حالت میں جو خیالات انکے ذہن میں آتے تھے انہی کو وہ منزل من اللہ سمجھ لیتے تھے۔ پھر ان میں بھی دو طبقے ہیں ایک کا خیال ہے کہ وہ آخری وقت تک اسی خود فریبی میں مبتلا رہے

اور دوسرا کہتا ہے کہ مکی زندگی میں تو واقعی انہیں اپنی نبوت کا خود یقین تھا لیکن مدینہ پہنچکر وہ صرف اپنی کامیابی کے لئے ایسا ظاہر کرتے تھے دراصل اب یقین انہیں بھی نہ تھا کہ وہ نبی ہیں۔ لیکن یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ آخر تمام علم انہیں کہاں سے حاصل ہوا اس لئے کہ وہ تو اُمی تھے۔ اس کے جواب میں طرح طرح کی خیال آرائیاں کی گئی ہیں جن میں سے اکثر حد درجہ مضحکہ خیز ہیں۔ اسی سوال کے جواب کے لئے بحیرا راہب کے قصے کو اسقدر شہرت دی گئی اور ذرا سی بات کو ایک افسانہ بناکر پیش کیا گیا۔ اسکے علاوہ جیسا خود ولہاوزن نے لکھا ہے یہ بھی کہا گیا کہ یہودیوں سے شروع شروع میں رسول اللہ صلعم کے تعلقات اچھے تھے اور انہیں یہ سب علم انہی سے حاصل ہوا۔ یہی نہیں بلکہ ماخذ اسلام کے نام سے من چلوں نے ضخیم رسالے لکھ ڈالے اور کس لئے محض اس نظریہ کے ثبوت کے لئے کہ رسول اللہ صاحب وحی نہیں تھے حالانکہ کوئی قطعی ثبوت اب تک یہ لوگ پیش نہ کرسکے۔ محض یہ ثابت کردینے سے کہ اسلام کا فلاں رکن فلاں مذہب سے ماخوذ ہے یا اس کے مطابق ہے وحی کا انکار لازم نہیں آتا اس لئے کہ اسلام نے کبھی جدت کا دعوی نہیں کیا۔ قرآن تو پکار پکار کر کہتا ہے کہ اسلام تمام انبیاء کا مذہب ہے۔ یہ وہی اصل الاصول ہے جسے تمام مذاہب نے اپنا سنگ بنیاد قرار دیا ہے البتہ زمانے کے لحاظ سے ہر مذہب کچھ اپنی خصوصیات رکھتا ہے اور اسی وجہ سے فروعات میں تمام مذاہب مختلف ہیں۔ ثابت تو یہ کرنا چاہئے کہ رسول اللہ صلعم نے جس دین کی تبلیغ کی اسے انہوں نے کسی انسانی ذریعے سے حاصل کیا تھا اور اسی کو مستشرقین باوجود کوشش کے ثابت نہ کرسکے۔ انہوں نے دور از کار قیاسات اور غلط استنباطات کو تحقیق علمی کی صورت میں پیش کیا حالانکہ اہل نظر پر انکی مضحکہ انگیزی بالکل عیاں ہے۔

رسول اللہ صلعم کے صاحب وحی ہونے سے جو لوگ انکار کرتے ہیں انکی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو عیسائی مشنری یا دوسرے مذاہب کے مبلغین ہیں جو اپنے نبی یا پیغمبر کو تو صاحب وحی سمجھتے ہیں مگر رسول اللہ صلعم ہی متعلق اسی چیز کا انکار کرتے ہیں۔ انکے لئے تو تمام دلائل بیکار ہیں اس لئے کہ ان کی رائے کا انحصار دلائل پر نہیں بلکہ جذبات پر ہے۔ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ دوسرا

طبقہ وہ ہے جو وحی کے امکان ہی کو تسلیم نہیں کرتا۔ اسکے لئے تمام انبیاء اور تمام مذاہب یکساں ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ عقلاً ایسا ہونا ناممکن ہی نہیں۔ دلائل کی ضرورت اس طبقہ کے لئے ہے۔ سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ وحی کا مسئلہ مابعد الطبیعات کے تمام مسائل کی طرح ظنی ہے۔ اس کے ثبوت میں کوئی ایسی قطعی دلیل نہیں پیش کیجا سکتی جیسی طبعی علوم سے متعلق کہ مخالف کو انکار کی گنجائش نہ رہے اور واقعہ تو یہ ہے کہ طبعی علوم میں بھی چند ہی ایسے مسئلے ہونگے جسے بلا استثنا تمام علما تسلیم کرتے ہوں اس لئے یہ تو ممکن ہی نہیں کہ نزول وحی کو اس طرح ثابت کر دیا جائے جس طرح ریاضی کا یہ مسئلہ کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ منکرین وحی کے پاس انکار کی کوئی وجہ بجز اس کے نہیں کہ سائنس یا عقل کی رو سے ایسا ہونا ممکن نہیں۔ اگر ذرا سا بھی غور کیا جائے تو اس استدلال کی کمزوری نمایاں ہوجاتی ہے۔ علوم وفنون میں آئے دن جو ترقی اور نظریات میں جو تغیر و تبدل ہو رہا ہے اس سے یہ حقیقت ناقابل انکار ہوتی جاتی ہے کہ عقل انسانی نہایت درجہ ناقص ہے اور انسانی معلومات یکسر محدود ہیں۔ ہر روز ایک نہ ایک چیز ایسی دریافت ہوتی رہتی ہے جس سے نظریات کی پرانی دیوار مسمار ہوجاتی ہے اور نئی دیوار تعمیر کرنی پڑتی ہے۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے بعد کوئی ذی فہم انسان کسی نظریے کی بابت یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ قطعی ہے اور نہ یہ کہ ایسا ہونا بالکل ناممکن ہے۔ جب طبعی علوم کا کوئی ایسا میدان نہیں جس کی انتہا تک انسان کا قدم پہنچ چکا ہو تو مابعد الطبیعات میں اس کا قطعی حکم لگانا کہاں تک مناسب ہے آج سے پچاس برس پہلے کون یہ تسلیم کرنے کو تیار ہوتا کہ نباتات میں بھی احساس رنج وغم موجود ہے اور وہ بھی حیوانات کی طرح متاثر ہوتے ہیں لیکن سر جے۔ سی بوس کی تحقیقات سے آج یہ تقریباً یقینی ہوگیا ہے پھر ہمارے لئے کیا ایسی مجبوری ہے کہ ہم حواس انسانی کو محض پانچ تک محدود سمجھ لیں اور قطعی حکم لگادیں کہ اس کے علاوہ کوئی حاسہ کسی انسان میں موجود ہو ہی نہیں سکتا۔ جو لوگ نزول وحی پر ایمان رکھتے ہیں وہ یہی تو کہتے ہیں کہ انبیاء علیہ السلام میں عام انسانوں کے خلاف یا ان سے بڑھ کر ایک طاقت یا حاسہ موجود ہوتا تھا جس کی مدد سے وہ ایسی چیزیں دیکھتے تھے جو عام انسان نہیں دیکھتے یا ایسی باتیں سنتے تھے جو عوام الناس نہیں سنتے

انسانی حواس اور قویٰ میں اس قدر فرق اور تدریج نظر آتی ہے کہ اس کا تو منطقی نتیجہ ہی یہی ہے کہ انسانوں کی ایک جماعت ایسی بھی ہو جس کے حواس اعلیٰ ترین درجے پر پہنچ گئے ہوں یا جس میں فطری طور پر کوئی ایسا حاسہ موجود ہو جو عوام الناس میں موجود نہیں ہوتا اور خصوصاً ایسی حالت میں جب ہم روز دیکھتے ہیں کہ انسانوں کی ایک جماعت ایسی بھی ہے جس میں حواس خمسہ میں سے کوئی حاسہ بہت کم یا یکسر ناپید ہے۔ ہمیں اس وقت تو تعجب نہیں ہوتا جب ہم ایک ایسے شخص کو دیکھتے ہیں جو عام انسانوں کی طرح دیکھ نہیں سکتا یا سن نہیں سکتا لیکن اس وقت تعجب ہوتا ہے اور ہم اسے ناممکن بھی کہنے لگتے ہیں جب ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی انسان نے وہ دیکھا جو ہمیں نظر نہیں آتا یا وہ سنا جو ہمیں سنائی نہیں دیتا۔ تعجب یا شک تو ہو سکتا ہے اس لئے کہ پہلی صورت عامۃ الورود ہے اور دوسری صورت بالکل نادر لیکن اس کے کیا معنی ہیں کہ ہم اسے ناممکن قرار دیں اور قابل التفات ہی نہ سمجھیں مناسب طریقہ تو یہ ہے جہاں تک ممکن ہو صحیح معلومات حاصل کرنے کے بعد نئی صورت حالات پر غور کریں اور ضرورت ہو تو اپنے پرانے نظریہ میں تبدیلی کریں۔ رسول اللہ صلعم کی ابتدائی زندگی کے حالات، انکی صداقت و راست بازی، پھر وہ کیفیات جو پہلے پہلے نزول وحی کے سلسلے میں ان پر طاری ہوئیں اور حدیث کی مستند کتابوں میں تفصیل کے ساتھ موجود ہیں اور آخر میں وہ نتائج جو نزول وحی سے مترتب ہوئے ان سب کا مطالعہ کرنے کے بعد بجز اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ وحی کے امکان کو تسلیم کیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی مان لیا جائے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی خداوندی کا نزول ہوتا تھا۔ اس مختصر سے رسالے میں اتنی گنجایش نہیں ہے کہ وحی کے تمام دلائل پیش کئے جائیں اور اس کی تمام صورتوں سے بحث کیجائے اس لئے صرف اشارے سے کام لیا گیا ہے۔ اس موضوع پر عربی کی بہت سی تصانیف میں مفصل بحث موجود ہے۔ انگریزی میں بھی کافی کتابیں ملتی ہیں اور اردو میں بھی باوجود قلت کے اتنا مسالہ مل سکتا ہے کہ طلب صادق رکھنے والے کو تسکین قلب کا سامان فراہم ہو سکے۔[۵۱]

۵۱۔ (نوٹ کے لئے ملاحظہ ہو صفحہ ۱۱ اصل کتاب کا

دوسرا اہم اعتراض یہ ہے کہ ہجرت مدینہ کے بعد اسلام کی معنویت فنا ہوگئی اور اس میں سیاسی رنگ زیادہ غالب نظر آنے لگا اور شروع شروع میں لوگوں پر جو اثر پڑا تھا اس سے فائدہ اٹھاکر سلطنت کی بنیاد رکھی گئی اور اس کے بعد رسول اللہ صلعم نے جو کارروائیاں کی وہ دراصل سیاسی اقتدار کو مستحکم کرنیکی غرض سے تھیں۔ دلہا وزن نے رسول اللہ صلعم کی مدنی زندگی کے تمام اہم واقعات کو اسی رنگ میں پیش کیا ہے اور ہر جگہ یہی ثابت کرنیکی کوشش کی ہے کہ ہجرت کے بعد رسول نے مذہبی اثر سے فائدہ اٹھاکر سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کی اور اسی وجہ سے انہیں تلوار اٹھانی پڑی اور خفیہ قتل کا موجب ہونا پڑا۔

غائر نظر سے دیکھنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ علاوہ تعصب کے جس کی ہر جگہ کارفرمائی نظر آتی ہے اس قسم کے اعتراض کی ایک اور وجہ بھی ہے اور وہ مذہب کا وہ ناقص تخیل ہے جو معترضین کے ذہن میں جاگزیں ہے۔ عیسائی معترضین اسلام کو بھی عیسائیت کی کسوٹی پر پرکھنا چاہتے ہیں۔ انکی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ دین کو سیاسی یا معاشی مسائل سے کیا سروکار ہے۔ انکا خیال ہے کہ اس میں صرف عبادات اور عقائد سے بحث ہونی چاہئے اور دوسرے شعبہ ہائے زندگی سے اسے بے تعلق رہنا چاہئے۔ خیر اگر عیسائی یہ اعتراض کریں تو سمجھ میں آنیکی بات ہے اس لئے کہ انکا مذہب دنیا سے قطع تعلق اور سیاست اور حکومت سے بے پروائی کی تعلیم دیتا ہے لیکن ہمارا مضمون نگار جو خود یہودی ہے کس طرح یہ اعتراض کرسکتا ہے۔ یہود کے مذہب میں تو سراسر حکومت اور ریاست سے متعلق احکام ہیں اور حضرت موسیٰ کا تو مقصد ہی۔ جہانتک انکی تعلیمات اور ابتدائی حالات سے معلوم ہوتا ہے بنی اسرائیل کو فراعنہ مصر کی سیاسی غلامی سے آزاد کرانا تھا۔ اسمیں شک نہیں کہ

وحی کی تفصیلی بحث کے لئے ملاحظہ ہو:۔

۱۔ کتاب دین و دانش ۔ مولوی محمود علی

۲۔ الکلام ۔ مولنا شبلی نعمانی

۳۔ سیرۃ النبی جلد سوم ۔ مولنا سید سلیمان ندوی

۴۔ اسرار شریعت جلد سوم ۔ مولوی محمد فضل خاں

ان کی تعلیمات میں بھی عبادات اور عقائد کا کافی ذکر ہے لیکن یہودیت کا اصل الاصول تو قواعدو احکام دنیوی ہی ہیں۔

اسلام کے علاوہ تاریخ سے جتنے مذاہب کا پتہ چلتا ہے انکی دو قسمیں ہوسکتی ہیں ایک کو ہم قومی کہہ سکتے ہیں اور دوسری کو تزدانی۔ قومی مذاہب سے مراد وہ مذاہب ہیں جن میں زیادہ تر سیاسی معاشی اور معاشرتی زندگی سے متعلق احکام ہیں یوں تو کوئی مذہب بھی ایسا نہ ہوگا جس میں عقائد اور عبادات کا ذکر نہ ہو لیکن مذاہب کی تقسیم یہاں انکے غالب رنگ کے لحاظ سے کی گئی ہے۔ اس تقسیم میں عہد عتیق کے تمام مذاہب۔ یہودیت اور زرتشتی مذہب داخل ہوسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی چھوٹے چھوٹے مذاہب ہیں جو عام طور پر مشہور نہیں ہیں۔ دوسری قسم یعنی تزدانی مذاہب سے وہ مذاہب مراد ہیں جن میں سراسر ترک دنیا اور تعبد وتقشف کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس میں دنیا کے تین بڑے مذاہب یعنی ہندومت، بدھ مت اور عیسائیت داخل ہیں۔ جن لوگوں نے ان مذاہب کی تعلیم کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے وہ اس کی شہادت دے سکتے ہیں کہ انکا غالب عنصر ترک لذات، قطع تعلقات دنیوی، فلسفیانہ غور وفکر اور عبادت ورہبانیت میں انہماک ہے۔ یہ تمام مذاہب اپنی قدر وقیمت رکھتے ہیں اور اپنے مخصوص عہد اور مخصوص حالات کے لئے بہترین مذاہب تھے لیکن نظر غائر سے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ ان میں سے ایک بھی کامل مذہب نہیں ہے انسانیت کے ابتدائی دور میں اس میں شخصیت پیدا کرنے کے لئے اور بنی نوع انسان کے باہمی تعلقات کو واضح کرنے کے لئے ایسے مذاہب کی ضرورت تھی جن میں زیادہ زور انہی عناصر پر دیا گیا ہو۔ لیکن انسان تو عجیب قسم کی مخلوق ہے وہ جس طرف جھکتا ہے اودھر اتنا منہمک ہوجاتا ہے کہ دوسرے رخ کو بالکل بھول ہی جاتا ہے چنانچہ ان تعلقات کی دیکھ بھال میں اس میں اتنی خودغرضی پیدا ہوگئی اور دنیاوی معاملات سے اس قدر شغف اسے ہوگیا کہ اس کی تخلیق کا مقصد ہی فوت ہونے لگا۔ اب ایسے مذاہب کی ضرورت پیش آئی جن میں زیادہ زور ان تعلقات کے قطع کرنے اپنی ہستی کو گم کرنے اور روحانی ترقی حاصل کرنے پر دیا گیا ہو۔ اس

سے رد عمل ہوا۔ اور انسان نے روحانیت کیطرف توجہ کی لیکن ایک عرصہ گذرنے کے بعد اس میں بھی وہی یک طرفہ شدت پیدا ہوگئی اور جائز دنیاوی تعلقات سے بے نیازی کے باعث پھر شیرازہ عالم درہم وبرہم ہونے لگا۔ اب زندگی کے دونوں پہلو انسان کے سامنے تھے لیکن علحدہ علیحدہ ایک طرف کچھ لوگ تھے جو سراسر دنیا میں محو تھے اور روحانیت سے بے نیاز۔ دوسری طرف ایک طبقہ تھا جو دنیا کی طرف رخ کرنا بھی حرام سمجھتا تھا اور یکسر تقشف و رہبانیت کی زندگی کو مقصد حیات سمجھتا تھا۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو انسان کی تخلیق نہ اس کے لئے ہوئی تھی اور نہ اُس کے لئے۔ اس وقت ایک ایسی طاقت کی ضرورت ہوئی جو دونوں عناصر میں ہم آہنگی پیدا کر سکے اور انسان کے لئے ایسا لائحہ عمل پیش کر سکے جس کی پابندی سے اسکی تخلیق کا مقصد حاصل ہو۔ اسلام اسی طاقت کا نام ہے۔ اور اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَام سے یہی مراد ہے۔ تمام دوسرے مذاہب نے اسی دین کے لئے زمین تیار کی تھی اور یہی اصل الاصول تھا جس کے لئے انسانی دماغ کی پرداخت کیجارہی تھی۔ اسلام نے اس حقیقت کو پیش نظر رکھا کہ نہ صرف دنیا سے کام چل سکتا ہے اور نہ صرف دین سے بلکہ دین و دنیا باہم آمیز کہ اکسیر شود۔ اور جبتک مسلمان اس اصل الاصول کو نہیں بھولے وہ خود بھی کامیاب رہے اور تمام دنیا کو ان سے فائدہ بھی پہنچا۔ اور جیسے ہی انہوں نے اس مرکزی حقیقت کو فراموش کیا انکی ترقی تنزل سے بدل گئی۔ اور اب انکا وجود صفحہ عالم پر حرف غلط کی طرح رہ گیا ہے۔ اگر معترضین ذرا ٹھنڈے دل سے غور کریں اور تعصب کی عینک اتار ڈالیں تو انپر یہ امر اچھی طرح واضح ہو سکتا ہے کہ اسلام نے قدم قدم پر اس ہم آہنگی کے قائم رکھنے کی تائید کی ہے۔ اگر ایک طرف اس نے جائز دنیوی تعلقات کے قائم رکھنے کی تعلیم دی ہے اور ایسے اصول بتائے ہیں جن کی پیروی سے انسان کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی کی تمام پیچیدگیاں رفع ہو جاتی ہیں تو دوسری طرف اتنے ہی زور سے روحانی زندگی کو قائم رکھنے کی بھی ہدایت کی ہے اور ایسے سامان فراہم کئے ہیں جن سے انسان کی روحانی احتیاج پوری ہو اور اسے ابدی مسرت اور دائمی خوشی حاصل ہو۔ قرآن کا ہر صفحہ اس دعوے کی دلیل ہے اور رسول کی زندگی کا ہر واقعہ اس حقیقت کا شاہد

دلائل و شواہد کی یہ کثرت ہے کہ انکار کی گنجایش باقی ہی نہیں رہتی۔

حیرت کا مقام ہے کہ معترضین کو رسول اللہ صلعم کی مکی اور مدنی زندگی میں کوئی ربط نہیں نظر آتا اور وہ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ مدینہ میں آکر ان کی زندگی میں کوئی تغیر رونما ہو گیا تھا۔ مکے کا کام دراصل بنیاد کا حکم رکھتا تھا جس پر مدنی زندگی کی عمارت تعمیر کی گئی تھی۔ سب سے پہلے اس بات کی ضرورت تھی کہ ایک ایسی قوم کو جو ضلالت و گمراہی کے عمیق ترین غار میں گری ہوئی ہو صحیح راستے پر لگا دیا جائے اس میں دینی احساس پیدا کیا جائے۔ اسے سمجھایا جائے کہ ایک اس سے بالا ہستی بھی ہے جس کے سامنے اسے جواب دینا پڑے گا۔ جب یہ حقیقت ایک گروہ کے ذہن نشین ہو گئی تو انہیں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق تمام مسائل کی تعلیم دی گئی اور یہ بتایا گیا کہ انسان کو دنیا میں کس طرح بسر کرنا چاہئے۔ اگر رسول اللہ صرف عقائد و عبادات کی تعلیم دینے پر اکتفا کرتے اور بنی نوع انسان کے لئے ایک مکمل لائحہ عمل نہ تیار فرماتے تو اس کا نتیجہ وہی ہوتا جو عیسائیت کا ہوا تھا۔ سیاست و معاشرت کو دین سے علیٰحدہ کرنے کے معنی یہ ہیں کہ زندگی کے اس شعبے میں انسان کو شتر بے مہار کی طرح چھوڑ دیا جائے اور اس کے جذبات و عواطف کی ہدایت کے لئے کوئی شمع نہ روشن کی جائے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ معاملات اور باہمی تعلقات میں انسان انتہائی خود غرضی اور بے رحمی سے کام لے گا اور صورت حالات وہ پیدا ہوگی جو آج کل یورپ میں ہے۔ عیسائیت کی تعلیم تو یہ ہے کہ اگر کوئی تمہیں ایک طمانچہ مارے تو دوسرے کے لئے بھی اپنے رخسار پیش کر دو اور اگر کوئی تمہاری چادر چھین لے تو تم اسے اپنا کرتا بھی اتار کر دیدو لیکن آج عیسائی اقوام کا طرز عمل کیا ہے۔ بالکل اس کے خلاف۔ اگر ان کا حق ایک گز زمین پر ہوتا ہے تو وہ اس وقت تک قانع نہیں ہوتیں جبتک ایک میل زمین حاصل نہ کر لیں۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ انکے نزدیک دین کو سیاست یا معاشرت سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ یہ خصوصیت صرف اسلام کی ہے کہ اس نے اپنے ابتدائی دور میں ایک ایسی جماعت تیار کر دی جو اپنے تمام معاملات کو خواہ وہ سیاسی ہوں یا معاشی یا معاشرتی دین کی روشنی میں دیکھتی تھی اور جس کے باہمی تعلقات میں مساوات و اخوت کا ایسا خوشنما رنگ جھلکتا

تھا جو اب تک صفحات تاریخ کی زیب و زینت ہے۔ اسلام ہی وہ دین ہے جس میں زندگی کے ہر پہلو سے متعلق ہدایات موجود ہیں اور کوئی ایسا گوشہ نہیں ہے جو تاریک رہ گیا ہو۔ کامل دین وہی ہے جو انسان کی ہر دشواری میں خواہ اس کی نوعیت کچھ بھی ہو۔ کام آئے۔ حالات کچھ بھی ہوں۔ ماحول کتنا ہی بدل جائے لیکن انسان کے پاس ایسے اصل الاصول موجود ہوں جن سے سیدھا راستہ معلوم کرنے میں کوئی دقت نہ ہو۔ اسلام اس ضرورت کو پورا کرتا ہے اور بدرجہ اتم پورا کرتا ہے۔ وہ ایسی شاہ راہ بتا دیتا ہے جس پر چل کر انسان منزل مقصود تک بہ آسانی پہنچ سکتا ہے۔ اور کمال تو یہ ہے کہ باوجود تمام پہلوؤں پر حاوی ہونے کے کہیں انسانی فکر کو پابند اور محدود نہیں کرتا۔ ہر جگہ انسان کو مناسب آزادی عطا کرتا ہے اور اسے اختیار دیتا ہے کہ مخصوص حالات اور واقعات کی مناسبت سے فروع میں تغیر و تبدل کر سکے اور ظاہر ہے کہ اصول کے تغیر کی تو کوئی دین اجازت دے ہی نہیں سکتا۔

ان سطور کے ملاحظہ سے ایک حد تک واضح ہو گیا ہو گا کہ اسلام میں اتنی معنویت موجود ہے جتنی انسان کے لئے ضروری ہے اور رسول اللہ صلعم کی مدنی زندگی کی تعلیمات عین منشائے تخلیق انسانیت کے موافق ہیں اور معترضین کے اعتراضات مذہب کے ناقص تخیل پر مبنی ہیں۔

تیسرا اہم اعتراض یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم اور کفار مکہ اور یہود کے درمیان جو جنگیں ہوئیں ان کی ذمہ داری رسول پر ہے اور ہمیشہ پیش قدمی انہیں کی طرف سے ہوئی۔ اسی سلسلے میں یہ الزام بھی ہے کہ بعض یہودیوں کو رسول اللہ صلعم نے خفیہ طور پر قتل کرا دیا۔ ان اعتراضات میں حقیقت کا ذرا سا شائبہ بھی نہیں۔ مندرجہ ذیل سطور کے مطالعہ سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے گی کہ قرآن نے صرف دفاعی جنگ کی اجازت دی ہے اور یہ بھی کہ رسول اللہ صلعم کو مجبوراً اپنی حفاظت اور تبلیغ دین کی آزادی کے لئے ہتھیار اٹھانا پڑا تھا۔

آیت جہاد جس میں مسلمانوں کو جنگ کرنے کی اجازت دی گئی اس قدر واضح ہے کہ شک اور شبہے کی گنجائش باقی ہی نہیں رہتی :-

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ	انہیں اجازت دیجاتی ہے جن سے جنگ کی گئی اس لئے کہ ان پر

نصرھم لقدیرہ الذین اخرجوا من دیارھم بغیر حق الا ان یقولوا ربنا اللہ ط ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع وبیع وصلوات ومساجد یذکر فیھا اسم اللہ کثیرا ولینصرن اللہ من ینصرہ ان اللہ لقوی عزیز

سورۃ الحج (۲۲) آیت ۴۰ و ۴۱

ظلم کیا گیا ہے اور بیشک اللہ انکی مدد کرنے پر قادر ہے۔ جو صرف اتنا کہنے پر کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے اپنے گھروں سے ناحق نکالے گئے اور اگر اللہ بعض لوگوں کو دوسرے لوگوں کے ذریعہ سے نہ روکتا تو صومعے، گرجا، عبادتگاہیں اور مسجدیں جن میں کثرت سے اللہ کا ذکر ہوتا ہے، مسمار ہو چکی ہوتیں اور اللہ ضرور ان لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں۔ بیشک اللہ قوی اور غالب ہے۔

ان آیات کے پڑھنے کے بعد کیا یہ صاف نہیں ہوجاتا کہ مسلمانوں کو جنگ کی اجازت محض اس وجہ سے دی گئی تھی کہ ان پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے گئے تھے۔ ناحق انہیں گھروں سے نکال دیا گیا تھا اور اس پر مستزاد یہ کہ ان سے جنگ بھی کیجاتی تھی اور اگر اس کی اجازت نہ ملتی تو اللہ کے نام لیوا دنیا سے مٹ جاتے۔ یہانتک تو اجازت جنگ کی وجہ بتائی گئی تھی اب اسکا مقصد ملاحظہ ہو :۔

وقاتلوھم حتے لاتکون فتنۃ ویکون الدین للہ فان انتھوا فلا عدوان الا علے الظالمین

البقرہ ۔ ۲۵ ۔ آیت ۱۸۹

اور ان سے لڑو یہانتک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ کے لئے ہو جائے۔ اور اگر وہ رک جائیں تو زیادتی ظالموں کے سوا کسی پر نہیں ہوسکتی۔

اس سے ایک طرف تو یہ صاف ہوگیا کہ جنگ کا مقصد یہ ہے کہ فتنہ دور ہو جائے اور دین میں سوا اللہ کے خیال کے دوسرے کا خوف یا ڈر باقی نہ رہے اور دوسری طرف یہ بھی واضح ہوگیا کہ فساد کرنے والے اگر باز آجائیں تو پھر جنگ خود بخود ختم ہو جاتی ہے اور مسلمانوں کو لڑائی جاری رکھنے کا کوئی حق نہیں رہتا۔ یہ بھی ملاحظہ ہو کہ کن لوگوں سے جنگ کی اجازت ہے :۔

وقتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین

(۲۔ ۱۸۶)

اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں اور زیادتی نہ کرو بیشک اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

کیا اب بھی کوئی شبہ باقی رہجاتا ہے کہ صرف دفاعی جنگ کی اجازت دی گئی ہے اور دفاع سے سرمو تجاوز کرنے کو منع کیا گیا ہو۔ قرآن میں اس قسم کی متعدد آیات ہیں جن میں اسی خیال کی تکرار ہے اور اچھی طرح واضح کر دیا گیا ہے کہ دین کے معاملے میں نہ تو خود مسلمانوں کو جبر و اکراہ سے کام لینا چاہئے اور نہ جبر و اکراہ برداشت کرنا چاہئے۔ جنگ کی اجازت انتہائی مجبوری کی حالت میں دی گئی ہے جب دنیا سے اللہ کے نام لیواؤں کے مٹنے کا خوف ہو۔ جب خدا کے دین کی تبلیغ میں طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالی جاتی ہوں تو خدا کے رسول کے لئے بجز اس کے کیا چارہ ہو کہ کمر ہمت باندہ کر کھڑا ہو جائے اور راہ حق سے تمام رکاوٹوں کو دور کرنیکی کوشش کرے۔ ہاں اگر اس مقصد کے حاصل ہو جانیکے بعد محض حصول اقتدار یا جلب منفعت کی خاطر رسول لوگوں سے جنگ کرے تو البتہ وہ مورد الزام ہوسکتا ہو۔ لیکن کون کہہ سکتاہے کہ رسول اللہ صلعم نے ایسا کیا۔ یا کوئی اس سے انکار کرسکتاہے کہ رسول اللہ صلعم نے بالکل آخری تدبیر کی صورت میں ہتہیار اٹھایا۔ مکے میں ان پر اور انکے متبعین پر کیا کیا تکلیفوں کے پہاڑ نہ گرائے گئے۔ کونسا ایسا ظلم باقی رہگیا جو دین حق کے ماننے والوں پر نہ ڈھایا گیا۔ اسی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ جب بے خانماں مسلمان اپنا گھر بار چھوڑ کر پردیس میں جابسے تو وہاں بھی انہیں چین سے نہ بیٹھنے دیا گیا۔ مدینے کے قرب و جوار میں برابر انپر چھوٹے چھوٹے حملے ہوتے رہے اور ساتھ ہی ساتھ ایک بڑے حملے کی تیاری بھی جاری رہی۔ حواشی میں تفصیل کے ساتھ دکھایا گیا ہے کہ جنگ بدر کے کیا اسباب تھے اور یہ کیسا بے بنیاد الزام ہے کہ رسول اللہ صلعم اور انکے ساتھی قافلے کو لوٹنے کی غرض سے نکلے تھے یہیں سے باقاعدہ جنگ کا سلسلہ شروع ہوتاہے۔ پھر جنگ احد اور جنگ احزاب کہاں ہوئی تھی۔ کیا اسمیں بھی رسول نے ہی پیش قدمی کی تھی کیا بار بار قریش مکہ اور انکے حلفا نے اپنی پوری طاقت کے ساتھ مدینہ پر حملہ نہیں کیا اور کیا مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لئے کوئی دقیقہ انہوں نے اٹھا رکھا۔ اگر خدا کی مدد مسلمانوں کے شامل حال نہ ہوتی تو انکا نام دنیا سے خارج ہو گیا ہوتا اور اللہ کا نام لیوا کوئی باقی نہ رہتا حواشی میں ہر واقعے کے ضمن میں یہ بھی اچھی طرح ثابت کر دیا گیا ہو کہ رسول اللہ کی کوئی جنگ جارحانہ

نہیں تھی۔ ابتدا میں تو انپر پے در پے حملے ہوتے رہے اور انہیں دم لینے کی فرصت ہی نہ ملی اس کے بعد یہ ضرور ہوا کہ انہیں دشمنوں کی تیاریوں کی خبر پہلے سے ملجاتی تھی اور وہ سلسلہ تقدم بلحاظ انکو جڑ ہی سے کاٹ دینے میں کامیاب ہوجاتے تھے۔ یہ جنگوں کا ایک سلسلہ تھا۔ ایک سے دوسرے کا سامان پیدا ہوتا تھا اور ہر جنگ کو علحدہ علحدہ نہیں دیکھا جا سکتا۔ کفار قریش نے جبتک ان میں کچھ بھی دم باقی رہا اپنی تمام کوششیں رسول اللہ صلعم کی مخالفت میں صرف کر دیں۔ تو کیا رسول اللہ صلعم کو یہ حق نہ تھا کہ ان کی تدابیر کا توڑ کرتے اور اپنی ہستی کو برقرار رکھنے اور اس دین کی تبلیغ کی آزادی کے لئے جس کے وہ حامل تھے کوئی صورت پیدا کرتے۔ یہ ہے حقیقت اس اعتراض کی کہ اسلام تلوار کے ذریعے سے پھیلا۔ اب اہل انصاف خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اس میں کہانتک صحت کو دخل ہے رہا بعض اکابر یہود کے خفیہ قتل کا سوال جسکا الزام رسول اللہ صلعم پر لگایا جاتا ہے۔ اسکی حقیقت بھی ایک افسانے سے زیادہ نہیں۔ حواشی میں ہر اس واقعے کے سلسلے میں جہاں یہ الزام لگایا جاتا ہے الگ الگ تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور سب کے مطالعے کے بعد یہ صاف ظاہر ہوجائیگا کہ اس اعتراض کی بھی کوئی اصلیت نہیں۔

چوتھا اور آخری اعتراض جس سے یہاں بحث کرنی منظور ہے یورپ کی نگاہ میں سب سے بڑا اعتراض ہے۔ کہا جاتا ہے کہ باوجود نہایت سادہ زندگی بسر کرنے اور لذات کے ترک کر دینے کے رسول اللہ صلعم میں ایک کمزوری باقی رہگئی تھی جس کا اظہار یوں ہوا کہ عام مسلمانوں کو انہوں نے صرف چار بیبیوں کی اجازت دی لیکن اپنی ذات کو اس کلیے سے مستثنیٰ کر لیا۔ معترضین کو اس میں خواہشات نفسانی کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ نعوذ باللہ من ذلک۔ واقعہ یہ ہے کہ دوسرے اعتراضات کی طرح اسکا انحصار بھی تعصب پر ہے اور کسی معترض نے ٹھنڈے دل سے اس پر غور کرنیکی کوشش نہیں کی ہے۔ اگر ازواج رسول اللہ صلعم کی فہرست پر نظر کریں تو یہ اعتراض حرف غلط کی طرح مٹ جاتا ہے۔ بجز حضرت عائشہ رضؓ کے تمام ازواج پہلے کسی نہ کسی کے عقد میں رہ چکی تھیں اور جب رسول اللہ صلعم نے ان

سے نکاح کیا تو ان کی عمریں شباب سے متجاوز ہو چکی تھیں دوسری طرف حضرت عائشہؓ کی عمر عقد کے وقت اتنی کم تھی کہ ایک عرصے تک وہ رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکیں اگر رسول اللہ صلعم واقعی نفسانی جذبے سے متاثر ہوتے تو ان کو جوان اور حسین خاتونیں عقد کے لئے نہ مل سکتی تھیں؟ عرب میں اس وقت کونسی عورت اس شرف سے انکار کر سکتی تھی۔ لیکن انہوں نے اس کے خلاف بیوہ اور مسن عورتوں سے شادی کی۔ اس کے بعد اگر ہم ان تعلقات پر نگاہ کریں جو رسول اللہ صلعم کے ازواج کے ساتھ تھے تو یہ مسئلہ اور زیادہ صاف ہو جاتا ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ نفس پرست انسان آزادی فکر اور آزادی عمل کھو بیٹھتا ہے اور عورتوں کی خواہشات کا پابند ہو جاتا ہے وہ جو کچھ حکم دیتی ہیں اس کی تعمیل اسے اپنی فطری کمزوری کی بنا پر لازمی طور پر کرنی پڑتی ہے۔ برخلاف اس کے رسول اللہ صلعم کی شخصیت کا اثر ان کی ازواج پر بہت زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ ان خاتونوں کو جن میں سے اکثر ناز و نعم کی خوگر تھیں آپ نے سادہ اور بے لذت زندگی کا عادی بنایا اور جب انہیں سے بعض نے زیادہ آرام سے زندگی بسر کرنے کی خواہش کی تو آپ نے ان سے سخت بیزاری کا اظہار کیا۔ کیا وہ انسان بھی جو اپنے جذبات نفسانی سے مغلوب ہو کبھی ایسا کر سکتا ہے۔

پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے اتنی تعداد میں عقد کیوں کئے۔ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ عرب میں تعدد ازدواج عام طور پر رائج تھا اور اسے بالکل معیوب نہ سمجھا جاتا تھا۔ خاندانی تعلقات کی توسیع اور حلفا پیدا کرنے کا بہترین طریقہ یہی تھا کہ دوسرے خاندان میں شادی کی جائے۔ بعض اوقات اگر کسی بیوہ کی کفالت منظور ہوتی تھی تو اس سے عقد کر لیتے تھے۔ رسول اللہ صلعم نے جو عقد کئے ان میں یہی مصالح پیش نظر تھے اور آپ کی اکثر ازواج ایسی خاتونیں تھیں جو اپنے سابق شوہروں کے انتقال کے بعد کفالت کی مستحق تھیں اور ان کی دلجوئی کی بہترین صورت یہی تھی کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں خود اپنے عقد میں لے لیں۔ کبھی مغلوب قبیلے کا درجہ بلند کرنے کے لئے بھی رسول اللہ نے اس قبیلے میں عقد کیا ہے۔ چنانچہ ام المومنین جویریہ سے اسی مصلحت سے عقد کیا تھا اور اس کا نتیجہ ہوا کہ انکا تمام خاندان آزاد ہوگیا اسی طرح غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے بعثت کے بعد جتنے نکاح کئے ان میں کوئی نہ کوئی اجتماعی مصلحت ضرور تھی اور ان کا محرک ہرگز کوئی ادنے جذبہ نہیں ہو سکتا۔

اب رہا یہ امر کہ جب تحدید تعداد کا حکم نازل ہوا تو رسول اللہ صلعم اس سے مستثنیٰ کیوں ٹھیرے اس میں بھی بے شمار مصالح ہیں اور ہرگز یہ نہیں کہا جا سکتا کہ رسول اللہ نے اپنے اقتدار سے ناجائز فائدہ اٹھایا اس لئے کہ اگر ایک طرف آپ کے لئے یہ رخصت تھی کہ چار سے زائد بیبیوں کو علیحدہ نہ کریں تو دوسری طرف یہ سخت قید تھی کہ آپ کسی صورت میں اس کے بعد کوئی دوسرا نکاح بھی نہیں کر سکتے تھے۔ عام مسلمانوں کو تو یہ اجازت تھی کہ اگر چار کی تعداد میں کمی ہو اور وہ چاہیں تو شرائط کی پابندی کے ساتھ اس تعداد کو پورا کر سکتے ہیں۔ لیکن رسول اللہ صلعم کسی حالت میں بھی کوئی عقد نہ کر سکتے تھے خواہ تعداد میں کتنی ہی کمی نہ واقع ہو۔ جدید عقد کی اجازت ختم ہو جانے کی تو یہ وجہ معلوم ہوتی ہے کہ جن مصالح کی بنا پر آپ عقد کرتے تھے وہ اب مکمل ہو چکے تھے یعنی اسلامی جماعت کی بنیاد خدا کے فضل وکرم سے بہت مستحکم ہوگئی تھی اور مصاہرت کے ذریعے سے کسی نئے قبیلے کو اپنا حلیف بنانے کی ضرورت نہ رہی تھی اسی سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ باقی ازواج کو علیحدہ نہ کرنے میں بھی کوئی اعلےٰ مصلحت ہوگی اور اس میں ذاتی جذبے کو بالکل دخل نہیں ہے۔ اس موقعے پر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ اسی زمانے میں یہ حکم نازل ہوا تھا کہ رسول اللہ صلعم کی وفات کے بعد ازواج مطہرات سے کوئی اور شخص عقد نہیں کر سکتا تھا اور انہیں امہات المومنین کا درجہ دیا گیا تھا۔ ظاہر ہیں معترض

اس پر بھی اعتراض کرتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ حکم بھی رسول اللہ کے کسی ذاتی جذبہ کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ اس میں یہ مصلحت تھی کہ ازواج مطہرات رسول اللہ صلعم کے اخلاق عادات اور انکی تعلیمات کی حامل اور انکا صحیح نمونہ تھیں۔ پھر آپ کے بعد ان کو کسی دوسری ہستی کا پابند نہ ہونا چاہیئے تھا بلکہ آزاد رہکر اس فیض کو جو رسول اللہ صلعم کی صحبت سے انہیں حاصل ہوا تھا عامۃ المسلمین تک پہنچانا چاہیے تھا اور اسی لئے ان کے متعلق یہ حکم نازل ہوا تھا۔ اب غور کرنے کی بات ہے کہ اس حکم کی موجودگی میں اگر رسول اللہ صلعم علاوہ چار کے باقی ازواج کو علحدہ کر دیتے تو ان کی کسقدر حق تلفی ہوتی اور ساتھ ہی ساتھ رسول اللہ صلعم کے فیض صحبت سے محرومی ان کے لئے کس قدر باعث تکلیف ہوتی۔ یہی مصلحت اس استثنا کی ورنہ حقیقۃً معترضین کے باطل توہمات کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ بھلا وہ انسان جو ترک لذات دنیوی کی بہترین مثال ہو اور جسے خلق خدا کی ہدایت کی تفویض ہوئی ہو کبھی ایسے جذبات سے مغلوب ہوسکتا ہے جو تمام انسانی خوبیوں پر پانی پھیر دینے کو کافی ہیں۔

یہ چار بڑے اعتراضات تھے جو مستشرقین عام طور پر سیرۃ رسول اللہ صلعم پر وارد کرتے ہیں اور انھی سے اس مقدمے میں مختصر طور پر بحث کی گئی ہے۔ ارادتاً تفصیل سے کام نہیں لیا گیا ہے اس لئے کہ مقدمے کے از حد طویل ہوجانے کا خطرہ تھا۔ ہر بحث میں اصولی مسائل کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کی گئی ہے۔ مقدمہ نگار کو اپنی خامیوں کا کماحقہٗ علم ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ترجمے، مقدمے اور حواشی میں بہت سے نقائص ہوں گے۔ اہل نظر سے امید ہے کہ وہ ان سے ہرگز چشم پوشی نہ کریں گے بلکہ ان کو ظاہر کردیں گے اس لئے کہ اس طرح قارئین بھی غلط فہمیوں سے محفوظ رہیں گے اور خود مولف کو بھی اپنی غلطیوں کا علم ہوجائے گا۔ صحیح تنقید علم کی سب سے بڑی خدمت ہے۔

یہاں پر میں اپنے مکرم استاذ مولنا ابو عبداللہ محمد بن یوسف السورتی کا شکریہ ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتا اس لئے کہ مجھے جو کچھ تھوڑا سا علم عربی ادب اور اسلامیات کا حاصل ہوا ہے وہ انہیں کے فیض سے حاصل ہوا ہے اور یہ تالیف بھی اگر وہ پوری مدد نہ کرتے تو کبھی تکمیل کو نہ پہنچتی۔ اسی کے ساتھ ساتھ میں اپنے تمام ان بزرگوں اور دوستوں کا شکر گذار ہوں جنہوں نے وقتاً فوقتاً اپنی ہدایتوں اور مشوروں سے مجھے سرفراز فرمایا۔

عبدالعلیم

جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ دہلی

۲۴؍ اپریل ۱۹۲۹ء

رائنر مریا رِلکے[۱]

رائنر مریا رِلکے ایک سال سے اوپر ہونے آیا دنیا سے اُٹھ گیا۔ ہندوستان میں اس نام سے آج کون واقف ہے؟ کوئی نہیں۔ لیکن رِلکے جرمنی کے غنائی شعراء کا بادشاہ تھا اور گو آجکل کے نقادانِ سخن میں سے اکثر شٹفان گیارگے کو شوکت کلام اور پختگی سخن کی بنا پر رِلکے سے بہتر جانتے ہیں لیکن وہ زمانہ آئے گا اور ضرور آئے گا جبکہ ذوق و غالب کی طرح اِن دونو کے مراتب بھی اپنی صحیح روشنی میں نمایاں ہونگے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ گیارگے حقیقی معنوں میں جرمن شاعر ہے اور گوئٹے کا وارث اگر کوئی قرار پاسکتا ہے تو وہ گیارگے ہے۔ چنانچہ یہی ہوا بھی کہ گزشتہ سال گیارگے کو جرمنی کے بہترین شاعر کی حیثیت سے ایک کثیر رقم نذر کی گئی۔ رِلکے کا کلام قومی طرزِ ادا سے الگ اور بالاتر ہے۔ اِس کی ایک وجہ یہ ہے کہ رِلکے یورپ کا پہلا شاعر ہے جس نے تصوّف کے راز کو سمجھا ہے اور اس طرح پر نہیں کہ اِس پر فارسی یا عام طور پر مشرقی شاعری کا اثر ہوا ہو یا زمانۂ متوسطہ کی شاعری میں جو کوششیں اکثر نصرانی شعراء نے تصوّف کے میدان میں کی ہیں اُن کا اِس پر کوئی صریحی اثر پڑا ہو۔ مادیّت کے آخری زینوں پر پہنچکر انسان کی روح اپنی خود شکستی و خود فراموشی سے پراگندہ و پریشان ہو جاتی ہے اور بے قرار ہو کر رِلکے کے قلم و زبان سے آشکار ہوتی ہے۔ اور یہی راز ہے رِلکے کی روحانی شاعری کی کامیابی کا۔ انسان غلامانہ تقلید سے کوئی بڑی چیز کبھی حاصل نہیں کرسکتا آدھی صدی کی مسلسل کوششوں کے باوجود ہندوستان کی کسی زبان نے ایک ناول بھی

---

۱ Rainer Maria Rilke

۲ Stefan George

ایسا پیدا نہیں کیا جس پر کوئی سخن سنج فخر کر سکتا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ناول نویسی ہندوستان کے ادبیات کے ارتقا کا ہنوز تقاضا نہیں اور انگریز ناول نویسوں کے غیر آہنگ تتبع سے ایک ایسی دوغلی چیز پیدا ہوئی ہے جس کو نہ ناول کہہ سکتے ہیں نہ فسانہ اور نہ جس کی ان دونو حیثیتوں سے جداگانہ طور پر بھی بین الاقوامی معیار نظر سے کوئی وقعت ہو سکتی ہے محض ارتقائے فطری سے جو شے دستیاب ہوتی ہے وہ ایک واقعی اور حقیقی قدر و قیمت رکھتی ہے۔ گوئٹے کے دیوان مغربی[1] نے جو اُس نے فارسی دواوین کے تتبع میں نظم کیا ہے بہت کچھ شہرت حاصل کی۔ گو ہم اُس کو ادبی تجربہ کی حیثیت سے ایک دلچسپ چیز مان لیں لیکن نہ تو اس میں سعدی و حافظ کے تغزل کا پتہ ہے نہ اُن کے تصوف کی شان اور ان کی چاشنیٔ کلام سے اِس کو کوئی واسطہ۔ ہائینے[2] اکثر ہندوستان کے جذبہ فروش[3] طبائع کو بہت بھاتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ ہائینے کے یہاں ہم کو مشرقی تغزل کی بہت کچھ جھلک نظر آتی ہے لیکن اس بنا پر کہ انسان اس طرز تغزل کا مقابلہ فارسی تغزل سے کئے بغیر نہیں رہتا ہائینے کا کلام اُس شخص کی نظروں میں بہت کم جچتا ہے جو فارسی تغزل کی نیرنگیوں سے آشنا ہے۔ برخلاف انکے رِلکے کی شاعری اور شعریت کو فارسی اثرات سے کوئی تعلق نہیں اور اس کا طرز ادا فارسی اور اُردو کے شعرا سے اس قدر جداگانہ ہے کہ موازنہ کا اصلا خیال نہیں گزرتا۔ لیکن باوجود طرز ادا میں انتہائی اختلاف کے ہم رلکے کے یہاں میر کا درد پائینگے، تو درد کا تصوف، انیس کے نوحے کی شان تو غالب کا علو خیال۔ اور جہاں تک شیرینیٔ زبان کا تعلق ہے حافظ شیرازی کے سوا اس کا کوئی ہم پلہ نہیں۔ اس کا ایک ایک لفظ سرچشمۂ نبات ہے لیکن اس کے لفظوں میں

---

[1] West-Östlichen Diwan

[2] Heine

[3] جذبہ فروش سے میری مراد Sentimental ہے۔

نبات کی سی ارزانی نہیں۔ اس کا علوِ خیال اس کے الفاظ کی شیرینی کو بے وقار ہونے نہیں دیتا اور اس کو ارزانی احساسات سے محفوظ رکھتا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ اس کے کلام کا ترجمہ اردو میں اُسی قدر ناممکن ہے جس قدر حافظ یا سعدی کا ترجمہ جرمن یا انگریزی میں۔ لیکن میں حتی الامکان اس کے کلام کی ایک تھوڑی سی جھلک دکھانے کی خاطر اس کی دو مختصر نظموں کا ترجمہ کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔ کوشش میری یہ رہی ہے کہ اس کے الفاظ کا اگر کہیں ترجمہ ممکن نہ ہو تو نہ سہی لیکن اس کے خیال اور طرزِ ادا کی ترجمانی ہو جائے اور اس کی نظم کی نوعیت میں حتی الوسع فرق نہ آنے پائے۔ اُمید ہے کہ ناظرین پر ترجمہ کا طرز اگر گراں گزرے تو میری ناداری سمجھیں اور شاعر کے کلام کی پستی پر محمول نہ کریں۔

ان ترجموں کو پیش کرنے سے پیشتر رلکے کے متعلق چند ایسی باتیں بتلا دینا ضروری سمجھتا ہوں جن سے کلام کو پوری طرح سمجھنے اور اُس سے لطف اندوز ہونے میں آسانی ہو۔ رلکے صریحاً یورپ کے دورِ جدید کا شاعر ہے اور نیچر پرستی[۵۱] کے خلاف جو ردِ عمل اواخر اُنیسویں صدی عیسوی سے وہاں کے فنونِ لطیفہ میں اکسپرشنزم[۵۲] کی تحریک کی صورت میں ظہور پذیر ہوا اُسکا اس پر نہایت درجہ اثر ہوا ہے، گو ہم اس کو مخصوص طور پر اکسپرشنی شاعر نہیں کہہ سکتے۔ وہ ذرّے ذرّے اور قطرے قطرے میں انسان کی روح کا متلاشی ہے اور خود انسان کی روح کا اظہار ہمیشہ سلجھے ہوئے جملوں اور صاف الفاظ میں نہیں کرتا بلکہ اکثر اپنی کج مج زبانی سے وہ کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے جو الفاظ ناطق و صریح سے ممکن نہیں۔ رلکے روحِ انسان کے رنگ و روپ کو حتی الامکان بے نقاب پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ عام فہم الفاظ میں ایک بات کہتے کہتے کچھ کھو سا جاتا ہے اور دماغ بلا ارادہ جہاں اس کو لے جاتا ہے وہاں جاتا ہے لیکن

---

۵۱ Naturalism

۵۲ Expressionism

حسن کلام کو کہیں ہاتھ سے نہیں دیتا۔ اکثر نظموں میں وہ ایک شخص خاص کی ایک وقت خاص میں پوری پوری دماغی کیفیت کا خاکہ کھینچتا ہے جو اس طور پر ہرگز ممکن نہیں کہ شاعر اُس کے جذبۂ مرکزی اور خیالات ارادی کو نظم کر دے۔ کچھ تو وہ جان بوجھ کر کہتا ہے اور کچھ بے خبری کے عالم میں اور دورانِ کیف میں جو اکثر متعلق وغیر متعلق احساسات و ایتلافات[لف] دماغ میں گزرتے ہیں اُن کو بھی قلمبند کر دیتا ہے۔ اس کے کلام کی یہ نفسیاتی پیچیدگیاں ہی اس امر کا باعث ہیں کہ وہ غالب کی طرح مقبولِ عام ہونے سے قاصر ہے اور رہیگا گو جہاں تک زبان کا تعلق ہے رتکے کا کلام نہایت سادہ اور سہل ہے۔ ایک بات اور قابلِ غور ہے کہ رتکے کی شاعری نہایت درجہ انفرادی ہے۔ اس کا "ترانۂ گدا" ہر گداگر کی فریاد نہیں بلکہ اسکے "گدا" میں خود اسی کا سراپا نظر آتا ہے یعنی اگر رتکے خود محتاج ہو کر در در بھیک مانگتا تو اُس کے احساسات وہی ہوتے جو اُس نے اِس ترانے میں نظم کئے ہیں۔ اسی طرح اس کی "فریاد" ہر نا اُمید کی فریاد نہیں بلکہ خود اُس کی نا اُمیدی کی فریاد ہے اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اس کے چشموں میں، اس کے نالایوں میں، اس کے پرندوں میں، اس کے پردہ ہائے ساز میں، اس کے مسیح میں، اِس کی ام المسیح میں، اس کے ہر ہر ذرہ اور ہر ہر آفتاب میں ہم اسی کی روح متحرک پائیں گے۔

کس قدر انوکھی معلوم ہوگی یہ شخصیت ہندوستان کے رہنے والوں کو جو سالہا سال سے ورڈس ورتھ، ٹے نی سن، اور انگلستان کے اور بے شمار شاعروں کی فطرت پرست ہستیوں سے دو چار رہے ہیں اور اُن کے اتباع میں کوشاں ہیں۔

بڑی چیز تھا رتکے۔ افسوس دنیا سے چل بسا گو ابھی اُس کے مرنے کے دن نہ تھے۔ یورپ کے باشندوں کے لئے پچاس برس کی عمر کیا ہوتی ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ خدا مغفرت کرے۔

Associations لف

ترانۂ گدا[1]

دروازے دروازے پھرنا۔
صدائیں دینا۔
آندھی میں، پانی میں، چلچلاتی دھوپ میں۔
اکبارگی تھک کر کہیں بیٹھ جانا۔
کسی کونے میں، کسی چوکھٹ پر۔
اپنا داہنا کان اپنے داہنے ہاتھ پر رکھ لینا، اور چلّانا۔
چلّانا، چلّانا، چلّانا۔

اور پھر۔
مجھکو خود اپنی آواز ایک غیر کی سی آواز لگتی ہے۔
پھر مجھکو نہیں معلوم ہوتا کہ یا الٰہی یہ کون حلق پھاڑ پھاڑ کر چلّاتا ہے۔
میں یا کوئی اور۔

---

[1] Das Lied des Bettlers کا ترجمہ "فقیر کی صدا" یا "سائیں کی صدا" میں نے اس لئے نہیں کیا کہ اوّل تو یورپ میں صدا دیکر بھیک مانگنے کا طریقہ نہیں دوسرے شاعر کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کا گدا گر اپنے ان شاعرانہ خیالات کو چند فلوس سیاہ کے بدلے دردر فروخت کرتا پھرتا ہے بلکہ جب وہ تھک کر کسی کونے میں کسی چوکھٹ پر بیٹھ جاتا ہے اور چلاتے چلاتے اپنی بے خودی فریاد سے ذرا بیدار ہوتا ہے تو اُس کے خیالات واحساسات وہ کچھ ہوتے ہیں جو اس ترانے میں ادا کئے گئے ہیں۔

ماخوذ از "دس بوخ در بلدر" (تصویروں کی کتاب)۔ ان نظموں کو نثر منظوم (Prose poem) کے قبیل سے سمجھنا چاہئے اور بلینک ورس کی طرح پڑھنے کی کوشش نہ کرنی چاہئے۔

میں چلاتا ہوں تو ایک ذرا سی چیز کے لئے۔
لیکن شاعر۔
ایک جلوۂ عالم خیال کی خاطر۔
اور، آخرکار۔
میں اپنا چہرہ اپنی دو نو آنکھوں سے ڈھانپ لیتا ہوں
اور اپنے سر کا سارا بوجھ دونوں ہاتھوں پر ٹیک دیتا ہوں۔
جس میں اُسکی صورت ایسی ہوتی ہے جیسے آرام کی۔
ہاں!
یہ نہ سمجھیں راہ گزرنے والے۔
کہ مجھ آفت نصیب کے سر کو۔
تکیہ تک نصیب نہ تھا۔

فریاد

کیسی ہر چیز دور اور بے بود سی ہے۔
اور مدت کی گزری ہوئی سی —
شاید وہ ستارہ
جس پر میرے کسب نور کا انحصار ہے
ہزارہا سال ہوئے مرچکا ہے —
شاید اس کشتی میں
جو ابھی ادھر سے گزری
کسی نے کسی سے کان میں ڈر کر کچھ بات کہی —

گھر میں ایک گھڑی ٹن ٹن بجی ......

کس گھر میں ؟......

الٰہی توبہ !

جی چاہتا ہے کہ دل کے اندر سے نکلکر کہیں بھاگ جاتا

فضائے آسمان میں قرار لیتا ۔

جی چاہتا ہے کہ سجدے کرتا ۔

اور !

ستاروں میں سے ایک

شاید اب تک برقرار ہو'

جی کہتا ہے کہ مجھے معلوم ہے

(ان میں سے) کون' یکہ و تنہا'

ہنوز آشنائے حیات ہے '

کون ایک شہر نور کی طرح

شعاعوں کی منزل پر آسمانوں میں روشن ہے ۔

اقبال کا شعر ہے ؎

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں   کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

یہاں ہم ایک آشنائے سجود کی جبین سجدہ خو کو شوق شہود میں مبتلا پاتے ہیں ۔ رلکے کی اس نظم میں جس کا ترجمے نے صریحاً خون کر دیا ہے ہم کو ایک مغربی شاعر جیسے معشوق ازلی کی بے نیاز یہائے بیجا کا دماغ نہیں، نشۂ الست سے لاچار، تلاش حق میں آلام نفسی سے مجبور، اپنے مادی ماحول سے پراگندہ و پریشان ہو کر انتہائی اضطراب اور اضطرار کے

ساتھ یک بیک شوقِ سجود سے مغلوب نظر آتا ہے۔

"جی چاہتا ہے کہ سجدے کرتا"

اب خدا جانے اس پردۂ زنگار کے پیچھے "نہیں" کے سوا اگر کوئی ہے تو اس کو ان دو نو چیزوں میں سے کون سی زیادہ بھاتی ہے، جبینِ سجدہ خو یا جبینِ سجدہ جو۔
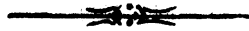
شخصیت اور تاریخ

پروفیسر فریڈرش مائینکے آج کل جرمنی میں تاریخ اور فلسفۂ سیاسیات کے سب سے بڑے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ یہ مضمون اُن کے ایک مشہور خطبے سے ماخوذ ہے جس کا محمد مجیب صاحب بی۔اے (آکسن) نے انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ اصل میں یہ خطبہ پروفیسر مائینکے نے مرکزی ادارہ تعلیمات برلن کے ایک جلسے میں دیا تھا۔ اُس کے بعد یہ رسالہ کی شکل میں شائع کیا گیا۔

جب میں نے آج کے خطبے کے لئے یہ مضمون منتخب کیا تو یہ اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ اسے فنِ تعلیم کے عملی مسائل پر منطبق کرنے میں، جو اس کا اصلی مقصد سمجھا جاتا ہے، مجھے توقع سے کم کامیابی ہوگی۔ لیکن یہ موضوع بجائے خود ایسا ہے کہ اس کا سلسلہ اُن مسائل تک پہنچتا ہے جو نہ صرف مورخوں کے لئے بلکہ شخصیت کے سبھی قدردانوں کے لئے دلچسپ ہیں۔ مجھے آپ کے سامنے اس موضوع پر تقریر کرنے کی تجویز اس لئے اور بھی پسند آئی کہ اس پُرآشوب زمانے میں ہمیں جس شدید کشمکش اور سخت تشویش کا سامنا کرنا پڑا اُس کے سبب سے یقیناً ہمارے دلوں میں مشاہدۂ نفس اور ضبطِ نفس کی گہری آرزو تازہ ہوگئی ہوگی۔

اصل مسئلہ جس پر ہم غور کرنا چاہتے ہیں یہ ہے کہ تاریخ شخصیت کی تشکیل میں کیا اہمیت رکھتی ہے؟ اس سوال کا جواب دینے کے بعد آسانی سے معلوم ہو جائے گا کہ تاریخ کی تعلیم دینے کے اصول اور طریقہ پر اس بحث کا کیا اثر پڑتا ہے۔

سب سے پہلے ہمیں اپنے دل میں سوچنا چاہئے کہ آخر یہ شخصیت کیا چیز ہے اور اس کا مقصد اور منشا کیا ہے؟ گوئٹے کا قول اب تک ہمارے کانوں میں گونج رہا ہے کہ شخصیت ہم ابنائے ارض کے لئے خدا کی سب سے بڑی نعمت ہے اور جب ہم مکروہاتِ زندگی سے پریشان ہو جاتے ہیں تو یہ الفاظ مژدۂ جانفزا بنکر چپکے سے ہمارے دل میں اُتر جاتے ہیں۔ مگر یہ مژدہ ایک طرح کا

مطالبہ بھی ہے ۔ یہ ہم سے اس کا طالب ہے کہ باہر سے جتنے اثرات ہمارے جذبات اور ہماری قوتِ عمل پر پڑتے ہوں اُن سب کے نرغے میں ہم اپنی اندرونی سیرت کو استوار رکھیں اور خارجی اور داخلی زندگی کے درمیان ایک حد قائم رکھیں جس کی حفاظت کرنا ہمارا حق اور ہمارا فرض ہے ۔ اس حدبندی سے یہ مراد نہیں کہ داخلی زندگی کسی آہنی کٹہرے میں مقید کر دیجائے بلکہ یہ منشا ہے کہ خارجی دنیا سے اس کے تعلقات ضابطے اور اصول کے ماتحت رکھے جائیں۔ اس حریم باطن میں آنے جانے کی راہیں ہوں لیکن وہ بیرونی زندگی کے شوروشر سے محفوظ ایسی جگہ ہو جہاں ہم دلجمعی سے اپنے نفس کا مشاہدہ کر سکیں، اپنی قوتوں کو مجتمع کر سکیں اور ان سے خارجی زندگی میں کام لے سکیں ۔ مختصر یہ کہ یہ بجائے خود ایک چھوٹی سی دنیا ہو لیکن بڑی دنیا سے وابستہ ہو، اپنا الگ اور مخصوص رنگ رکھتی ہو لیکن اس کی ترکیب انھیں زندگی کی عام قوتوں سے ہوئی ہو؛ سب سے آزاد بھی ہو اور کل کی پابند بھی ۔ علاوہ ان باتوں کے یہ ان سب حقیقی اور زندہ کیفیات پر حاوی ہو جن کے وجود میں علمیاتی تنقید سے کسی طرح کا شبہ نہ پیدا ہو سکے ۔ یہ چیز کیا ہے ؟ ایک نفس جسے اپنے آپ پر اعتماد ہو ۔ یہ جیتی جاگتی کرامت ہمیں مبداء فیاض نے عطا کی ہے ۔ دوسری کرامت یہ ہے کہ ہم اس نفس خام سے شخصیت کی تعمیر کریں اور یوں اپنی ذات کو فطرت محض کی سطح سے بلند کریں لیکن اس کرامت کے لیے خود ہماری سعی کی ضرورت ہے ۔ جب انسان کو اس دُہری کرامت کا شعور ہوتا ہے تب اُس کی سمجھ میں آتا ہے کہ واقعی شخصیت زمین والوں کے لیے سب سے بڑی سعادت ہے ۔ فطرت نے زندگی کی اور جتنی صورتیں پیدا کی ہیں اُن سب کو ایک معیّنہ سلسلۂ نشو و نما کا پابند کر دیا ہے مگر صرف انسان کے لیے اُس نے یہ امکان رکھا ہے کہ اس زنجیر کو ڈھیلا کر دے، روحانی آزادی کی ایک نئی دنیا تعمیر کرے اور اس دنیا میں آزادی کا سب سے برتر ثمرہ یعنی ایک مخصوص اور ناقابل تقلید سیرت حاصل کرے مگر اس طرح کہ مجموعی زندگی سے اُس کا رابطہ ٹوٹنے نہ پائے ۔ انسان نہ تو بالکل تنہائی میں خوش رہ سکتا ہے اور نہ

اپنے آپ کو اپنے ماحول میں محو کر کے۔ اگر انسان حقیقی مسرت حاصل کرنا چاہتا ہے تو اُس پر لازم ہے کہ انفرادی آزادی میں مجموعی تمدنی زندگی کا پابند رہے اور اجتماعی پابندی میں اپنی شخصی آزادی اور اپنی مخصوص سیرت کو محفوظ رکھے۔ یہی شخصیت اور عالم خارجی کا تعلق ہر معقول اور قابل زندگی سیاسی اور سماجی دستور کی بنیاد ہے۔ یہی فرد اور جماعت نفس اور ماحول کا باہمی تعامل اور اُن کی باہمی کشمکش تاریخی زندگی کا لبِّ لُباب ہے۔

یہی دونوں مسائل ہیں جن پر ہمیں غور کرنا ہے: ایک تو یہ کہ شخصیت کی اہمیت عالم تاریخ کے لیئے کیا ہے اور دوسرے یہ کہ عالم تاریخ کا اثر شخصیت کی تشکیل پر کیا پڑتا ہے۔ پہلی ہی نظر میں یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ اب تک دوسرے مسئلے کے مقابلے میں پہلے مسئلے پر زیادہ کثرت سے اور زیادہ دلچسپ طریقے پر بحث کی گئی ہے۔ کیا اِس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پہلا مسئلہ دوسرے سے زیادہ اہم ہے؟ کیا اس میں یہ اعتراف پنہاں ہے کہ کل قدر و قیمت کا حامل فرد ہے؟ کیا ہمارا اصل کام یہ ہے کہ ہم عالم تاریخ کا اِس نظر سے مطالعہ کریں کہ اُس میں اشخاص کی جد و جہد کو کہاں تک دخل ہے؟ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ انیسویں صدی کے لوگوں میں جو تاریخی روح سرایت کر گئی تھی اور اِس دور کی تاریخی زندگی کے موضوع کو جو وسعت حاصل ہوئی دونوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پہلے مسئلے کو ترجیح دی جاتی تھی۔ عین پسند فلسفہ کی تحریک میں ابتدا سے انتہا تک شخصیت ہی مدنظر رہی اور کانٹ اور فشٹے کی تصانیف میں فرد کی اخلاقی آزادی کے مسئلہ پر زیادہ زور دیا گیا۔ لیکن ہیگل کی تصانیف میں مجموعی تاریخی زندگی کو جو افراد کو چار و ناچار اپنے دھارے میں بہالے جاتی ہے زیادہ اہمیت حاصل ہوئی۔ پھر جب جدید علم تاریخ کی بنیاد پڑی اور جمہور کو زیادہ اہمیت حاصل ہوئی تو اجتماعیت اور انفرادیت میں از سر نو جنگ چھڑ گئی۔ اجتماعیت اُس کی رفیق ثبوتیت اور نئے علم اجتماعیات کی بنیاد اِس پر تھی کہ جماعت فرد سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ تاریخی انفرادیت اور اُس کی مؤید فلسفیانہ تحریک نے بجائے جارحانہ طرز عمل کے مدافعت اختیار کی اور اسی کے ساتھ ایمانداری

سے یہ کوشش کی کہ اجتماعیت پسندوں کے اصولوں میں جو معقول باتیں ہوں اُن کی سچائی کا اعتراف کرے۔ اِس طرح تاریخ پر اجتماعیت چھا گئی اور چونکہ مجموعی تاریخی زندگی کے اثرات نے فرد کو ہر طرف سے دبا لیا اِس لئے یہ سوال آہستہ آہستہ سرد پڑ تا گیا کہ عالم تاریخ کا فرد کی آزاد اور مخصوص سیرت کی تربیت میں کیا منشا اور مقصد ہے۔ اس کا اندیشہ تھا کہ فرد کی اہمیت بالکل نہ رہے گی اور وہ بجائے ایک مستقل مقصد ہونے کے مجموعی زندگی کا ایک ذریعہ بن کے رہ جائے گا۔ اِس طرح شخصیت اور عالم تاریخ میں جو تعلقات پیدا ہوئے اُن پر بھی ہم نظر ڈالیں گے۔ بہرحال یہ یقینی ہے کہ یہ دونوں سوال یعنی تاریخ کے لیے شخصیت کی اہمیت اور شخصیت کے لیۓ تاریخ کی اہمیت کیا ہے، ایک دوسرے سے تعلق رکھتے ہیں اور جو ایک سوال کا جواب ہوگا اُس کا اثر دوسرے سوال کے جواب پر بھی پڑے گا۔ جو لوگ تاریخ میں شخصیت کی اہمیت پر زور دیتے تھے وہ زیادہ تر اسوجہ سے ایسا کرتے تھے کہ انہیں تاریخی زندگی کا بہت گہرا اثر خود اپنی ذات پر محسوس ہوتا تھا۔ انہیں اِس مسئلہ سے علمی اور اخلاقی دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے شرم آتی تھی اسلئے انہوں نے اسے بالکل نظری رنگ دے دیا۔ اب ہمارا یہ کام ہے کہ اس سوال کو اِس کی اصلی صورت میں پیش کریں اور یہ دکھائیں کہ اجتماعیت اور انفرادیت سے ہمارے موضوع بحث کے لیۓ کیا نتائج اخذ ہو سکتے ہیں۔

اجتماعیت کی انتہائی شکل اصل میں فرد کو محض مختلف اجتماعی قوتوں کا جولانگاہ سمجھتی ہے۔ اُس کے خیال میں جماعتوں کے عظیم الشان مستقل نظام، اُن کے رسوم اور اُن کے خیالات فرد پر حاوی ہوتے ہیں جو فطری طور پر قدامت پسند اور سست ہوتا ہے اور جسے فطرت نے گلوں میں رہنے والے جانوروں کی سی طبیعت عطا کی ہے۔ اِس لئے ترقی اور تجدید اشخاص کی بدولت نہیں ہوتی بلکہ حالات زندگی کے بدل جانے سے خود بخود ہوتی ہے۔ افراد جو بظاہر تجدید کے بانی ہوتے ہیں اصل میں محض عام حالات اور

رجحانات کے مظہر ہوتے ہیں۔ اس لئے عالم تاریخ جو قدیم آئین و دستور اور زندگی کی قوتوں کا حامل ہے، عملی حیثیت سے بیشک افراد پر بہت بڑا اثر ڈالتا ہے بلکہ اُن پر بالکل چھا جاتا ہے لیکن انہیں اس کا موقع نہیں دیتا کہ ان کی مخصوص سیرتیں نشوونما پا سکیں۔ جو چیز بظاہر آزاد اور جداگانہ شخصیت معلوم ہوتی ہے وہ اصل میں ماحول کے اثرات سے تعمیر پاتی ہے اور اس کی تعمیر میں جتنا مسالہ لگتا ہے سب کا سب خارجی دنیا سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہر فرد کے یہاں اس مسالہ کی ترتیب مخصوص اور انوکھی ہوتی ہے لیکن محض اس حد تک جیسے "کلائڈ اسکوپ" یا نیرنگی شیشے میں ہر لمحے رنگوں کا ایک نیا نقشہ نظر آتا ہے۔ اسی طرح عالم تاریخ کا نظری مطالعہ یعنی زمانہ ماضی کی تحقیق اور مشاہدہ اجتماعیت پسندوں کے نزدیک ارباب فکر پر یہ حقیقت ثابت کر دیتا ہے کہ انسان اسی معمولی آب و گل سے بنا ہے اور اس نے عادت کی گود میں پرورش پائی ہے۔

"اشتراک"

کسی گزشتہ اشاعت میں ہم نے اشتراک اور اسکی مختلف قسموں کی تعریف کی تھی۔ لیکن ناظرین کو یاد ہوگا کہ یہ تعریفیں صرف اشتراک کے معاشی مقاصد کو خصوصاً املاک کے مسئلہ کو پیش نظر رکھ کر کی گئی تھیں۔ اور یہ اس لئے کہ قیاس و رائے کی بے ترتیبیوں میں کچھ ترتیب پیدا کی جاسکے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اپنے وسیع معنوں میں اشتراک محض نظام املاک کی کسی مخصوص شکل سے عبارت نہیں۔ یہ تو حیات اجتماعی کے سب شعبوں اور تمام اداروں پر حاوی ہونا چاہتا ہے۔ یہ ایک بنیادی اصول ہے جس پر جماعت کی زندگی کی ساری عمارت کھڑی کرنی ہے، ایک ذہنیت جو مذہب و اخلاق، معیشت و آئین، فنون و صنعت، غرض تمدنی زندگی کے ہر گوشہ میں جلوہ گری کے لئے بیتاب ہے۔

جماعتی زندگی پر نظر ڈالئے تو جماعت بندی کی مختلف شکلیں نظر آئینگی۔ کہیں اسکی بنیاد معاہدہ پر ہوگی، کہیں باہمی ہمدردی پر، کہیں روایات پر کہیں قانون پر، کہیں آزادی پر کہیں جبر پر، لیکن ان مختلف شکلوں کی تہ میں ہمیشہ تین اصولوں میں سے کسی ایک یا کئی کی کارفرمائی دکھلائی دیگی۔ یعنی طاقت، محبت، عقل ـــ جب جماعتی زندگی میں انسان کے فطری رجحانات، اور قدرتی محرکات کو اپنا اثر پیدا کرنے کا موقع ہوتا ہے اور حیاتِ اجتماعی میں مدارج و مراتب کی تقسیم افراد یا گروہوں کی جسمانی یا ذہنی یا روحانی بلندی و پستی کی بنا پر ہوتی ہے تو اُس وقت طاقت کا اصول کارفرما ہوتا ہے۔ یہ طاقت چاہے جسمانی ہو، چاہے عقلی و ذہنی۔ "جسکی لاٹھی اُس کی بھینس" یا "جس کی بُدھی اُس کی بھینس" یہ دونوں اصول طاقت کی شکلیں ہیں۔ اِس اصول کے ماتحت

جماعت میں پستی و بلندی کی ترتیب طاقت کی تقسیم کی بنا پر ہوتی ہے۔

لیکن جب فطری و قدرتی طاقتوں یا صلاحیتوں کو من مانی شکلیں اختیار کرنے سے روکا جائے اور جماعت کی شیرازہ بندی افراد سے بالاتر اصولوں کے ماتحت کی جائے تو اُس وقت جماعت بندی کو عقلی اصول کا پابند کہیں گے۔ اِس میں یہ نہ ہوگا کہ جس کے پاس طاقت ہے وہ کمزور پر حاوی ہو جائے، یا جس کے پاس دولت ہے وہ مفلس پر، جس کے پاس علم ہے وہ جاہل پر تفوق حاصل کرے۔ بلکہ مثلاً اس قدرتی فرقِ مراتب سے قطع نظر یہ اصول بنایا جائے کہ دولت سب کے پاس برابر ہونی چاہیے، علم سے سب کو بہرہ یاب ہونا چاہیے، توانا اور ناتوان کا فرق مٹانا چاہیے وغیرہ وغیرہ تو اُس وقت حیاتِ اجتماعی مقررہ اصولوں کے تحت میں آجاتی ہے اور اِس پر عقل کی کارفرمائی ہوتی ہے۔

پھر انسانوں کی بعض جماعتیں ایسی بھی بنتی ہیں کہ نہ اُن میں طاقت کا تفوق ہوتا ہے نہ اصولوں کی فرمانروائی بلکہ دوست دوست کو 'رشتہ درگردن' جدھر چاہتا ہے لیجاتا ہے۔ عقل یہاں لاچار ہوتی ہے اور طاقت بے بس۔ عقل اور اِس کے خودساختہ اصول یہاں دفترِ بےمعنی بن جاتے ہیں، یہاں توانا ناتوان کے آگے اور عالم اُمّی کے سامنے سر جھکا دیتا ہے۔ اور سب شاید اپنے مشترک خالق کی وحدت کے پرتو سے ہزار قالب لیکن یک جان ہو جاتے ہیں۔ ان جماعتوں کا اصول بنیادی محبت ہوتا ہے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ اشتراک کا مجوزہ نظام جماعتی موجودہ نظام سرمایہ داری کی مخالفت میں پیدا ہوا ہے۔ نظام سرمایہ داری میں عجیب بات یہ ہے کہ اِس میں جماعت بندی کے مذکورہ بالا تینوں اصول کارفرما ہیں۔ اِس میں زیادہ تر تو وہی طاقت کا اصول ہے، وہی جس کی لاٹھی اُس کی بھینس یا جس کی دولت اُس کی بھینس۔ یہی وہ اصول ہے جو چند ہزار سرمایہ داروں کے ہاتھ میں کروڑوں محنت کش مزدوروں کے جسم (اور ان کی

روحیں!) دیدیتا ہے۔ اور دولت واقتدار کے سامنے اسی کی وجہ سے اخلاق و مذہب، انصاف وعدل کے تمام اصول ماند پڑ جاتے ہیں لیکن ہرچند کہ زیادہ اثر اس نظام میں طاقت کے فطری اصول ہی کا ہے تاہم یہ نہیں کہ دوسرے اصول بالکل کارفرما ہوں، سرمایہ داری نے اپنے نظام کا ایک گوشہ کو تمامتر اصولِ عقلی کے زیرِ فرمان بھی کر دیا ہے۔ اور وہ کاروباری زندگی کا گوشہ ہے۔ سرمایہ دار اپنا تسلط بھی قائم کرنا چاہتا ہے، غیر عقلی آرزوؤں کا شکار بھی ہوتا ہے لیکن منافع کے اصول سے سرمو انحراف نہیں کر سکتا۔ معاشی زندگی کے اس شعبہ میں بہی کھاتہ اس کی کتاب مقدس ہے۔ پھر زندگی کے بعض حصے سرمایہ داری کے نظام میں محبت کے اصول کے لئے بھی وقف ہیں مثلاً خاندانی زندگی سے ابھی اس مقدس اصول کو خارج نہیں کیا گیا ہے۔ یا قومی جنگوں کے وقت اب بھی اس کے مظاہر دکھائی دیتے ہیں۔

سرمایہ داری کے بنیادی اصولوں اور محرکات کی اس بوقلمونی کے مقابلہ میں اشتراک صرف ایک اصول کی حکومت چاہتا ہے۔ عقل کی! سرمایہ داری نے کاروباری زندگی کے جس گوشہ میں عقل کو فرمانروا بنایا تھا اشتراک اس پر قانع نہیں اور وہ زندگی کے سب شعبوں کو اس کے سپرد کرنا چاہتا ہے۔ طاقت واقتدار کے اصول کو حرام جانتا ہے اور محبت کے دعاوی کو حرفِ غلط سمجھتا ہے۔ اسکی صدا ہے عقل، عقل، عقل!

∴

یہ اصولِ اعلیٰ جس کے مطابق معاشرتی زندگی کو ترتیب دیا جاتا ہے مختلف لوگ جدا جدا طریق پر نکالتے اور بناتے ہیں۔ کسی کے لئے ان کا مخرج وحی و تنزیل کا سرچشمہ ہوتا ہے، کوئی فلسفہ سے یہ اصول نکالتا ہے، کوئی تجربہ سے۔ چنانچہ ان اختلافات کی وجہ سے اشتراک بھی ایک قسم کا نہیں ہے بلکہ اس کی متعدد اقسام ذہنی اور عملی دنیا کے سامنے پیش ہو چکی ہیں۔ لیکن موجودہ زمانہ میں جس مذہب اشتراک نے فروغ پایا ہے وہ وہ اشتراک

ہے جس کی تعلیم مدون شکل میں مارکس اور اُس کے دوست انگلس نے دنیا کے سامنے
پیش کی۔ زمانۂ حال میں سرمایہ داری کے خلاف جو ردعمل ہوا اور ہر ملک میں مزدوروں
اور ناداروں کی جو تحریکیں اٹھیں اُس کی ذہنی ترجمانی اس جدید اشتراک نے کی۔ اور
چونکہ یہ تحریکیں خود موجودہ نظام جماعت کی بنیادی خامیوں کے باعث ناگزیر تھیں اسلئے
اس ذہنی تعلیم نے بھی جس کا نام ہم "اشتراکِ جدید" رکھتے ہیں بہت فروغ پایا اور
اشتراکی زندگی کے دوسرے نظام بالکل پس پشت پڑگئے۔ ان دوسرے نظاموں کو
سمجھنا اس وقت محض تاریخی یا علمی دلچسپی کی چیز ہے۔ لیکن "اشتراکِ جدید" کا فہم تو
موجودہ دنیا کے اہم ترین مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ ہم اس سلسلۂ مضامین میں
اسی "اشتراکِ جدید" کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

∴

کسی چیز کو "سمجھنے" کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں۔ آپ اس کے معنی و مفہوم کو ذہن نشین
کرنے کی کوشش کرسکتے ہیں اور متعلقات و زوائد کی الجھنوں میں سے اس کے بنیادی
اصولوں کو نکالکر اس کی اصلی غرض و غایت کو اپنے سامنے لاسکتے ہیں۔ یا یہ ہوسکتا ہے
کہ آپ اُس کے منبع و مخرج کو معلوم کریں اور اُس کے عالم وجود میں آنے کے اسباب
و علل کو دیکھکر اس کی ہیئت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ یا ایک صورت سمجھنے کی یہ بھی ہے
کہ اس چیز کے معنی اور اس کے اسباب کو جانکر آپ اسے بعض مقررہ معیاروں پر پرکھیں
یعنی تنقیدی طور پر اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔

اس مضمون میں ہم اشتراک کو اس کی اصل کے اعتبار سے سمجھنے کی کوشش کرینگے۔
ہم اس جگہ اس ماحول کا مختصر سا ذکر ناظرین کے سامنے پیش کرتے ہیں جس میں اشتراک
کے مسلک نے جنم پایا۔ اس کے بعد ان شخصیتوں کا حال بیان کریں گے جنکی کاوشوں
سے اس ذہنی پودے کی آبیاری کی اور ان رائج الوقت تصورات و خیالات کا جنہوں

نے اس کی نشو و نما میں حصہ لیا۔ اور اس طرح مذہب اشتراک کی موجودہ شکل میں رونما ہونے کے اسباب تین حصوں میں ہمارے سامنے آجائیں گے یعنی جماعتی حالات، رائج الوقت تصورات اور بانیوں کی ذہنی کیفیات۔

جماعتی حالات

اشتراک جدید کا مسلک مغربی تاریخ کے اُس عہد کی پیداوار ہے جبکہ قرونِ وسطیٰ کے قائم کردہ تمام جماعتی بندھن کٹ رہے تھے، تمام وہ جماعتی ادارے جن میں فرد پناہ لیتا تھا منتشر ہو رہے تھے، تمدنی زندگی کے معیار بدل رہے تھے، ایمان جارہا تھا، علم آرہا تھا، بندشوں کی جگہ آزادیوں اور یقین کی جگہ شک کو مل رہی تھی لیکن اس عام انتشار اور بندکشائی کے عہد میں خاص طور پر ۱۸۳۰ء سے ۱۸۴۰ء تک کا زمانہ وہ زمانہ ہے جب مسلک اشتراکیت کے بیج یورپ کی ذہنی زمین میں بوئے گئے۔ جن کی آبیاری نہایت کاوش کے ساتھ دو شخصوں نے ۱۸۴۰ء سے ۱۸۴۷ء تک کی یعنی مارکس اور انگلس نے۔ ۱۸۴۷ء میں جبکہ کمیونسٹ منی فسٹو شائع ہوا ہے اشتراک کی کشت زار تیار تھی۔ اور اس سال کے بعد کوئی نیا ذہنی پودا اس میں نہیں لگا۔ صرف چمن بندی کے سلسلہ میں کچھ کانٹ چھانٹ ہوتی رہی اس لئے ہمیں ۱۸۳۰ء اور ۱۸۵۰ء کے درمیان کے زمانہ کے حالات پر نظر ڈالنی چاہیئے۔

معاشی حالات

اس زمانہ کی معاشی حالت میں سب سے اہم بات تو یہ تھی کہ سرمایہ داری کا نظام کچھ عرصہ سے اپنے مدارج عروج پر پہونچ چکا تھا۔ اس کی اچھائیاں اور بُرائیاں سب کے

سامنے آچکی تھیں۔ دنیا اس نئے دیو سے سہمی ہوئی تھی۔ اس کی تباہ کاریوں اور ہلاکت خیزیوں پر ہر ایک کی نظر پڑ رہی تھی۔ اس کی ریل پیل سے ہر کہ و مہ پریشان تھا اب یہ نہ تھا کہ معاشی اور جماعتی مسائل پر صرف ایوانِ حکومت میں بحث مباحثہ ہوتا ہو۔ ہر راہ چلتا اس نئی مصیبت کا احساس رکھتا تھا اور اس کا حل سوچتا تھا۔ اس زمانہ کی تصانیف کی فہرست اٹھا کر دیکھو مغربی یورپ کے ہر ملک میں بے شمار سرکاری تحقیقاتوں کی رپورٹیں ملیں گی جس میں مزدوروں کی حالت پر بحث ہے۔ ہر ملک میں اسی موضوع پر اچھی بری بے تعداد کتابیں ملیں گی۔ انگلستان میں ۱۸۳۹ء میں کارلائل نے اپنی کتاب Chartism لکھی اور ۱۸۴۳ء میں Past & Present۔ ۱۸۴۴ء میں کنگسلے نے Village Sermons شائع کی؛ ۱۸۴۵ء میں دسرائیلی نے Sybill or the two Nations۔ فرانس اور جرمنی میں بھی کثرت سے تصانیف نکلیں۔ اس مسئلہ پر غور و بحث کے لئے ہر طرف انجمنیں قائم ہوئیں۔

دیکھنے والے دیکھتے تھے اور لکھتے تھے کہ نئی صنعت نے خصوصاً ریل اور تار نے سارے جماعتی نظام کی شکل ہی بدل دی۔ لوگ سمجھتے تھے کہ سرمایہ دار کے وجود اور اس کی ترقی کے لئے یہ ضروری ہے کہ روز تغیر ہو روز تبدل۔ لوگوں نے پیدائش دولت کے طریقوں کی نت نئی تبدیلیوں کو محسوس کیا، ہر وقت دلچسپ کے عدم تیقن و گھبراہٹ سے پریشان ہوئے، آدمی آدمی کے درمیان تمام قدیم رشتوں کے کٹنے اور صرف خودغرضی کے رشتہ کے باقی رہ جانے پر مرثیہ خوانی کی، نودولتیوں کی بدتمیزیوں پر چلا اٹھے۔ لیکن سب سے زیادہ یہ زمانہ متاثر تھا افلاس و فلاکت کے اس منظر سے جو روزافزوں دولت و مرفہ الحالی کے دوش بدوش ابر غم کی طرح ملکوں کے ملکوں پر چھایا جا رہا تھا۔ اگر دیہاتوں میں زراعتی مزدوروں کی مصیبت تھی، تو صنعتی کام کرنیوالوں پر بھی آبنی تھی۔ کھیتر بھی روتا تھا اور جولاہا بھی۔ کانوں کے علاقوں میں صنعت کو فروغ

تھا لیکن بے گھر بے در مزدوروں کی فوج میں انسانوں کے غول کے غول داخل ہوتے جاتے تھے، شہروں میں سربفلک عمارتیں بن رہی تھیں، لیکن جن کے خون کو پسینہ کرنے سے یہ سب کچھ ممکن ہوا تھا ان کی جسمانی و روحانی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ سختی سے کام لینے کی شرمناک سے شرمناک صورتیں موجود تھیں۔ لوگ یہ سب کچھ دیکھتے تھے اور یہ بھی کہ خود کام کی نوعیت بدل گئی، پہلے کام ہر مزدور کی شخصیت سے ایک گہرا تعلق رکھتا تھا، اب مشینوں کی ایجاد اور تقسیم عمل کے اصول نے اسے ایک غیر دلچسپ اور بے روح مشغلہ بنا دیا تھا۔

ایک طرف دولت بڑھ رہی تھی دوسری طرف افلاس، ایک طرف مرفہ الحالی کی حکومت تھی دوسری جانب فلاکت و ادبار کی۔ صنعت ترقی کر رہی تھی لیکن لوگ اور بھی غریب ہوتے جاتے تھے، مشینیں اتنا مال بنا دیتی تھیں کہ خریدنے والے نہ ملتے تھے۔ کارلائل نے لکھا ہے: "تمہارے بُنے ہوئے قمیص کس کام کے؟ اُدھر دوکانوں میں دیکھو لاکھوں کی تعداد میں رکھے ہیں اور اِدھر لاکھوں محنت کش برہنہ تن ان کے انتظار میں ہیں لیکن یہ انہیں نہیں ملتیں۔" ضرورت سے زیادہ اشیاء کے پیدا ہونے سے جلد جلد کاروباری دنیا میں بحرانی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ وبائی مرض کی طرح یہ مصیبت نہایت پابندی سے کچھ کچھ سال بعد رونما ہوئی تھی۔ چنانچہ ۱۸۱۷ء میں آئی پھر ۱۸۲۵ء میں، ۱۸۳۶ء میں ظاہر ہوئی پھر ۱۸۴۷ء میں۔ مال بہت، خریدنے والے ندارد۔ کارخانے بند کیے جاتے تھے، مزدوروں کے لئے مزدوری نہ تھی۔ محنت کش کے لئے محنت کا دروازہ بند اور فاقہ اور موت کی راہ کھلی ہوئی۔

سیاسی حالات

سیاسی حالات میں سب سے اہم چیز یہ تھی کہ نپولیانی جنگوں کے بعد سے لوگ امن میں بسر کر رہے تھے۔ اور امن کی زندگی نے امن پسندی کا جذبہ بھی پیدا کر دیا تھا۔ قوموں

اور ریاستوں کی نظر اپنے رعب و داب، فتوحات و جنگ آزمائی کی طرف سے ہٹی ہوئی تھی بجائے اس کے کہ ریاستیں اپنے اپنے اغراض کی فکر میں پڑی ہوں اور اپنی ہی غرض کو فلسفہ سیاسی کا اصول اعلیٰ قرار دیتی ہوں اب اغراض ملکی و سیاسی سے بالاتر اصولوں کی حمایت شروع ہو گئی تھی مثلاً آزاد تجارت کا اصول۔ غرض اس عہد کی خصوصیت یہ تھی کہ ملکی اور خارجی سیاست کا صحیح احساس بہت کم ہو گیا تھا اور اس عہد کو "غیر سیاسی عہد" کہہ سکتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ قومیت کے اصول پر اس زمانہ میں خاصہ زور دیا گیا لیکن یہ ہمیشہ ملکوں کے داخلی اور اندرونی مسئلہ کی حیثیت سے اور انقلابی خیالات کے ساتھ ساتھ۔ اصول قومیت اور انقلاب کا تعلق یونان، پولینڈ، بلجیم کے معاملوں میں نظر آتا ہے۔ اُدھر انگلستان میں چارٹسٹ تحریک سراسر انقلابی تحریک تھی۔ فرانس میں بھی دنیا بھر کے خارج البلد انقلابی اور خود فرانس کے اشتراکی اور کمیونسٹ انتہا پسند انقلابی تحریک کو زندہ رکھنے کے لئے کافی تھے۔ اٹلی میں اسی انقلاب کا مجسمہ میزینی تھا۔ جرمنی میں بھی انقلابی پارٹی موجود تھی اور اگرچہ بہت قوی نہ سہی لیکن پروشیا کی احمق حکومت اس سے اس درجہ خائف تھی کہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ بس دو چار ہی مہینہ میں کمیونسٹ حکومت قائم ہو جائے گی۔

سرمایہ داری نظام سے بے اطمینانی و بیزاری، فکر سیاسی کے انحطاط اور انقلاب و تغیر کی خواہش کی فضا میں اشتراک کے مسلک نے نشو و نما پائی۔ ذہنی اعتبار سے مختلف تصوراتِ رائج کا اس پر اثر پڑا۔ لیکن اس کا صحیح تعین کہ کن خیالات اور کس فلسفہ نے اس پر سب سے زیادہ اثر ڈالا ظاہر ہے کہ بہت مشکل کام ہے۔ کسی نے اسے پروٹسٹنٹ ذہنیت کا نتیجہ قرار دیا ہے [۵۴]۔ کسی نے کیتھولک خصوصاً فرانسیسی کیتھولک مذہب کا [۵۵]، اکثر مورخین

---

[۵۴] Felix — Cathrein — Masaryk

[۵۵] Dostojewski

نے غلطی سے اسے جرمن کلاسکی فلسفہ سے مشتق گردانا ہے اور مارکس و انگلس کی تعلیمات اور کانٹ، فشٹے اور ہیگل کے فلسفہ میں نہایت گہرا تعلق جتلایا ہے۔ یہ آخری رائے اب تک بہت عام تھی لیکن جرمنی کے مشہور معاشی ورنرزومبارٹ نے حال میں اسے غلط ثابت کردیا ہے اور واضح طور پر بتلا دیا ہے کہ اشتراک جدید کو جرمن کلاسکی فلسفہ سے دور کا تعلق بھی نہیں ہے۔ اس مصنف کی رائے میں اشتراکِ جدید کا ذہنی شجرۂ نسب یہ ہے:-

اشتراک جدید

مارکس اور انگلس کی تعلیم

سابقہ انگریزی اور فرانسیسی اشتراکی (موورتی، گاڈون، اوون، مین سیمون فوریے، پرودھان وغیرہ)

سابقہ جرمن اشتراکی (سوسی ہس، وائٹلنگ وغیرہ)

مادہ پرست فلسفی (فائرباخ)

اٹھارویں صدی کا فرانسیسی فلسفہ

۱۷ویں اور ۱۸ویں صدی کا انگریزی فلسفہ (یعنی ہابس، لاک، شیفٹس بری، مینڈول کی تعلیمات)

کالونیت

جیسوئیٹ

یہودی ذہنیت

یونان کے دَورِ انحطاط کا فلسفہ
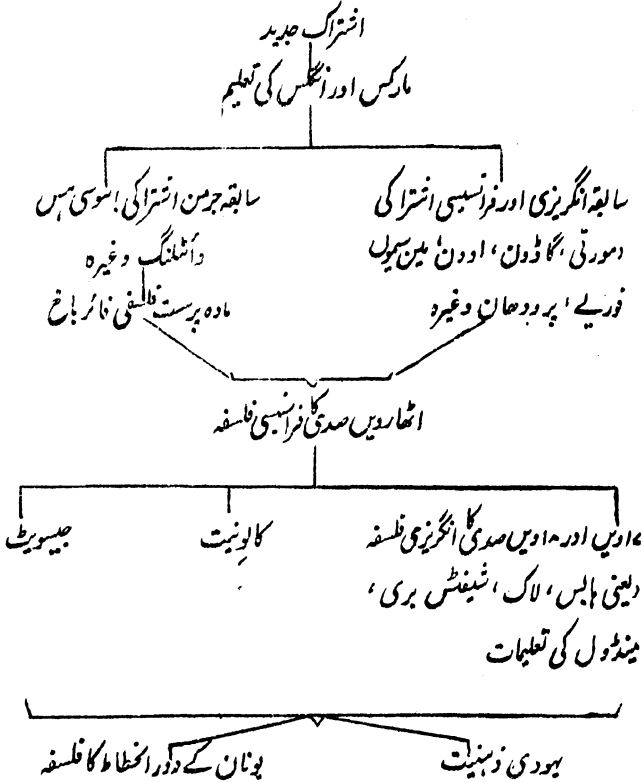
ہم نے سطور بالا میں ان عام جماعتی حالات کا ایک خاکہ پیش کردیا ہے جن میں اشتراک کی تدوین ہوئی اور ان ذہنی تحریکوں اور تعلیموں کا ذکر جن سے یہ مشتق ہے۔ لیکن اشتراک

کے تاریخی فہم کے لئے ماحول مادی وذہنی کا یہ بیان کافی نہیں۔ خیالات و مذاہب بیشک اپنے ماحول سے بہت متاثر ہوتے ہیں لیکن باوجود اس تمام تاثر کے وہ پھر بھی اپنے بانیوں کی نفسی کیفیت اور اُنکی ذہنیت سے بہت گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ شاید بڑے سے بڑا آدمی اپنے خیالات میں ماحول سے غیر متاثر نہ رہتا ہو لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ کسی بڑے آدمی کی تعلیم محض ماحول کے اثرات کا مکانیکی نتیجہ نہیں قرار دی جاسکتی۔ اس لئے اِن حالات گردوپیش کے علاوہ ہمیں اشتراک جدید کی اصل کو سمجھنے کے لئے اس کے بانیوں کی کیفیات نفسی پر بھی نظر ڈالنی چاہئے۔ یہ کام ہم انشاءاللہ کسی آیندہ مضمون میں انجام دینے کی کوشش کرینگے۔
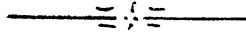
نئی دہلی

رہتے رہتے حیدرآباد اب ہمارا وطن نہیں تو مسافر کا گھر ضرور ہو گیا ہے۔ پھر بھی کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی ضرورت سے دہلی جانا ہو ہی جاتا ہے۔ ابھی تھوڑے دن ہوئے اپریل میں کچھ دنوں کے لئے دہلی گیا تھا۔ گرمی کا پورا زور تو نہ تھا، ہاں مزا آنے لگا تھا۔ لاٹ صاحب کے کچھ دفتر شملہ جا چکے تھے۔ کچھ جا رہے تھے۔ نئی دہلی چوپٹ تھی۔ مگر اصلی دلّی میں وہی چہل پہل تھی۔ دس دن ٹھیرا۔ عزیزوں سے ملا، دوستوں سے ملا۔ بنواری لال کا مکان دیکھا۔ نانک چند کی کوٹھی دیکھی۔ لالہ سری رام کا حال دیکھا۔ واحدی صاحب کے ہاں دعوت کھائی۔ خواجہ حسن نظامی صاحب نے دہلی کے اہل قلم سے ملاقات کرائی۔ ہر چیز دیکھتا اور خوش ہوتا۔ ہر شخص سے ملتا اور لطف اُٹھاتا۔ دل باغ باغ تھا کہ دلی پھر نئے سرے سے دلی ہو رہی تھی۔ مگر چلنے سے ایک دن پہلے مرزا قمر سے جو باتیں جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ہوئیں اُس سے سارا جوش ٹھنڈا ہو گیا۔ دل بیٹھ گیا اور اس وقت سمجھ میں آیا کہ دلی کیا تھی اور کیا ہو گئی۔

مرزا قمر کو مرزا قمر کہوں تو دلی والا تو کوئی نہ سمجھے۔ ہاں مرزا چھکڑا کہوں تو سب سمجھ جائیں۔ ان کو بھی پرانی دلی کا ایک کھنڈر سمجھو۔ چند روز کی ہوا کھا رہے ہیں۔ زمانہ کا ایک آدھ تھپیڑا پڑا اور ان کا خاتمہ ہے۔ پہلے اچھے کھاتے پیتے لوگوں میں تھے — ساٹھ ستر ہزار کی جائداد تو دو ہزار کے تمسک میں برابر ہو گئی۔ کچھ یہی کچھی رہ گئی ہے وہ ٹوٹ پھوٹ کر ٹھیکرا ہے۔ انھوں نے اپنے خرچ کم نہیں کئے۔ زمانہ نے سوا ان کی جائداد کے ہر چیز کی قیمت بڑھا دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس جائداد کو بھی گروی ڈالنا پڑا۔ نالش ہوئی ہے۔ کوئی دن میں وہ بھی جاتی ہے۔ اس سے پہلے ہی یہ مرجائیں تو

اچھا ہے۔

نام تو ان کا مرزا فخر الدین ہے مگر ان کی وضع قطع، ان کے بھاری بھرکم جسم اور ان کی ٹھمک چال کی وجہ سے ساری دلی ان کو مرزا جھکڑا کہتی ہے۔ پڑھے لکھے خاک نہیں۔ پھر بھی اپنے کو شاعر سمجھتے ہیں اور ایک چھوڑ دو دو تخلص خیال اور دل رکھ لیے ہیں۔ ان دونوں میں سے کوئی استعمال میں تو آتا نہیں۔ ہاں یونہی شوق میں ایک نام کے تین نام کر لئے ہیں۔ خیر یہ جتنے چاہیں نام رکھ لیں دلی والے تو ان کو مرزا جھکڑا کہتے ہیں اور یہی کہیں گے۔ تمام دلی کی وضع بدل گئی اور نہ بدلی تو ان کی اور بدلنے کیوں لگی۔ دلی کے جو جھکڑے پہلے تھے وہ اب بھی ہیں۔ رتی برابر فرق نہیں ہوا جب وہ نہ بدلے تو یہ کیوں بدلنے لگے۔ پرانی وضع پر جان دیتے ہیں، نئی وضع پر لعنت بھیجتے ہیں۔ آج کل کی کسی بات کی تعریف سنی اور پیچھے پڑ گئے۔ لوگوں کو مذاق ہاتھ آگیا ہے۔ ایک آیا لاٹ صاحب کی کوٹھی کی تعریف کر گیا، انھوں نے مذمت شروع کی۔ ابھی یہ بات ختم نہ ہوئی تھی کہ دوسرے نے آکر کسی اور چیز کی تعریف کر دی۔ یہ پہلا سلسلہ چھوڑ دوسرے کے پیچھے پڑ گئے۔ لوگ بیچارے کو بہت ستانے لگے ہیں۔ میں نے دس برس پہلے بھی ان کو دیکھا تھا اس وقت یہ حالت نہ تھی۔ اب کچھ باؤلے سے ہو گئے ہیں۔ اسی برس کی عمر ہے آخر دماغ کہاں تک کام دے۔ یہ دوسروں پر بگڑتے ہیں دماغ ان سے بگڑ بیٹھا ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ نئی دہلی کے یہ ایسے دشمن ہیں۔ اگر معلوم ہوتا تو بیچارے کو ناحق کیوں پریشان کرتا۔ چلنے سے ایک دن پہلے شام کو کوئی ساڑھے پانچ بجے گھر سے ٹہلنے نکلا۔ جامع مسجد قریب ہی ہے خود بخود پاؤں اِدھر اُٹھے کیا دیکھتا ہوں کہ شربت والے کی دوکان کے قریب رومال بچھائے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر مرزا صاحب بیٹھے ہیں۔ میں نے جا کر سلام کیا۔ پہلے تو آنکھوں کو چندھیا کر ذرا شست لگائی۔ جب یوں کام نہ چلا تو آنکھوں کے سامنے ہاتھ کا چھجہ بنا کر غور سے

دیکھا اور ایک دفعہ ہی گھبرا کر کھڑے ہوگئے " اوہو! میاں فرحت ہیں۔ کہو بیٹا تم یہاں کہاں۔ ہم تو سمجھے تھے کہ تم حیدرآباد ہی کے ہو لئے۔ آخر آئے مگر بھئی بہت دنوں میں آئے " میں نے کہا " مرزا صاحب کیوں نہ آتا دلی کہیں ہم سے چھوٹ سکتی ہے " کہنے لگے " دلی۔ بیٹا! دلی تو بہت دن ہوئے جنت کو سدھاری۔ اب یہ دلی تھوڑی ہے یہ تو لاہور کی اماں ہے۔ جاؤ جائداد بیچ کر کہیں اور جا بسو۔ اب یہ تمہاری دلی نہیں رہی یہ دوسروں کی دلی ہوگئی " مجھے کیا معلوم تھا کہ نئی دہلی کی تعریف سن کر ان کے آگ لگ جاتی ہے۔ میرے منہ سے نکل گیا " واہ مرزا صاحب واہ۔ دلی تو اب دلہن بن گئی ہے اور ابھی کیا۔ تھوڑے دنوں میں دیکھنا کیا سے کیا ہو جاتی ہے۔ کبھی ادھر آئے بھی؟ یا یونہی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھے بیٹھے نئی دہلی کو صلواتیں سناتے ہو " میرا اتنا کہنا تھا کہ بپھر گئے۔ ہاتھ پکڑ کر جھٹکا دیا۔ کہا " آ۔ بیٹھ۔ میں تجھے تیری دلی کی تعریف سناؤں۔ تجھے معلوم بھی ہے کہ دلی کا دل کیا تھا " میں نے کہا " چاندنی چوک " کہنے لگے " ہٹ تیرے جھوٹے کی۔ شرماتا کیوں ہے۔ چاوڑی کیوں نہیں کہتا۔ کہیں بڑی جگہ نوکر ہوگیا ہے جو چاوڑی کو چھوڑ چاندنی چوک کی تعریف پر اتر آیا ہے۔ بیٹا دلی کا دل چاوڑی ہے۔ اب تو جاکر چاوڑی کو دیکھ کیا رنگ ہے۔ جب دل ہی بگڑ گیا تو شہر کیا رہا۔ اب جامع مسجد سے لگا کر اجمیری دروازہ تک چلا جا۔ وہ وہ شکلیں نظر آئیں گی کہ خدا کی پناہ۔ نہ وہ اللہ دی غازی آباد والی رہیں، نہ نور جہاں، نہ وہ حشمت ہے، نہ وہ میرٹھ والی زہرن۔ زہرن تو تجھے یاد ہوگی۔ اب اس کے قاضی حوض والے کوٹھے کو جاکر دیکھ ایک پہلوان بیٹھے ہیں، تھوبڑا سا منہ، بیل کے سے دیدے، یہ موٹی ناک۔ ڈھیلا ڈھالا لٹھے پوزوں کا سا لباس۔ منہ کے سامنے بجلی کا لمپ رکھا ہے۔ یہ جئے یہ ہیں بی صاحبہ اور کس جگہ آکر بیٹھی ہیں کہ بی زہرن جان کی جگہ۔ اوپر جائیے تو نہ سلام نہ مزاج پرسی۔ نہ پان ہے نہ چھالیہ۔ جاتے ہی مطلب کی باتیں شروع ہو جاتی ہیں اور

ماشاراللہ گفتگو ایسی شستہ زبان میں کی کہ منہ سے پھول جھڑنے لگے ۔ گالی بغیر تو بات ہی نہیں ہوتی ۔ بھلا ان کے ہاں پان کہاں ۔ یہ نہ پان کھائیں نہ پان بنانا جانیں ۔ کسی نے بے حیا بنکر پان مانگا تو دو پیسے نکال پھینکدئے ۔ نیچے پنواڑی کے ہاں سے پان آگئے ۔ ہاں حقہ بہت پیتی ہیں ۔ حقہ آیا تو وہ آیا کہ گنوار بھی اس کو منہ لگاتے ذرا گھبرائیں ۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو سارے کا سارا مل کر کوئی دس سیر کا ہوگا ۔ نیچہ پر بان لپٹا ہوا ۔ نے اتنی موٹی جیسے پھکنی ۔ چلم ایسی کہ سوا پا تمبا کو آئے ۔ لیجئے حقہ حاضر ہے ۔ حقہ کا پانی ٹپکا چلا آرہا ہے ۔ یہ بھی کوئی نہیں دیکھتا کہ چاندنی پر رکھا گیا تو دھبہ پڑجائے گا ۔ اب ہے کوئی ہمت والا جو اس حقہ کا ایک دم بھی لگائے ۔ کھانستے کھانستے دم نہ نکل جائے تو میرا ذمہ ۔ اب فرما رہی ہیں "پیجئے ۔ پیجئے ۔ امبرسر کا تمبا کو ہے ۔ کل ہی سردار صاحب نے لاکر دیا ہے"۔ بھلا کس کی شامت آئی ہے جو اس حقہ کا دم لگاکر مفت میں اپنی جان کو مصیبت میں ڈالے اور خود بی جان نے جو دم لگایا تو حقہ بھی چیخ اٹھا ۔ منہ اوپر کرکے جو دھواں چھوڑا تو معلوم ہوا کہ قطب کی لاٹ کمرہ میں آکر کھڑی ہوگئی ۔ یہ میں نے اُس رنڈی کا ذکر کیا ہے جو اس وقت چاوڑی کی ناک کہی جاتی ہے ۔ دوسروں کی کچھ نہ پوچھو ۔ ان کے ہاں تو دروازہ ہی پر ٹکٹ بٹتا ہے ۔ پہلے زمانہ کی چاوڑی تو تجھے یاد ہوگی گرمی کا موسم ہے ۔ ادہر شام ہوئی اُدہر سب کمرے روشن ہوگئے ۔ یہاں گانا ہو رہا ہے ، وہاں گانا ہو رہا ہے ۔ شوقین بیٹھے سن رہے ہیں ۔ شریف لوگ سفید براق کپڑے پہنے ، موتیا کے گجرے گلے میں ڈالے ، مولسری کی لڑیاں ہاتھوں میں لپیٹے سڑک پر ٹہل رہے ہیں ، چہل قدمی بھی ہو رہی ہے ، گانے کا لطف بھی آرہا ہے ۔ بارہ ایک بجے تک یہی گھما گھمی رہی ۔ اس کے بعد سب اپنے اپنے گھروں کو جا آرام سے سو رہے ۔ اب چاوڑی میں رات کو جائیے تو دوسرا ہی رنگ نظر آتا ہے ۔ برآمدوں میں کھمبوں سے لگی رنڈیاں بیٹھی ہیں ۔ ابھی اندر گئیں ، ابھی باہر آئیں ، پھر گئیں ، پھر آئیں ۔ ایک

آدہ کوٹھے پر رُوں رُوں رُوں رُوں بھی ہو رہی ہے۔ مگر گانا کیا ہے۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بی جان اپنی اماں کو یاد کرکے رو رہی ہیں۔ سنتا ہوں اب سب کی سب جاؤڑی سے نکالی جانے والی ہیں۔ اچھا ہوگا خس کم جہاں پاک۔"

میں نے کہا "مرزا صاحب، بھلا رنڈیوں سے اور دلی کے اچھے بُرے ہونے سے کیا واسطہ؟" کہنے لگے "واہ۔ بیٹا۔ واہ۔ خوب سمجھے۔ اور ننھے بن جاؤ۔ یار عزیز انہیں سے تو دلّی دلّی تھی نہیں تو دلّی میں رکھا ہی کیا تھا۔ ذرا حکیموں کے مطب میں جاکر دیکھتے تو معلوم ہوتا کہ دلی کی زبان کا سنبھالنے والا کون ہے۔ کبھی کسی کوٹھے پر گئے ہوتے تو کھلتا کہ آدابِ مجلس کس کو کہتے ہیں۔ ذرا ان کے بننے سنورنے کو دیکھتے تو پتہ چلتا کہ لباس کس کو کہتے ہیں۔ ذرا ان کے گھروں کو دیکھا ہوتا تو سمجھتے کہ سلیقہ کس کو کہتے ہیں۔ میاں۔ رنڈیاں دلّی کی تہذیب کا نمونہ تھیں۔ لاکھ عورتوں میں سے الگ نکال لوں کہ یہ دلّی کی رنڈی ہے۔ اب جیسی روح ہے ویسے فرشتے ہیں۔ خیر تم بڑے متقی پرہیز گار سہی۔ رنڈیوں کو چھوڑو.... شہر والوں کو لو۔ لعنت ہے ان کی شکل پر۔ یہ دلی والے ہیں۔ خدا کے لئے سچ کہنا۔ کیا ان کو کوئی دِلّی والا کہیگا۔ بال دیکھو تو جھاڑ جھنکار، منہ دیکھو تو ہیجڑوں کا سا۔ لباس دیکھو تو سبحان اللہ۔ نیچے قمیص ہے اوپر کرشاٹونوں جیسا چھوٹا کوٹ، ٹانگوں میں دو تھیلے چڑھائے گٹ بٹ گٹ بٹ کرتے چلے آرہے ہیں۔ لیجئے یہ ہیں آپ کے دلی والے۔ یہ تو یہ کمبخت عورتوں نے بھی کچھ اپنی عجیب وضع بنالی ہے۔ انگیا، کرتی اور ڈھیلے پیجامے تو غدر کے ساتھ گئے۔ چوڑی دار تنگ پیجامے اور کرتے دربار کے ساتھ رخصت ہوئے۔ اب لباس کیا ہے بس یہ سمجھ لو کہ کہیں کی اینٹ اور کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا۔ سلیقہ کا یہ حال ہے کہ بچوں کی مالک آیا، باورچی خانہ کی مالک ماما، سینے پرونے کے ذمہ دار درزی، درزی نہیں ماسٹر ٹیلر۔ اب ان کو گھر والیاں کون کہے گا۔ شام ہوئی اور بیگم صاحبہ ہوا خوری کو نکلیں۔

صاحب ایک طرف گئے، میم صاحب دوسری طرف گئیں۔ اب نہ اُن کو اِن کی خبر اور نہ اِن کو اُن کی۔ یعنی یہ آپ کی دلی کی حیا و شرم رہ گئی ہے۔ کچھ بچے کھچے گھرانے اپنی پرانی چال پر چل رہے ہیں لیکن کب تک۔ خربوزہ کو دیکھکر خربوزہ رنگ بدلتا ہے۔ وہ بھی یا اِسی بھیڑیا چال کو اختیار کریں گے یا نکو بن جائینگے"۔ میں نے کہا "مرزا صاحب یہ تو نہ کہو۔ پردہ تو اب بھی دلی میں خاصہ ہے"۔ کہنے لگے "اوہو۔ تو ماشاءاللہ آپکے میاں کچھ اس سے بھی زیادہ تیز رنگ ہے۔ بندۂ خدا۔ یہ کوئی پردہ میں پردہ ہے۔ پہلے باہر پھرنے والیاں بھی نکلتی تھیں تو اوڑھے پہنے، برقع اوڑھتی تھیں تو اس طرح کہ صرف ایک آنکھ باہر رہے، نہ اس طرح جیسے اب پھرتی ہیں۔ برقع تو اب بھی ان کے سر پر ہے لیکن پلو ہیں کہ ہوا میں اِدھر اُدھر اڑ رہے ہیں۔ خود ہیں کہ برقع سے دو قدم آگے مردمیدان بنی چلی آرہی ہیں۔ اب برقع کو برقع سمجھ کر تھوڑی اوڑھا جاتا ہے۔ صرف یہ بتانا ہوتا ہے کہ ہم مسلمان ہیں۔ رسم چلی آتی ہے اس کو پورا کر رہے ہیں۔ جب اپنے ہی بُرے ہو گئے تو دوسری قوم والوں کو میں کیا کہوں۔ بس یہ سمجھ لو کہ پہلے جن کی انگلی نہیں دکھائی دیتی تھی اب اُن کی پنڈلیاں دکھائی دیتی ہیں۔ ارے بھئی یہ تو جو کچھ تھا سو تھا۔ اب دل بھی تو صاف نہیں رہے ہیں۔ ایک دوسرے کو کھائے جاتے ہیں۔ ہندو مسلمانوں سے بیزار، مسلمان ہندوؤں سے بیزار۔ بات بات پر کٹے مرتے ہیں۔ ذرا کلو نے ملا کر گالی دی یا ملوا نے کلو کو مارا تو سمجھ لو کہ قیامت آگئی۔ کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ میاں معاملہ کیا ہے۔ آخر لڑنے کا سبب کیا تھا۔ مسلمانوں سے پوچھو تو کہتے ہیں ہم کچھ نہیں جانتے مسلمان کو ہندو نے کیوں مارا ہندوؤں سے پوچھو تو وہ کہتے ہیں میاں پرے ہٹو۔ ہم کو اس سے غرض نہیں کہ کیا ہوا۔ ہندو کو مسلمان نے کیوں گالی دی۔ جو ہے آپے سے باہر ہوا جاتا ہے۔ جس کو دیکھو بھوکے شیر کی طرح بپھر رہا ہے۔ آج اس کا سر پھوٹا۔ کل اُس کا خاتمہ ہوا۔ اسپتال

بھرے چلے جا رہے ہیں۔ ولایت سے دواؤں پر دوائیں چلی آ رہی ہیں۔ ڈاکٹروں کی فیسیں بھرتے بھرتے دیوالہ نکلا چلا جاتا ہے۔ اور ہے کیا کہ کلو نے ملو کو مارا۔ گوروں سے بھری موٹریں اِدھر سے اُدھر یوں یوں کرتی چلی جا رہی ہیں۔ توپیں کھڑا کھڑ کرتی اِدھر سے اُدھر دوڑ رہی ہیں۔ ہوائی جہاز چیلوں کی طرح سروں پر منڈلا رہے ہیں۔ فوجیں پرا باندھے یہاں کھڑی ہیں وہاں کھڑی ہیں۔ تلاشیاں ہو رہی ہیں۔ لوگ پکڑے جا رہے ہیں۔ جیل خانے بھر رہے ہیں۔ مقدمہ بازی ہو رہی ہے۔ کسی کو جنم قید ہوتی ہے۔ کوئی پھانسی پر لٹکایا جاتا ہے اور یہ سب کس لئے کہ ملو نے کلو کو گالی دی تھی۔ لیجئے یہ آپ کی دلی ہے اور یہ آپ کے دلی والے ہیں۔ کل ہی کا قصہ ہے میں بڑیوں کے کٹڑہ سے قاضی کے حوض آ رہا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ پنڈت کے کوچہ کے قریب دو بجار[1] لڑ رہے ہیں۔ سب راستے ہیں کہ بند ہیں۔ موٹریں، گاڑیاں، تانگے، ٹرام، پیدل غرض سارا راستہ کا راستہ رکا کھڑا ہے اور کسی کی ہمت نہیں ہوتی کہ آگے بڑھ کر اور دو لٹھ مار کر انکو علیحدہ کرے۔ آخر جب لڑتے لڑتے خود ہی تھک گئے اس وقت ایک بھاگا۔ دوسرا اُس کے پیچھے بھاگا۔ دو تین آدمی جھپیٹ میں آ گئے۔ جب کہیں جا کر راستہ کھلا۔" میں نے کہا "مرزا صاحب آخر مار کر بھگا دینے میں کیا ہرج تھا؟" کہنے لگے "میاں۔ ابھی تم نے دلّی دیکھی کیا ہے۔ ہٹانے میں ہرج۔ ارے بھائی خون خرابے ہو جاتے وہ کیا لفظ ہے تصادم۔ ہاں تصادم ہو جاتا۔ بین الاقوامی تصادم ہو جاتا۔" میں نے کہا "ہیں.... بین الاقوامی تصادم۔ یہ بھی آپ نے خوب کہی۔" کہنے لگے "ہاں۔ میاں۔ تم پڑھے لکھے ہو۔ ہماری زبان میں مین میخ نکالتے ہو۔ ہم تو

---

[1] دلی میں اُن بیلوں کو بجار کہتے ہیں جو کسی دیوتا کے نام پر چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ اُن کو سانڈ بھی کہتے ہیں مگر بجار (ب۔ ج۔ ا۔ ر) کا لفظ زیادہ مستعمل ہے۔

اب یہی سنتے ہیں کہ جب دو قومیں لڑتی ہیں تو اخبار والے اِس کو بین الاقوامی تصادم کہتے ہیں۔ اب جانے ہماری بلا۔ وہ صحیح کہتے ہیں یا غلط۔ انہی سے جاکر پوچھو کہ اِس کے کیا معنی ہیں۔ ہمارے زمانہ میں تو بڑے بڑے واقعات ہو جاتے تھے تو بین الاقوامی تصادم نہیں ہوتا تھا۔ کوئی پچیس تیس برس کی بات ہے کہ ہم پھول والوں کی سیر کو جا رہے تھے۔ تمکو یاد ہوگا سیدھی سڑک قطب کو جاتی تھی۔ اب بھی کبھی اِدھر گئے ہو۔ خدا نہ لیجائے۔ قطب جانا مشکل ہوگیا ہے۔ چاروں طرف سڑکیں ہی سڑکیں ہیں۔ بے لکھا پڑھا آدمی صبح کو چلے تو کہیں شام کو جاکر قطب پہنچے۔ اب اِدھر چلو۔ اب اِدھر مڑو۔ اب ادھر گھومو۔ اب ادھر جاؤ۔ ہر موڑ پر تختی لگی ہوئی ہے۔ پڑھنے والے پڑھ لیتے ہوں گے ہمارے تو خاک سمجھ میں نہیں آتا۔ جہاں دیکھو تختی پر ہاتھ بنا ہے۔ ایک انگلی آگے کو نکلی ہے یعنی اِدھر جاؤ۔ آخر ادھر جاؤ تو کہاں جاؤ۔ یہ تو ہم بھی جانتے ہیں کہ اِدھر بھی سڑک ہے کہیں جاتی ہی ہوگی لیکن جاتی کہاں ہے یہ کیونکر معلوم ہو۔ اگر ہاتھ کی جگہ قطب کی لاٹھ بنا دیتے تو سب سمجھ جاتے کہ یہ سڑک قطب جاتی ہے۔ مقبرہ بنا دیتے تو جان جاتے کہ یہ سڑک مدرسہ[1] کو جاتی ہے۔ سڑکیں کیا ہیں خاصی بھول بھلیاں ہوگئی ہیں۔ سڑک پر یہاں، وہاں جہاں دیکھو سپاہی کھڑے تھرک رہے ہیں۔ کبھی یہ ہاتھ اونچا کرتے ہیں کبھی وہ۔ کبھی ادھر پھیر جاتے ہیں کبھی اُدھر۔ غرض کیا کہوں دلّی کی سڑکیں بھی تماشہ ہوگئی ہیں۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ایک دفعہ ہم قطب جا رہے تھے منصور کے مقبرہ کے پاس جو پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک اونٹ گاڑی چلی آرہی ہے۔ اندر بیسیوں آدمی ٹھنسا ٹھس بھرے ہیں۔ چھت پر بوریاں لدی ہیں۔ ان کے بیچ میں بھی پانچ چھ گنوار دبکے دبکائے بیٹھے ہیں۔ میاں میواتی اونٹ کی نکیل تھامے سامنے کے تختے پر بیٹھے اونگھ رہے ہیں۔

---

[1] ہمایوں اور منصور کے مقبروں کو مدرسہ بھی کہتے ہیں۔

خدا کی قدرت دیکھو دوسری طرف سے ایک یکہ آرہا تھا یکہ میں تین سیلانی ایک بیچ میں دو اِدھر اُدھر، ایک ہاتھ سے چھتری کے ڈنڈے پکڑے دوسرا ہاتھ ٹوپی سنبھالنے کے لئے سر پر دھرے صاف ستھرے کپڑے پہنے چلے آرہے ہیں۔ یکہ والے نے ہری گھاس چھتری کے اندر باندھ رکھی تھی کہ قطب میں کام آئے گی۔ یکہ جو اونٹ گاڑی کے پاس سے گزرا تو میاں اونٹ کی نظر گھاس پر پڑی۔ انہوں نے بڑے اطمینان سے اپنی گردن بڑھا چھتری میں داخل کردی۔ سیلانیوں نے ہشت ہشت کی۔ اونٹ نے جو گھبرا کر گردن سیدھی کی تو یکہ گردن میں لٹک گیا۔ بھئی مزہ آگیا۔ اونٹ کے گلے میں بلّی تو سنی تھی یہ اونٹ کے گلے میں یکہ اسی دن دیکھا۔ خیر اِدھر ٹٹوانی نے ہاتھ پاؤں مارے، اِدھر یکہ والے نے غل مچایا، کچھ راہگیروں نے گڑبڑ کی۔ اونٹ نے جو گردن کو جھٹکا دیا تو یکہ، ٹٹو، سیلانی سب وہ جا کر گرے، چوٹیں بھی آئیں، کپڑے بھی خاک میں سلے، نقصان بھی ہوا، مگر نہ کچھ جھگڑا ہوا نہ ٹنٹا۔ یکہ والے نے کچھ گڑبڑ شروع کی تھی اس کو لوگوں نے ڈانٹ دیا کہ چل بے یہ ہوتا ہی ہے، نہ چھتری میں گھاس باندھ کر لاتا، نہ اونٹ گردن ڈالتا، نہ یہ تماشہ ہوتا۔ لیجیے معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ خدانخواستہ اگر آجکل یہ واقعہ پیش آجاتا تو بات کہیں کی کہیں پہنچتی، خوب کشم کشٹا ہوتی، لکڑی چلتی، نالشا نالشی ہوتی اور کیوں نہ ہوتی؟ کسی مسلمان کے اونٹ کا کسی ہندو کے ٹٹو کو زخمی کرنا کوئی معمولی بات ہے؟" میں نے کہا "تو مرزا صاحب آپ دلّی کی عورتوں سے تو خفا تھے ہی، مردوں سے بھی صاف نہیں!" کہنے لگے "مرد عورت کیا، میں تو دلّی کی ہر بات سے خفا ہوں۔ اب اس گھڑی ہی کو دیکھ لو۔ اب یہ گدڑی تھوڑی رہی ہے خاصہ بزازہ ہوگیا ہے جو ململ شہر میں نہ ملے یہاں سے لو۔ سودے والے ہیں وہ نئی نئی آوازیں نکالتے ہیں۔ اب جو یہ بی۔ اے۔ بی۔ اے پکار رہا ہے۔ جانتے ہو کیا بیچ رہا ہے۔ میاں کھیر بیچ رہا

ہے۔ بھلا اس آواز پر کوئی کیا آئے گا۔ کا ہچھی سب گونگے ہو گئے۔ یا کسی زمانہ میں گرمی کا موسم ہے تو آوازیں آرہی ہیں کالے اودے لگا دئے ہیں شربت کو، سانولے سلونے لگا دئے ہیں شربت کو۔ جاڑا ہے تو آوازیں آرہی ہیں گھونگٹ والی نے توڑے ہیں بیر۔ لاڈو پیاری نے توڑے ہیں بیر۔ اب کاچھی تو دلی سے ناپید ہو گئے۔ ہاں فتحپوری کے نیچے کچھ میوہ والے بیٹھے ہیں۔ وہ ٹھیرے کابلی۔ اُردو بھی کچھ یوں ہی سی جانتے ہیں۔ آوازیں کیا لگائیں گے اور لگائیں بھی تو لوگ ڈر کر بھاگ جائیں۔ پہلے چاندنی چوک میں یہاں سے وہاں تک میوہ والوں کی دوکانیں تھیں۔ نیچے نہر، اوپر درختوں کا سایہ، جا بجا فالودے والوں کی دوکانیں۔ دوکانوں کے سامنے کہیں بنچ بچھے ہیں کہیں مونڈھے پڑے ہیں۔ لوگ آئے، بیٹھے، اِدھر اُدھر کی باتیں کیں، پیسے دو پیسے کا شربت پیا، اُٹھے، چلے گئے۔ اب نہ وہ نہر ہے نہ درخت۔ فتح پوری سے لگا قلعہ تک صفاچٹ میدان ہے۔ گرمی میں یہاں سے وہاں جاؤ تو فنا ہو جائے یا وہ زمانہ تھا کہ دوپہر کو بھی اس سڑک پر بہار رہتی تھی، گھر میں وہ آرام نہ ملتا تھا جو یہاں ملتا تھا۔ اور اس چاندنی چوک کی سڑک تو دیکھو، کیا کالی بھٹ ہوئی ہے۔ ایک چکر لگا کر جاؤ تو یہ معلوم ہو کہ ابھی کوئلے بیچ کر آرہے ہو اور گرم ایسی کہ تنور بھی کیا ہو گا۔ دوپہر کو روٹیاں پکالو۔ کہتے ہیں سب سے زیادہ قیمتی سڑک یہی ہوتی ہے۔ ہاں بھائی ہوگی، ولایت کا مال لگا ہے، قیمتی کیوں نہ ہوگی۔ ایک دن رام لیلا دیکھنے نکلا تھا رات کے بارہ بجے تک تو یہ سڑک ٹھنڈی ہوئی نہ تھی۔ اور ہاں میاں فرحت، کبھی تم رام لیلا کے زمانہ میں بھی دلی آئے ہو؟" میں نے کہا "جی نہیں" کہنے لگے" ارے بھئی کیا کہوں۔ اس میلہ کے ٹوٹنے کا جتنا رنج کیا جائے کم ہے۔ پہلے جو سواری نکلتی تھی تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی بڑے بادشاہ کا جلوس جا رہا ہے۔ ہندو، مسلمان، امیر، غریب، شریف، رذیل سب کے سب کھانا وانا کھا، سفید کپڑے پہن چاوڑی

ہیں شام ہی سے نکل آتے۔ کوٹھے ہیں کہ روشنی سے بڑے جگمگ جگمگ کر رہے ہیں۔ رنڈیاں ہیں کہ بنی سنوری گاؤتکیوں سے لگی برآمدوں میں بیٹھی ہیں۔ نیچے سے کیہ بات ہوتی ہے اوپر سے جواب ملتا ہے۔ اُدھر سے پان آرہے ہیں ادھر سے روپے جارہے ہیں۔ بھیڑ کا یہ عالم ہے کہ کھوے سے کھوا چھلتا ہے، روشنی کا یہ عالم ہے جیسے دن نکلا ہو۔ سواری اس شان سے آتی کہ کیا کہوں۔ ہنسی خوشی چار پانچ گھنٹے گزار گھروں میں جا پڑے۔ اور اب کی سواری دیکھو تو واہ۔ واہ۔ واہ آگے توپ ہے، پیچھے توپ ہے۔ سامنے فوج ہے، پیچھے فوج ہے۔ سپاہی ہیں کہ ڈنڈے بجا رہے ہیں۔ ایک غل مچ رہا ہے کہ بڑھے چلو بڑھے چلو۔ کوٹھے بند ہیں اور ان کا بند ہونا ہی اچھا۔ بھلا آجکل کی کوٹھے والیوں سے میلے کی کیا شان بڑھ سکتی ہے۔ کوٹھوں کی چھتوں پر پولیس والے چڑھے ہوئے ہیں۔ جہاں چار آدمی جمع ہوئے اور سپاہی نے ڈانٹا کہ آگے بڑھو۔ ذرا ہیر پھیر کی تو پکڑ تھانہ میں لیگئے۔ بھلا اس مصیبت میں کون پڑے بھلے آدمیوں نے تو جانا ہی چھوڑ دیا۔ اب ایک مذہبی رسم ہے، وہ پوری ہو جاتی ہے۔ اس میں بھی کبھی کبھی مار کٹائی کی نوبت آجاتی ہے اور ہم سے پوچھو تو نہ اب وہ رام لیلا ہے اور نہ رام لیلا کا مزا۔ اس سے بدتر حال پھول والوں کی سیر کا ہے۔ بس یہی دو میلے دلی کے ایسے تھے کہ سارے جہان میں لاجواب تھے۔ اب نہ رام لیلا وہ رام لیلا ہے اور نہ پھول والوں کی سیر وہ پھول والوں کی سیر ہے۔ پہلے بھادوں آیا، سیر کی تاریخ مقرر ہوئی، نفیری بج گئی، مہرولی آباد ہونی شروع ہو گئی۔ مکانوں میں سفیدی ہو رہی ہے، کمرے سجائے جا رہے ہیں۔ کرایہ کا یہ حال ہے کہ پہلے جو کمرہ دو روپے مہینہ کو ملے وہ سو روپے روز پر ملنا مشکل ہے۔ رنڈیاں رتھوں میں بیٹھی جا رہی ہیں، امیر فینسیں اڑاتے چلے جاتے ہیں۔ غریب غربا مٹکے سروں پر اوندھائے، لنگوٹ کسے، پتنگیں اڑاتے، گاتے، بجاتے چلے جا رہے ہیں قطب

کی لاٹھ تک آدمی ہی آدمی ہوتا تھا۔ بڑے لوگ تو اپنے کمروں پر جا، نہا، دھو، کپڑے بدل نکل آئے، غریبوں نے جھرنے پر جا دو تین غوطے مارے، مٹکے میں سے تحفہ تحفہ کپڑے نکالے، کارچوبی ٹوپی، ٹاٹ بافی جوتی، شربتی ململ کا کرتا انگرکھا، نٹ مار لٹھے کا پیجامہ پہن ایسے نکلے جیسے چاند گہن سے نکلتا ہے۔ بھلا دیکھ کر کوئی کہہ تو دے کہ یہ میاں قادر بقہ ہیں اور یہ نتھو کہار۔ مہرولی میں اس سرے سے اُس سرے تک دوکانیں لگی ہیں، لوگ بیٹھے ہیں، کھا رہے ہیں، باتیں ہو رہی ہیں، ادھر گانا ہو رہا ہے، ادھر دف بج رہا ہے۔ باریک باریک پھوار پڑ رہی ہے کہ ایک دفعہ ہی نفیری کی آواز آئی لیجئے جوگ مایا جی کا پنکھا آگیا، سب کے سب اس میں جا شریک ہوئے، عبدالوہاب کٹورہ بجا رہا ہے، نفیری کے کمال دکھا رہا ہے، بیلیں مل رہی ہیں، کوئی روپیہ دیتا ہے، کوئی دوشالہ۔ رات کے ایک دو بجے تک یہی چہل پہل رہی۔ دوسرے دن درگاہ شریف میں پنکھا چڑھا، وہاں اس سے زیادہ دھوم دھام رہی۔ چار پانچ روز آنکھ بند کرتے گزر گئے، ہنسی خوشی گھر آئے، قطب کے پراٹھے لائے، چاندی کے چھلے لائے، اب گھر گھر پراٹھے اور چھلے بٹ رہے ہیں۔ اور اب کی پھول والوں کی سیر خدا نہ دکھائے۔ شریف لوگ تو وہاں کیوں جانے لگے۔ جاتے ڈرتے ہیں کہ کہیں بین الاقوامی تصادم نہ ہو جائے۔" میں نے کہا "مرزا صاحب بین الاقوامی تصادم نہیں۔ فرقہ واری جنگ۔" کہنے لگے "چل ہٹ۔ جو بین الاقوامی تصادم وہی فرقہ واری جنگ، نہ اِس کے کچھ معنی، نہ اُس کے کچھ معنی۔ خواہ مخواہ اخبار والوں نے نئے نئے لفظ گھڑ ڈالے ہیں اور تو نے یہاں کی زبان بھی سنی۔ سبحان اللہ کیا زبان ہے اور اسی پر مرے جاتے ہیں کہ اُردو ہماری زبان ہے۔ لکھنؤ کا حال تو مجھے معلوم نہیں، ہاں دلی کی زبان تو اب کچھ نئی زبان ہو گئی ہے، وہ وہ لفظ سننے میں آتے ہیں کہ کیا کہوں۔ اور ان پڑھے لکھے لوگوں نے تو زبان کو اور بھی غارت کر دیا ہے۔ ایک

لفظ اردو کا بولینگے تو دو لفظ انگریزی کے۔ بھئی مجھے تو میاں کی زبان سے بھی نفرت ہوگئی ہے۔ پرسوں ہی جمعہ کو جامع مسجد میں ایک مولوی صاحب وعظ بیان کر رہے تھے ماشاءاللہ کیوں نہ ہو مولوی تھے۔ چھانٹ چھانٹ کر وہ وہ لفظ حلق سے نکالتے ہیں کہ سبحان اللہ۔ میری تو خاک سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر یہ کہہ کیا رہے ہیں۔ یہ تو رہے مسلمان۔ اب ہندوؤں کی گفتگو سنو تو وہ اس سے بھی زیادہ عجیب ہے۔ کہتے ہیں کہ ہم ہندی بولتے ہیں۔ جو وہ بولتے ہیں اگر اسی کا نام ہندی ہے تو میاں ہم تو مرتے جائیں گے یہ زبان نہ آئیگی اچھا بھئی ہم عربی بولیں، تم ہندی بولو مگر اس طرح کہ جو لفظ ہماری تمہاری اُردو میں نہیں ہے اُس کے لیے مولوی صاحب عربی کا لفظ استعمال کریں، پنڈت جی سنسکرت کا لفظ بولیں۔ یہ کیا ہے کہ اردو میں لفظ موجود ہے اور اس کی جگہ ایک صاحب سنسکرت کا یہ موٹا لفظ لائیں اور دوسرے صاحب عربی کا یہ بڑا لفظ قاموس میں سے نکالکر استعمال کریں۔ ابے بھئی سنتا ہوں تمہارے ہاں بھی تو اُردو کا کوئی بڑا مدرسہ کھلا ہے۔ سب علم اُردو ہی میں پڑھایا جاتا ہے"۔ میں نے کہا "جی ہاں۔ کلیہ جامعۂ عثمانیہ"۔ مرزا صاحب بڑے زور سے قہقہہ مار کر کہنے لگے "اوہو! یہ نام اور اُردو کا مدرسہ۔ معلوم ہوتا ہے وہاں بھی مولویوں کا زور ہے۔ خیر جامعہ تو یہ جیسے جامع مسجد، عثمانیہ تمہارے بادشاہ کا نام ہوا، اور میاں یہ کلیا کیا بلا ہوئی"؟ میں نے کہا "آپ اس بحث کو چھوڑیے۔ دلی کی کہیے اور سنائیے۔ جب دلی کی ہر چیز سے آپ کو نفرت ہے تو گزرتی کیسے ہوگی"۔ کہنے لگے "میاں بہت ہوگئی تھوڑی رہی ہے۔ صبح ہی اُٹھتا ہوں۔ نماز پڑھ کبھی مہندیوں[۱] میں چلا جاتا ہوں کبھی کلو کے تکیہ۔ پرانی دلی والے وہاں آرام کر رہے ہیں۔ اُنکی قبروں پر جا بیٹھتا ہوں، ان کو اور اُن کی دلی کو یاد کرکے دو آنسو بہا لیتا ہوں۔ جی ہلکا ہو جاتا ہے۔ شام

---

[۱] مہندیاں اور کلو کا تکیہ دلّی کے دو بڑے قبرستان ہیں۔

جامع مسجد کی سیڑھیوں پر آبیٹھتا ہوں اور خدا کی قدرت کا تماشہ دیکھتا ہوں کہ پہلے دتی کیا تھی اور اب کیا ہو گئی :: اتنے میں مغرب کی اذان ہوئی مرزا صاحب رومال جھاڑ اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے " میاں فرحت ! بیاں بس اس لئے آتا ہوں - اگر دلی میں کچھ لطف رہ گیا ہے تو جامع مسجد میں مغرب اور عشاء کی نماز میں رہ گیا ہے - یہ بھی نہ ہوتا تو کچھ کھا کر سو رہتا ۔"

دوسرے دن میں حیدرآباد چلا آیا - سارے راستے مرزا صاحب کی باتوں کا خیال رہا - جو خوشی دلی جا کر ہوئی تھی وہ مرزا صاحب کی باتوں نے خاک میں ملا دی - یہ تو میں بھی کہونگا کہ دلی مجھ کو بھی کچھ نئی نئی معلوم ہونے لگی ہے اور شاید اسی وجہ سے اس کا نام نئی دہلی رکھا گیا ہے - جو دلی ہمارے زمانہ میں تھی وہ تو اب نہیں رہی - اب چاہے دلی والے اس کو مانیں یا نہ مانیں ۔

دلاری

گو وہ لونڈی بچپن سے اس گھر میں رہی اور پلی مگر سولہ سترہ برس کی عمر میں بھاگ گئی۔ اس کی ماں کا پتہ نہ تھا، اس کی ساری دنیا یہی گھر تھا اور اس گھر والے۔ شیخ ناظم علی صاحب خوشحال آدمی تھے، خاندان میں کئی بیٹے اور بیٹیاں تھیں۔ بیگم صاحب بھی زندہ تھیں اور زنانہ میں ان کا پورا راج تھا۔ دلاری خاص ان کی لونڈی تھی۔ گھر میں اور نوکرانیاں، مامائیں آئیں، مہینہ دو مہینہ، سال دو سال کام کرتیں، اس کے بعد چھوڑ کر چلی جاتیں۔ اس کی وجہ ہمیشہ یہ نہیں ہوتی تھی کہ ان کے ساتھ سلوک برا ہوتا یا دوسری جگہ انہیں تنخواہیں اچھی ملتیں، بلکہ غالباً یہ وجہ تھی کہ وہ ایک جگہ رہتے رہتے گھبرا جاتیں اور آخر کار کسی معمولی سی بات پر جھگڑ کر نوکری چھوڑ دیتیں۔ مگر دلاری کے لئے ہمیشہ ایک ہی ٹھکانا تھا۔ اس سے گھر والے کافی مہربانی سے پیش آتے۔ اسے کھانے اور کپڑے کی کوئی شکایت نہ تھی، دوسری نوکرانیوں کے مقابلہ میں اس کی حالت اچھی تھی مگر باوجود اس کے کبھی کبھی جب کسی ماما سے اور اس سے جھگڑا ہوتا تو وہ یہ طنز ہمیشہ سنتی "میں تیری طرح کوئی لونڈی تھوڑئی ہوں۔" اس کا دلاری کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

اس کا بچپن بے فکری میں گزرا۔ اس کا مرتبہ گھر کی بیبیوں سے پست تھا۔ وہ پیدا ہی اس درجہ میں ہوئی تھی۔ خدا جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے، جسے چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے۔ اس کا رونا کیا! دلاری کو اپنی پستی کی کوئی شکایت نہ تھی مگر جب اُسکی عمر کا وہ زمانہ آیا جب لڑکپن ختم اور جوانی کی آمد ہوتی ہے، دل کی گہری اور اندھیری بے چینیاں زندگی کو کبھی تلخ اور کبھی میٹھی بناتی ہیں، تو وہ اکثر مغموم سی رہنے لگی لیکن یہ ایک اندرونی کیفیت تھی جس کی اُسے نہ تو وجہ معلوم تھی نہ دوا۔ چھوٹی صاحبزادی حسینہ بیگم

اور دلاری دونوں قریب قریب ہم سن تھیں اور ساتھ کھیلتیں۔ مگر جوں جوں ان کا سن بڑھتا تھا توں توں دونوں کے درمیان فاصلہ زیادہ ہوتا جاتا۔ صاحبزادی کا وقت سینے پرونے، پڑھنے لکھنے میں صرف ہونے لگا۔ دلاری کمروں کی خاک صاف کرتی، گھڑوں میں پانی بھرتی، چھوٹے برتن دھوتی۔ وہ خوبصورت تھی لمبے لمبے ہاتھ پیر، بھرا جسم، مگر عام طور سے اس کے کپڑے میلے چکیلے ہوتے اور اس کے بدن سے بو آتی۔ تیوہار کے دنوں البتہ وہ اپنے اُجلے کپڑے نکال کر پہنتی اور سنگار کرتی۔ یا اگر کبھی شاذ و نادر اسے بیگم صاحب یا صاحبزادیوں کے ساتھ کہیں جانا ہوتا تب بھی اسے صاف کپڑے پہننا ہوتے۔

شب برات تھی، دلاری گڑیا بنی تھی، زنانے کے صحن میں آتش بازی چھوٹ رہی تھی۔ سب گھر والے، نوکر چاکر، کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ بچے غل مچا رہے تھے، بڑے صاحبزادے کاظم بھی موجود تھے جن کا سن بیس اکیس برس کا تھا۔ یہ اپنی کالج کی تعلیم ختم ہی کر نیوالے تھے۔ بیگم صاحب انہیں بہت چاہتی تھیں، مگر یہ ہمیشہ گھر والوں سے بیزار رہتے، انہیں تنگ خیال اور جاہل سمجھتے۔ جب چھٹیوں میں گھر آتے تو ان کی بحث ہی کرتے گزر جاتی۔ یہ قریب قریب ہر پُرانی رسم کے، خلاف تھے۔ مگر اظہار ناراضی کر کے سب کچھ برداشت کر لیتے۔ آخر کرتے کیا! انہیں پیاس لگی اور انہوں نے اپنی ماں کے کاندھے پر سر رکھکر کہا "امی جان! پیاس لگی ہے"۔

بیگم صاحب نے محبت بھرے لہجہ میں جواب دیا "بیٹا شربت پیو، میں ابھی منواتی ہوں"۔ اور یہ کہکر دلاری کو پکار کر کہا کہ شربت تیار کرے۔

کاظم بولے "جی نہیں امی، اسے تماشہ دیکھنے دیجیے، میں خود اندر جا کر پانی پی لونگا"۔

مگر دلاری حکم سنتے ہی اندر کی طرف چل دی۔ کاظم بھی پیچھے پیچھے دوڑے۔ دلاری ایک تنگ، اندھیری سی کوٹھری میں شربت کی بوتل اُتار رہی تھی۔ کاظم بھی وہیں پہونچکر

رکے - دلاری نے مڑکر پوچھا " آپ کے لئے کونسا شربت تیار کروں" مگر اسے کوئی جواب نہ ملا - کاظم نے اسے ایک نظر دیکھکر گردن جھکالی - دلاری کا سارا جسم تھرتھرانے لگا اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے - اس نے ایک بوتل اٹھالی اور دروازہ کی طرف بڑھی کاظم نے بڑھکر بوتل اس کے ہاتھ سے لیکر الگ رکھدی اور اسے گلے سے لگا لیا - لڑکی نے آنکھیں بند کرلیں اور اپنے تن من کو اس کی گود میں دیدیا - اُمڈی ہوئی گھٹائیں آخر برس پڑیں - دو ہستیوں نے جن کی ذہنی حالت میں زمین و آسمان کا فرق تھا یکایک یہ محسوس کیا کہ وہ آرزوؤں کے ساحل پر آگئیں - دراصل وہ تنکوں کی طرح تاریک طاقتوں کے سمندر میں بہی چلی جارہی تھیں - اکثر پریم کا میٹھا گیت دیپک اگ میں گایا جاتا ہے -

---

ایک سال گزر گیا - کاظم کی شادی ٹھیر گئی - شادی کے دن آگئے - چار پانچ دن میں گھر میں دلہن آجائیگی - گھر میں مہمانوں کا ہجوم ہے - ایک جشن ہے - کام کی کثرت ہے - دلاری ایک دن رات کو غائب ہوگئی ، بہت چھان بین ہوئی ، پولیس کو اطلاع دی گئی ، مگر کہیں پتہ نہ چلا - ایک نوکر پر سب کا شبہ تھا - لوگ کہتے تھے کہ اسی کی مدد سے دلاری بھاگی ، اور وہی اسے چھپائے ہوئے ہے - وہ نوکر نکال دیا گیا - درحقیقت دلاری اسی کے پاس نکلی مگر اُس نے واپس جانے سے صاف انکار کردیا -

تین چار مہینہ بعد شیخ ناظم علی صاحب کے ایک بڈھے نوکر نے دلاری کو شہر کی غریب رنڈیوں کے محلہ میں دیکھا - بڈھا بیچارا بچپن سے دلاری کو جانتا تھا - وہ اُس کے پاس گیا اور گھنٹوں تک دلاری کو سمجھایا کہ واپس چلے - وہ راضی ہوگئی - بڈھا سمجھتا تھا کہ اسے انعام ملے گا اور یہ لڑکی مصیبت سے بچیگی -

دلاری کی واپسی نے سارے گھر میں کھلبلی ڈال دی - وہ گردن جھکائے

ایک سفید چادر سر سے پیر تک اوڑھے، پریشان صورت اندر داخل ہوئی اور سائبان کے کونے میں زمین پر جا کر بیٹھ گئی۔ پہلے تو نوکرانیاں آئیں، وہ دور سے کھڑی ہو کر اسے دیکھتیں اور افسوس کر کے چلی جاتیں۔ اتنے میں ناظم علی صاحب زنانہ میں تشریف لائے۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ دلاری واپس آگئی ہے تو وہ باہر نکلے جہاں دلاری بیٹھی تھی۔ وہ کام کاجی آدمی تھے، گھر کے معاملات میں بہت کم حصہ لیتے تھے، انہیں ان باتوں کی فرصت ہی نہیں تھی۔ دلاری کو دور سے پکار کر کہا "بے وقوف! اب ایسی حرکت نہ کرنا" اور یہ کہکر اپنے کام پر چلے گئے۔ اس کے بعد چھوٹی صاحبزادی، دبے قدم، اندر سے برآمد ہوئیں اور دلاری کے پاس پہونچیں، مگر بہت قریب نہیں۔ اس وقت وہاں اور کوئی نہ تھا۔ وہ دلاری کے ساتھ کی کھیلی ہوئی تھیں۔ دلاری کے بھاگنے کا انہیں بہت افسوس تھا۔ شریف، پاکباز، باعصمت حسینہ بیگم کو اس غریب بیچاری پر بہت ترس آرہا تھا مگر اُن کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کوئی لڑکی کیسے ایک گھر کا سہارا چھوڑ کر جہاں اُس کی ساری زندگی بسر ہوئی ہو باہر قدم تک رکھ سکتی ہے۔ اور پھر نتیجہ کیا ہوا؟ عصمت فروشی، غربت، ذلت۔ یہ سچ ہے کہ وہ لونڈی تھی مگر بھاگنے سے اس کی حالت بہتر کیسے ہوئی۔ دلاری گردن جھکائے بیٹھی تھی۔ حسینہ بیگم نے خیال کیا کہ وہ اپنے کئے پر پشیمان ہے۔ اس گھر سے بھاگنا جس میں وہ پلی، احسان فراموشی تھی۔ مگر اسے اس کی کافی سزا مل گئی۔ خدا بھی گنہگاروں کی توبہ قبول کر لیتا ہے۔ گو کہ اس کی آبرو خاک میں مل گئی مگر ایک لونڈی کے لئے یہ اتنی اہم چیز نہیں جتنی ایک شریف زادی کے لئے۔ کسی نوکر سے اس کی شادی کر دی جائے گی۔ سب پھر سے ٹھیک ہو جائے گا۔ انہوں نے آہستہ سے نرم لہجے میں کہا "دلاری یہ تو نے کیا کیا؟" دلاری نے گردن اُٹھائی، ڈبڈبائی آنکھوں سے ایک لمحہ کے لئے اپنی بچپن کی ہمجولی کو دیکھا اور پھر اسی طرح سے سر جھکا لیا

حسینہ بیگم واپس جا ہی رہی تھیں کہ خود بیگم صاحب آگئیں۔ اُن کے چہرہ پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی، وہ دُلاری کے بالکل پاس آکر کھڑی ہوگئیں۔ دلاری اسی طرح چپ، گردن جھکائے بیٹھی رہی۔ بیگم صاحب نے اسے ڈانٹنا شروع کیا۔

"بے حیا، آخر جہاں سے گئی تھی وہیں واپس آئی نہ۔ مگر منہ کالا کرکے۔ سارا زمانہ تجھ پر تھڑی تھڑی کرتا ہے۔ بُرے فعل کا یہی انجام ہے۔......" مگر باوجود ان سب باتوں کے بیگم صاحب اس کے لوٹ آنے سے خوش تھیں۔ جب سے دلاری بھاگی تھی گھر کا کام اتنی اچھی طرح نہیں ہوتا تھا۔

اس لعن طعن کا تماشہ دیکھنے سب گھر والے بیگم صاحب اور دلاری کے چاروں طرف جمع ہوگئے تھے۔ ایک نجس، ناچیز ہستی کو اس طرح ذلیل دیکھکر سب کے سب اپنی بڑائی اور بہتری محسوس کر رہے تھے۔

یکایک ایک بغل کے کمرے سے کاظم اپنی خوبصورت دلہن کے ساتھ نکلے اور اپنی ماں کی طرف بڑھے۔ انہوں نے دلاری پر نظر نہیں ڈالی۔ ان کے چہرے سے غصہ نمایاں تھا۔ انہوں نے اپنی والدہ سے درشت لہجے میں کہا: "اے خدا کے لئے اس بدنصیب کو اکیلی چھوڑ دیجئے۔ وہ کافی سزا پا چکی ہے۔ آپ دیکھتی نہیں اس کی حالت کیا ہو رہی ہے۔" یہ کہکر وہ فوراً واپس چلے گئے۔

لڑکی اس آواز کو سنکر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس نے سارے گروہ پر ایک ایسی نظر ڈالی کہ ایک ایک کرکے سب نے ہٹنا شروع کیا۔ مگر یہ ایک مجروح، پرشکستہ چڑیا کی پرواز کی آخری کوشش تھی۔ اُس دن رات کو وہ پھر غائب ہوگئی۔

غزل

(مولانا آزاد سبحانی صاحب)

تمہاری زلف مشکیں سے بندھی ہے زندگی اپنی
نہ مرنا ہے خوشی اپنی نہ جینا ہے خوشی اپنی

سبھی پژمردہ بیٹھے رہ گئے حتیٰ کہ ساقی بھی
کچھ ایسی چھا گئی اس انجمن میں بیدلی اپنی

دل بے ظرف نے بے ظرفیاں کیں وائے نادانی
اُڑائی طبقۂ عشاق میں اس نے ہنسی اپنی

کہانتک کیتے پھرتے قصۂ بیچارگی اپنا
کہانتک اپنے ہاتھوں کیجئے پردہ دری اپنی

خوشا تقدیر جو رہزن مسلم ہیں زمانہ کے
انہیں کے ہاتھ میں سونپی گئی ہے رہبری اپنی

کہاں زور جنوں میں رہ سکے بخیہ گری باقی
محض دیوانگی تھی کوشش بخیہ گری اپنی

خدا کے نام پر ہم نے بہت سے بت تراشے ہیں
حرم کو بھی لئے ہے دائرہ میں بت گری اپنی

کسی کا کیا ہے کل سامان حسن و عشق اپنے ہیں
دل اپنا، حسن دلبر اپنا، طرز دلبری اپنی

دل پُر حوصلہ نے کر لیا خود راستہ پیدا
نہ چھوڑی چرخ کج رفتار نے گو کجروی اپنی

بہت مشہور ہے تو سنگدل اے آسماں لیکن
ہلا دیگی تجھے بھی داستان بے کسی اپنی

ہے راز زندگی پوشیدہ قربانی میں سبحانی
اگر تم چاہتے ہو زندگی دو زندگی اپنی

نوائے محوی

(از حضرت محوی صدیقی لکھنوی)

اُف مرے چارہ گروں کا یہ ہراساں ہونا
آج دشوار ہے صبح شب ہجراں ہونا

قیس کا جوشِ جنوں مفت میں بدنام ہوا
اُس کی تقدیر میں تھا خاکِ بیاباں ہونا

تجھ سے رنگین ہے افسانۂ حسرت میرا
میرے دل سے نہ جدا ای غم جاناں ہونا

ہے پشیمان اجل ، روح پریشاں میری
ہائے اُس شوخ کا انگشت بدنداں ہونا

غیرتِ دل کو نہیں منتِ خنجر منظور
ورنہ مشکل نہیں مشکل مری آساں ہونا

نگہِ دوست کا ہدیہ ہے یہ ناسورِ جگر
ہم نہیں چاہتے شرمندۂ درماں ہونا

گر کے دامن پہ ترے بن گیا افسانۂ شوق
ورنہ اس خون کے آنسو کو تھا طوفاں ہونا

چپ ہی بیمار ، سحر دور ، ہی غمخوار اُداس
مفت بدنام نہ تو ای شب ہجراں ہونا

دل کے اِک جذبۂ پنہاں کا مرقع سمجھو!
شمع کا پردۂ فانوس میں عریاں ہونا

دیکھ لو گریۂ خونیں اٗسکی چمن آرائی
دیکھ لو گوشۂ دامن کا گلستاں ہونا

جان لے کر ہی غم دوست نے چھوڑا آخر
دِل کی تقدیر میں تھا کشتۂ مہماں ہونا

اپنی تقدیر ہے ورنہ کوئی دشوار نہ تھا
دل کے ہر داغ کا اک شمع فروزاں ہونا

میں نہیں تو مری تربت ہے ٹھکانا تیرا
بیکسی! تو نہ مرے بعد ہراساں ہونا

دل میں روشن ہے جو تلای مری شمع اُمید
غیر ممکن ہے مرا کشتۂ حرماں ہونا

موہ نہ ہو اخون تمنا کا پتہ دیتا ہے
اشک خونیں کا نمایاں سر مژگاں ہونا

دیکھ کر حسن کی آنکھوں میں بھر آئے آنسو
عشق کا خاک بسر ، چاک گریباں ہونا

دیدۂ شوق ہے اور جلوۂ فردوس جمال
اب کسے چاہیئے منت کش رضواں ہونا

ہو الگ سب سے ترا طرز سخن اے محوی
تو نہ دلدادۂ انداز حریفاں ہونا

غزل

(مولانا صفی لکھنوی مدظلہ العالی)

کچھ نہ تھا اور، وعظ کے سلسلۂ دراز میں
نہرِ شراب موجزن، جنت خانہ ساز میں

یارب اثر تھا کون سا، آہ جگر گداز میں
کوند رہی ہیں بجلیاں، ایک حریم ناز میں

سنگ درِ حبیب کے جذب کی، کوئی حد نہیں
پھر نہ اُٹھا جو سر جھکا، سجدہ گہِ نیاز میں

ہجر وطن ہے اک عذاب، کیوں نہ تڑپ کے جان دے
صید حقیقت آشنا، دامگہ مجاز میں

جہل ہے منتہائے علم، عقل ہے اسکی معترف
عبدِ ذلیل! شک نہ کر، قدرت کارساز میں

عمرِ دو روزہ کاٹ دی، شیب میں اُٹھتے بیٹھتے
فرض ہیں دو ہی رکعتیں، وقت سحر نماز میں

پی لیا آبِ زندگی آپ نے کیوں جناب خضر!
قید حیات الجھ گئی، سلسلۂ دراز میں

ایسے محل پہ دوستو! رخنہ گری ہے، خودکشی
ہم بھی اُسی جہاز میں، تم بھی اُسی جہاز میں

مستِ صبوحِ الست تھے جو صفیؔ، بہک گئے
کیف شراب دیکھکر، نرگسِ نیم باز میں

اقتباسات

روس کی تعلیمی ترقی | جنگ عظیم کے بعد روس کی سیاسی اور معاشی نظام میں جو انقلاب ہوا ہے اور جو تجربات ہو رہے ہیں اُس کے متعلق کوئی رائے ابھی آسانی کے ساتھ نہیں قائم کی جا سکتی۔ البتہ وہاں کی تعلیمی حالت میں جو عظیم الشان ترقی ہو رہی ہے وہ ضرور قابل لحاظ ہے خصوصاً ہندوستان کیلئے ۱۹۲۰ء کی مردم شماری کے مطابق اُس ملک میں پڑھے لکھے مرد اور عورتوں کی تعداد کا اوسط فی ہزار ۵۹۴ تھا، لیکن اشترا کی جمہوریت کے قیام کے بعد سے جو اصلاح وہاں کے نظام تعلیم میں کی گئی ہے اُس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب پڑھے لکھوں کی تعداد میں تقریباً ۴ فی صدی کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اتنی قلیل مدت میں اتنی ترقی یقیناً حیرت انگیز اور قابل داد ہے۔

روسی جمہوریت کے تمام تعلیمی امور جس جماعت کے متعلق ہیں اُسکو Peoples Commissariat کہتے ہیں اور اس کے سات شعبہ ہیں۔ ایک شعبہ کے متعلق انتظامی امور ہیں مثلاً تعمیرات اور مصارف وغیرہ۔ دوسرے شعبہ کے متعلق ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی نگرانی ہے۔ تیسرے شعبہ کے متعلق حرفتی تعلیم اور بالغوں کی تعلیم کا انتظام ہے۔ چوتھے کے متعلق غیر روسی زبانوں کی تعلیم کا انتظام ہے۔ چونکہ روس میں تقریباً سو سے زائد مختلف اقوام کے لوگ بستے ہیں اور اُن کی زبانیں بھی مختلف ہیں۔ اس لیئے اُن کی مادری زبان میں تعلیم کے انتظام کے لیئے اِس شعبہ کی خصوصیت کے ساتھ ضرورت تھی۔ یہ شعبہ مختلف اقوام کی معاشرتی اور تمدنی ضروریات کا لحاظ رکھ کر ہر ایک کی مادری زبان میں تعلیم کا انتظام کرتا ہے۔ پانچواں شعبہ ایک علمی جماعت ہے جو طریق تعلیم کا مطالعہ اور تحقیق کرتی ہے اور تمام تعلیمی اور صنعتی مدارس کے لیئے نصاب تعلیم تیار کرتی ہے۔ چھٹا

شعبہ وہ ادارہ ہے جو اکیڈمی اور تحقیقی کام کرنے والی جماعتوں کی نگرانی کرتا ہے۔ یہی شعبہ جمہوریت کے اندر تمام آثار قدیمہ، فنون لطیفہ کے عجائب خانوں، موسیقی کی درسگاہوں اور سرکاری تھیٹروں کی نگرانی بھی کرتا ہے۔ ساتویں شعبہ کے متعلق اشاعت علوم کا کام ہے چاہے وہ کتب کے ذریعہ سے ہو یا رسائل کے ذریعہ یا سینما کے ذریعہ سے۔

ابتدائی تعلیم کی مدت چار سال رکھی گئی ہے اور ثانوی کی پانچ سال، اِس کے بعد یونیورسٹی کی تعلیم شروع ہوتی ہے۔ جو لوگ عمر کی زیادتی کی وجہ سے یا کار و بار زندگی کی مشغولیت کی وجہ سے، یا غربت کی وجہ سے مدارس میں باقاعدہ تعلیم نہیں حاصل کر سکتے، اُن کے لئے مدارس شبینہ، صنعتی مدارس، مدرسہ بالغین قائم کئے گئے ہیں۔ روس میں سب سے زیادہ قابل تعریف اُن کے وہ مکتب ہیں جہاں ۳ برس سے ۷ برس تک کی عمر کے بچوں کی تعلیم و تربیت کنڈرگارٹن کے اصول پر کیجاتی ہے۔ حکومت نے غریب، لاوارث، اور یتیم بچوں کے لئے جگہ جگہ دارالاقامہ قائم کئے ہیں، اور سرکار کی طرف سے اِن کی تعلیم اور تربیت کا معقول انتظام کیا جاتا ہے۔ طلبار کے اخلاق کی نگرانی کے لئے انسپکٹر مقرر ہیں جو بازاروں میں، ریلوے اسٹیشن پر اور دیگر مقامات پر نوجوانوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں ۱۹۲۷ء میں ابتدائی مدارس کی تعداد ۱۱۴۵۰۴ تھی اور طلبار کی تعداد ۱۱۰۰۰۰۰ تھی۔

مدارس بالغین تین قسم کے ہیں، دن کے مدرسے، مدارس حرفہ، اور سیاسی مدرسے۔ دن کے مدرسے یا تو صنعتی ہوتے ہیں یا زراعتی جیسی ضرورت مقامی حالات کے لحاظ سے ہو، مدت تعلیم ۲ سال عام طور پر ہوتی ہے لیکن اگر کسی خاص فن کے کسی خاص شعبہ میں مہارت تامہ پیدا کرنا ہو تو ایک سال تعلیمی مدت میں اور بڑھجاتا ہے۔

مدارس حرفہ میں حرفہ کی تعلیم کے ساتھ ادبی تعلیم بھی رکھی گئی ہے۔ بے پڑھے لکھوں کے لئے خاص مدارس قائم کئے گئے ہیں۔ لیکن اِن مدارس کی تعداد اب روز بروز کم

ہوتی جاتی ہے اس لئے کہ لوگ پڑھنا لکھنا سیکھتے جاتے ہیں۔ سیاسی تعلیم کے لئے مدارس روس کے تعلیمی نظام کی ایک خصوصیت ہیں اور ان مدارس کا مقصد ایسے اشخاص پیدا کرنا ہے جو بالشویک اصول کی تبلیغ و اشاعت کا کام کریں۔ ۱۹۲۳ء میں اس قسم کے سیاسی مدارس کی تعداد ۲۴۲ تھی جن میں ۱۶۰۰۰ طالبعلم تھے۔ ان کے علاوہ کمیونسٹ جماعت کی یونیورسٹیاں ہیں جنکی تعداد ۱۹۲۶ء میں کل پندرہ تھی اور طالب علموں کی تعداد چھ ہزار سے زائد تھی۔ ملک کی عام تمدنی و معاشرتی اصلاح اور باشندوں میں شہریت کا احساس اور عام بیداری پیدا کرنے کے لئے انجمنیں قائم کیگئی ہیں جن کی تعداد ۱۹۲۶ء میں ۲۰ ہزار سے زیادہ تھی۔

روس میں یونیورسٹیاں دو قسم کی ہیں ایک کا مقصد جدید امریکی طریقہ پر کسانوں اور مزدوروں کی تعلیم ہے اس لئے ٹریڈ یونین اپنی آمدنی کا دسواں حصہ ان یونیورسٹیوں کی امداد میں صرف کرتی ہے۔ ان یونیورسٹیوں کی طرف سے شام کے وقت مختلف علمی، ادبی اور فنی مضامین پر قابل اساتذہ تقریر کے ذریعہ درس دیتے ہیں۔ اس طریقہ سے صرف ماسکو میں اس وقت تقریباً دس ہزار طلبا ۱۶ مختلف مضامین کے درس میں شریک ہوتے ہیں۔ دوسری قسم کی یونیورسٹیاں جو باقاعدہ مختلف علوم و فنون کی اور مشرقی زبانوں کی تعلیم دیتی ہیں ان کی تعداد اس وقت سوا سو کے قریب ہے اور طلباء کی تعداد ڈیڑھ لاکھ سے زائد ہے۔ ان یونیورسٹیوں کے علاوہ سائنس کی تعلیم اور تحقیقی کام کے لئے معمل گاہیں قائم کی گئی ہیں جن کی تعداد ۳۵ ہے۔ ان میں مختلف کیمیائی، طبیعی اور برقی تجربات کئے جاتے ہیں جن سے ملک کی صنعت، حرفت اور تجارت کی ترقی کی راہیں نکلیں۔

یونیورسٹی، مدرسہ اور معمل گاہوں اور انجمنوں کے ذریعہ جو تعلیم ہوتی ہے اُس کے علاوہ کتب خانہ، سنما، عجائب خانہ بھی تعلیم کے لئے بہت مفید ذریعہ ثابت

ہوئے ہیں چنانچہ اس وقت جمہوریت روس میں ۲۰ ہزار مستقل کتب خانے ہیں اور ۵۰ ہزار سفری کتب خانے جو روس کے ساڑھے پانچ لاکھ دیہاتوں میں وقتاً فوقتاً دورہ کرتے رہتے ہیں، پھر ۳½ ہزار مستقل سنما اور ۱½ ہزار سفری سنما بھی تعلیمی کام کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں ۔ Broad Casting کے ذریعہ سے بھی تعلیم دینے کا کام اب حکومت نے شروع کیا ہے ۔

سطور بالا سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ گزشتہ دس سال کے اندر روسی جمہوریت نے اپنی قوم کی تعلیم میں کس قدر سرگرمی سے کام کیا اور کیسی حیرت انگیز ترقی حاصل کی ہے ۔ اس دس سال کی مدت میں ہندوستان نے جو ترقی کی ہے اُس کا ثبوت بھی عنقریب ہارٹوگ کمیٹی کی رپورٹ شائع ہو جانے کے بعد مل جائے گا ۔

تنقید و تبصرہ

کتب

اَرلنسٹ ۔ مخزنِ نجات ۔ مہمات الصرف و النحو ۔ مبادی نباتات ۔

اَرلنسٹ | (مصنفہ آسکر وائلڈ مترجمہ مولوی سید تمکین کاظمی صاحب و مولوی عبدالمنعم صاحب
حجم ۱۰۹ صفحہ تقطیع $\frac{20 \times 30}{16}$ ۔ لکھائی معمولی چھپائی اوسط درجے کی کاغذ اچھا ۔ قیمت عہ
ملنے کا پتہ مکتبۂ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن)

آسکر وائلڈ کا یہ ڈراما اُس کی تصانیف میں معنوی خوبیوں کے لحاظ سے سب سے ہلکا مگر اسلوب بیان کی شوخی اور ظرافت کے چٹخارے کے اعتبار سے سب پر بھاری ہے ۔ اس کا ترجمہ اُسی صورت میں جائز تھا کہ جو دلچسپی اَصل میں ہے وہی ترجمے میں پیدا کردی جائے ۔ افسوس ہے کہ ترجمہ کرنے والوں کو اس میں کامیابی نہیں ہوئی ۔ ترجمہ صحیح ہے مگر یہ کافی نہیں ۔

کتاب میں پہلے ایک "تقدیم" ہے، پھر مصنف کی اور دونوں مترجموں کی تصویریں، پھر سلطان حیدر صاحب جوشؔ کا "پیش لفظ"، پھر شبیر حسن صاحب جوشؔ کا تاثر، پھر مسعود حسن صاحب ذوقیؔ کا "تعارف"، پھر انیس مجتبےٰ صاحب کا "اعلام" پھر تمکین کاظمی صاحب کی "تقریب"۔ ان چیزوں سے علاوہ مصنف کی صورت اور سیرت کے ناظرین مترجموں کی شکل سے، اُن کے لباس سے، اُن کی زندگی کے حالات سے اور کتاب کی طباعت کی مختصر روداد سے بھی واقف ہوجائیں گے اور جو باتیں دریافت کرنا ہوں وہ غالباً خط و کتابت سے معلوم ہوسکتی ہیں ۔

ترجمے میں طباعت کی غلطیاں کثرت سے ہیں جن میں سے بعض کا لمبی چوڑی "تصحیح" میں بھی ذکر نہیں مثلاً صفحہ ۴، سطر ۱۱ اور ۱۳ میں "شکر" کی جگہ "شکریہ"۔ چند غیر مانوس انگریزی الفاظ بجنسہ رکھدئے گئے ہیں اور ان کے معنی حاشیے میں بھی نہیں بتائے گئے مثلاً "کرمپٹ" "مفن"۔ بعض انگریزی الفاظ ایسے ہیں جو غیر مانوس تو نہیں مگر ان کا ترجمہ اردو میں ہوسکتا تھا مثلاً "میڈم" "کمپنی" بمعنی صحبت۔ خیر یہ بھی سہی مگر خدا جانے Handle کا تلفظ "ہانڈل"، Hand-bag کا "ہائنڈ بیاگ" اور Cloak Room کا "کلاک روم" کیوں ہوگیا۔

باوجود ان باتوں کے کتاب پڑھنے کے قابل ہے۔

مخزن نجات (پہلا حصہ) (مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ۔ حجم ۱۶ صفحے۔ تقطیع ۲۰×۲۶/۱۶۔ لکھائی، چھپائی کاغذ خوشنما۔ قیمت ۴ر

عرب کے معجز بیان کی چالیس حدیثیں مولانا جامی کی منتخب کی ہوئی اور ان کے منظوم ترجمے کے ساتھ۔ ایسا دینی تبرک اور ایسی ازلی دولت ہر مسلمان اور ہر شائق ادب کے لئے زر و جواہر سے زیادہ قیمتی ہے۔ شرف الدین احمد خاں صاحب نے اردو میں بہت عمدہ ترجمہ کرکے اس کے فیض کے دائرے کو اور وسیع کردیا ہے۔

مہمات الصرف والنحو (مؤلفہ حکیم شیخ عبدالوحید صاحب ندوی شائع کردہ شبلی بک ڈپو "لکھنؤ۔ حجم ۳۰ صفحے۔ تقطیع ۲۰×۲۶/۱۶، لکھائی چھپائی اور کاغذ اوسط درجے کا۔ قیمت ۲ر)۔

افعال کی خاصیتیں خوبی اور اختصار سے سمجھائی گئی ہیں۔ آخر میں نحو کی اصطلاحات کی ایک فرہنگ ہے۔ عربی کے طلبہ کے لئے مفید چیز ہے۔

مبادی نباتات | از جگموہن لال صاحب چترویدی۔ حجم ۱۰۳ صفحہ۔ تقطیع $\frac{۲۰\times۳۰}{۱۶}$۔ لکھائی چھپائی معمولی، کاغذ اوسط درجے کا قیمت عمر۔ ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی۔ اسٹیشن روڈ۔ لاہور)۔

نباتیات کے ابتدائی مسائل سہل اور سلیس عبارت میں سمجھائے گئے ہیں مطالب کو واضح کرنے کے لئے سادی تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ نہ صرف طلبہ کے لئے بلکہ تمام شائقین علم کے لئے مفید چیز ہے۔

کتاب کا نام مبادی علم نباتات یا مبادی نباتیات ہوتا تو اچھا تھا۔

شذرات

افسوس ہے کہ رسالہ کو وقت پر لانے میں اتنی جلدی نہیں ہوسکتی جتنی ہم چاہتے ہیں۔ پھر بھی اُمید ہے کہ اگست سے ہر مہینہ کا رسالہ اُسی مہینہ میں شائع ہونے لگے گا۔ انشاءاللہ

کارکنان جامعہ ملیہ کی تجویز ہے کہ آئندہ سال اپنے معلمین کی دلچسپی اور فائدے کے لئے ماہرین تعلیم کے لکچروں کا انتظام کریں۔ مسلم یونیورسٹی ٹریننگ کالج کے پرنسپل صاحب اور دوسرے اساتذہ نے ازراہ عنایت وعدہ کیا ہے کہ وقتاً فوقتاً خود تشریف لاکر لکچر دیا کریں گے اور ہر طرح سے اس تجویز کو کامیاب بنانے میں مدد دیں گے۔ ابھی پروگرام مرتب نہیں ہوا جب ہوجائے گا تو جامعہ اور پیام تعلیم میں شائع کردیا جائے گا۔

امیر امان اللہ خاں کا افغانستان کے تخت سے دستبردار ہوکر یورپ چلاجانا نہ صرف مسلمانوں کے لئے بلکہ تمام ایشیا والوں کے لئے صدمے اور عبرت کا باعث ہے۔ امیر صاحب کی نسبت بدقسمتی سے پچھلے دنوں یہ خیال قائم ہوگیا ہے اور قائم کرایا گیا ہے کہ اُن کی زندگی کے سارے کارنامے مغربی تہذیب کی اوچھی تقلید تک محدود ہیں اور اب کہنے والے یہ کہتے ہیں کہ افغان قوم نے دینی جوش اور قومی غیرت سے کام لے کر اُس شخص کو جو اُن کے دین کو ضعیف اور اُن کے شعار قومی کو معدوم کرنا چاہتا تھا ملک بدر کردیا ہے اور اب وہ امیر حبیب اللہ کے زیر حکومت سچی اسلامی زندگی بسر کریگی۔

جو لوگ یہ خیالات رکھتے ہیں اور دوسروں میں پھیلاتے ہیں اُن کی مختلف قسمیں ہیں۔ بعض جان بوجھ کر اپنے ذاتی فائدے یا ملکی مصالح کی خاطر سچائی کا خون کرتے ہیں۔

بعض نیک نیتی اور سادہ لوحی سے سنی سنائی باتوں پر بے سمجھے بوجھے ایمان لے آتے ہیں اور بعض صحیح واقعات کا علم رکھنے کے باوجود اپنی تنگ نظری اور تاریک خیالی سے نتیجے اُلٹے نکال لیتے ہیں۔

... ...

لیکن جو شخص ذاتی اغراض سے پاک ہے اور تھوڑی سی سمجھ اور وسعت نظر رکھتا ہے وہ افغانستان کے حالات پر نظر ڈالتے ہی یہ رائے قائم کریگا کہ امان اللہ خاں کی ذات اُن کی قوم کے لئے بہت بڑی نعمت تھی جسے کھو کر وہ بہت جلد پچھتائے گی۔ امیر صاحب کا یورپ کی ظاہری زندگی کی تقلید پر اس قدر زور دینا بجائے خود قابل اعتراض ہو لیکن اس کی وجہ سے اُن کی گراں قدر قومی اور ملکی خدمت کو یک قلم فراموش کر دینا انتہائی بے ایمانی، یا تعصب، یا جہالت ہے۔

... ...

یورپ کی تقلید کا مسئلہ بہت طویل بحث کا محتاج ہے۔ اس وقت ہم اس سے قطع نظر کرتے ہیں۔ ہمیں اس وقت دو باتوں کی طرف توجہ دلانا ہے۔ ایک تو یہ کہ یورپ کے لباس وغیرہ کا رائج کرنا امیر امان اللہ خاں کے کام کا صرف ایک پہلو ہے جس سے اُن کی مجموعی خدمات پر حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ دوسرے یہ کہ جو قومیں اُنکی مخالف ہیں انہیں دینی جوش یا قومی غیرت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ ان کی مخالفت کی وجوہ بالکل دوسری ہیں۔

... ...

امیر امان اللہ خاں نے جو مفید اصلاحات اپنے ملک میں کیں اُنکی مختصر فہرست حسب ذیل ہے:۔

(۱) صنعت و حرفت کو فروغ دینا۔

(۲) لڑکے اور لڑکیوں کی تعلیمی ترقی میں انتہائی کوشش کرنا اور طلبہ کو وظیفے دیکر مغربی ممالک اور ٹرکی بھیجنا۔

(۳) باضابطہ اور منظم فوج تیار کرنا۔

(۴) امرا کی قوت کو کم کرکے بادشاہ کی مرکزی حکومت کو مضبوط کرنا اور اس طرح افغانوں کو مختلف جرگوں کے مجموعے کی جگہ ایک قوم بنانے کی کوشش کرنا۔

(۵) اصلاح معاشرت خصوصًا عورتوں کی اصلاح و ترقی کی تدابیر اختیار کرنا۔

... ...

اِن میں سے نمبر ۴ کو مابہ النزاع سمجھکر چھوڑ دیا جائے تب بھی ایسی چیزیں باقی رہتی ہیں جن کی بنا پر تاریخ امان اللہ خاں کا شمار افغانستان کے سچے خادموں اور محسنوں اور دنیا کے قابل ترین حکمرانوں میں کریگی۔

... ...

اب رہے ناکامی کے اسباب تو اُن میں سب سے بڑا سبب اُمرا کی غداری ہے جب انہوں نے اپنی دولت اور حکومت کو خطرے میں دیکھا تو ہر جائز اور ناجائز طریقے سے امیر صاحب کی مخالفت شروع کی اور بھولی بھالی رعایا کو اُن کے خلاف اُبھارنا شروع کیا۔ انہوں نے ایک طرف تو افغانستان کے بیرونی دشمنوں سے اور دوسری طرف اُسکے اندرونی دشمنوں یعنی ملاؤں سے سازباز کرکے اپنی قوت کو اور مضبوط کرلیا۔

... ...

اِس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ان لوگوں کو اپنی کوششوں میں خود امیر صاحب کی ناعاقبت اندیشی سے بڑی مدد ملی۔ امیر صاحب نے اصلاحات کے معاملہ میں عجلت اور بیصبری سے کام لیا۔ ملک کی اقتصادی حالت سنبھلنے سے پہلے انہوں نے اِس پر اتنا مالی بوجھ ڈال دیا جسے وہ ہرگز برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ یورپ کی تقلید میں سب سے بڑی غلطی جس کے

ایشیائی مرتکب ہوتے ہیں وہ یہ ہے کہ اختلاف حالات پر غور کئے بغیر وہ یورپ والوں کی طرح فضول خرچی پر کمر باندھ لیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ تعلیم کی ترقی کے لئے شاندار مدرسے، روشن خیالی کیلئے بجلی کی روشنی، ذہنی ترقی کے لئے قیمتی سازوسامان ضروری ہے کیونکہ یورپ میں یہ چیزیں موجود ہیں۔ وہ اس پر غور نہیں کرتے کہ یورپ نے یہ مرفہ الحالی دوسری قوموں کو لوٹ کر اور غلام بنا کر حاصل کی ہے۔ اس لئے ہم لوگ اس معاملہ میں اسکی ریس نہیں کر سکتے۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ مادی فلاح کا موجودہ معیار ذہنی ترقی کا آئینہ نہیں ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ یورپ میں بھی جو قومیں ذہنی دولت سے مالا مال ہیں انہیں دولت دنیا میں دوسروں سے کم حصہ ملا ہے۔

... ...

یہی غلطی امیر امان اللہ خاں سے بھی سرزد ہوئی۔ انہوں نے اپنے اور اپنی قوم کے معیار زندگی کو بڑھانے کی کوشش میں بھاری محصول لگائے اور اُن کے وصول کرنے میں سختی کی۔ اس سے ملک میں ایک عام بے چینی پیدا ہوئی جس سے امرا اور ملاؤں نے فائدہ اُٹھایا اور چونکہ امیر صاحب نے یورپ سے واپسی کے بعد اصلاح معاشرت میں بہت شدت شروع کر دی تھی اس لئے ان لوگوں نے حامئ دین بن کر جہلا کے قدامت پرستانہ جذبات کو اُبھارنا شروع کیا۔

... ...

ان سب باتوں کے ملجانے سے ملک میں ایسی آگ لگ گئی جسے امیر امان اللہ خاں نہ بجھا سکے اور آخر انہیں اپنے ملک کو طوائف الملوکی کی حالت میں چھوڑ کر ہجرت کرنا پڑی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انہیں پھر افغانستان کے تخت پر بیٹھنا نصیب ہوگا یا نہیں۔ افغانستان کے بہیخواہ سوائے اس کے کیا کر سکتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ سے امیر صاحب کی واپسی اُن کی اصلاح اور انکی کامیابی کی دعا کریں۔

سیرۃ نبوی پر مستند و مفید کتابیں

سیرۃ النبی علامہ شبلی مرحوم کی شہرۂ آفاق اور مقتدر تصنیف :-
حصہ اول للعہ/ حصہ دوم ۱ے/ حصہ سوم صہ/

خطبات مدراس سیرۃ نبوی پر مولنا سید سلیمان ندوی کے گرانقدر، بصیرت افروز اور پرکیف آتشہ مفید و موثر لیکچر۔ قیمت عہ

رحمۃ للعالمین قاضی محمد سلیمان صاحب منصور پوری کی مشہور اور مقبول ترین کتاب
حصہ اول عا/ حصہ دوم للعہ/

سیرۃ خیر البشر - از مولنا محمد علی امیر شریعت احمدیہ لاہور۔ قیمت ۶/

اسوۂ حسنہ علامہ ابن قیم شاگرد رشید امام ابن تیمیہؒ کی مشہور کتاب زاد المعاد کے اختصار کتاب ہدی الرسول کا اردو ترجمہ از مولنا عبدالرزاق ملیح آبادی۔ ۱۲/

تذکرۃ المصطفیٰ - از پروفیسر سید نواب علی صاحب پرنسپل جوناگڈھ کالج قیمت عہ

نشر الطیب - از مولنا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی۔ قیمت عہ

لڑکے، لڑکیوں، عورتوں اور عام مطالعہ کے لئے

ہمارے نبیؐ
از پروفیسر سید نواب علی صاحب ایم اے قیمت ۴ہر

ہمارے رسولؐ
از مولنا خواجہ عبدالحی استاذ جامعہ ملیہ قیمت ۸

سرکار کا دربار
از احمد الیاس صاحب مجیبی قیمت عہ

سیرۃ الرسولؐ
از مولنا محمد اسلم جیراجپوری استاذ جامعہ عہ

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

1927

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی

جلد ۱۲	بابتہ ماہ مئی سنہ ۱۹۲۹ ع	نمبر ۵

فہرست مضامین

آزادی کی راہیں

(۱)

تمہید

تباہی اور بے رحمی کے جس انتشار میں نوع انسانی نے اب تک دن گزارے ہیں تخیل میں جماعت انسانی کے اس سے بہتر نظام کے تصور کی کوشش کچھ نئی چیز نہیں ہے۔ یہ کم سے کم اتنی ہی قدیم ہے جتنا فلاطون جس کی "ریاست" نے بعد میں آنے والے فلسفیوں کی خیالی یوٹوپیا کے لئے نمونہ کا کام دیا۔ جو شخص بھی دنیا کو ایک نصب العین کی روشنی میں دیکھتا ہے ــــ خواہ اُسے جس چیز کی تلاش ہے وہ ذہنیت ہو یا فن، محبت ہو یا سیدھی سادی خوشی و مسرت یا ان سب کا مجموعہ ــــ اُس کے دل کو ان برائیوں سے ضرور دُکھ پہنچنا چاہیئے جنھیں انسان بلاضرورت جاری رہنے دیتا ہے اور اگر یہ زوردار آدمی ہے اور قوت حیات اپنے اندر رکھتا ہے تو ضرور اُس میں یہ شدید آرزو پیدا ہوگی کہ وہ انسانوں کو اس خیر کی تکمیل کی طرف لے جائے جو اُس کے تخلیقی تصور میں ساری ہے۔ یہی آرزو وہ اصلی قوت ہے جس نے اشتراک اور نراج کے ہراولوں کو تحریک دی ہے، جیسے کہ اس سے قبل اسی نے گزشتہ خیالی نظامہائے ریاست کے مخترعین کے لئے محرک کا کام دیا تھا۔ اس میں کوئی بات نئی نہیں۔ اشتراک اور نراج میں جو بات نئی ہے وہ نصب العین کا وہ قریبی تعلق ہے موجودہ مصائب انسانی سے جس نے تنہا فلسفیوں کی اُمیدوں سے طاقتور سیاسی تحریکوں کی پیدائش ممکن کر دی۔ یہ ہے جو اشتراک اور نراج کو اس قدر اہم بناتا ہے اور یہی بات ہے جو انہیں ان لوگوں کے لئے خطرناک بناتی ہے جو جان کر یا بے جانے موجودہ نظام جماعت کی برائیوں پر پل رہے ہیں۔

معمولاً مرد عورتوں کی بڑی اکثریت زندگی سے خود اپنے حالات یا اور ساری دنیا کی حالت پر بہ حیثیت کُل غور یا تنقید کئے بغیر گزر جاتی ہے ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ جماعت میں کسی خاص جگہ پر پیدا ہوئے ہیں اور ہر نیا دن اپنے ساتھ جو کچھ لاتا ہے اُسے قبول کر لیتے ہیں بلا اس کے کہ محض وقتی ضرورت سے آگے اپنے خیال کو ذرا بھی کام میں لائیں ۔ کم و بیش کمیت کے مویشیوں کی طرح جبلی طور پر یہ بس آنی ضروریات کی تسکین چاہتے ہیں، بلا پیش بینی اور بلا اس بات پر دھیان دئے ہوئے کہ کافی کوشش سے ان کی زندگی کے سارے حالات بدل سکتے ہیں ۔ ان میں سے فی صدی چند ذاتی حوصلہ کے اثر سے خیال اور ارادہ کی وہ سعی گوارا کرتے ہیں جو انہیں جماعت کے زیادہ خوش نصیب اراکین میں شامل ہونے کے لئے ضروری ہے ۔ لیکن ان میں سے بہت ہی کم کو اس سے سروکار ہوتا ہے کہ جو فائدے یہ خود اپنے لئے ڈھونڈتے ہیں وہ دوسروں کے لئے بھی مہیا کریں ۔ بس چند ہی کمیاب اور غیر معمولی آدمی ایسے ہوتے ہیں جنھیں ساری نوع انسانی سے وہ محبت ہوتی ہے جو انہیں بُرائی اور فلاکت کے مجموعہ کو صبر سے برداشت نہیں کرنے دیتی بلا لحاظ اس کے کہ اس کو خود ان کی زندگی سے کیا تعلق ہے ۔ یہ چند لوگ ہمدردانہ دکھ کے اثر سے پہلے اپنے خیال میں اور پھر عمل میں رہائی کی کوئی راہ ڈھونڈتے ہیں، جماعت کا کوئی ایسا نظام جس سے زندگی زیادہ مالا مال، خوشیوں سے زیادہ پُر، اور بہ مقابلہ حال قابل اصلاح بُرائیوں سے کم مملو ہو ۔ لیکن زمانہ گزشتہ میں یہ حضرات خود اُن لوگوں میں اپنے خیالات سے دلچسپی نہیں پیدا کرا سکے جو ان ناانصافیوں کا شکار تھے جنکی اصلاح کی انہیں خواہش تھی ۔

آبادی کے زیادہ بد نصیب حصے جاہل تھے، مشقت اور تکان کی زیادتی سے بے حس، ارباب قوت کے ہاتھوں فوری سزا پانے کے ڈر سے بزدل اور دبو، اور اپنی تذلیل کے باعث احساس نفس کھو کر اخلاقاً ناقابل اعتماد ۔ ان طبقوں میں عام بہبودی کے لئے کسی جانی بوجھی، بالارادہ کوشش کا پیدا کرنا ایک ناممکن کام معلوم ہوتا ہوگا اور واقعاً پچھلے زمانہ میں عموماً ایسا ہی

ثابت بھی ہوا۔ لیکن تعلیم کی فراوانی اور مزدوروں میں معیار آرام کے بلند ہو جانے سے موجودہ دنیا میں ایسے نئے حالات پیدا ہو گئے ہیں جو بالکل بنیادی تعمیر نو کے مطالبہ کے لئے پہلے سے بہت زیادہ موافق ہیں۔ سب سے زیادہ تو اشتراکی اور ان سے کم درجہ پر نراجی (خصوصاً وہ لوگ جو پیشہ وارانہ پنچائت بندی کے حامی ہیں) اس مطالبہ کے حامل بن گئے ہیں۔

اشتراک اور نراج دونوں کے متعلق سب سے زیادہ قابل غور بات شاید یہ ہے کہ ایک بہتر دنیا کے نصب العین کے ساتھ وسیع عام تحریکیں منسوب ہیں۔ یہ نصب العین اوّل اوّل کتابوں سے گوشہ نشین مصنفوں نے ترتیب دیئے اور تاہم مزدور طبقہ کے طاقتور حصوں نے دنیا کے عملی معاملات میں انھیں اپنا راہنما تسلیم کیا۔ اشتراک کے بارہ میں تو یہ صورت بالکل ظاہر ہے، البتہ نراج کا جہاں تک تعلق ہے یہ بات صرف کچھ تبدیلی کے بعد صحیح کہی جاسکتی ہے۔ نراج بجائے خود کبھی زیادہ پھیلا ہوا مذہب نہیں رہا صرف پنچائت بندی کی تبدیل شدہ شکل میں اسے ہردلعزیزی حاصل ہوئی ہے۔ برخلاف اشتراک اور نراج کے پنچائت بندی اصلاً کسی نصب العین کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک نظام کا۔ اہل حرفہ کی جماعت بندی کا نظام پہلے قائم ہوا اور پنچائت بندی کے خیالات دراصل وہ خیالات ہیں جو زیادہ ترقی یافتہ فرانسیسی جماعتوں کے نزدیک اس نظام کے لئے مناسب تھے۔ لیکن زیادہ تر یہ خیالات نراج سے لئے گئے ہیں، وہ لوگ جنہوں نے ان خیالات کے لئے قبولیت حاصل کی زیادہ تر نراجی تھے چنانچہ ہم پنچائت بندی کو بازاری نراج خیال کرسکتے ہیں جو ان مختلف تنہا افراد کے نراج سے الگ ہے جس نے پچھلے زمانہ میں بڑی غیر یقینی اور ڈانواڈول زندگی گزاری تھی۔ اس خیال کی رو سے ہم نراجی پنچائت نبسی میں بھی نصب العین اور تنظیم کا ویسا ہی مجموعہ پاتے ہیں جیسا کہ اشتراکی سیاسی جماعتوں میں۔ چنانچہ ہم اسی نقطۂ نظر سے ان تحریکوں کا مطالعہ کرینگے۔

اپنی موجودہ شکل میں اشتراک اور نراج دو مجددوں سے شروع ہوتے ہیں یعنی مارکس اور باکونین جو ساری عمر باہم برسرپیکار رہے اور جن کا انجام بالآخر پہلی بین الملی کانفرنس "کا مناقشہ ہوا

ہم اپنا مطالعہ انہیں دو شخصوں سے شروع کرینگے! پہلے اِن کی تعلیم اور پھر وہ جماعتیں جو انہوں نے قائم کیں یا جن پر ان کا اثر تھا۔ اسکے بعد ہم زمانۂ حال میں اشتراک کی اشاعت کا ذکر کریں گے اور پھر اشتراک نے ریاست اور سیاسی کارروائی پر جو زور دیا تھا اُس کے خلاف پنچایت بندی کی بغاوت کا اور نیز بعض ان تحریکوں کا جو فرانس کے باہر رونما ہوئیں لیکن جنہیں پنچایت بندی کی تحریک سے کچھ تعلق ہے ۔ خصوصاً امریکہ کی تحریک "صنعتی کارکنانِ عالم" (I. W. W.) اور انگلستان کا پیشہ وارانہ اشتراک ۔ اس تاریخی تبصرہ کے بعد ہم مستقبل کے بعض ضروری مسائل پر نظر ڈالیں گے اور فیصلہ کرنے کی کوشش کرینگے کہ اگر اشتراکی یا پنچایت بندی کے مقاصد حاصل ہوجائیں تو دنیا کو کن کن باتوں کے اعتبار سے خوشی نصیب ہوگی ۔

میری ذاتی رائے ۔ جس کا اظہار بہتر ہے کہ میں شروع ہی میں کردوں ۔ یہ ہے کہ اگرچہ خالص نراج ہمارا آخری نصب العین ہونا چاہیئے جس سے قریب تر ہونے کی کوشش جماعت انسانی کو دائمی طور پر جاری رکھنی چاہیئے تاہم یہ فی الحال ناممکن ہے اور اگر اسے اختیار کیا گیا تو زیادہ سے زیادہ ایک یا دو سال سے زیادہ قائم نہیں رہ سکتا ۔ برخلاف اس کے میرے نزدیک باوجود بہت سے نقائص کے اشتراک اور پنچایت بندی سے ایک ایسی دنیا کے پیدا ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے جو اس دنیا سے بہتر اور خوشتر ہوگی جس میں ہم لوگ زندگی گزار رہے ہیں ۔ لیکن میں ان میں سے کسی کو بھی بہترین قابل عمل نظام نہیں مانتا ۔ مارکسی اشتراک سے مجھے ڈر ہے کہ یہ ریاست کو بہت زیادہ قوت دیدیگا اور پنچایت بندی جو ریاست کو مٹانا چاہتی ہے یہ میں سمجھتا ہوں کہ مختلف پیشہ وار گروہوں کی رقابت کو ختم کرنے کے لئے ایک مرکزی قوت (با اختیار) کی از سر نو ترتیب پر مجبور ہوگی ۔ بہترین قابل عمل طریقہ میرے نزدیک پیشہ وارانہ اشتراک کا ہی جو ریاست والے اشتراکیوں کے مطالبات اور پنچایت بندی کے حامیوں کی خوف ریاست دونوں کی معقول بات کو یوں تسلیم کرتا ہے کہ مختلف حرفوں میں ایک نظام اتحادی اختیار کرتا ہے ۔ حرفوں کے مابین اس نظام اتحادی کی موافقت میں وہی وجوہ ہیں جو قوموں کے مابین اس تحریک کو پیش کررہے ہیں ۔ ان

نتائج کے وجوہ جوں جوں ہم آگے بڑھینگے واضح ہوتے جائیں گے۔

بنیادی تعمیر نو کی جدید تحریکوں کی تاریخ شروع کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعض ان خصوصیات سیرت پر نظر ڈالی جائے جو اکثر سیاسی جینپ وں کو ممتاز کرتی ہیں اور جن کے متعلق علاوہ تعصب کے اور بعض دیگر وجوہ سے بھی بڑی غلط فہمی ہوتی ہے۔ میں ان وجوہ کے ساتھ انصاف کرنا چاہتا ہوں تاکہ یوں اور بھی مؤثر طور پر بتا سکوں کہ انہیں کیوں اس معاملہ میں دخل نہ ہونا چاہیئے۔

زیادہ ترقی یافتہ تحریکوں کے پیشوا اکثر نہایت غیر معمولی بے نفسی کے لوگ ہوتے ہیں، جیسا کہ اُن کے حالات زندگی پر نظر ڈالنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ ان میں اتنی ہی قابلیت ہوتی ہے جتنی کہ اکثر ان لوگوں میں جو بڑے اقتدار کی جگہیں حاصل کر لیتے ہیں تاہم یہ خود واقعات عصر کے حَکَم نہیں بنتے، نہ دولت حاصل کرتے ہیں اور نہ اپنے انبوہ معاصرین کی مدح سرائی۔ یہ لوگ جنہیں ان انعامات کے حاصل کرنے کی صلاحیت ہے اور جو کم از کم اتنا ہی کام کرتے ہیں جتنا کہ ان انعاموں کے حاصل کرنے والے لیکن پھر بھی جان بوجھکر ایسی راہ اختیار کرتے ہیں جس سے ان کا حصول ناممکن ہو جائے ان کے متعلق ضرور یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ اپنی زندگی کے لئے ذاتی ترقی کے علاوہ کوئی اور مقصد رکھتے ہیں۔ ممکن ہو کہ انکی زندگی کی جزویات میں نفس پرستی کا بھی کچھ میل ہو مگر اس زندگی کی محرک اصلی یقیناً ان کے نفس سے باہر کوئی چیز ہے۔ اشتراک، نراج اور پنچائت بندی کے ہراولوں نے قید، جلاوطنی اور افلاس کی تکلیفیں سہی ہیں اور جان بوجھ کر کیونکہ یہ اپنی تبلیغ سے باز نہیں آنا چاہتے تھے۔ اپنے اس رویہ سے انہوں نے ثابت کر دیا کہ جو امید انہیں سہارا دیتی تھی وہ خود اُن کی ذات کے لئے نہ تھی بلکہ نوع انسانی کے لئے۔

ہر چند ان لوگوں کی زندگی کی تہ میں زیادہ تر انسانی فلاح کی خواہش ہی کیوں نہ ہو اکثر یہ ہوتا ہے کہ ان کی تحریر و تقریر کی جزویات میں محبت کے مقابلہ میں نفرت زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ بے صبر عین پسند ـــ اور بلا تھوڑی سی بے صبری کے انسان مشکل ہی سے مؤثر ثابت ہو سکتا ہے ـــ جب دنیا کو مسرت و خوشی دینے کی کوشش میں مخالفت اور مایوسیوں سے دوچار ہوتا

ہو تو یہ چیزیں تقریباً یقینی طور پر اسے نفرت کی طرف لے جاتی ہیں۔ اسے اپنی خلوص نیت اور اپنی تعلیم کے حق ہونے کا جس قدر یقین ہوتا ہے اُسی قدر اس غلط تعلیم پر یہ برافروختہ ہوگا۔ عوام کی بے توجہی اور حالات موجودہ کے حامیوں کی دلی مخالفت کی طرف سے تو یہ اکثر کامیابی کے ساتھ ایک فلسفیانہ رواداری کا رویہ اختیار کرے گا، لیکن اُن لوگوں کو وہ ہرگز معاف نہیں کرسکتا جو اجتماعی بہبود کی خواہش کے اسی طرح دعویدار ہیں جیسے یہ خود لیکن اس مقصد کے حصول کے لئے اس کے طریقہ کو قبول نہیں کرتے۔ اس کا وہ شدید یقین جو اُسے اپنے عقاید کی خاطر تکلیفیں برداشت کرنے کے قابل بناتا ہے وہی اس کی نظر میں ان عقاید کو اس درجہ روشن و بین ثابت کرنے دیتا ہے کہ اس کے خیال میں ہر سمجھدار آدمی جو انہیں رد کرے لازماً بے ایمان ہو اور بدنیتی سے مقصد کے خلاف دغا کرنا چاہتا ہے۔ یہاں سے تراوش کرتی ہے فرقہ بندی کی روح، وہ تلخ و تنگ اذعانیت جو ہر دلعزیز عقیدے میں غلو کرنے والوں پر ایک عذاب کیطرح مسلط ہو جاتی ہے۔ دغابازی کے لئے واقعی اتنی لالچیں موجود ہوتی ہیں کہ شبہ کرنا بالکل فطری بات ہے۔ اور قاید جن جاہ پرستی کو اپنی راہ زندگی کے انتخاب میں دبا دیتے ہیں وہ ضرور دوسری شکل میں رونما ہوتی ہے یعنی فرقہ کے اندر ذہنی اقتدار اور استبدادی طاقت کی خواہش کی شکل میں۔ ان اسباب کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بنیادی اصلاح کے حامی مختلف مخالف گروہوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں، جن میں باہم نہایت تلخ نفرت ہوتی ہے، جو ایک دوسرے پر اس قسم کے الزام لگاتے ہیں کہ یہ پولیس کا تنخواہ دار ہے، جس مقرر یا مصنف کی یہ تعریف کریں اُس سے مطالبہ ہوتا ہے کہ ان کے تعصبات کی من وعن مطابقت کرے اور اپنی ساری تعلیم کو اُن کے اس عقیدہ کا معین بنائے کہ اصلی حقیقت صرف ان کے مذہب کی حدود ہی میں مل سکتی ہے۔ اس کیفیت دماغی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سرسری نظر سے دیکھنے والے کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے نوع انسانی کو فائدہ پہنچانے کے لئے سب سے زیادہ قربانی کی ہے محبت سے زیادہ نفرت کے بندے ہیں۔ اور اذعانیت کا مطالبہ ذہن کے آزاد فعل کے لئے گویا موت

ہے۔ کچھ تو اسو جہ سے اور کچھ معاشی تعصبات کے باعث ارباب فکر کے لئے یہ بات مشکل ہے کہ وہ ان انتہا پسند مصلحین کا عملاً ساتھ دے سکیں چاہے انہیں ان کے خاص مقاصد سے اور خود اُن کے لائحۂ عمل کے دس میں نو حصوں سے کتنی ہی ہمدردی کیوں نہ ہو۔

ایک اور سبب جس کی وجہ سے عام لوگ ان بنیادی مصلحوں پر غلط حکم لگاتے ہیں یہ ہے کہ یہ موجودہ نظام جماعت کو باہر سے دیکھتے اور اس کی رسوم کی طرف مخالفانہ رویہ رکھتے ہیں۔ اگرچہ اکثر انہیں اپنے ہمسایوں کے مقابلہ میں اصلاح و ترقی کے لئے فطرت انسانی کی واقعی صلاحیت پر زیادہ یقین ہوتا ہے تاہم یہ موجودہ رسوم سے پیدا ہونے والی بے رحمی اور تشدد کا اس درجہ احساس رکھتے ہیں کہ دوسرے پر یہ بالکل غلط اثر پڑتا ہے کہ یہ لوگ دنیا سے بیزار ہیں۔ اکثر انسان عام رویہ کے دو مختلف قانون رکھتے ہیں۔ ایک اُن کے لئے جنہیں یہ ساتھی یا ہمعصر یا دوست یا اور کسی طرح "اپنے گلہ" سے متعلق سمجھتے ہوں اور دوسرا اُن کے لئے جنہیں یہ دشمن یا ذات باہر یا جماعت کے لئے خطرہ جانتے ہوں۔ بنیادی مصلح اکثر اپنی تمامتر توجہ جماعت کے اس رویہ پر مجتمع کر دیتے ہیں جو یہ موخرالذکر طبقہ کے ساتھ رکھتی ہے یعنی وہ طبقہ جس کے ساتھ "گلہ" بدظنی رکھتا ہے۔ اس طبقہ میں جنگ کرنے والے دشمن بھی شامل ہوتے ہیں اور مجرم بھی۔ ان لوگوں کے دشمن ہیں، جو موجودہ نظام کا قیام اپنی سلامتی اور اپنے ذاتی حقوق کے لئے لازمی جانتے ہیں، اس طبقہ میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو کسی بڑی معاشی یا سیاسی تبدیلی کے حامی ہوں نیز وہ ساری جماعتیں جن میں اپنے افلاس یا کسی اور وجہ سے خطرناک درجہ تک بے چینی کے احساس کا احتمال ہو۔ معمولی شہری غالباً شاذ ونادر ہی ایسے افراد یا طبقوں پر دھیان کرتا ہے اور زندگی بھر یہ یقین کرتے گزار دیتا ہے کہ وہ خود اور اُس کے احباب بھلے آدمی ہیں کیونکہ یہ کسی کو جس سے جماعت کو مخالفت نہ ہو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتے۔ لیکن جس شخص کے پیش نظر ان لوگوں کی مصیبتیں ہیں جن سے یہ گروہ نفرت کرتا اور ڈرتا ہے وہ تو بالکل دوسرا حکم لگائے گا۔ ان تعلقات سے حیرت خیز سفاکی پیدا ہو سکتی ہے اور فطرت انسانی کا ایک نہایت بدنما پہلو نمودار ہوتا ہے۔ سرمایہ داری کے مخالف بعض تاریخی واقعات

کے مطالعہ سے دیکھتے ہیں کہ سرمایہ داروں اور ریاست نے مزدوروں کے طبقہ کے ساتھ اکثر یہ سفاکی برتی ہے خصوصاً جب کبھی انہوں نے اس ناقابل بیان مصیبت کے احتجاج کی جرأت کی ہے جسمیں موجودہ نظام صنعتی نے انھیں عموماً ڈالدیا ہے ۔ چنانچہ معمولی کھاتے پیتے شہری کا جو رویہ موجودہ نظام جماعت کی طرف ہے اُس سے بالکل مختلف صورت یہاں پیدا ہوتی ہے ۔ یہ رویہ اتنا ہی صحیح ہوتا ہے جتنا کہ اول الذکر کا، شاید اُسی قدر غلط بھی لیکن اسی طرح واقعات پر مبنی ۔ البتہ اس کی بنا اُن واقعات پر ہوتی ہے جن میں جماعت کے تعلقات دوستوں کے ساتھ نہیں بلکہ دشمنوں کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں ۔

قوم کے طبقوں کی جنگ خود قوموں کی جنگ کی طرح دو مخالف خیال پیدا کرتی ہے اور یہ دونوں یکساں صحیح بھی ہیں اور غلط بھی۔ ایک مشغول جنگ قوم کا شہری جب اپنے ہموطنوں کا خیال کرتا ہے تو زیادہ تر اس حیثیت سے خیال کرتا ہے جس میں اسے ان کا تجربہ ہوا ہے یعنی دوستوں سے برتاؤ، خاندان سے تعلقات وغیرہ کے اعتبار سے ۔ یہ اسے مجموعی طور پر نیک اور بھلے آدمی معلوم ہوتے ہیں لیکن جس قوم سے اس کا ملک برسرِ جنگ ہے وہ اس کے ہموطنوں کو بالکل مختلف تجربوں کی روشنی میں دیکھتی ہے : جیسے یہ جنگ کی سفاکی، مخالف علاقوں پر حملہ و تسلط، یا سیاسی بازیگری کے ہتھکنڈوں میں دکھائی دیتے ہیں ۔ جن انسانوں کے متعلق یہ باتیں صحیح ہیں وہ وہی لوگ ہیں جنھیں ان کے ہموطن شوہر، باپ یا دوست کی حیثیت سے جانتے ہیں ۔ لیکن اسکے متعلق بالکل دوسری رائے اس لئے قائم کی جاتی ہے کہ حکم لگانے کی بنیاد بالکل دوسری ہے چنانچہ یہی حال ان لوگوں کا ہے جو سرمایہ دار کو انقلاب جو مزدور کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں ۔ یہ سرمایہ دار کے خلاف بے حد سخت اور غلط حکم لگاتے ہیں کیوں کہ جن واقعات پر انہوں نے اس کے متعلق اپنی رائے قائم کی ہے وہ ایسے واقعات ہیں جنھیں یہ یا تو جانتا نہیں یا عادتہً نظر انداز کر دیتا ہے ۔ تاہم یہ رائے جو باہر سے قائم کی جاتی ہے اتنی ہی صحیح ہے جتنی وہ رائے جو اندر سے قائم کی جائے ۔ کامل حق کے لئے دونوں ضروری ہیں ۔ اور وہ اشتراکی جو خارجی رائے پر زور دیتا ہے دنیا سے بیزار نہیں محض

مزدوروں کا دوست ہے جو اس غیر ضروری مصیبت کے منظر سے پراگندہ دماغ ہو گیا ہے جو سرمایہ داری کی بدولت ان مزدوروں پر پڑتی ہے۔

میں نے یہ عام ملاحظات اپنے مطالعہ کے شروع میں اس لئے رکھدئے ہیں تاکہ پڑھنے والے پر واضح کردوں کہ ہم جن تحریکوں کی تحقیق کرنے والے ہیں ان میں کتنی ہی تلخی اور نفرت کیوں نہ پائی جائے ان کا اصلی سرچشمہ تلخی و نفرت نہیں بلکہ محبت ہے۔ اپنے محبوب کو عذاب و تکلیف پہنچانے والے سے نفرت نہ کرنا بہت دشوار ہے لیکن دشوار ہی ہے، ناممکن نہیں، البتہ اس کے لئے ضرورت ہے ایک ایسی وسعت نظر اور ذہن کی ایسی ہمہ گیری کی جس کا قائم رکھنا شدید مقابلہ و مجادلہ کی حالت میں آسان کام نہیں۔ اگر اشتراکی اور نراجی معقولیت تام قائم نہیں رکھ سکے ہیں تو وہ اس بارہ میں اپنے مخالفوں سے کچھ مختلف نہیں اور اپنے خیالات کے سرچشمہ کے اعتبار سے انہوں نے اپنے کو ان لوگوں سے افضل ثابت کیا ہے جو لاعلمی یا کاہلی کے باعث ان ناانصافیوں اور ظلموں کو تسلیم کرتے ہیں جن سے موجودہ نظام قائم ہے۔

(باقی آئندہ)

عربوں کا تمدن

رسالہ "معارف" کی پچھلی اشاعت میں ڈاکٹر سہیل کی کتاب "عربوں کا تمدن" کا ایک طویل معائب نامہ شائع ہوا ہے۔ سترہ اٹھارہ صفحے کا مضمون، شروع سے لیکر آخر تک نکتہ چینیوں سے پُر۔ تعجب ہوا کہ ایک معمولی سی بات کے لیے جناب "تنقید نگار" نے اس قدر زحمت کیوں اُٹھائی۔ "عربوں کا تمدن" کوئی محققانہ یا تنقیدی تصنیف تو تھی نہیں۔ اس کے متعلق شروع ہی میں عرض کر دیا گیا تھا کہ یہ عربی تمدن پر ایک مختصر مگر دلچسپ رسالہ ہے جس میں بہت کم باتیں قابل اعتراض ہیں "تنقید نگار" صاحب اگر اس بات کو سمجھ لیتے تو معاملہ اس قدر طول نہ کھینچتا۔

لیکن تنقید نگار صاحب مصنف اور مترجم دونوں سے خفا ہیں۔ مصنف سے اس لئے کہ اس نے دیدہ و دانستہ غلط بیانیوں سے کام لیا اور مترجم سے اس لئے کہ اُس نے مصنف کو ان غلط بیانیوں پر مناسب تنبیہ نہیں کی بلکہ اپنے جوش خوش اعتقادی میں یہاں تک لکھدیا کہ "سوائے ایک آدھ بات کے ساری کتاب مصنف کی دقت نظر، اصابت رائے اور وسیع الخیالی کا ثبوت ہے" حالانکہ مصنف نے جابجا واقعات میں رنگ آمیزی کی ہے، غلط قیاسات اور تدلیس سے کام لیا ہے حتیٰ کہ کتاب کے دوسرے باب کی تو ایک ایک سطر میں "زہر" بھرا ہے۔ بدقسمتی سے مترجم کو نہ تو تنبیہ و تہدید کا کوئی خاص شوق تھا نہ یہ مناسب معلوم ہوتا تھا کہ جناب ناقد کی طرح مصنف کے ہر بیان کی جائز و ناجائز تاویل سے خواہ مخواہ تنبیہ کا موقع پیدا کیا جائے۔ ہماری رائے میں یہ طرز عمل کچھ بہت زیادہ مستحسن نہیں اس لئے کہ جو لوگ دوسروں کی عیب جوئی کو اپنا مقصد بنا لیتے ہیں وہ اکثر اپنی ہی تنگ نظری اور خوئے اعتراض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے غلط نہیں۔ جناب ناقد کے تمام اعتراضات پر غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انہوں نے محض نکتہ چینی کی خاطر نکتہ چینی کی ہے۔ البتہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس سے ان کا مطلب کیا تھا۔ پہلے

کہ ایسا کرنے میں نہ تو انہوں نے کوئی علمی خدمت سرانجام دی ہے اور نہ اپنی معارف پروری کا کوئی بہتر ثبوت پیش کیا ہے۔

کتاب کے پہلے باب میں کوئی بات قابل اعتراض نہیں تھی لیکن ہمارے تنقید نگار صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جو "مستشرقانہ فضیلت" کے سرے ہی سے قائل نہیں۔ فرماتے ہیں :۔

"کتاب کے پہلے باب میں جغرافیۂ عرب، عرب کی قدیم مشہور حکومتوں ...... کا تذکرہ ہے ...... عربوں کی ان مختلف حکومتوں کے زمانۂ عروج کی تعیین ارباب تاریخ و ماہرین کتبات کا ایک مستقل موضوع رہا ہے اور اس کے متعلق اہل علم کے مختلف نظریے معروف ہیں۔ اس موقع پر اگر مصنف نے اپنے دیگر ہم وطن جرمن ماہرین آثار و کتبات کے نظریوں کو اختیار کیا ہے تو کوئی حیرت انگیز امر نہیں (حیرت انگیز امر یہ ہے کہ آپ نے اپنے نظریوں کا اظہار نہیں فرمایا۔ نیازی) لیکن اس موقع پر مصنف کے اس نظریے پر خاص توجہ کی ضرورت تھی کہ عربوں میں فقدان وحدت اور ایک قوم ہونے کے نہ (!) احساس رکھنے سے یہ نتیجہ کیونکر اخذ ہوتا ہے کہ ان میں اطاعت و فرمانبرداری کا مادہ موجود نہ تھا (محض اس لئے کہ یہ ایک مستشرق کا خیال ہے۔ نیازی) یہاں تک کہ وہ اپنے سرداروں کی اطاعت بھی نہیں کرتے (مصنف نے کہیں یہ نہیں لکھا۔ نیازی) پھر مصنف نے اپنے اسی نظریے سے (جناب ناقد کے نزدیک۔ نیازی) آگے چلکر (یعنی دوسرے باب میں۔ نیازی) یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام نے ان میں اسی وصف کو پیدا کرکے اپنی اشاعت کی (گویا یہ خیال غلط ہے کہ اسلام نے عربوں میں اطاعت و فرمانبرداری کی روح پیدا کی۔ نیازی) حالانکہ عربوں کا اپنے سرداروں کی اطاعت ایک نمایاں وصف کے طور پر مخصوص شیوہ سمجھا جاتا ہے۔ عہد جاہلیت کا وہ زمانہ جو اسلام سے قریب تر تھا اس میں ان کے فقدان وحدت اور ایک قوم ہونے کے نہ (!) احساس رکھنے سے اگر کوئی نقص تھا تو یہ تھا کہ حکومت کے فرائض کسی مرکزی شخصیت یا جماعت کے سپرد ہونے کی بجائے قبائل کے سرداروں کے ہاتھ میں تھے اور اس وقت حکومت کی کوئی تشکیل نہیں تھی

(بہت خوب! حکومت کی کوئی تشکیل ہی نہیں تھی اور حکومت کے فرائض سرداران قبائل کے ہاتھ میں تھے۔ نیازی) ورنہ جہاں تک سرداروں کے اقتدار کا تعلق ہے وہ اپنے قبائل کے ایک ایک فرد پر مطلق العنان حاکم تھے۔ اور بچہ بچہ ان کی اطاعت پر تیار رہتا۔ اسلئے اگر واقعی آنحضرت صلعم کے پیش نظر دعوت اسلام پیش کرتے وقت بقول مصنف کسی متحدہ حکومت کا خاکہ ہوتا (نہ مصنف نے کہیں یہ کہا ہے کہ دعوت اسلام پیش کرتے وقت آنحضرت صلعم کا یہ مقصد تھا نہ وہ تنقید نگار صاحب کی "متحدہ حکومت" کا مطلب سمجھتا ہے۔ نیازی) تو آنحضرت صلعم غلاموں، لاوارثوں اور غربا میں دعوت اسلام پیش فرمانے کی بجائے (آنحضرت صلعم نے امیر وغریب کسی کو اپنی دعوت سے محروم نہیں رکھا۔ نیازی) سرداران عرب کو اتحاد باہمی کی دعوت دے کر کسی ایک نقطے پر جمع فرماتے (یہ "کوئی ایک نقطہ" خود بخود کہاں سے آ جاتا؟ نیازی) اور نہایت آسانی سے متحدہ عربی حکومت کی بنا ڈال سکتے تھے خصوصاً جبکہ قبائل عرب پر خاندان عبدالمطلب کو ایک عام تفوق حاصل تھا اور عبدالمطلب واقعہ فیل میں عرب کی (عرب کی؟ نیازی) رہنمائی کر چکے تھے (تنقید نگار صاحب کو یقین ہے کہ سرداران عرب بغیر کسی مزاحمت کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعوت کو قبول کر لیتے اور چونکہ ہر سردار اپنے قبیلے کا مطلق العنان حاکم تھا اس لئے بغیر کسی سیاسی اور ذہنی انقلاب کے تمام عرب میں "متحدہ عربی حکومت" قائم ہو جاتی۔ نیازی)۔

یہ نتائج صرف تنقید نگار صاحب کے قائم کردہ ہیں۔ مصنف کی تحریر سے ان کو کوئی تعلق نہیں۔ ہم قارئین کرام کی توجہ کتاب کی اصلی عبارت کی طرف منعطف کرائیں گے:-

"عربوں میں جس چیز کی کمی تھی وہ وحدت قومی کا خیال ہے۔ ان کو خاندان اور قبیلے کا وجود تو نظر آتا تھا لیکن ایک قوم ہونے کا احساس نہ تھا۔ اس کے علاوہ ان میں یہ نقص تھا کہ ان میں اطاعت کا مادہ موجود نہیں تھا (یعنی اسی ایک قوم ہونے کے سلسلے میں۔ نیازی) ان کے اندر کبھی یہ خیال پیدا نہیں ہوا تھا کہ اطاعت ضروری ہے بلکہ بعض موقعوں پر ایک طرح کی

خوبی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر قبیلے کا ایک سردار ہوتا تھا جس کی وہ عزت واحترام بھی کرتے تھے لیکن نہ کسی سردار کو حکومت کرنے کا حق حاصل تھا نہ ان کی اطاعت کرنا کسی کا فرض تھا" (صفحہ ۲۰)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ مصنف کو صرف عربوں کی سیاسی پستی کی طرف اشارہ کرنا مقصود تھا۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ہر فرد قبیلہ کو اپنے سردار سے جو تعلق تھا وہ کسی سیاسی مفاہمت پر مبنی نہیں تھا۔ نہ وہ اس وسیع مفہوم میں انضباط جماعت اور اطاعت کی خوبیوں سے آشنا تھے۔ مگر تنقید نگار صاحب کے نزدیک ان میں یہ سب اوصاف موجود تھے البتہ "ایک قوم ہونے کے نہ احساس رکھنے سے ان میں کوئی نقص تھا تو یہ تھا کہ حکومت کے فرائض کسی مرکزی شخصیت یا جماعت کے سپرد ہونے کی بجائے سرداران قبائل کے ہاتھ میں تھے" حقیقت تو یہ ہے کہ عربوں کو اس قسم کے سیاسی اور اجتماعی ادارات کا احساس ہی نہیں تھا ورنہ ظاہر ہے کہ جہاں تک قبائلی عصبیت کا تعلق ہے مصنف کو اس سے انکار نہیں۔ مصنف نے لکھا ہے "ان میں ایک ناقابل علاج مخصوصیت پیدا ہوگئی تھی جس کے ماتحت ہر قبیلہ اپنے آپ کو کافی بالذات سمجھتا تھا صفحہ ۱۵" اور "ابتک وہاں جو عصبیت پائی جاتی تھی اس کا تعلق صرف خاندان سے تھا۔ صفحہ ۲۶"۔ چنانچہ آگے چل کر جہاں مصنف نے یہ خیال ظاہر کیا ہے (دوسرے باب میں۔ نیازی) کہ نماز کے اخلاقی اثرات سے مسلمانوں میں مساوات انسانی کا احساس پیدا ہوا اور اس سے عرب اطاعت و فرمانبرداری کی خوبیوں سے واقف ہوئے اور اس طرح اس نے اسلام کے مقاصد عالیہ کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے کہ "اسلام کی ابتدا ہی سے یہ خواہش تھی کہ وہ خاندان اور قبائل کے تنگ رشتوں کو توڑ ڈالے" تو اس سے ناقد صاحب نے محض اس لئے انکار کر دیا کہ یہ خیالات ایک مستشرق نے ظاہر کئے ہیں اور اگر انہوں نے خدانخواستہ یہ تسلیم کر لیا کہ اسلام نے عربوں کو اطاعت و فرمانبرداری سکھائی، ان میں نظم و انضباط کا مادہ پیدا کیا تو اس سے غالباً یہ یقین کر لینا لازم آجائیگا کہ "دعوت اسلام پیش کرتے وقت آنحضرت صلعم کے پیش نظر "متحدہ عربی حکومت"

کا خاکہ تھا۔ ان کی رائے میں اگر آگے چلکر "متحدہ عربی حکومت" قائم ہوئی تو اس میں رسول اللہ صلعم کو کوئی دخل نہیں تھا۔ بہرحال مصنف نے کہیں یہ نہیں لکھا کہ "دعوت اسلام پیش کرتے وقت آنحضرت صلعم کے سامنے 'متحدہ عربی حکومت' کا خاکہ موجود تھا" لیکن جس طرح اس "متحدہ عربی حکومت کی منطق ہماری سمجھ میں نہیں آئی اسی طرح یہ بھی پتہ نہ چلا کہ اگر اسلام کی بدولت عربوں میں اطاعت و فرمانبرداری کے اوصاف پیدا ہوئے اور ان سے اسلام کی اشاعت میں بھی ترقی ہوئی تو اس میں کونسی عیب کی بات ہے۔ معلوم ہوتا ہے تنقید نگار صاحب جہاد بالقلم پر آمادہ تھے اور بڑی محنت و جانفشانی کے ساتھ اسلام کی حمایت و مدافعت کا فریضہ ادا کر رہے تھے۔ انہیں اس امر کا مطلق خیال نہیں تھا کہ اپنے استدلالات پر تھوڑا سا غور بھی فرمالیتے۔

تقریباً یہی کیفیت ان اعتراضات کی ہے جو جناب ناقد صاحب نے "عہد رسالت کے مستشرقانہ تبصرے" پر فرمائے ہیں۔ افسوس ہے انہوں نے مصنف کی "زہر چکانی" اور مترجم کی "خموشی" پر تو اظہار افسوس فرمایا لیکن اپنی مناظرانہ شان کا مطلق خیال نہیں کیا۔ مصنف نے لکھا ہے "چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں وسطی عرب اور اس کے مرکزی علاقہ حجاز میں جہاں اس سے بیشتر مذہب پر کوئی غور نہیں کرتا تھا لوگوں کے اندر ایک بہتر مذہب کی جستجو کا شوق پیدا ہو چکا تھا۔ وہ نہ صرف یہودیت اور عیسائیت سے واقف تھے بلکہ ان میں سے بعض ان مذاہب کو قبول بھی کر چکے تھے" صفحہ ۴۴ "عرب اور بالخصوص مکہ کے کچھ لوگ اس وقت کے مذہب سے غیر مطمئن ہو کر یہودیت اور عیسائیت میں ہدایت ڈھونڈتے تھے۔ انہوں نے ایک قسم کا انتخابی مذہب قائم کر لیا تھا۔۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ جب آنحضرت صلعم کا ظہور ہوا اور لوگوں نے آپ کا شمار انہیں متلاشیان حق میں کیا تو یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی" صفحہ ۲۱۔ مصنف کے نزدیک نماز کی انضباطی اور تعلیمی قدر کا اندازہ اس امر سے کرنا چاہیئے کہ "اس کا آغاز ان مغرور لوگوں میں ہوا۔۔۔۔ جن کو اطاعت اور فرمانبرداری کا مطلق احساس نہیں تھا۔ اگر ہم اتنا خیال کرلیں تو اس سے یہ بات سمجھ میں آجائیگی کہ ضوابط کے احساس اور ان کے قیام میں اس طریق

عبادت کو کیا اہمیت حاصل ہے ...... نماز با جماعت سے ..... مسلمانوں میں عصبیت پیدا ہوئی ..... ان میں مساوات انسانی کا احساس قائم ہوا" صفحہ ۲۶ - اس کی رائے میں اہل مکہ نے آنحضرت صلعم کی مخالفت کی تو اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ "مکہ کے حکمراں قبائل کو آنحضرت صلعم کی تعلیمات کی مخالفت کا اس قدر خیال نہیں تھا جس قدر وہ ان معاشرتی اور سیاسی انقلابات سے خائف تھے جو ان سے مترتب ہو رہے تھے" صفحہ ۲۷ - آنحضرت کی ہجرت کا حال بیان کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے "آنحضرت صلعم تبلیغ اسلام کی خاطر کئی سال سے عکاظ کے میلے میں شریک ہو رہے تھے ..... یہ درست ہے کہ آنحضرت کو اس قدر کامیابی نہیں ہوئی جیسی کہ آپ کو توقع تھی - بایں ہمہ ان میں سے بعض کو رفتہ رفتہ آپ کی تعلیمات سے ہمدردی پیدا ہوگئی - یہ اہل یثرب تھے ...... ان لوگوں نے آنحضرت صلعم کی باتوں کو بڑی ہمدردی اور توجہ سے سنا - ۶۲۰ء میں ان کے چند آدمی آنحضرت کے مقاصد کے حامی بن گئے" صفحہ ۲۸ - لیکن جناب تنقید نگار صاحب نے اس سے جو نتائج مترتب کئے ہیں ان سے ان کی دیانت تنقید کا راز فاش ہو جاتا ہے - فرماتے ہیں :-

> "مصنف نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ عربوں میں عیسائیوں اور یہودیوں کے اختلاط سے ایک ایسا گروہ پیدا ہوا جو دین حق کی جستجو میں سرگرداں تھا - آنحضرت صلعم اسی گروہ میں پیدا ہوئے اور آپ حالات وقت کے مناسب ایک مذہب کی دعوت دیتے ہیں (تنقید نگار صاحب اس سے پہلے لکھ چکے ہیں کہ مصنف کے نزدیک دعوت اسلام پیش کرتے وقت آنحضرت کے پیش نظر "متحدہ عربی حکومت" کا خاکہ تھا - نیازی) عربوں میں اطاعت و انضباط کی کمی تھی - آپ اپنی دور اندیشی سے اس کمی کو نماز باجماعت سے پورا کرتے ہیں جس سے امام کی اطاعت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ مساوات انسانی کا جذبہ پیدا کرتے ہیں اور مکہ میں ایک مضبوط جماعت پیدا ہو جاتی ہے اور یہی دین اسلام کی اساس ہوتی ہے لیکن شرفائے مکہ اس تحریک کو پھولنے پھلنے نہیں دیتے - آپ حج کے موقعہ سے فائدہ اٹھا کر یثرب کی خانہ جنگیوں کو

(نعوذ باللہ) بھاگتے ہیں اور ایک "داعی امن" کی حیثیت سے اپنی جماعت کے ساتھ مدینہ میں پہنچتے ہیں۔"

یہ صحیح ہے کہ آنحضرت صلعم کی مدنی زندگی پر مصنف نے چند ناروا الزامات قائم کئے ہیں۔ بایں ہمہ اسے اعتراف کرنا پڑا ہے کہ "عرب کے ہر حصے سے سفارتیں آئیں تاکہ وہ سیاسی نقطہ نظر سے قبولیت اسلام کے مسئلے پر غور کریں لیکن آنحضرتؐ نے اپنی اصلی مذہبی مقصد کو نہیں چھوڑا ..... آپ چاہتے تھے کہ لوگ صرف اِن اخلاقی ذمہ داریوں کا احساس کریں جو خدا کی طرف سے ان پر عائد ہوتی ہیں ..... آپ نے خدا کے نام پر شرک کو مٹایا ....." صفحہ ۴۴۔ بہرحال مترجم نے مصنف کے ان تمام غلط خیالات کی نفی کر دی تھی جو اُس نے آنحضرت صلعم کے متعلق ظاہر کئے ہیں۔ مگر تنقید نگار صاحب اِس سے مطمئن نہیں ہوئے۔ غالباً وہ یہ چاہتے تھے کہ مترجم حواشی کی بجائے مصنف کے اعتراضات کی تردید میں ترجمے کے ساتھ ساتھ ایک جدید تصنیف کا آغاز کر دیتا چنانچہ انھوں نے مصنف کے ان الزامات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:-

"انگریزی مترجم نے اِس موقع پر گبن اور جسٹس امیر علی کی تاریخ کے مختلف اقتباسات جابجا درج کئے ہیں جو مصنف کے بیانات سے مختلف ہیں (تنقید نگار صاحب کا خیال غلط ہے۔ گبن اور جسٹس امیر علی کی تاریخ کے اقتباسات بھی "نیازی صاحب" ہی کے پیش کردہ ہیں ۔ نیازی) اور نیازی صاحب نے اپنے حاشیہ میں سلسلۂ غزوات کے وجوہ مولینا شبلی کی سیرت النبی سے اخذ کرکے پیش کر دئے۔ پھر مصنف کے چند فقروں اور خیالات کو نقل کرکے اپنی ان سے برأت کر دی جو اسلامی نقطۂ نظر سے قابل اعتراض تھے لیکن اول تو جس قدر فقرے نقل کئے گئے ہیں اُن کے ماسوا اس باب میں جابجا زہر موجود ہے۔ اِس کے علاوہ جو فقرے نقل کئے گئے ہیں وہ تو محض واقعات سے نتائج پیدا کئے گئے ہیں (اگر فقروں سے تنقید نگار صاحب کی مراد وہ فقرے ہیں جو مترجم نے مصنف کے غلط بیانات کی تردید میں اس کی تحریر سے اقتباس کئے ہیں تو اس سے بہتر مصنف کی غلط بیانی کے ازالہ کی اور

کی صورت ہوسکتی تھی۔ تنقید نگار صاحب کو اس امر پر بھی غور کرلینا چاہیئے کہ اگر بقول اِن کے "یہ فقرے واقعات سے نتائج پیدا کئے گئے ہیں" ___ ہم تنقید نگار صاحب کی عبارت بعینہٖ نقل کررہے ہیں ___ تو ظاہر ہے کہ مصنف کو آنحضرت صلعم کی صداقت کا اعتراف ہے۔ (نیازی) ہمارا اِن نتائج سے انکار کرنا اس وقت تک قطعی بے سود ہے جبتک ہم نفس واقعات کی تصدیق یا تکذیب نہ کرلیں (عبارت کی ترتیب مدنظر رہے۔ ایک ہی جملے میں پہلے مصنف کے فقروں کی حیثیت نتائج کی سی تھی۔ ایسے نتائج جو مترجم نے تسلیم کئے اور ان کو مصنف کی غلط بیانی کے جواب میں نقل کیا لیکن اب دفعتہً اس کے معنی ان نتائج کے ہو جاتے ہیں جو واقعات سے پیدا کردہ ہیں اور جن سے مترجم انکار کر رہا ہے پوری عبارت ملاحظہ ہو" اس کے علاوہ جو فقرے نقل کئے گئے ہیں وہ تو محض واقعات سے نتائج پیدا کئے گئے ہیں ہمارا ان نتائج سے انکار کرنا اُس وقت تک قطعی بے سود ہے"۔ نیازی) جن سے وہ نتائج اخذ کئے گئے ہیں۔ اس لئے نیازی صاحب کو صرف ان چند فقروں سے (وہی جو واقعات سے نتائج پیدا کئے گئے ہیں اور جن سے ہم انکار بھی کر رہے ہیں مگر جن کو ہم نے نقل بھی کیا ہے۔ نیازی) محض اسلامی نقطۂ نظر کی بنا پر بیزاری ظاہر کرنا ان کے پہلو کو اور بھی کمزور کردیتا ہے (یہ کیسے؟ اور وہ گبن، جسٹس امیر علی مرحوم اور سلسلۂ غزوات کے وجوہ جو مولینا شبلی کی سیرت النبی سے ماخوذ ہیں کیا بیکار ہی ثابت ہوئے۔ کیا گبن، امیر علی اور شبلی کو واقعات کی تصدیق و تکذیب سے کوئی تعلق نہ تھا اور اس تمہیدات کی طرح ان کا پہلو بھی کمزور ہوگیا ہے؟ پھر یہ فقروں کا گورکھ دھندا ہماری سمجھ میں نہ آیا۔ یہ پتہ نہ چلا کہ ان سے تنقید نگار صاحب کا مطلب آیا ان فقروں سے ہی جن سے ہم انکار کر رہے ہیں یا جن کو ہم مصنف کی غلط بیانی کی تردید میں نقل کر رہے ہیں۔ بہرکیف ہماری حیثیت ظاہر ہے۔ ہم نے کہیں بھی مصنف کے ایسے فقرے نقل نہیں کئے جو قابل اعتراض ہوں۔ ہم نے صرف دو حاشیوں میں مصنف کے وہ "فقرے" نقل کئے ہیں جن سے خود اُس کے قائم کردہ اتہامات کی تردید ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۳۳ حاشیہ (۴)

"مصنف نے ابھی یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ آنحضرتؐ صرف یہ چاہتے تھے کہ اپنے آپ کو اور اپنے پیروؤں کو اہل مکہ کے تشدد سے محفوظ رکھیں۔ اس حالت میں یہ کہنا کہ آنحضرت مکہ پر فتح کرنی کرنا چاہتے تھے کس قدر ناانصافی ہے" اور صفحہ ۴۴ حاشیہ (۱): "یہاں مصنف نے خود ـــ یعنی یہ لکھکر کہ آنحضرت نے اپنے اصلی مذہبی مقصد کو نہیں چھوڑا ـــ اپنے سابقہ بیان کی کہ وہ شخص جس نے مکہ سے ہجرت کی اور وہ شخص جو اب مدینہ میں داخل ہوا دو بالکل مختلف آدمی معلوم ہوتے ہیں ..... کی تردید کی ہے"۔ (نیازی) ضرورت تو اس کی تھی کہ نفسِ(؟) ان واقعات کی صحت، ترتیب وقوع اور اُن کے اسباب وعلل پر اپنے ذاتی مذہبی جذبہ سے علیحدہ ہو کر محض تحقیقی نقطۂ نظر سے غور کرتے اور پھر اسی معیار پر مصنف کے قائم کردہ نظریوں اور پیش کردہ نتائج کو جانچتے (اب اس تحقیقی نقطۂ نظر اور واقعات کی جانچ کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔ نیازی) مثلاً مصنف نے مکہ میں اسلام کی کامیابی اور پھر عام عربوں میں قبول اسلام کا راز نماز باجماعت کو قرار دیا ہے اور لکھتا ہے:۔"

"نماز باجماعت ..... ایسی ہی قدیم ہے جیسا کہ خود اسلام ..... اس کا آغاز ان معزز (متن میں معزز کی بجائے مغرور ہے۔ نیازی) لوگوں میں ہوا جنہوں نے آج تک کسی اجنبی کے سامنے گردن نہیں جھکائی ..... اگر ہم اتنا خیال کرلیں تو یہ بات سمجھ میں آجائیگی کہ ضوابط کے احساس اور اُن کے قیام میں اس طریق عبادت کو کیا اہمیت حاصل ہے ..... نماز باجماعت میں باقاعدہ اجتماع سے مسلمانوں کے اندر عصبیت پیدا ہوئی اور ان میں مساوات انسانی کا احساس ہوا ..... اور اس سے خاندان اور قبائل کے تنگ اتحاد پر ایک کاری ضرب پڑی (کیا اس سے ہم یہ نتیجہ مترتب کریں کہ اس طرح اسلام کی اشاعت ہوئی؟ نیازی)۔

"آخر نماز باجماعت کا نتیجہ مصنف کے خیال کے مطابق یہ ہوا کہ:۔

"مکہ کی اس جماعت میں نہ صرف قبیلہ وارانہ اختلافات مٹ چکے تھے بلکہ آقا و غلام

کا قدیم امتیاز بھی خطرے میں تھا" (شاید ان الفاظ سے یہ نتیجہ مترتب ہوتا ہے کہ نماز با جماعت کی بدولت عام عربوں میں اسلام پھیلا۔ نیازی)

مترجم کا خیال تھا کہ اب عنقریب تنقید نگار صاحب کی تحقیق و اجتہاد کے طفیل ایک ایسے نکتے کا انکشاف ہوگا جس سے اِس کا پہلو مضبوط ہو جائے گا لیکن یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی کہ یہی ایک عبارت ہے جس کے جزوی اقتباسات سے تنقید نگار صاحب بار بار نئے نتائج مترتب کرتے ہیں۔ پہلے انہوں نے اُس کا جوڑ "عربوں کے ایک قوم ہونے کے احساس نہ رکھنے" سے مترتب شدہ نتائج سے ملایا تھا۔ اب ان کے نزدیک اس عبارت کے معنی یہ ہیں :۔

"اب دیکھئے مصنف نے یہ تمام قیاسات و نتائج صرف اس پر استنباط کئے کہ آنحضرت صلعم نے مکہ میں نماز با جماعت قائم کی اور اسی سے اسلام نے ترقی کا راستہ دیکھا .... حالانکہ ..... نماز با جماعت کا حکم ...... اُس وقت ہوا ..... جب آپ مکہ سے مدینہ تشریف لا چکے تھے ...... یہ صحیح ہے کہ نماز با جماعت سے عبادت کے ماسوا انسان کی اخلاقی زندگی پر بھی گہرا اثر پڑتا ہے اور اس سے عصبیت کے دائرے کو توڑنے اور مساوات انسانی کا احساس پیدا کرنے کے اثرات بھی پیدا ہوتے ہیں لیکن نماز با جماعت کے یہ اثرات مدینہ کی زندگی کے واقعات ہیں نہ مکہ کی (گویا جب تک مسلمانوں نے ہجرت نہیں کی تھی تب تک ان میں یہ اوصاف موجود نہیں تھے ؟ نیازی) وہاں تو ایک آدمی کا بھی تنہا نماز پڑھنا مشکل تھا چہ جائیکہ ایک جماعت (کیا تنقید نگار صاحب کا یہ مطلب ہے کہ مکہ میں لوگ نماز نہیں پڑھتے تھے اور اگر پڑھتے تھے تو اس کا ان کی اخلاقی زندگی پر کوئی گہرا اثر نہیں پڑتا تھا ؟ نیازی) لیکن مصنف نے اس موقع پر تدلیس سے کام لے کر نماز با جماعت کو مدنی احکام میں شمار کرنے کی بجائے اُسی قدر قدیم بنایا ہے جس قدر اسلام ..... اِس کے خیال کے مطابق آپ چاہتے تھے کہ مدینہ کی ہر جماعت کو اپنا ہمدرد بنالیں (کیا تنقید نگار

صاحب کے نزدیک آنحضرت صلعم ایسا نہیں چاہتے تھے؟ نیازیؔ) ان حالات میں مصنف سے سوال ہوسکتا ہے ایسی حالت میں مدینہ میں آکر غلاموں کا آقا سے آزاد کرنا۔ قبائل کو اپنی عصبیت سے روکنا کیا نعوذ باللہ آپ کے مدنی اصول سیاست کے برخلاف ثابت نہ ہوگا؟ کیا آپ اپنی اس طرز عمل سے مدینہ کی تمام جماعت کو اپنا ہمنوا بنا سکتے تھے..... کیا آپ کو اسے ملتوی کر دینا نہ تھا۔ لیکن اس کے برخلاف ہم دیکھتے ہیں کہ مکہ میں جہاں مصنف کے خیال کے مطابق اس کی ضرورت تھی آپ اس کو قائم کرنے کا موقع نہیں پاتے اور مدینہ میں جہاں مصنف کے نظریوں کے مطابق اس کو روکنے کی ضرورت تھی آپ جاری فرماتے ہیں۔"

اس عبارت کا مطلب تو کچھ تنقید نگار صاحب ہی خوب سمجھتے ہونگے البتہ یہ امر غور طلب ہے کہ اگر ایک لحظے کے لئے مصنف کے انہی "نظریوں" کو صحیح مان لیا جائے جو تنقید نگار صاحب کے ذہن میں ہیں تو اس سے یہ کیسے ثابت ہوتا ہے کہ مدنی زندگی میں نماز باجماعت معہ اپنے تمام اخلاقی اثرات کے آنحضرت صلعم کے اصول سیاست کے برخلاف ثابت ہوتی۔ نماز کا مسلمانوں میں عصبیت، مساوات انسانی کا احساس اور نظم وانضباط پیدا کرنا اُسی طرح آنحضرت صلعم کے مقصد سیاست کے لئے مفید ثابت ہوتا جس طرح (نعوذ باللہ) "نبوت سے آپ کی شان ریاست میں اضافہ ہو رہا تھا"۔ بہرکیف مصنف کی اصلی عبارت یہ ہے:۔

"نماز یا نماز باجماعت..... ایسی ہی قدیم ہے جیسا کہ خود اسلام۔ غالباً اس طریق عبادت کا خیال یہودیت اور عیسائیت کا پیدا کردہ ہے لیکن اس کی اصلیت کچھ بھی ہو مسلمانوں میں اسے خاص قوت اور اہمیت حاصل ہے۔ مسلمانوں کی اس خواہش سے کہ مفروضہ رکوع و سجود ٹھیک طور سے ادا ہوں نماز باجماعت کا آغاز ہوا..... جس کسی نے مسلمانوں کو باقاعدہ صفوں میں...... نماز ادا کرتے دیکھا ہے وہ اس انضباطی عبادت کی تعلیمی قدر کا بخوبی اندازہ کرسکتا ہے...... اس کا آغاز ان مغرور لوگوں میں ہوا...... جن کو اطاعت و فرمانبرداری کا مطلق احساس نہیں تھا۔ اگر ہم اتنا خیال کرلیں تو یہ بات سمجھ....

میں آجائیگی کہ ضوابط کے احساس اور ان کے قیام میں اس طریق عبادت کو کیا اہمیت حاصل ہے ...... نماز باجماعت سے ...... مسلمانوں میں عصبیت پیدا ہوئی اور ان میں مساوات انسانی کا احساس قائم ہوا۔ عرب میں یہ خیالات نہایت عجیب تھے۔ اب تک وہاں جو عصبیت تھی اس کا تعلق صرف خاندان سے تھا ہر شخص کو اپنی دولت و قوت پر ناز تھا ...... اپنے سے کم رتبہ لوگوں سے نفرت کرتا تھا۔ عربوں کی زندگی کے یہ دو نمایاں پہلو تھے۔ لہذا جب آنحضرتؐ نے ایک ایسا اتحاد قائم کر دیا جس میں امیر و غریب سب کو مساویانہ حیثیت حاصل تھی تو اس سے متفرق و منتشر عربوں کے اتحاد و اتفاق کا دروازہ کھل گیا۔ اسلام کی ابتدا ہی سے یہ خواہش تھی کہ وہ خاندان اور قبائل کے تنگ رشتوں کو توڑ ڈالے .....

نماز باجماعت کے علاوہ معاشرتی مساوات کا احساس بھی اسلام کا پیدا کردہ ہے اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ غربا کی امداد اور اُن کی کفالت نے ایک مذہبی فریضہ کی شکل اختیار کر لی ...... بلکہ زکوٰۃ کی ادائیگی ہر مسلمان پر فرض قرار پائی" صفحہ ۲۶

سطور بالا سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے کہیں بھی نماز و زکوٰۃ کی تاریخ لکھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ صرف اس اخلاقی انقلاب کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو اسلام کا مرہون منت ہے۔ آنحضرت صلعم کی مکی زندگی کے حالات مصنف نے آگے چلکر بیان کرنا شروع کئے ہیں جیساکہ صفحہ ۲۶ کے آخری پیراگراف کے ابتدائی الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے" بدقسمتی سے آنحضرت صلعم کے پہلے دس سال کی زندگی ...... کے متعلق ہمیں بہت کم معلومات حاصل ہیں" اسی سلسلے میں اس نے قریش کی مخالفت کے اسباب پر تبصرہ کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ " اہل مکہ ان معاشرتی اور سیاسی انقلابات سے خائف تھے جو آنحضرت صلعم کی تعلیمات سے مترتب ہو رہے تھے .... مکہ کی اس جدید جماعت میں نہ صرف قبیلہ وارانہ اختلافات مٹ چکے تھے بلکہ آقا و غلام کا قدیم امتیاز بھی خطرے میں تھا" صفحہ ۲۷۔ مصنف نے اس دوران میں کہیں نماز باجماعت کی طرف اشارہ نہیں کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ تنقید نگار نے اس موقع پر "تدلیس" سے کام لیکر موضوع بحث

کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

اس کے بعد جناب ناقد صاحب آنحضرت صلعم کی سادہ زندگی اور بنائے منبر کی بحث چھیڑتے ہوئے مصنف کو ناجائز تاویلات کا ملزم ٹھہراتے ہیں حالانکہ مصنف کے الفاظ صرف اس قدر ہیں "لوگوں سے ملنے جلنے میں آنحضرت صلعم نے یہاں تک سادگی اور انکسار سے کام لیا کہ آپ نے نماز میں بھی اپنے لئے کوئی خاص جگہ معین نہیں کی۔ جب آپ مسلمانوں سے خطاب کرتے تو کھجور کے تنوں میں سے کسی ایک سے ٹیک لگا لیتے۔ البتہ وفات سے دو برس پہلے آپ نے اپنے لئے ایک اونچی نشست تعمیر کرائی جس پر آپ اُس وقت بیٹھتے جب آپ کو کسی ایلچی یا سفیر سے ملنا ہوتا تھا یا جب آپ جماعتی امور پر غور فرماتے یا مقدمات کا فیصلہ کرتے۔ یہ منبر ایک چھوٹا سا چبوترہ تھا .... اس نہایت سادہ نشست سے رفتہ رفتہ عیسائی اثر کی بنا پر منبر کی بنا پڑی۔" صفحہ ۱۳۱۔ تنقید نگار صاحب کہتے ہیں کہ مصنف کو اس میں ترفع اور تفوق کی جھلک نظر آتی ہے اور پھر اس مفروضہ الزام کی تردید میں مختلف روایات کا اقتباس پیش کرتے ہوئے بیکار اپنے غم و غصے کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ ہے جناب ناقد صاحب کا باب التقریظ والانتقاد؟

اسی طرح مصنف کے دوسرے بیانات کے متعلق تنقید نگار صاحب نے جس بدگمانی اور سوئے ظن سے کام لیا ہے اس سے ہمیں نہایت افسوس ہوا۔ اختصار بیان کی کوشش میں کہیں کہیں مصنف سے کچھ فروگزاشتیں ہوگئی ہیں۔ پانچویں باب میں بہت سی بحثیں تشنہ رہ گئی ہیں۔ بہت سی باتوں میں سلسلہ تحقیق و تفتیش مکمل نہیں ہوا۔ کلیسائے یوحنا اور ہیکل سلیمانی کے متعلق بھی مصنف کی روایات صحیح نہیں۔ حضرت عمرؓ کے متعلق اگرچہ مصنف کا یہ خیال صحیح ہے کہ "آپ کسی غیر عرب کو عرب کے برابر نہیں سمجھتے تھے" لیکن یہ صحیح نہیں کہ "آپ بالقصد عربیت کو فروغ دینا چاہتے تھے یا آپ نے اُن معاہدوں کا خیال نہیں کیا جو یہود و نصاریٰ سے ہوئے"۔ بایں ہمہ مترجم نے مصنف کی ان لغزشوں کو کچھ بہت زیادہ اہمیت نہیں دی۔ بعض ضروری فروگزاشتوں پر حواشی میں گرفت کردی گئی ہے لیکن بعض غلطیوں کو محض اس لئے نظر انداز کردیا کہ ان کی

حیثیت جزوی اور ضمنی باتوں کی سی تھی اور کتاب کے اصلی مباحث پر ان کا چنداں اثر نہیں پڑتا تھا لیکن تنقید نگار صاحب مترجم کے اس انداز سے خوش نہیں ہوئے۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ مترجم ذرا ذرا سی بات پر مصنف سے دست و گریباں ہو جاتا۔ اتفاق سے ان کو بعض فتوحات کے سنین میں اختلاف ہے۔ ان کی رائے میں:۔

"بیت المقدس کی فتح سنہ ۱۵ھ میں بتائی گئی ہے حالانکہ صحیح روایت رجب سنہ ۱۶ھ ہے۔ قادسیہ کی جنگ کو سنہ ۱۶ھ میں بتایا ہے حالانکہ وہ محرم سنہ ۱۴ھ میں پیش آئی ...... برقہ کی فتح کو سنہ ۲۲ھ میں قرار دیا ہے حالانکہ سنہ ۲۱ھ میں واقع ہوئی۔ سب سے پرلطف قبرس کی فتح کا سنہ ہے صفحہ ۵۶ پر ہے سنہ ۲۸ھ میں ..... قبرس فتح کرلیا آگے چلکر یہی سنہ ۳۴ھ ہو جاتا ہے ..... سنہ ۳۴ھ میں قبرس فتح ہوگیا تھا۔ ہم دونوں واقعات میں تطبیق دینے کے لئے اس کی توجیہ میں اس تاریخی حقیقت کی طرف رجوع کریں کہ سنہ ۲۸ھ میں قبرس فتح ہوا...... چند سال کے بعد بدعہدی کی ...... امیر معاویہ نے دوبارہ فوج کشی کی ...... یہ واقعہ سنہ ۳۴ھ کی بجائے سنہ ۳۳ھ کا ہے......"

اس ذرا سی بات پر تنقید نگار صاحب بے قابو ہوگئے اور بڑے مزے لیکر یہ کہنا شروع کیا کہ "کیا ہم ان غلط بیانیوں کو اس لئے تسلیم کرلیں کہ یہ ایک مستشرق کی شان تحقیق ہے"۔ جناب ناقد صاحب سے باادب گزارش ہے کہ مستشرقانہ شان تحقیق کی بنیادیں اس قدر ناپائدار نہیں جس قدر وہ سمجھے بیٹھے ہیں۔ اُن کو شاید خیال ہوگا کہ ایسی فاحش غلطیوں کے ہوتے ہوئے مصنف کے مبلغ علم پر کس کو ہنسی نہیں آئیگی لیکن ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ اول تو ترتیب سنین کے متعلق ہم کو ڈاکٹر ھل کے دلائل کا علم نہیں پھر سنین کے بارے میں اختلاف کی بہت کافی گنجائش موجود ہے۔ ابو الفدا نے بیت المقدس اور جنگ قادسیہ دونوں کا سنہ ۱۵ھ بتایا ہے۔ برقہ اس کے نزدیک سنہ ۲۲ھ میں فتح ہوا۔ اس کو بھی جانے دیجئے تو یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جس پر تنقید نگار صاحب اس قدر مسرت کا اظہار کرتے۔ کیا وہ محسوس نہیں کرتے کہ اس قسم کے معمولی گناہ کبھی کبھی اُن کے شہر میں

بھی سرزد ہو جایا کرتے ہیں۔

اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا

بہرکیف یہ امر غور طلب ہے کہ مصنف نے کہیں مسلمانوں پر کلیسائے یوحنا سے تعارض کرنے کا الزام قائم نہیں کیا۔ مصنف لکھتا ہے "خلافت راشدہ کے آخری عہد میں مکہ و مدینہ عربی نغمہ و ساز کا گہوارہ بن گئے"۔ "تنقید نگار صاحب ان باتوں کو مزخرفات قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں" خلافت راشدہ اور عہد نبوی میں جو کچھ موسیقی تھی وہ اس قدر تھی جو شاعری کا لازمہ ہوتی ہے .... اس عہد کے چند مغنیوں کے نام بھی ملتے ہیں ......" اور اس طرح خود ہی ان "مزخرفات" کی تصدیق کر دیتے ہیں۔ مصنف نے آویزش خلافت کی تاریخ میں مکی اور مدنی گروہوں کی تقسیم قائم کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ "اہل مدینہ کا فریق جمہوری نصب العین رکھتا تھا اور اہل مکہ خاندان اور قبیلوں کی حمایت پر قائم رہے"۔ تنقید نگار صاحب خفا ہیں کہ مصنف نے اس عہد کی تاریخ کو مکی اور مدنی تفریق سے ملوث کیوں کیا۔ ان کی رائے میں یہ سب کچھ قبائلی عصبیت کا نتیجہ تھا۔ تنقید نگار صاحب اگر غور کرتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ ان کا یہ خیال صحیح نہیں۔ بہرکیف مصنف کا مطلب تو صرف اس قدر تھا کہ مدینہ اور اہل مدینہ سے اسلامی اور جمہوری روح کا اظہار ہوتا رہا یہ مکہ کی ذہنیت تھی جو بادشاہت اور سلطنت کی صورت میں خلافت پر حاوی ہوئی۔ اسی طرح تنقید نگار صاحب کو مصنف کے اس بیان پر بھی اظہار تعجب کی ضرورت نہیں تھی کہ "امویوں کے زمانۂ حکومت کے وسط ہی میں عباسیوں نے ...... راسخ الاعتقاد مسلمانوں میں عزت و اعتماد حاصل کر لیا تھا" اس لئے کہ اگر لوگوں میں عباس اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اولاد کا احترام موجود تھا تو یہ کوئی ایسی ناممکن بات نہیں تھی جس پر جناب ناقد صاحب اظہار تعجب فرماتے۔ ان کا یہ کہہ کر مصنف کی تاریخ دانی پر حملہ کرنا کہ "بنو امیہ کے مقابلہ خلافت کا دعویدار جو گروہ تھا وہ علوی اور شیعان علی کی جماعت تھی ...... اتفاقی واقعات کی بنا پر زمام حکومت عباسیوں کے ہاتھ میں چلی گئی" کچھ بہت زیادہ ٹھیک نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بنو امیہ کے مقابلے پر علوی اور

شیعان علی کی جماعت موجود تھی لیکن بنو امیہ کے زوال میں محمد عباسی کا جو حصہ ہے اسے کوئی اہل نظر فراموش نہیں کرسکتا۔ ابراہیم عباسی بھی جسے بعد میں اموی حکومت نے قتل کی سزا دی ائمہ عباسیہ ہی سے تھا۔ سلیمان اور ابو مسلم بھی محمد ہی کے داعیوں میں سے تھے۔ ہر پڑھا لکھا آدمی جسے تاریخ دانی سے ذرا بھی بہرہ ملا ہے ان باتوں سے بے خبر نہیں۔

تنقید نگار صاحب کو شکایت ہے کہ مصنف نے اسلامی فن تعمیر کے سلسلے میں صقلیہ کو کیوں نظر انداز کر دیا۔ ہمارے خیال میں اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مصنف کو عربی تعمیرات کے صرف بڑے بڑے اسالیب اور ان کے نمونوں کا تذکرہ کرنا مقصود تھا اور ظاہر ہے کہ اس لحاظ سے صقلیہ کی عمارات کو کوئی اہمیت حاصل نہیں البتہ تنقید نگار صاحب کا یہ خیال صحیح نہیں کہ نوکدار محرابوں وغیرہ کے زمانے کی تعیین میں مصنف سے تسامح ہوا ہے۔ بارہویں صدی سے مصنف کا مطلب بارہویں صدی مسیحی ہے۔ تنقید نگار صاحب نے دائرۃ المعارف برطانیہ کے حوالے سے ان کا زمانہ چوتھی صدی ہجری سے چھٹی صدی ہجری بتایا ہے یعنی گیارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی۔ صفحہ ۴۷، پر مصنف نے لکھا ہے "المرابطین کے عہد میں جامع تمسان تعمیر ہوئی (۱۱۳۵ - ۳۸) جس سے عربوں کی اُس ترقی کا پتہ چلتا ہے جو انہوں نے فن تعمیر میں حاصل کرلی تھی...... اب...... اور بیضاوی محرابوں کی بجائے نوکدار محرابیں وجود میں آئیں" اس سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں اول تو یہ کہ مصنف محض نوکدار محرابوں کی ابتدا سے بحث نہیں کررہا ہے ثانیاً (۱۱۳۵ - ۳۸) جامع تلمسان کی تعمیر کی تاریخ ہے جو اُس کے نزدیک فن تعمیر کے اس بدلے ہوئے اسلوب کا ایک نمونہ ہے۔

قرطبہ کی علمی ترقیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنف نے اتفاق سے لکھدیا تھا "سرزمین قرطبہ نے علم کا خیر مقدم بڑی گرمجوشی سے کیا...... ہر شخص کو کتابوں کی فراہمی...... کا شوق تھا...... قیصر روم کو بھی...... عبدالرحمٰن ثالث کے لئے دیاسقوریدس کی کتاب دواسازی کے ایک خوبصورت نسخے سے بہتر اور کوئی تحفہ نہیں ملا" تنقید نگار صاحب بگڑ بیٹھے۔ سب سے پہلے انہوں

نے مغربی اور مشرقی فضیلت کی تقسیم قائم کی۔ پھر مغربی فضیلت کو مبالغہ آمیزی کا طعنہ دیتے ہوئے فرمایا "دیاسقوریدا اس کی تصنیف عربوں کے لئے کوئی نایاب کتاب نہیں تھی ..... اس کا ترجمہ متوکل کے عہد میں ہوا ..... حسن اتفاق سے قیصر روم نے دوسرے تحائف کے ساتھ کتاب دیاسقوریدا اس بھیجدی ...... اس کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ تصاویر سے مزین تھی ...... نکولس نے اس کا ترجمہ لاطینی میں کیا عربی میں نہیں کیا" تنقید نگار صاحب غور کریں کہ مصنف نے عربوں کی شان میں کوئی ایسی گستاخی نہیں کی۔ نہ اس نے کتاب کے متعلق ان جزوی بحثوں کو چھیڑا جنمیں ناحق آپ الجھ گئے۔ ممکن ہے کسی لاطینی کتاب میں یہی مذکور ہو کہ نکولس نے کتاب کا ترجمہ عربی میں کیا۔ بہرکیف مصنف کا مطلب تو صرف قرطبہ کے ذوق علم کی طرف اشارہ کرنا تھا۔

یہاں تک تو مصنف کے جرائم کی بحث تھی۔ اب مترجم کے گناہوں کی فہرست شروع ہوتی ہے۔ تنقید نگار صاحب نے مارک انٹنی کی طرح جو جولیس سیزر کی لاش کی طرف بار بار اشارا کرتے ہوئے اُس کے اُن احسانات کا تذکرہ کرتا جاتا تھا جو اُس نے اہل روما پر کئے تھے مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہتا جاتا تھا کہ اسے بروٹس کی شرافت کا اعتراف ہے مصنف کی غلط بیانیوں اور ان سے مترجم کی بے اعتنائی کی شکایت کرتے ہوئے بین السطور میں کچھ کہنے کی کوشش کی ہے۔ ہم تنقید نگار صاحب کو اس حسن بیان پر مبارکباد دیتے ہیں۔

سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

تنقید نگار صاحب کا خیال ہے کہ مترجم کا ضمیمہ بیشتر مستشرقین کی تحریروں کا رہین منت ہے۔ یہ صحیح ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ ایسا کرنے میں ہم نے کسی غلطی کا ارتکاب نہیں کیا اس لئے کہ مترجم کی حیثیت میں ہمارے پیش نظر ایک مستشرق کی تصنیف تھی اور اس لحاظ سے یہی مناسب معلوم ہوتا تھا کہ اگر اس پر کچھ اضافہ کیا جائے تو مستشرقین ہی کی تحریروں سے کیا جائے۔ البتہ تنقید نگار صاحب ہمارے اس "مستشرقانہ انداز" سے خفا ہو گئے جس میں ہم نے بغاوت فقہا پر تبصرہ کیا ہے

لیکن انہوں نے یہ نہیں بیان کیا کہ ان کی خفگی کے کیا وجوہ ہیں۔ بہرکیف ہم اس کے لیے ان سے معافی کے خواستگار ہیں اور انہیں یقین دلاتے ہیں کہ آیندہ مترجم سے فقہا کی شان میں اس قسم کی کوئی گستاخی نہیں ہوگی (انشاء اللہ)۔ اس خیال کی تردید میں کہ تصوف ویدانت کا مرہون منت ہے یا یہ کہ اسے خالص ایرانی چیز سمجھنا چاہئے مترجم نے لکھا تھا کہ "بیرونی سے قبل ہندوستان اور عالم اسلامی میں کوئی علمی تعلق قائم نہیں تھا۔ یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ تصوف محض ایرانیوں کی پیداوار ہے اس لئے کہ اس میں ابن عربی اور ابن فارض ایسے خالص عرب شامل تھے" تنقید نگار صاحب نے اسے مترجم کی ذاتی تحقیق ٹھہرا کر اس کی اس طرح تغلیط شروع کی "منصور .... ہارون مامون..... خصوصاً برامکہ کے دور اقتدار میں بہت سے اہل علم ہندوستان آئے اور ہندوستان کے اطبا، فلاسفر اور پنڈت بغداد بلائے گئے..... ابن عربی اور ابن فارض تو اس وقت پیدا ہوئے جب تصوف کی نشو و نما کامل طور پر ہو چکی تھی" تنقید نگار صاحب مترجم کی جس عبارت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں وہ پروفیسر براؤن کے بیان سے ماخوذ ہے۔ اس لحاظ سے یہ اجتہاد مترجم کا نہیں ہے بلکہ پروفیسر براؤن کا ہے۔ سچ پوچھئے تو ہمیں تنقید نگار صاحب کا اجتہاد کچھ بہت زیادہ پسند نہیں آیا اس لئے کہ ان کی طرح پروفیسر براؤن کو بھی معلوم تھا کہ "برامکہ کے دور اقتدار میں بہت سے..... پنڈت بغداد آئے" بایں ہمہ ان کو اپنے اجتہاد پر اصرار تھا۔ تنقید نگار صاحب اگر ان کے دلائل کو قبول نہیں کرتے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ براؤن مرحوم کو خوب معلوم تھا کہ ہندوستان کے پنڈتوں کے ورود بغداد کے باوجود تحریک تصوف پر اس زمانے میں ان کا کوئی اثر نہیں پڑا اسی طرح وہ تصوف کے نشو و نما میں ابن عربی کی زبردست شخصیت کو بھی فراموش نہیں کر سکتے تھے۔

افسوس ہے ہمیں جناب ناقد صاحب کے انداز تنقید سے کوئی خاص مسرت نہیں ہوئی۔ ہمارا خیال تھا کہ اٹھارہ صفحوں کی نکتہ چینیوں کے بعد دس بیس نہیں تو کم از کم دو چار صفحے مصنف کی مدح و ستائش میں بھی صرف کریں گے۔ لیکن معلوم ہوا کہ ان کے پیش نظر

کوئی علمی مقصد نہ تھا۔ انہوں نے کمال مہربانی سے مترجم کی چند غلطیوں پر گرفت کی ہے اور بعض ناموں
کی تصحیح میں اسے غیر معمولی مدد دی ہے۔ کتابوں کی عدم موجودگی اور کتابت و طباعت کی دشواریوں
سے خود مترجم کو اس بارے میں بے حد دقتیں پیش آچکی تھیں اور اس کا دل کسی طرح بھی کتاب
کی ترتیب سے مطمئن نہیں تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ تنقید نگار صاحب اسی طرح ہماری بعض فروگزاشتوں
کے متعلق بھی ہمیں قابل قدر مشورہ دینگے۔ بدقسمتی سے اُن کی ساری توجہ کتاب کی خامیوں پر
رہی یہاں تک کہ وہ اپنی غلط فہمی میں کتاب کے اصلی اور جزوی مباحث میں بھی کوئی امتیاز قائم
نہیں کرسکے۔ تنقید نگار صاحب کا یہ انداز نہایت مایوس کن ہے۔ انہوں نے یہ کیسے سمجھ لیا
کہ دنیا کا ہر مصنف جسد اسلامی میں زہر رسانی کی کوشش کرتا ہے اور یہ خدمت انہیں کے حصے
میں آئی ہے کہ وہ اس کے ازالہ کی کوشش کریں۔ اس سے پہلے ان کو اس امر کا فیصلہ کرلینا
چاہئے کہ ان کی حیثیت کیا ہے۔ اگر تنقید کی انتہا یہی ہے کہ ہم مستشرقین کے ہر بیان کی تردید کردیں
اور کسی طرح بھی تاریخ کے اُس اعلیٰ نصب العین کی طرف قدم نہ اُٹھائیں جس کے ماتحت ہمیں
اقوام و ملل کی صحیح زندگی کا علم حاصل ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہمارا دماغ ایک ناقابل
علاج مرض کا شکار ہوچکا ہے اور ہم خواہ مخواہ اپنی نادانی اور پستی کے احساس سے دوسروں کے
تفوق پر حملہ کرتے ہیں۔ ہمارے خیال میں اس قسم کے منفیانہ رویے سے ہماری علمی زندگی پر کوئی
عمدہ اثر نہیں پڑتا۔ ہمیں اس کا خیال نہ کرنا چاہئے کہ مصنف زدیمر ہے یا شبلی، امیر علی ہے یا ڈیل ونلر
ہمارے پاس اگر واقعی کوئی چیز موجود ہے تو ہمیں نہایت جسارت کے ساتھ اسے پیش کردینا چاہئے
تحقیق و اجتہاد کا دروازہ ہر شخص کے لئے کھلا ہے۔ ہمارے یہ کہدینے سے کچھ نہیں ہوتا کہ مستشرقین
کو آنحضرت صلعم کی فلاں حیثیت کا علم نہیں۔ اُن کی سمجھ میں اسلام کی یہ خصوصیت نہیں آتی اور وہ
خصوصیت نہیں آتی۔ کتابوں کی قدر و قیمت کا اندازہ اُن کی مجموعی خوبیوں اور اُن کی علمی حیثیت سے
کیا جاتا ہے۔ کیا تنقید نگار صاحب اتنا نہیں سمجھتے کہ دنیا کے بہتر سے بہتر اداروں سے بھی جو کتابیں
شائع ہوتی ہیں اُن کا مطالعہ اس لئے نہیں کیا جاتا کہ ان کی ایک ایک سطر صحیح ہوتی ہے یا اسلئے

کہ وہ ہماری ہر علمی ضرورت کے لئے کافی ہوتی ہیں۔ ان کی خوبیاں بھی ان کے مجموعی محاسن میں مضمر ہیں۔ ہماری رائے میں علم کا منتہا مغربی اور مشرقی فضیلتوں کی تقسیم سے کہیں زیادہ بالاتر ہے اور اگر کسی مستشرق کی تصنیف میں تھوڑی بہت خامیوں کے باوجود عالمانہ شان موجود ہے تو ہمیں اس سے استفادہ حاصل کرنے میں کوئی عذر نہیں ہونا چاہئے۔

مجذوب کی بڑ
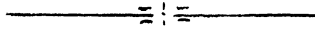
رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف + آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

اس مرتبہ گرمیوں کی چھٹیوں میں مجھے کئی سال بعد وطن جانے کا اتفاق ہوا۔ کہتے ہوئے شرم آتی ہے مگر کہنا پڑتا ہے کہ نہ مجھے اپنا گاؤں ملک سلیمان سے بہتر معلوم ہوا اور نہ وہاں کے کانٹوں میں سنبل و ریحان سے زیادہ دلکشی محسوس ہوئی۔ شاید اس کا یہ سبب ہو کہ میں بچپن سے اپنے والد کے ساتھ رہا اور وہ ملازمت کے سلسلے میں شہر شہر پھرتے رہے اس لئے میرے دل میں حُبِ وطن کا جذبہ دب کر رہ گیا یا یہ ہو کہ مجھے خلیل آباد میں کبھی وہ محبت نصیب نہیں ہوئی جس کا پَرتو مٹی پتھر اور درختوں کو زندگی اور کشش بخشتا ہے اور وطن کو وطن بناتا ہے۔ یہ دوسری بات زیادہ قرینِ قیاس ہے کیونکہ میرے دل میں حُبِ وطن نہ سہی مگر اُس سے ملتی جلتی ایک چیز ضرور موجود ہے۔ میں جس کالج میں تعلیم پاتا ہوں اُس سے مجھے عزیز دوستوں اور شفیق اُستادوں کی بدولت سچا اُنس ہے۔ جب میں وہاں سے کہیں جاتا ہوں تو دل میں دردِ جدائی کی کسک لئے ہوئے اور جب لوٹ کر آتا ہوں تو جوشِ مسرت میں ڈوبا ہوا مگر خلیل آباد سے مجھے کوئی قلبی رشتہ محسوس نہیں ہوتا۔ میں دو برس کا تھا کہ میری والدہ اور پھوپھی کا انتقال ہو گیا اور اُسی سال میرے چچا وطن کی سکونت ترک کر کے بمبئی چلے گئے۔ خلیل آباد میں چند دور کے عزیزوں کے سوا کوئی باقی نہیں رہا۔ اس لئے میں کبھی تعطیل کے دنوں میں وہاں جاتا ہوں تو محض ایک فرض سمجھ کر۔ جب تک وہاں رہتا ہوں صبر کی نیکی روزانہ میرے نامۂ اعمال میں لکھی جاتی ہے اور جب وہاں سے رخصت ہوتا ہوں تو میرا شمار شکر گزاروں میں ہوتا ہے۔

اس بار خلیل آباد میں میرے ہمسنوں میں سے کوئی موجود نہ تھا اس لئے مجھے وہاں کا قیام اور بھی کھَل گیا۔ صبح سے شام تک میرا وقت اس طرح گزرتا تھا کہ کبھی اپنے خاندانی کتبخانے

میں جا کر کرم خوردہ کتابوں کی گرد جھاڑی اور ورق گردانی کی، کبھی زنانے مکان میں جا کر عورتوں کے آپس کے جھگڑے اور ہمسایوں کی شکایتیں سنیں، کبھی کھیتوں کی طرف چلا گیا، کبھی آم کے باغ میں جا کر بیٹھ گیا۔ ممکن ہے کہ فلسفیانہ طبیعت والوں کو تنہائی کی زندگی میں غور و فکر کا بہت اچھا موقع ملتا ہو اور نظر ہوشیار کو درختوں کے پتوں میں معرفت کردگار کے دفتر نظر آتے ہوں لیکن میرے جیسے لوگ جو تنہائی میں اونگھتے ہیں اور پتوں کی دفتری زبان سے ناواقف ہیں اس موقعے سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ مجھے تو پہلے ہی دن سے فکر تھی کہ کوئی انسان ملے جس سے باتیں کرکے دو گھڑی دل بہلا سکوں مگر ہمارے گھر میں کیا سارے گاؤں میں کوئی ایسا شخص نہ تھا جسے سوائے کھیتی، مویشی، پٹواری وغیرہ کے کسی چیز سے دلچسپی ہو۔ مجھے گانوں کے ہر آدمی سے وحشت تھی خصوصاً ایک صاحب سے تو ڈر سا لگتا تھا۔ ان بزرگ کا نام مجھے معلوم نہیں مگر یہ مجذوب کہلاتے ہیں اور ہمارے گھر کے قریب ایک مسجد میں رہتے ہیں۔ یہ مجھے اکثر راہ میں ملا کرتے تھے کبھی مسجد میں جھاڑو دیتے ہوئے، کبھی کسی درخت کے تلے بیٹھے ہوئے کبھی کھیتوں کے بیچ میں منڈیر پر لیٹے ہوئے۔ مگر ان کی بے تصنع ہیئت اور ان کا بے تکلف لباس دیکھ کر میری ہمت نہیں پڑتی تھی کہ ان کے قریب جاؤں یا ان سے بات کروں۔ ایک دن کیا اتفاق ہوا کہ میں سیر کرنے نکلا اور بستی سے باہر جا کر ریل کی پٹڑی کے پاس ایک آم کے باغ میں تالاب کے کنارے جا بیٹھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے قریب ہی ایک بڑے سے پیڑ کی آڑ میں حضرت مجذوب سو رہے ہیں۔ میں سر جھکائے تالاب کی موجوں کا شمار کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں سر جو اٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میاں مجذوب پاس کھڑے ہیں۔ پہلے تو میں نے ارادہ کیا کہ اٹھ کر غیر معمولی تیزی سے قطع مسافت کرتا ہوا چلدوں لیکن خیال ہوا کہ شاید کوئی دیکھے اور اس فعل کو بھاگنا سمجھے اس لئے میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہا مگر دل میں دعا مانگتا جاتا تھا کہ خدا کرے خود ان حضرت کے دل میں اس وقت ذوقِ سفر لطفِ مقام پر غالب آ جائے۔

مگر دعا کا اثر الٹا ہوا۔ مجذوب صاحب اور قریب آئے اور مجھ سے کوئی ایک گز کے فاصلے پر مزے میں پیر پھیلا کر بیٹھ گئے۔ میں سہم کر تھوڑا سا پیچھے کھسکا۔ اس حرکت سے وہ میری طرف متوجہ ہو گئے، اور غصے کے لہجے میں پوچھنے لگے "تو تیرنا جانتا ہے؟" مجھے واحد حاضر کی ضمیر زیادہ مرغوب نہیں مگر اس وقت مصلحتاً میں نے اسے سہہ لیا اور آہستہ سے جواب دیا "جی نہیں"۔ کہنے لگے "تو پھر تو اس تالاب میں کیوں نہیں کود پڑتا؟" یہ مجذوبانہ منطق مجھے بہت مہلک معلوم ہوئی۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا مگر اس خوف سے کہ کہیں یہ اس سلسلے میں کوئی عملی دلیل نہ دے بیٹھیں میں سنبھل کر بیٹھ گیا کہ ضرورت ہو تو بے اجازت رخصت ہو کر گھر کی راہ لوں۔

مجذوب صاحب نے میرے جواب کا انتظار نہیں کیا بلکہ سلسلۂ گفتگو کو جاری رکھا "کیا تو دنیا سے نرالا ہے، سب یہی کرتے ہیں، ہر مسلمان یہی کرتا ہے۔ مسلمان، مسلمان سب برابر ہیں۔ کوئی غریب ہے کوئی امیر ہے، کوئی عالم ہے کوئی جاہل ہے، مگر ہیں سب مسلمان، سب بے صبر سب غافل، سب ناعاقبت اندیش، سب من کے موجی، سب جذبات کے غلام۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ وہ مسلمان جو اپنے نفس پر، اپنے دل پر، اپنی زبان پر، اپنے ارادوں پر، اپنی خواہشات پر، اپنے خیالات پر قابو نہیں رکھتے رہنما بن کر قوم کی رہنمائی کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں؛ وہ مسلمان جو سچے علم و فضل سے، مطالعہ فطرت سے، مشاہدۂ زندگی سے، حق کی محبت سے بیگانۂ محض ہوتے ہیں عالم دین بن کر تعلیم و تلقین کے مسند پر بیٹھ جاتے ہیں، وہ مسلمان جو لذت بے خودی سے، کیف تسلیم سے، ذوق دردسے، ہمدردی اور خدمت کے جذبات سے ناآشنا ہوتے ہیں پیر روشن ضمیر بن کر رشد و ہدایت کا باب کھول دیتے ہیں؟ اگر تو نے اس کا مشاہدہ کیا ہے تو پھر تو جو تیرنا نہیں جانتا اس تالاب میں کیوں نہیں کود پڑتا؟...... کیا تو نہیں جانتا کہ مسلمان مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں مگر ذرائع سے بے نیاز ہیں، سفر کرنا چاہتے ہیں لیکن زادِ سفر سے مستغنی ہیں، فصل کاٹنا چاہتے ہیں لیکن بونے جوتنے سے بے پروا ہیں؟ کیا تجھے معلوم

نہیں کہ مسلمان ایک طلسمی دنیا میں رہتے ہیں جہاں قول کے معنی فعل، ارادے کے معنی عمل، دعوے کے معنی دلیل، خواہش کے معنی واقعہ سمجھے جاتے ہیں جہاں آنکھ صرف اُن چیزوں کو دیکھتی ہے جو اُسے پسند آئیں، کان صرف ان باتوں کو سنتا ہے جو اُسے مرغوب ہوں اور ذہن صرف ان معروضات کا ادراک کرتا ہے جو اُسے گوارا ہوں؟ اگر تجھے یہ علم ہے تو پھر تو کیوں بیکار عقل سے کام لیتا ہے اور کیوں اس تالاب میں کود نہیں پڑتا؟...... معلوم ہوتا ہے تو باوجود مسلمان ہونے کے مسلمانوں کی اصلی حالت سے واقف نہیں۔ سُن میں تجھے سناتا ہوں؛ دیکھ، میں تجھے دکھاتا ہوں۔ یہ پیکرِ خیالی جو تیری چشم باطن کے سامنے ہے ہندوستان کا مسلمان ہے۔ اس نے دنیا میں آنکھ کھولی تو دیکھا کہ اس کے پاس کچھ نہیں ہے اور سنا کہ اس کے بزرگوں کے پاس سب کچھ تھا۔ اس کے بزرگ ہندوستان پر حکومت کرتے تھے، قوت وسطوت، جاہ وحشمت، مال، و دولت کے مالک تھے۔ زراعت، تجارت، لین دین یہ چیزیں ان کے پاس نہ تھیں اور انکی انھیں ضرورت بھی نہ تھی۔ سلامت روی، مسکنت، تحمل، جفاکشی کی صفات یہ لوگ نہیں رکھتے تھے اور یہ اُن کے شایان شان بھی نہ تھیں۔ دفعتہً ہوا بدلی، زمانہ پلٹا، ہندوستان میں انقلاب ہو گیا۔ مسلمانوں کے ہاتھ سے حکومت جاتی رہی اور اس کے ساتھ وہ باتیں بھی جو حکومت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ قصرِ زندگی کی بنیادیں پہلے ہی سے ان کی نہ تھیں؛ اب اُسکی دیواریں اُسکی چھتیں، اُس کے کنگرے، اُس کے گنبد بھی چھن گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیچارے مسلمان کا کہیں ٹھکانا نہ رہا۔ سر پر سائے کا تو کیا ذکر ہے پیر تلے سے زمین بھی نکل گئی۔ اب یہ اللہ کا بندہ ہوا میں معلق ہو کر رہ گیا۔ اُس کی زندگی خیالی دنیا میں بسر ہونے لگی۔ کون سی خیالی دنیا؟ وہ نہیں جو ایمان ویقین، وسعتِ نظر اور قوت عمل بخشتی ہے بلکہ وہ جو حواس ظاہری و باطنی کو نیم بیداری کی حالت میں رکھتی ہے، جو جسم وجان پر ایک کابوس مسلط کر دیتی ہے۔ وہ نہیں جو انسان کو اُبھار کر مشاہدۂ عرفان کی بلندی پر لے جاتی ہے بلکہ وہ جو اُسے گرا کر جمود وغفلت کے گڑھے میں ڈال دیتی ہے۔ اُسے زندگی کی حقیقتوں سے وحشت ہونے لگی وہ واہمہ کی

بنائی ہوئی تصویروں سے دل بہلانے لگا۔ کاہلی کا نام اُس نے قناعت رکھ لیا، بے عملی کا توکل، بےبسی کا صبر، بےحسی کا زہد ...... یہ غنودگی، یہ غفلت اس پر ہمیشہ طاری نہیں رہتی بلکہ اکثر وہ چونکتا ہے، سر اُٹھاتا ہے، اِدھر اُدھر دیکھتا ہے، کبھی کبھی وہ اُٹھتا ہے، دوڑتا ہے اور اتنا دوڑتا ہے کہ تھک کر گر پڑتا ہے۔ لیکن کیا چونکنے کے بعد اُسے زندگی کی حقیقتیں نظر آتی ہیں، کیا دوڑنے کے بعد وہ منزل مقصود سے قریب تر ہو جاتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ یہ چونکنا محض خواب پریشاں کا نتیجہ ہے اور یہ دوڑنا محض وحشت کی دلیل ...... یہ حقیقت سے بےخودی، یہ واہمہ کی غلامی، یہ غفلت اور وحشت کا تضاد مسلمان کی زندگی کے ہر شعبہ سے نمایاں ہے۔ مذہب کو اُس نے زندگی کے واقعات سے، دنیا کے حالات سے، زمانے کی رفتار سے جدا کر لیا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ دینداری نام ہے ہر زندہ قوت سے ڈرنے کا، ہر تغیر کی طرف سے آنکھ بند کر لینے کا، ہر نئی چیز سے نفرت کرنے کا۔ وہ خود نا تمام اور نیم گرم عقیدہ رکھتا ہے، بےتوجہی اور بےدلی سے عبادت کرتا ہے مگر جب کسی دوسرا عقیدہ رکھنے والے یا دوسرے طریقے سے عبادت کرنیوالے کو دیکھتا ہے تو بادل کی طرح اُٹھتا ہے، گرجتا ہے اور برس پڑتا ہے۔ شاعری کو اُس نے سچے مشاہدات، واردات اور جذبات سے بےتعلق کر کے بیرنگ حسن، بےکیف عشق، بےثمر وصل اور بےتسکین ہجر کے دائرے میں گھیر لیا ہے۔ اُس کے نزدیک شاعری حقیقت کو تخیل کی آنکھ سے دیکھنے اور جذبات میں خوشنما حرکت اور ہم آہنگی پیدا کرنے کو نہیں کہتے بلکہ خارجی اور عینی دنیا سے منہ موڑ کر اپنے نفس کی اندھیری کوٹھری میں بھٹکنے، اِدھر اُدھر ٹٹولنے اور کچھ نہ پا کر کفِ افسوس ملنے کو۔ اُس کے خیال میں شاعر وہ نہیں جس کا دل کائنات کے درد سے دکھتا ہے اور جس کا ذہن حسن ازلی اور عشق ابدی کی مومیائی میں اس درد کی دوا ڈھونڈھتا ہے بلکہ وہ ہے جو اپنے ناقص ادنیٰ خواہشات اور جذبات کے دلدل میں پھنس جاتا ہے اور بجائے اس کے کہ باہر نکلنے کی کوشش کرے روتا ہے، چلاتا ہے، تڑپتا ہے۔ اُس نے اقتصاد و سیاست کی طرف سے ابتدا میں ایسی غفلت

برتی کہ وہ مال و زر سے بالکل خالی اور قوت و سطوت سے قطعاً محروم ہوگیا اور اب جو ذرا چیتا ہے تو اُس نے اُن چیزوں کو جن میں فکر و عمل کی ضرورت ہے جذبات کا کھیل بنا دیا ہے۔ اپنے بوتے کھڑا نہیں ہو سکتا دوسروں کا سہارا ڈھونڈھتا ہے، آج ایک کا کل دوسرے کا پھر جب اُسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں کوئی کسی کا نہیں تو طیش میں اپنے آپ سے لڑتا ہے، جھنجھلاہٹ میں اپنی بوٹیاں چباتا ہے .... اگر اس خیالی تصویر پر تیری نظر نہ جمتی ہو تو مجھے دیکھ مَیں تیرے سامنے کھڑا ہوں۔ ایک دن تھا کہ میں بھی انسان تھا، میں بھی مسلمان تھا۔ میں نے بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح اِس عرصۂ جد و جہد سے اس جہان گیر و دار سے الگ ایک طلسمی دنیا میں پرورش پائی تھی: مذہب کے پردے میں کاہلی، بے عملی، بے بسی، بے حسی سیکھی تھی: شاعری کے نام سے نفس پرستی، حقیقت فراموشی، جذبات فراموشی کی تعلیم پائی تھی؛ سیاست و اقتصاد کے دھوکے میں شیخ چلی کے سے منصوبے باندھنے اور آخر میں مایوس ہو کر تقدیر سے، دنیا سے، اور اپنے آپ سے لڑنے کی مشق کی تھی۔ میری زندگی بھی غفلت اور وحشت، جمود اور اضطراب کا تضاد تھی۔ مگر میرا تخیل دوسروں سے زیادہ قوی تھا اور میرا دل و دماغ دوسروں سے زیادہ کمزور۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میرے قوائے ذہنی میں باہمی ربط کے رشتے ٹوٹ گئے، میری محدود خیالی زندگی کا سلسلہ بھی میری آنکھوں کے سامنے الگ الگ کڑیوں میں بکھر گیا جن کو ملانے کی میں کوشش کیا کرتا ہوں مگر بہت کم کامیاب ہوتا ہوں۔ لوگ مجھے دیوانہ سمجھتے ہیں مگر چونکہ میری پچھلی زندگی میں مذہبیت غالب تھی اور اب بھی اس کا شائبہ موجود ہے اس لئے اخلاقاً مجذوب کہتے ہیں۔ بعضوں کا خیال ہے کہ مجھ پر حقیقت کے بھید اور معرفت کے اسرار کھل گئے ہیں مگر میں انہیں برداشت کرنے کی تاب نہیں رکھتا۔ آہ انہیں کیا معلوم کہ رازِ حقیقت اور اسرارِ معرفت تو درکنار میں معمولی ذی فہم انسانوں کے مربوط ادراک، احساس اور عمل کے لئے تڑپتا ہوں۔ مگر کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ دوسرے مسلمانوں کی حالت مجھ سے کچھ بہتر ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ وہ سب میری

طرح مجذوب ہیں۔ اگر فرق ہے تو بس اتنا کہ میں کھلا ہوا مجذوب ہوں، وہ چھپے ہوئے مجذوب ہیں، میں نے زندگی کی بازی میں ہار مان لی اور وہ ہاری ہوئی بازی کھیل رہے ہیں ...... خیر مجھے اس وقت سب سے غرض نہیں، میں تو تجھ سے وہ بھید کہنا چاہتا ہوں جو میں نے سب کچھ کھو کے پایا ہے۔ میرے ذہن کی تاریکی میں اس وقت جو عارضی روشنی آگئی ہے اُسے غنیمت سمجھ اور میری بات غور سے سُن۔ تو ابھی نوجوان ہے اور زندگی کے گھنے اور تاریک جنگل میں قدم رکھ رہا ہے جس میں میں سیدھی راہ چھوڑ کر بھٹک گیا ہوں۔ تیرے پاس ابھی عقل کا چراغ موجود ہے جس میں عقیدے کا تیل جلتا ہے۔ تیری رگوں میں ابھی شوق اور ولولے کا خون دوڑ رہا ہے اور تیرے پیروں میں رہ نوردی کی قوت موج زن ہے۔ اگر تو منزل مقصود تک پہنچنا چاہتا ہے تو پہلے اُس منزل کو متعین کرلے۔ پہلا قدم اُٹھانے سے پہلے بیٹھ کر اچھی طرح سوچ لے کہ تجھے کہاں جانا ہے۔ اُس آسمانی چراغ کی روشنی میں جو تیرے پاس ہے اس جنگل کو ملک کے بھیجے ہوئے نقشہ کا خوب مطالعہ کرلے اور منزل رسیدہ مسافروں کے سفرناموں کو غور سے پڑھ لے۔ جب یہ کر چکے تو استقلال اور استقامت کو اپنا رفیق راہ بنا اور خدا کا نام لے کر اس اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں داخل ہو جا۔ اگر راہ میں تیرے پیر تھک جائیں تو قدم اور تیزی سے بڑھا، اگر تجھ پر نیند غالب ہو تو آنکھیں اور اچھی طرح کھول لے، اگر روشنی چھپ جائے اور اندھیرا چھا جائے تو اپنے چراغ کی بتی کو اور اُکسا دے۔ جب تجھے دوسرے رہ نورد نظر آئیں تو ان سے گریز نہ کر کیونکہ وہ تیرے رفیق سفر ہیں؛ ان کی مدد کرنا تیرا فرض ہے اور اُن سے مدد لینا تیرا حق ہے۔ لیکن سہارا لینا ہو تو اُس کا لے جو سیدھے راستہ پر چل رہا ہے، سہارا دینا ہو تو اُسے دے جو سیدھے راستہ پر چلنا چاہتا ہے ...... اگر تجھے یہ باتیں منظور ہیں تو جا خدا تیرا حافظ ورنہ اُٹھ اور اس تالاب میں کود پڑ۔ اگر تیرا بھی وہی انجام ہونا ہے جو میرا ہوا تو بہتر ہے کہ تو اپنے وجود سے دنیا کو پاک کر دے۔"

میں تصویر حیرت بنا ہوا مجذوب صاحب کی گفتگو سن رہا تھا۔ اُن کے آخری الفاظ

سن کر میں چونک پڑا مگر قبل اس کے کہ میں کچھ جواب دوں وہ اُٹھے اور بستی کی طرف روانہ ہو گئے۔

خدا جانے انھیں مجھ پر رحم آگیا یا اُن کے دل میں میری طرف سے کچھ امید پیدا ہو گئی۔
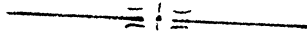
جادو وہ جو سر پہ چڑھکے بولے

ہندوستان میں برطانوی راج کی برکات و انعامات، انصاف اور حسن انتظام کی داستانیں سنتے سنتے کئی نسلیں گزر چکی ہیں، اگر کبھی کسی غریب ہندوستانی نے ان خداوندان ارضی کی حکومت کے برکات سے انکار کیا تو اس کفران نعمت پر قوم نے اُسے مجنون اور شوریدہ سر کا لقب دیا اور ارباب حکومت کی طرف سے کبھی حبس دوام کبھی عبور دریائے شور اور کبھی سولی کی سزا دی گئی! ظلم وستم کی انتہا کہئے یا زمانہ کا انقلاب کہ ہندوستان کے طول وعرض میں اب سوائے چند کاسہ لیسان حکومت کے کوئی نہیں جو برطانوی حکومت کو ظلم واستبداد کا مرادف نہ سمجھتا ہو یا حکومت کے "حسن انتظام" کا قائل ہو، لیکن مظلوم اور دل جلے ہندوستانیوں کی زبان سے نہیں بلکہ خود انگریزوں کی زبان اور قلم نے ہندوستان میں اپنی حکومت کے متعلق جو کچھ کہا ہے یا لکھا ہے اُس کا کچھ نمونہ بلاکسی اضافہ، ترمیم یا حاشیہ کے نذر کیا جاتا ہے۔ امید ہے کہ ناظرین بھی اس کو پڑھکر یہی کہنے پر مجبور ہونگے کہ "جادو وہ جو سر پہ چڑھکے بولے!"

ا۔ ہندوستان کے ایک سابق وائسرائے لارڈ لٹن ۱۸۷۸ء میں بصیغۂ راز اپنے ایک مراسلہ میں وزیر ہند کو تحریر فرماتے ہیں:۔

"ایک طرف یہ ایکٹ (انڈیا ایکٹ بابتہ ۱۸۳۳ء) منظور ہوا اور دوسری طرف حکومت نے ایسی تدابیر سوچنا شروع کردیں کہ جس سے عملاً اس ایکٹ کا نفاذ کسی طرح ٹل جائے! اس ایکٹ کے ایک ایک لفظ کو تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے بغور مطالعہ کرکے ذہن نشین کر لیا ہے۔ یہ تعلیم یافتہ طبقہ روز بروز بڑھتا جاتا ہے اور خود حکومت اس کو ترقی دینے کی کوشش کرتی ہے حالانکہ حکومت اس طبقہ کے موجودہ افراد کے حوصلوں اور ان کے مطالبات کے پورا کرنے کی بھی گنجائش نہیں رکھتی ہے۔ ہر ہندوستانی جو ایک مرتبہ سرکاری ملازمت میں کسی ایسی

جگہ پر مقرر ہو جائے جو پہلے صرف انگریزوں کے لئے مخصوص ہوتی تھیں تو اس کو حق ہے کہ وہ یہ توقع رکھے اور اس کا مطالبہ کرے کہ قاعدہ کے مطابق ترقی کرتے کرتے اس کو اس صیغہ کی سب سے بڑی ملازمت ملجائیگی۔ ہم سب جانتے ہیں کہ یہ توقعات اور مطالبات نہ کبھی پورے ہوسکتے ہیں اور نہ ہونے پائینگے۔ ہمارے سامنے دو راستے تھے یا تو صاف طور پر بڑی بڑی ملازمتوں پر ترقی دینے سے ان کو روک دیں یا ان کو دھوکہ دیں۔ ان دونوں طریقوں میں سے ہم نے وہی پسند کیا جو سب سے زیادہ نامناسب تھا۔ امتحان مقابلہ کا جو طریقہ انگلستان میں رائج ہے اُس کا ہندوستانیوں پر عمل درآمد یا جس عمر تک امیدوار مقابلہ میں شریک ہوسکتے ہیں اُس میں جو تخفیف حال ہی میں کیگئی ہے یہ سب دانستہ اور کھلی ہوئی دھوکہ بازی ہے تاکہ اس ایکٹ کو بے معنی اور حروف غلط بنا دیا جائے۔ چونکہ میری یہ تحریر راز کی ہے اس لئے مجھے یہ لکھنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ میرے نزدیک حکومت انگلستان اور حکومت ہند اس وقت تک اُس الزام کا قابل اطمینان جواب دینے سے قاصر ہیں کہ انہوں نے اپنے مواعید کو توڑنے کے لئے کوئی دقیقہ جو اُن کے اختیار میں تھا نہیں اُٹھا رکھا۔"

۲۔ مارکوئس آف سیلسبری سابق وزیر اعظم انگلستان ۲۹ اپریل ۱۸۷۵ء کو اپنی ایک تقریر کے دوران میں فرماتے ہیں :۔

"اگر ہندوستان کا خون چوسنا ہی ہے تو نشتر ایسی جگہ لگایا جائے جہاں خون جمع ہو گیا ہے یا کم از کم موجود تو ہے نہ کہ ایسے حصوں میں جو خون کی کمی کی وجہ سے پہلے ہی سے کمزور ہو چکے ہیں۔"

۳۔ آنریبل ٹی۔ آئی۔ شور اپنی تصنیف مسمی "معاملات ہند پر حاشیہ" کی دوسری جلد کے صفحہ ۵۱۶ پر لکھتے ہیں :۔

"انگریزوں کا بنیادی اصول یہ رہا ہے کہ ہر ممکن طریقہ سے اور ہر حیثیت سے پوری ہندوستانی قوم کو اپنے مفاد کا تابع اور محکوم بنائے۔ ان پر زیادہ سے زیادہ ٹکس لگایا جائے۔

چنانچہ جو صوبہ یکے بعد دیگرے ہمارے قبضہ میں آیا ہے وہ اضافۂ محصولات کے لئے ایک نیا میدان سمجھا گیا۔ اس کے بعد ہم اس پر فخر بھی کرتے ہیں کہ ہم نے محاصل کی رقم اس سے کئی گنی زیادہ کردی جتنی دیسی راجہ وصول کیا کرتے تھے۔ پھر ہندوستانیوں کو ہر اُس اعزاز اور جائے شرف اور عہدہ سے محروم کردیا گیا جس کے لئے ادنیٰ سے ادنیٰ انگریز کو قبول کرنے پر آمادہ کیا جاتا تھا۔"

۴۔ اڈمنڈ برک نے ۱۷۸۳ء میں فاکس کے ایسٹ انڈیا بل پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ:۔

"......لیکن برطانوی حکومت کے ماتحت یہ ترتیب بالکل بدل جاتی ہے۔ تاتاریوں کا حملہ تباہ کن تھا لیکن اب یہ ہمارا سایۂ عاطفت ہے جو ہندوستان کو تباہ کر رہا ہے، ان کی دشمنی نے جو نہ کیا تھا وہ اب ہماری دوستی سے ہو رہا ہے۔ آج بیس برس بعد ہمارا قبضہ اُسی طرح بے آئین ہے جیسے اول روز تھا، ہندوستانی لوگ مشکل ہی سے کبھی کسی انگریز کی صورت دیکھنا جانتے ہونگے۔ نوجوان بلکہ لونڈے ان پر حکومت کرنے کے لئے جاتے ہیں جنہیں نہ ہندوستان کے لوگوں کے ساتھ کوئی ہمدردی ہوتی ہے نہ ان کے ساتھ کسی قسم کا میل جول۔ گویا وہ اب بھی انگلستان ہی میں رہتے ہیں۔ اگر کچھ تعلقات ہیں تو اس قدر کہ جلد سے جلد زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرلی جائے تاکہ یہ دولت آئندہ کسی دور دراز ملک میں جاکر کام آئے۔ جوانی میں جو دولت کی حرص اور جو تیز مزاجی ہوتی ہے اُس سے بھرے ہوئے نوجوان حکمراں یکے بعد دیگرے اُمڈے چلے جاتے ہیں اور ہندوستانیوں کی نظروں میں ان کی حیثیت سوا اس کے کچھ نہیں کہ چڑیوں اور چیلوں کا ایک جھنڈ ہے جو بھوک کی شدت میں اُڑ اُڑ کر برابر چارہ گھاس کی تلاش میں آتا ہے اور نوچا کھسوٹا بھر کرلے جاتا ہے۔"

۵۔ سر طامس منرو اپنی سوانح حیات کی تیسری جلد میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"بادشاہی راج میں ایک طبقہ امرا اور رؤسا کا تھا جس میں جاگیردار، انعام دار، اور اعلیٰ حکام عدالت اور افسران فوج شامل ہوتے تھے۔ یہ لوگ اور دوسرے بڑے بڑے تاجر

اور کاشتکار ملکر ایک ایسی جماعت بنجاتی تھی جو دولت مند کہے جا سکتے ہیں یا کم از کم خوش حال اور فارغ البال ضرور تھے .... یہ تمام فوائد ہماری حکومت میں جاتے رہے۔ تمام فوجی اور عدالتی عہدے انگریزوں کے ہاتھ میں ہیں جن کی اندوختہ رقوم خود اُن کے ملک میں چلی جاتی ہیں .... پھر ایسے نظام حکومت کو جاری رکھتے ہوئے جس کا رجحان ساری قوم کی سیرت کو ارذل بنانا ہے ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ تعلیم کے ذریعہ ان کی سیرت کو بہتر اور اعلیٰ بنانے کی ہم کو بڑی فکر ہے۔"

۶۔ سر ہنری کاٹن اپنی تصنیف "نیو انڈیا" کے صفحہ ۱۱۳ اور ۱۱۵ پر تحریر فرماتے ہیں:۔

" ہندوستان کے روز افزوں افلاس اور غربت کے بہت سے اسباب ہیں لیکن اصلی سبب جو میں نے تلاش کیا ہے وہ دیسی صنعتوں کی تباہی اور اُن کی بجائے بدیسی صنعتوں کا فروغ پانا ہے۔ ایک اور سبب ہندوستان کی غربت کا وہ 'خراج' بھی ہے جو ہر سال یہاں سے جاتا رہتا ہے۔ 'مطالبات وطن' سال بہ سال بڑھتے جاتے ہیں۔ سب باتوں کا لحاظ رکھ کر اگر اُس رقم کا اندازہ لگایا جائے جو سالانہ ہندوستان سے برطانیہ عظمیٰ کو مختلف صورتوں اور مختلف ناموں سے جاتی ہے تو اُس کی میزان کم از کم ۴۵ کروڑ روپیہ ہوگی۔"

۷۔ دارالعوام میں معاملات ہند پر ایک مباحثہ کے دوران میں جان برائٹ نے ۱۸۵۳ء میں کہا تھا کہ:۔

" دیسی تعلیم کا جو نظام ہمارے ملک میں عام طور پر رائج تھا کہ ہر گاؤں میں ایک مدرسہ ہونا اُسی طرح ضروری تھا جیسے ایک پٹیل یا ایک مکھیا کا ہونا۔ اس نظام تعلیم کو حکومت نے تباہ کر دیا لیکن اس کے بدلے میں اچھی یا بُری کسی تعلیم کا بھی انتظام نہیں کیا گیا کہ اس کمی کو پورا کیا جاتا۔"

۸۔ 'دامن مشرق پر ایک سیاہ دھبہ' کے دیباچہ میں سر والٹر اسٹرک لینڈ لکھتے ہیں:۔

" راقم الحروف نے دو سال تک سیلون، اسٹریٹ سٹلمنٹ اور جنوبی ہند میں صرف

ایشیائی اور یورپ نشین لوگوں کے ساتھ بود و باش رکھی لیکن جو تجربات اس طرح حاصل ہوئے ان سے میرے اس عقیدہ میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی کہ مشرق میں برطانوی حکومت کی سب سے بڑی خصوصیت برطانوی حرص و آز اور بدنظمی حکومت ہے جو عمداً اس قوم کو تباہ کرنے کے لئے اختیار کی گئی ہے جس کے مفاد کا خیال رکھنے کا بظاہر دعویٰ کیا جاتا ہے۔"

۹ ۔ اسی کتاب میں ایک دوسری جگہ مصنف مذکور تحریر فرماتے ہیں :۔

"جو انگریز ان سطور کا مطالعہ کرے اس کو غور کرنا چاہئے کہ جب وہ سیلون کی سستی چائے کا کوئی گھونٹ پیتا ہے تو وہ اس حد تک انسان کا خون پیتا ہے ۔ واقعتہً یہ چائے نہیں ہے جو پی جاتی ہے بلکہ غریب اور مفلس غلاموں کا خون ہے جس میں سے زندگی اور حیات کا سرخ رنگ اُڑ گیا ہے ! اگر خدا انصاف کرتا تو ہر قطرہ جو ان کے حلق سے اُترتا ہے وہ ایک زہر بنکر اس ساری قوم کے جسم سے قوت اور مردانگی کو زائل کرکے اس کو ارذل نامرد اور ناکارہ قوم بنا دیتا۔"
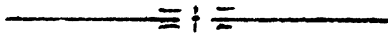
سیّد قاسم آذربائیجانیؒ

قاسم انوار نام، قاسم تخلص، آذربائیجان کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے دو مرتبہ پیادہ پا حج کیا ہے۔ ہرات میں بسلسلہ تلقین ارباب یقین کچھ عرصہ تک قیام رہا، پھر سمرقند چلے آئے اور ۸۳۷ھ میں بمقام جام انتقال کیا۔ مجھے اپنے والد کے کتب خانے میں ان کا قلمی دیوان ملا ہے جو کسی خوش نویس کا قلمی ہے جس کو اس نے ۱۱۰۳ھ میں گویا سید قاسم کے انتقال کے ۲۶۶ سال بعد لکھا تھا۔ باقی صحیح حالات تاریکی میں ہیں۔ کلام میں نہ صرف زور اور مستی پائی جاتی ہے بلکہ سوز و گداز سے بھی بھرا ہوا ہے۔ بعض غزلیں خواجہ حافظ کی غزلوں کے جواب میں ہیں۔ خواجہ حافظ کی غزل ہے ؎ تا ز میخانہ و مے نام و نشاں خواہد بود۔ سید قاسم نے اس زمین میں دو غزلہ لکھا ہے اس کے علاوہ قافیہ بدل کے بھی دو غزلیں لکھی ہیں۔ خواجہ حافظ کا شعر ہے ؎

تا ز میخانہ و مے نام و نشاں خواہد بود   سر ما خاکِ رہِ پیرِ مغاں خواہد بود

پہلی غزل میں سید قاسم نے حافظ کے مصرعہ پر یہ گرہ لگائی ہے ؎

ما دریں دیر مغاں بہر نیاز آمدہ ایم   سر ما خاکِ رہِ پیرِ مغاں خواہد بود

دوسری غزل میں "پیر مغاں" کو اس طرح نظم کیا ہے ؎

عاشقاں تومن و ایمان شہادت آنکہ   ایں ہم از دولت آں پیرِ مغاں خواہد بود

اس میں "من" کے بعد "و" ہے اس وجہ سے مصرعہ موزوں نہیں ہوتا اس کے علاوہ مضمون میں بھی کوئی خوبی نہیں ہے۔

نہاں ۔ خواجہ صاحب نے یہ قافیہ اس طرح باندھا ہے ؎

بر و اے زاہد خود بیں کہ زچشم من و تو   راز ایں پردہ نہان ست نہاں خواہد بود

سید قاسم نے اس کو صوفیانہ رنگ میں اس طرح نظم کیا ہے ؎

من را آنی و انا الحق چہ سخن می گوئیم　　　تا تو پیدا نشوی یار نہاں خواہد بود

اس کے بعد سید قاسم نے حافظ کے قافیوں میں کوئی شعر نہیں لکھا ہے بلکہ طبع زاد قافیوں میں غزل کو پورا کیا ہے۔ وحشت کی تصویر اس طرح کھینچی ہے ؎

تا تو از خلوتِ غیر عازمِ خلوت نشوی　　　دل ما نعرہ زناں جامہ دراں خواہد بود

مگر پہلے مصرعہ میں لفظ "غیر" کی "ر" یا لفظ "عازم" کا "ع" گرتا ہے۔

دوسری غزل میں اسی مضمون کو کسی تبدیلی کے ساتھ باندھا ہے۔ کہتے ہیں ؎

دل اگر روئے ترا باز نہ بیند ہیہات　　　دائما نعرہ زناں جامہ دراں خواہد بود

خفقان کی تصویر ملاحظہ ہو ؎

تا نہ بینم رُخ زیبائے تو شاداں نشوم　　　سینہ پُر سوز، دلم پُر خفقاں خواہد بود

"سر بارگراں ہے" اس مضمون کو اس طرح باندھا ہے ؎

قاسمی سر بنہادئے تو کند روز وصال　　　سرِ ما بر تنِ ما بارگراں خواہد بود

نگراں۔ خواجہ حافظ نے یہ قافیہ اس طرح لکھا ہے ؎

چشمم آں دم کہ زشوق تو نہد سر بہ لحد　　　تا دمِ صبح قیامت نگراں خواہد بود

سید قاسم نے اپنی دوسری غزل کے مقطع میں نگراں کا قافیہ اس طرح نظم کیا ہے لیکن مضمون کچھ دلچسپ اور شگفتہ نہیں ہے ؎

عشق می گفت کہ قاسم بچہ کارست دریغ　　　خبر خیر کہ خاطر نگراں خواہد بود

دوائے دارد۔ اس میں خواجہ حافظ کے دو شعر قابل ذکر ہیں ؎

اشک خونیں بطبیباں بنمودم گفتند　　　دردِ عشق ست و جگر سوز دوائے دارد

نغز گفت آں بت ترسا بچۂ بادہ فروش　　　شادی روئے کسے جو کہ صفائے دارد

سید قاسم نے بھی اس زمین میں غزل لکھی ہے اور نہایت خوبی سے انہیں قافیوں کو اس طرح نظم کیا ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

جانم از دولت دردتو ووائے دارد　　　　دلم از صیقل ذکر توصفائے دارد

خواجہ حافظ نے "شادی روئے کسے" کو "صفائے دارد" سے ممتاز کیا تھا لیکن سید قاسم نے "صیقل ذکر" سے مصرعہ کو بلند کردیا۔ شاہ تراب علی قلندر کاکوروی نے بھی اس زمین دو غزلہ لکھا ہے۔ مطلع خوب ہی کہا ہے ؎

عشق دردیست کہ ہر گز نہ دوائے دارد　　　　ہر کہ دارد دل پُردرد بلائے دارد

دلبری داند۔ اس میں خواجہ حافظ کی مشہور غزل ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند　　　　نہ ہر کہ آئینہ سازد سکندری داند

سید قاسم نے دلبری کا قافیہ ایک نئے انداز سے باندھا ہے ؎

چنانکہ چشم تو در غمزہ دلبری داند　　　　سواد زلف سیاہت ستمگری داند

خواجہ حافظ کا مقطع ہے ؎

ز شعر دلکش حافظ کسے شود آگاہ　　　　کہ لطف طبع و سخن گفتن دری داند

سید قاسم مقطع ہی میں اس کا جواب دیتے ہیں ؎

حدیث وصف لبت ہمچو قاسمی گوید　　　　بوجہ احسن اگر کس سخنوری داند

پروانہ قافیہ۔ خواجہ حافظ کہتے ہیں کہ آگ وہ نہیں ہے کہ جس کے شعلہ پر شمع ہنسے بلکہ آگ وہ ہے جو بھڑک کر پروانہ کے خرمن میں جالگی ؎

آتش آن نیست کہ بر شعلۂ او خندد شمع　　　　آتش آں ست کہ بر خرمن پروانہ زدند

سید قاسم نے اسی مضمون کو نہایت دلکش انداز میں اسطرح لکھا ہے کہتے ہیں کہ ساقی نے عشاق کو میخانہ کی دعوت (نہیں) دی بلکہ پروانہ کے دل میں آگ لگادی ؎

عاشقاں را چو صلا جانب میخانہ زدند　　　　آتشے بود کہ اندر دل پروانہ زدند

میرا جہاں تک خیال ہے سید قاسم کا شعر خواجہ حافظ سے بڑھ گیا ہے۔

پیمانہ زدند۔ خواجہ حافظ لکھتے ہیں ؎

دوش دیدم کہ ملائک درمیخانہ زدند گل آدم بسرشتند بہ پیمانہ زدند

سید قاسم کہتے ہیں ؎

عکس ساقی چو دریں بادۂ صافی افتاد عاشقاں از ہوسش ساغر و پیمانہ زدند

بکام ست امروز۔ اس میں خواجہ حافظ کا شعر ہے ؎

روز عیش و طرب و ماہ صیام است امروز کام دل حاصل ایام بکام ست امروز

سید قاسم جواب میں مطلع لکھتے ہیں ؎

از لب لعل تو ام کار بکام ست امروز فلکم بندۂ و خورشید غلام ست امروز

دوسرے مصرعہ نے شعر کو نہایت بلند کر دیا ہے۔

خواجہ حافظ کا شعر ہے ؎

گو عروس فلکی رخ منما از مشرق کہ مرا دیدن آں ماہ تمام ست امروز

سید قاسم کہتے ہیں ؎

ہر کہ قانون شفائے دل خود می طلبد ز اشارات نفس کار تمام ست امروز

غماز قافیہ۔ اس میں خواجہ حافظ لکھتے ہیں ؎

چہ گویمت کہ ز سوز دروں چہ می بینم ز اشک پرس حکایت کہ من نیم غماز

سید قاسم نے "غماز" کا قافیہ اس طرح لکھا ہے ؎

ز چشم مست تو مستم کہ اہل صومعہ را دریدہ پرتو تقویٰ بغمزۂ غماز

ایاز۔ اس قافیہ میں خواجہ حافظ نے زلف ایاز کو کرشمۂ حسن کی غرض ثابت کیا ہے ؎

غرض کرشمۂ حسن ست ورنہ حاجت نیست جمال دولت محمود را بزلف ایاز

مگر سید قاسم نے بجائے زلف ایاز کے، حسن ایاز نظم کرکے "لیلیٰ را بچشم مجنوں باید دید" کا کلیہ یاد دلایا ہے ؎

بنور دیدۂ محمود می تواں دیدن اشعۂ لمعات جمال حسن ایاز

دوسرے مصرعہ میں لمعات سے پہلے جو لفظ ہے اُس مصرعہ میں باعتبار موزونیت ایک قسم کی ثقالت پائی جاتی ہے کیونکہ بغیر مشدد کئے مصرعہ موزوں نہیں ہوتا ممکن ہے کہ سہو کتابت ہو اور اس جگہ کوئی اور لفظ ہو۔

چاک۔ خواجہ حافظ معشوق کی خوشبو سونگھ کر گریبان چاک کرتے ہیں ؎

نفس نفس اگر از باد نشنوم بو یت　　　زماں زماں کنم از غم چو گل گریباں چاک

دونوں مصرعوں میں تکرار نے ایک خاص لطف پیدا کر دیا ہے۔ سید قاسم نے چاک کا قافیہ لکھا ہے لیکن نہایت کمزور ؎

چہ بود قصہ لیلی دریں نشیمن خاک　　　چہ بود حالت مجنون مست دامن چاک

حاشاک۔ خواجہ حافظ کہتے ہیں اگر تیرے خیال میں دونوں آنکھیں سو جائیں یا تیرے فراق میں دل کو صبر آجائے کیا ایسا ممکن ہے ؟ ہرگز نہیں۔

رود بخواب دو چشم از خیال تو ہیہات　　　بود صبور دل اندر فراق تو حاشاک

سید قاسم معشوق سے کہتے ہیں کہ تو اس درجہ لطیف و ظریف ہے کہ لطافت حسن کی وجہ سے تیرا کلبۂ احزاں میں قدم رکھنا ہی دور از قیاس ہے ؎

چناں لطیف و ظریفی کہ از لطافت حسن　　　قدم بکلبۂ احزان من نہی حاشاک

"حاشاک" کے قافیہ کا سید قاسم نے ایک شعر اور بھی لکھا ہے مگر اس کا پہلا مصرعہ موزوں نہیں معلوم ہوتا ممکن ہے کہ کوئی لفظ چھوٹ گیا ہو ؎

دلی مظہر انساں کہ مظہر خاص ست　　　قیاس مظہر دیگر مکن مگو حاشاک

ادراک۔ خواجہ حافظ کہتے ہیں کہ ہر شخص کی نظر اپنی عقل و ادراک کے موافق تجھ کو دیکھتی ہے لیکن جیسا کہ تو ہے ویسا کہاں دیکھ سکتی ہے ؎

ترا چنانکہ توئی ہر نظر کجا بیند　　　بقدر بینش خود ہر کسے کند ادراک

سید قاسم کہتے ہیں کہ خدا کے نور سے جہان بھرا پڑا ہے لیکن اندھی آنکھیں اس کا کیسے ادراک

کرسکتی ہیں ؎

جہاں پرست ز نور خدائے عز وجل ولیک دیدۂ اعمش نمی کند ادراک

سید قاسم نے فقر و شاہی کا نہایت دلچسپ مکالمہ لکھا ہے ۔ ہم اس کو یہاں نقل کرتے ہیں ؎

مکالمۂ فقر و شاہی

فقر می گفت کہ من افسر جاویدانم شاہ می گفت کہ من سایۂ آں سلطانم

فقر می گفت بہر جائے منم شمس منیر شاہ می گفت چنیں ست ولے نتوانم

شاہ می گفت کہ من حاکم بر و بحرم فقر می گفت کہ ہر دو بجوے نستانم

شاہ می گفت کہ من ملک جہانی دارم فقر می گفت کہ من جنت جاویدانم

فقر می گفت کہ فردا کہ قیامت گردد نہ غم از پل صراط ست نہ از میزانم

شاہ می گفت کہ صد درد دریغست مرا آں زمانے کہ بہ بدکردۂ خود درمانم

شاہ را گفتم چو بنے بقیامت گفتہ ایں سخن از دگرے پرس کہ من حیرانم

اس میں پہلا مصرعہ غیر موزوں ہے ۔

اندراں روز من محنت و غم افزا دم مرکب جاں بسر کوئے یقیں می رانم

اس مکالمہ کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ شاہ نہایت عاجزی سے شہنشاہ حقیقی کی بارگاہ میں سربسجود

ہے اور اس طرح عرض پرداز ہے :-

بادشاہا بسر کوئے نیاز آمدہ ام سر بکوے تو گہ عید و گہ قربانم

شہریارا بکرم عذر دل من بپذیر کہ بدرگاہ تو ہم بوذرؓ و ہم سلمانم

قاسمی عمر گرامیست بغفلت مگذار عمر برباد شد اکنوں چہ بود درمانم

ایک بہت مشہور غزل ہے جس کا پہلا مطلع یہ ہے ؎ قصر جنت چہ کنم کوچۂ یارے دارم ٭

ترس دو زخ نکنم روئے نگارے دارم ۔ سید قاسم نے اس طرح پر بھی طبع آزمائی کی ہے ۔ منتخب دو شعر یہ ہیں :۔

چشم گریان و دل زار و نزارے دارم　　　　در نہاں خانۂ دل نقش و نگارے دارم

ہمچو بلبل کہ بنالد بہ ہوائے گل مست　　　　با خیالش ہمہ شب نالہ زارے دارم

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ جن کا کلام " دیوان شمس تبریز " کے نام سے چھپا ہے ان کے دیوان کے صفحہ ۲۰۰ میں ایک غزل ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

با روئے تو ز گلشن و گلزار فارغیم　　　　با چشم تو ز بادۂ و خمار فارغیم

سید قاسم نے اس زمین جو غزل لکھی ہے اُس میں ہو بہو یہی مطلع موجود ہے ۔ صرف دو لفظوں " بادہ " اور " خانہ " کا فرق ہے بس دیکھئے ؎

با روئے تو ز بادۂ و گلزار فارغیم　　　　با چشم تو ز خانۂ خمار فارغیم

اسی طرح مولانا روم ؒ کا شعر ہے کہ

ما لاف می زنی و تو انکار می کنی　　　　ز اقرار جملہ عالم و انکار فارغیم

سید قاسم کی غزل میں یہ شعر بھی موجود ہے لیکن کسی قدر تبدیلی سے ؎

ما درد دوست را بدو عالم نمی دہیم　　　　ز اقرار ہر دو عالم و انکار فارغیم

حقیقت یہ ہے کہ پہلے مصرعے نے مضمون بہت بلند کر دیا ہے :۔

مولانا روم ؒ نے " غمخوار " قافیہ اس طرح لکھا ہے اور تو خوب ہی لکھا ہے ؎

غم را چہ زہرہ باشد تا نام ما برد　　　　دستے بزن کہ از غم و غمخوار فارغیم

سید قاسم اسی قافیہ کو ایک دوسرے عنوان سے اس طرح باندھتے ہیں ؎

اے جان من اسیر مشو در طریق غم　　　　رقصے بکن کہ از غم و غمخوار فارغیم

اب ہم سید قاسم کے کچھ منتخب شعر لکھتے ہیں ۔

حمد

من بے چارہ سودا زدہ سرگردانم — کہ باوصاف خداوند سخن چوں رانم
من و توحید تو ابہات دلم می لرزد — اینقدر بس کہ حدیثت بزباں می رانم
من بسامان صفات تو کجا رہ یابم — عاجزم خستہ دلم بے سر و بے سامانم

نعت

علیہ الصّلات و علیہ السّلامی — امینی زمینی امانی زمانی

ان کا یہ شعر بہت مشہور ہے ؎

ای صبح سعادت زجبین تو ہویدا — ایں حسن چہ حسن ست تقدس و تعالیٰ

نعت میں ایک قصیدہ لکھا ہے جس کے دو شعر قابل ذکر ہیں۔ ایک مطلع ہے جسمیں تنہائی اور سوز و گداز کی تصویر کھینچی ہے ؎

جگر پر درد، دل پرخوں اماں سرست تا پرپا — دریں حالت نمی آید دو عالم در نظر ما را

دوسرا شعر یہ ہے ؎

محمد را ابہامی کنار خوان احساں بر — شراب از جام سبحاں بر کہ سبحان الذی اسریٰ

۸۳۷ھ میں سید قاسم نے انتقال اور مولانا جامیؒ نے ۸۹۸ھ میں وفات پائی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا جامیؒ نے اسی قصیدہ پر وہ غزل لکھی ہے جس کا مقطع یہ ہے ؎

ز لوح سینہ اش جامی الم نشرح لک برخواں — ز معراجش چو میخوانی کہ سبحان الذی اسریٰ

مولانا جامیؒ نے جس خوبی سے "سبحان الذی اسریٰ" نظم کیا ہے سید قاسم اس عمدگی سے نظم نہ کرسکے۔ سچ ہے "ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء"۔ اب سید قاسم کے قصیدہ کے کچھ شعر اور سن لیجئے، جو دلچسپی اور خوبی سے خالی نہیں ہیں۔

تو بہار وصے میموں را بر افشاں جعد شبگوں را — کہ می یابم ز بوئے او نسیم جنت الماویٰ

اگر از اسم قہاری تجلی می کند مارے | بگو کر مرد اقراری نشان طامۃ الکبریٰ
پس آنکہ عالم افعال و آثار ست پیوستہ | زہے حکمت زہے قدرت تعالیٰ ربنا الاعلیٰ
زخورشید جمال او بہر وصفے می گویم | ہمہ ذرات می گویند شہدنا بعد آمنّا
بباید رفتن و خفتن حدیث عشق بنهفتن | سخن گفتن ز اوصاف گہ اوصاف لا تخفیٰ
بیا اے جان خوش سودا بہ بیں نور تجلی را | خطاب مستطاب را بگو لبیک ما اوحیٰ
توئی مومن توئی ایماں توئی سرچشمۂ حیواں | توئی سلطان جاویداں توئی مقصد توئی ملجا
شریعت از تو روشن شد طریقتہا مبرہن شد | حقیقتہا معین شد زہے پس زہے طٰہٰ
الا اے احمدؐ مرسل چراغ مسجد و منبر | توئی سید توئی سرور توئی از مسجد اقصیٰ

ایک موقع پر عاشقانہ انداز میں اپنی بیقراری اس طرح دکھاتے ہیں ؎

از حد گذشت قصۂ دردِ نہان ما | ترسم کہ نالہ فاش کند راز جان ما

معشوق کے بغیر زندگی تلخ ہے اس کو اس طرح بیان کیا ہے ؎

بے جمالت بوستانِ عشق ما را نور نیست | بیو صالت خاطر مہجور را مسرور نیست

ہجر میں معشوق کا تصور رہے پھر اس سے اس طرح مخاطب ہوتے ہیں ؎

اے دل و دلدار من راہ بوصل از چہ روست | اے بت عیار من راہ بوصل از چہ روست

توحید وجودی میں کہتے ہیں ؎

بچشم وحدت مطلق بدیدم روئے جاناں را | دریں حالت نمی آید دو عالم در نظر ما را

ایک عاشقانہ سلام لکھا ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی منقبت میں ہے جس کے نمونتاً چار شعر لکھے جاتے ہیں۔

نور ولایت توئی شاہ سلامٌ علیک | شمع ہدایت توئی شاہ سلامٌ علیک
لحمک لحمی نبی گفت ترا اے ولی | سرور مرداں علی شاہ سلام علیک

درج درِ لا فتیٰ برجِ مہ ھل اتیٰ ۔۔۔ انت ولی الولا شاہ سلامٌ علیک

نیرِ ولایت توئی حسن ملاحت توئی ۔۔۔ غایت غایت توئی شاہ سلامٌ علیک

مذکور الصدر شعر قافیہ کی قید سے آزاد ہے ۔ اسی طرح یہ شعر ہے ؎

حیدر صفدر توئی ساقی کوثر توئی ۔۔۔ خواجہ قنبر توئی شاہ سلامٌ علیک

ایک ایک شعر سے عقیدت ٹپک رہی ہے ۔ کیوں نہ ہو آخر صوفی مشرب ہیں ۔ ایک سلام اور لکھا ہے جس کے دو شعر نہایت ہی دلکش ہیں ۔

اے زلفِ و رخت میگوں ای دوست سلام علیک ۔۔۔ وے شیوۂ تو موزوں ای دوست سلام علیک

دریا ہمہ ہاموں شد دلہا ہمگی خوں شد ۔۔۔ جاں جانب بیچوں شد ای دوست سلام علیک

طالب و مطلوب دونوں کا کمال اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

عشق بفر خندہ فال داد بوجہ کمال ۔۔۔ عشق مرا لم یزل ۔ حسن ترا لا زوال

جوش میں آکے کہتے ہیں ؎

مائیم کہ چوں بادۂ گلرنگ بجوشیم ۔۔۔ گہ بادہ بنوشیم گہے بادہ فروشیم

پھر ایک جگہ دیدار میں انتہائی شغف کی حالت اس طرح دکھاتے ہیں ؎

دینار نمی خواہم من عاشق دیدارم ۔۔۔ اغیار نمی خواہم من شیفتۂ یارم

ہجر و فراق میں بحالت تنہائی معشوق سے اس طرح کہ رہے ہیں ؎

از نائرۂ شوقت در دل شررے دارم ۔۔۔ با طلعت خورشیدت عشق و نظرے دارم

معشوق کے تصور میں مگن ہیں ۔ اس کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں ؎

از دولت او شادم و ز بند غم آزادم ۔۔۔ در خلوت جان و دل زیبا قمرے دارم

نفی و اثبات کے شغل کی اس طرح تعلیم دیتے ہیں ؎

لا زنم لا لا زنم لا بر سر الا زنم ۔۔۔ من بیخ لا سا بر کنم بیچوں دارم از الانشاں

کہتے ہیں اگر میرے دل پر معشوق غمزوں کے تیر مار رہا ہے تو کیا پروا ۔ ابھی وہ اس سے بھی زیادہ

جفا کرے تب بھی میرا کام صدق و صفا رہنا چاہیئے ؎

ناوک غمزہ می زند بر دل من نگار من　　صدرہ اگر جفا کند صدق و صفاست کار من

انسان میں تجلی الٰہی موجود ہے اس کو نہایت مدلل طریقہ سے بیان کرتے ہیں ؎

کے بدے ادراک در سمع و بصر　　گر نبودے نور حق در ما و طین

حقائق میں اپنا تحیر دکھاتے ہیں ؎

بچہ نسبت کند جاں کہ شدست در تو حیراں　　بتو ہیچ کس نہ ماند تو بہ ہیچ کس نمانی

رباعیاں

اشتیاقم بملاقات تو چندانکہ مپرس　　اقتیاجم براعات تو چندانکہ مپرس
دارم امید عنایات تو چندانکہ مپرس　　شادم از ذوق مناجات تو چندانکہ مپرس

من بندۂ شیوہ ہائے شیریں تو ام　　آشفتۂ طرہ ہائے مشکین تو ام
گفتی کہ بگو تا چہ کسی در رہ ما　　مسکین تو مسکین تو مسکین توام

اے دلبر دلدار طلب گار تو ایم　　اے منبع انوار طلب گار تو ایم
اے سالک اطوار طلب گار تو ایم　　اے واقف اسرار طلب گار تو ایم

ہر چند کہ در زمانہ یک محرم نیست　　بنیاد اساس دوستی محکم نیست
ما در ہمہ حال در غمش دلشادیم　　چوں غم بسلامت ست دیگر غم نیست

دل عاشق چشم مست ترکانهٔ تست | تو شمعی و عالم همه پروانهٔ تست
جان و دل ما عاشق و دیوانهٔ تست | تو خانهٔ دل شدی و دل خانهٔ تست

در دیدهٔ چوں سحاب من رحمت کن | بر فقر و نکوساریٔ من رحمت کن
بر گریهٔ بیداریٔ من رحمت کن | بر مفلسی و خواریٔ من رحمت کن

تا بر سر کوئے عاشقی منزل ماست | سر حق و ابدی و ازلی منزل ماست
تا نشاءِ عشق تو ز آسائش ماست | سرنامهٔ تا مها بنام دل ماست

یادگار اساتذہ حضرت اثر ردولوی

فصل بہار آئی مسرت کا جوش ہے
ہنگامہ ساز انجمنِ نای و نوش ہے

کیا خوش نوائی قلقل مینا گوش ہے
بے بادہ مست خاطرِ ہر بادہ نوش ہے

مرکر بھی پردہ داری سوز نہاں ہے
گو شمع ہے مزار پہ لیکن خموش ہے

اے چشمِ خونفشاں کوئی رنگ اپنا تو دکھا
سنتے ہیں اب فسانۂ غم بارِ گوش ہے

اے شوق بےخبر نگہہ نا زفتنہ زا
صد برق خرمنِ خرد و عقل و ہوش ہے

مایوسی سے آہ تمنائیں مٹ گئیں
اب وہ نہ ذوق شوق نہ جوش و خروش ہے

کیونکر طلسم جلوہ گہہ راز کھل سکے
ہر کامیاب اہل تماشا خموش ہے

پھر دلفریب و روح فزا ہو دی صدا
پھر محو اضطراب تمنائے گوش ہے

دیکھی ہے جس نے صورت حیرت فزا تری
شکلِ شبیہ آئینہ ہر دم خموش ہے

پھولے پھلے نہال تمنائے باغباں
ہر گوشۂ قفس سبد گل فروش ہے

ہاں اے اثر سنا کوئی روداد خونچکاں
مشتاق گوش قصۂ عبرت نیوش ہے

محبت کی جیت

فرانس کے مشہور انشاپرداز وافسانہ نویس موپسان کا یہ ایک دل پذیر
افسانہ ہے جسے مصر کے مشہور مرحوم ومغفور ادیب محمد تیمور نے اکتوبر
۱۹۲۰ء میں عربی کا جامہ پہنایا۔ مترجم کا بیان ہے کہ "اس نے اس
افسانے کے اشخاص اور زمان ومکان کو بدل دیا ہے اور اس کے ہر جزو
میں مصریت پیدا کر دی ہے۔ اب اس میں روح کے سوا اصلی کاتب
کی کوئی شے باقی نہیں ہے۔ یعنی روح فرانسیسی ہے اور قالب مصری! اس
بات میں مترجم نے ٹالسٹائے کے نقش قدم کی پیروی کی ہے جو اس
نے موپسان کے ایک قصہ کے ترجمے میں اختیار کیا تھا" میں نے اسے
بجنسہ عربی سے اردو میں ترجمہ کر دیا ہے۔ اور لفظی ومعنوی کوئی تغیر نہیں کیا۔

محوی

محمد بک عبدالقادر ایک پچپن سالہ شخص ہے، اس کی آنکھیں سیاہ، ناک لمبی،
بھویں جڑواں ہیں۔ مونچھیں ترشواتا ہے، داڑھی چھوڑ رکھی ہے۔ جب چلتا ہے تو آہستہ
آہستہ سکون ووقار کے ساتھ، اور جب بیٹھتا ہے تو اپنی کرسی پر پالتی مار کر، اپنے
موزے اتار کر، یہ لمبا کوٹ پہنتا ہے، اس کے سوا یورپ کے لباس میں سے کوئی
چیز پسند نہیں کرتا، اس لئے کہ یہ لباس بظاہر اپنی وضع قطع اور صورت شکل کے
لحاظ سے ثقاہت لئے ہوئے ہے اور پرہیزگاری وتقوے کا لباس معلوم ہوتا ہے۔
محمد بک اپنی تمام بات چیت اور قول وفعل میں ایک پکا مسلمان ہے، وہ
مذہب کے لئے گھلا جاتا ہے، اگر کسی ایسے بددین، ملحد سے مقابلہ ہو جائے جو خدا کو

ڈرتا ہو نہ رسول سے تو پوری مدافعت سے کام لیتا ہے ، پردۂ نسواں کی ہر مجلس میں تائید کرتا ہے ۔ خاصکر جہاں قدیم عادات کے پیرو اور پرانی روشنی کی تقلید کے موافق و طرفدار لوگ ہوں تو اُن کی تائید کرتا ہے کسی نئی روشنی کے مسلمان نوجوان کو جب کسی دوکان پر بیٹھا ہوا جام شراب کے دور میں مصروف دیکھتا ہے تو اپنی جگہ پر کھڑا کا کھڑا رہ جاتا ہے ، پھر غصے میں زمین پر نفرت سے تھوکتا ہوا چلدیتا ہے ۔ قرآنی آیات پڑھتا جاتا ہے ۔ کریوں بنک میں تقریباً بیس ہزار پونڈ اُس کے جمع ہیں ۔ مگر اس کا سود وغیرہ نہیں لیتا ، خدائے عزوجل کے اس ارشاد کی پیروی میں کہ " احل اللہ البیع وحرم الربوا " (خدا نے لین دین کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام) وہ اسے ناجائز بلکہ حرام جانتا ہے ۔

محمد بک ایک خوبصورت محل میں رہتا ہے ، جو دریائے نیل کے کنارے پر بنا ہوا ہے ، اور جسے ایک دل کشا باغ اپنے احاطے میں لئے ہوئے ہے ۔ اس کے درخت جھوم جھوم پڑتے ہیں ، جب نسیم خوشگوار انہیں دھیمے دھیمے ہچکولے دیتی ہے ۔ اس میں ننھی ننھی خوبصورت چڑیوں کے جان نواز نغمے سننے میں آتے ہیں ، جو نیل کی موجوں کے نغموں سے ملے جلے ہوتے ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حسین و پرسکون موسیقی ایک عاشق مایوس کے کانوں کے لئے نوائے نغمۂ محبت ہے ۔ جس وقت مغرب سے کچھ پہلے درختوں کی آڑ سے شفق سرخ نمودار ہوتی ہے ، اور آسمان اپنا لال جوڑا پہنتا ہے تو دیکھنے والا یہ تصور کرتا ہے کہ یہ سرخی رات کے آنسوؤں کی ہے ، جو دن کی روشنی کو وداع کرنے کے لئے نکل آئے ہیں ۔ جس وقت اس گنبد نیلی فام پر چاند کسی رات جلوہ پیرا ہوتا ہے ، خاصکر جب کہ رات بھی موسم گرما کی ہو ، تو دلکشی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ طلوع فجر تک دیکھنے والے کا جی باغ سے جدا ہونے کو نہیں چاہتا ۔ یہ ایک بڑی خوش نصیبی ہے جو خدائے برتر نے اس نیک بخت بوڑھے کو اپنے خزانہ قدرت سے عطا کر رکھی ہے ۔ اس کی نیک بختی ، پرہیزگاری

اور اس کی عبادت و ریاضت کے صلے ہیں۔ اس کی بدولت بک کا دل مسرور اور آنکھیں ٹھنڈی رہتی ہیں۔ اس کے چہرے پر خوشی و مسرت کی چمک ہوتی ہے، جب وہ خدا کا نام لیتا ہے اور اُس کی پیشانی پر نور مسرت نمایاں ہوتا ہے، جب وہ اپنے نبی کریم پر درود بھیجتا ہے۔ یا کوئی دُعا پڑھتا ہے۔

مگر محمد بک عبدالقادر کی اولاد صرف ایک حسین صورت، خوش کلام، خوش اندام دوشیزہ کے سوا اور کوئی نہیں۔ یہ دوشیزہ گلستان شعر کی وہ نرگس جمیلہ ہے جس کے آگے ہر بلند خیال و بدیع فکر شاعر ہاتھ باندھے کھڑا رہتا ہے۔ وہ کچھ اوپر بیس[۲۰] سال کی عمر کو پہنچ چکی ہے، اور اب اُس کے شفیق باپ کو زیادہ تر اُسی کے بیاہ شادی کی فکر دامنگیر رہتی ہے، وہ اپنی شریک زندگی بیوی سے اس بارے میں بارہا بات چیت بھی کر چکا ہے، نیز کئی ایک امیر خاندان کے نوجوانوں کے نام بھی بتا چکا ہے۔ یہ دونوں میاں بیوی ایک نوجوان کو انتخاب کرتے ہیں جس میں انہوں نے مطلوبہ اوصاف پائے ہیں مگر لڑکی اس نوجوان سے شادی کرنے سے صاف انکار کر دیتی ہے، ماں بیٹی میں جو کچھ بات چیت ہوئی تھی، اس کی اطلاع ماں نے اپنے شوہر کو دی۔ یہ انکار اُسے سخت ناگوار ہوا اور اس نے بہت کچھ افسوس کیا تھا ایک دوسرا لڑکا انتخاب کیا اور ماں کے ذریعے لڑکی کو اطلاع دی۔ مگر لڑکی نے اس نسبت سے بھی نارضامندی ظاہر کی بلکہ شادی ہی سے انکار کر دیا۔ نوجوان لڑکی کے شادی سے اظہار بیزاری نے باپ کو سخت غضب ناک کر دیا۔ ماں باپ کے حکم سے بیٹی کی اس نافرمانی نے سارے گھر میں ایک قیامت برپا کر دی۔ غصے میں جو کچھ بک کے دل اور منہ میں آیا اس نے اپنی بیٹی کو کہہ سنایا، خوب ڈانٹا ڈپٹا اور نہایت درجہ ناراضی کا اظہار کیا۔ محمد بک کی اس بیجا محبت نے جو اسے ہر قدیم عقیدے کے ساتھ

تھی، خواہ وہ اچھا ہو یا بُرا۔ اُسے پہلے نوجوان کے ساتھ لڑکی کو بیاہ دینے پر آمادہ کردیا۔ اور اس نے اپنا یہ حکم ناطق لڑکی کے کانوں تک پہنچا دیا۔ وہ بھی اس سختی کے ساتھ جو اس سے پہلے اس نازپروردہ بیٹی نے اپنے نیک بخت باپ کی جانب سے کبھی نہیں دیکھی تھی مگر لڑکی نے صبر و خاموشی اور آنسوؤں کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا۔

(۲)

ماں ایک آنکھ یہ نہ دیکھ سکی کہ اس کی پیاری بیٹی زار زار روئے، اُسے یہ گوارا نہ ہوا کہ اس دوشیزہ کی جوانی یوں خاک میں ملے، اور اس کا جائز حق چھین لیا جائے اُس کی شباب کی امیدوں کو پامال کیا جائے، وہ اس کی حسرتوں کو یوں ساحل یاس پر چھوڑ دے۔ ماں ایک روز سویرے اپنی بیٹی کے پاس تنہائی میں گئی، جبکہ اُس کا باپ کسی دوست سے ملنے کے لئے گھر سے باہر گیا ہوا تھا اُس نے پہلے تو یہ عہد کیا کہ اپنے شوہر کے ہر ظلم و ستم کے مقابلے میں وہ ایک قوی بازو معاون ہوگی پھر قسم دے کر لڑکی سے شادی کے بارے میں گفتگو کی۔ لڑکی پھوٹ پھوٹ کر ماں کے آگے رونے لگی، اور رو رو کر اس سے رحم و امداد کی طالب ہوئی۔ مگر زبان سے اس نے کچھ نہ کہا۔

آخر یہ لڑکی اس قدر بلک بلک کر کیوں روئی؟ اتنی بیتاب اور بے قرار کیوں ہوئی؟ آخر وہ کیا بلا ہے، جس نے اُس کے پاک دل میں یہ چھپی ہوئی آگ بھڑکائی؟ ہر دوشیزہ شادی کی آرزومند ہوتی ہے، امیر اور حسین نوجوان کو پسند کرتی ہے، اس کے باپ نے جو لڑکا اس کی شادی کے لئے انتخاب کیا ہے، وہ خوش اخلاق ہے، شریف النسب بھی ہے، خوش اندام اور خوبصورت بھی، روپے والا بھی ہے اس کے ساتھ شادی کرنے سے کیوں انکار کرتی ہے؟ غالباً اس میں کوئی اور راز

ہے! یہ باتیں تھیں جو اُس کی ماں اپنے دل سے کر رہی تھی۔ اور اپنی بیٹی کے آنسو پونچھتی جاتی تھی۔ جب لڑکی سسکیاں لیتے لیتے ذرا رُکی تو اس کی ماں نے اپنی شفقت اور رحم سے بھری ہوئی آواز میں اس سے کہا:

بیٹی! میں تجھ سے وعدہ کرتی ہوں کہ اُسی لڑکے کے ساتھ تیری شادی کروں گی جس کے لئے تو اپنی جان دے دیتی ہے، مگر یہ تو بتا کہ وہ ہے کون؟

لڑکی نے اپنا سر جھکا لیا اور کچھ اس انداز سے آہستہ آہستہ مسکرائی کہ جو راز اب تک اُس کے دل میں دفن تھا، وہ اس کی ماں پر آئینہ ہوگیا۔ ماں نے اُسے پیار کر کے کہا:

آخر وہ ہے کون؟

لڑکی خاموش رہی، اور اپنا سر ماں کے کاندھے پر رکھ دیا۔ ماں نے نہ چاہا کہ اب زیادہ سوالات کی بوچھار سے اپنی بیٹی کے نازک دل کو پریشان کرے، جو کچھ وہ سمجھ چکی تھی، اُس پر اکتفا کی۔

(۳)

محمد بک اپنے گھر آیا، اس کی بیوی اُس سے تنہائی میں ملی، اور اپنے شوہر سے درخواست کی کہ اس نامبارک شادی کو تھوڑے دنوں کے لئے ملتوی رکھے مگر وہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ ماں نے بہت عاجزی کے ساتھ رحم و کرم کے ہر دروازے کو کھڑکھڑایا لیکن کوئی نہ کھلا۔ بک کو یہ امر سخت ناگوار تھا کہ وہ اس معرکے میں مغلوب ہو۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ آج اس کی شکست اُس کی جیت سے بہتر ہے۔ اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھ کر کہا:

غالبًا لڑکی کسی اور لڑکے کو پسند کرتی ہے اور اُسی سے نکاح کرنا چاہتی ہے؟

ماں نے بگڑ کر کہا: اگر ایسا ہے بھی تو ہمارے لئے نقصان کی کیا بات ہے،

"نقصان کی کیا بات ہے! یہ خوب کہی - ناسمجھ عورت! تو آگ کے ساتھ کھیل رہی ہے۔ میں اس لڑکی پر آسمان کی شفاف فضا اور سورج کی روشنی تک حرام کردونگا۔ میں اُسے ایک اندھیری کوٹھری میں قید رکھوں گا اور جب تک میں زندہ ہوں، یہ ایک راہبہ کی زندگی بسر کرے گی۔"

وہ کمرے سے نکلا، جیسے کوئی دیوانہ، اور اپنی لڑکی کو آواز دی۔ لڑکی فوراً ایک فرماں بردار بیٹی کی طرح آئی، محمد بک نے آتے ہی گالیوں کی بوچھار شروع کردی اور برا بھلا کہتے کہتے اتنا طیش میں آیا کہ اگر اس کی بیوی بیچ میں نہ آجاتی تو غالباً جوان لڑکی کو وہ مار بیٹھتا۔ وہ اب گھر سے نکلا، اُس کے چہرے سے غصے کے آثار نمایاں تھے۔

اس واقعے کو دو ماہ گزر گئے، اس اثنا میں کوئی نئی بات پیش نہ آئی۔ اس گھر پر ایک سناٹا چھایا رہا، محمد بک بالکل چپ تھا۔ اس نے آئندہ اس ناخوش گوار موضوع پر ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالا، لیکن غصے کی آگ اس کے دل میں شعلہ زن تھی، اُس کی بیوی بھی خاموش تھی، مگر حقیقت میں وہ اپنی بیٹی کے رنج وغم پر دل ہی دل میں کڑھ رہی تھی، وہ بہت اداس اور غمگین رہتی تھی، ادھر نوجوان لڑکی تمام تمام دن اور ساری ساری رات رو رو کر گزارتی، بغیر اس کے کہ کسی پر بھی اس کا دکھ درد ظاہر ہو وہ اس مصیبت کو استقلال سے برداشت کررہی تھی۔ وہ چپکے چپکے راتوں کو بستر پر رو رو کر اپنی بھڑاس نکالتی تھی، اس کے لئے صرف آرزو کی ایک دھندلی سی روشنی زندگی کا سہارا تھا۔ مگر وہ روشنی بھی جھوٹی ثابت ہوئی، امیدوں اور حسرتوں کا ایک عارضی جلوہ تھا مگر وہ بھی نظروں سے اوجھل ہوچکا تھا! سلام ہو اس کی گزشتہ خوش نصیبی پر اور سلام ہو اس کی ہر مردہ امید و آرزو پر!

ایک روز کا واقعہ ہے کہ محمد بک نے اپنی عادت کے موافق رات کا کھانا کھایا، قہوے کی دو پیالیاں پیں، پھر سگار سلگایا، اور اُسے ختم کرکے نماز عشا پڑھی۔ نماز پڑھکر وہ اپنی جانماز سے دو گھنٹے کے بعد اٹھا، جس میں اس نے چالیس وظائف پڑھ ڈالے، اٹھکر وہ ذرا دیر ٹہلتا رہا۔ پھر اپنے سونے کے کمرے میں داخل ہوا پلنگ پر لیٹ کر دیر تک آنکھیں بند کئے اس کوشش میں رہا کہ نیند آجائے لیکن اس ارادے میں کامیاب نہ ہوا۔ آخر چپکے سے اپنے باغ کیطرف نکل آیا، اس طرح کہ کسی کو اُس کے آنے کی خبر نہ ہو،

محمد بک اپنے شاداب و سرسبز باغ میں ٹہلنے لگا، اس نے اس خاموش رات میں نہایت فروتنی اور عاجزانہ بندگی کے ساتھ ایک نگاہ آسمان پر ڈالی، اُس نے دیکھا کہ معصوم چاندنی پھیلی ہوئی ہے، صاف اور شفاف چاند نکلا ہوا ہے جگمگاتے تارے چھٹکے ہوئے ہیں، اس منظر سے وہ بہت متاثر ہوا اور خدا کو مخاطب کرکے کہنے لگا "یارب! تونے یہ نعمت کس کے لیے پیدا کی ہے؟" - پھر اُس نے درختوں پر ایک نگاہ ڈالی - دیکھا کہ وہ بھی مزے لے لیکر کبھی داہنے کبھی بائیں کو جھوم رہے ہیں، نسیم بہار چل رہی ہے، اور گلاب کے پھولوں کی دو چار پنکھڑیاں، چمبیلی کے پھولوں کی دو چار نرم و نازک پتیاں لا لاکر اس کے سامنے ڈالدیتی ہے، پھر محمد بک نے اپنے معبود کو پکار کر کہا: "خدایا یہ جنت تونے کس کے لئے پیدا کی ہے؟"

پھر اُس نے نہر کو دیکھا چاند کی نقرئی کرنیں نیل کی موجوں کے ساتھ اٹھکھیلیاں کر رہی ہیں، اور دیکھا کہ ایک کشتی چند لوگوں کو اپنی گود میں لئے تیرتی چلی جارہی ہے یہ لوگ گاتے بجاتے، ہنستے ہنساتے، کشتی میں بیٹھے، نیل کی معصوم موجوں کو روندتے اور سطح آب کو پامال کرتے چلے جارہے ہیں۔ اسی دوران میں اُس نے ایک پرندے کی دلکش آواز سنی، جو اس خاموش رات کے سناٹے میں دیوانہ وار چہچہا رہا تھا۔

بک نے پھر اپنے خالق کو پکار کر کہا: الہی! یہ نعمت تو نے کس کے لئے پیدا کی ہے؟"
اب وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور ہر شے کو دیکھنے لگا، فطرت کی ہر اس تصویر کو جو کائنات کے مصور ازل نے اپنے ہاتھ سے صفحۂ ہستی پر بنائی تھی۔ وہ دیکھنے لگا اس جمالِ قدرت کو جو خالقِ برتر کی عظمت و جلال کا پردہ فاش کر رہا تھا، اور اُس کی قوت، اُس کی شفقت کا راز آشکارا کر رہا تھا۔ اس جنت کو جو محبت کا گہوارہ اور جو لذت و نعیم کی ایک جلوت گاہ ہے اس نے پھر اپنے حقیقی آقا کو مخاطب کر کے کہا: میرے معبود! تو نے یہ نعمتیں کس کے لئے پیدا کی ہیں" محمد بک کو اب اپنا وہ زمانہ یاد آگیا جب کہ وہ نوجوان تھا، اس کا دل یہ جمیل مظاہر۔ دیکھ کر ڈھرکنے لگا۔ اس نے اپنی دونوں آنکھیں بند کر لیں، قرآن کریم کی کچھ آیتیں اور رسول اللہ کی کچھ حدیثیں پڑھنے لگا۔ پھر آنکھیں کھول کر بولا: بیشک جنت صرف ...... " اور نہ سمجھ سکا کہ اب کون لفظ ہوگا جس سے جملہ پورا ہو سکتا ہے، وہ حیران تھا، آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں، اتنے میں کیا دیکھتا ہے کہ دو انسانی پیکر اُسی کی طرف بڑھتے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ وہ ایک بڑے درخت کی آڑ میں چھپ گیا کہ دیکھنے والوں کی نظروں سے اپنے آپ کو نہاں رکھ سکے، اس کا دل دھڑکنے لگا، اور وہ اپنے جی میں کہنے لگا: "آخر یہ کون اجنبی ہے جس نے میرے باغ میں یوں پھرنے کی جرأت کی اور وہ بھی آدھی رات کے قریب" دونوں مورتیں اس سے بالکل پاس آگئیں۔ وہ غور سے دونوں کو تاڑنے لگا۔ کیا دیکھتا ہے کہ اُس کی حسین نوجوان بیٹی ایک خوبصورت نوجوان کے پہلو بہ پہلو چلی آرہی ہے اور اس نے اپنا سر اس نوجوان کے کاندھے پر رکھ دیا ہے۔ نوجوان کی صورت خوب غور سے دیکھنے کے بعد محمد بک نے اُسے پہچان لیا، اور اپنے جی میں کہنے لگا "ارے یہ تو وہی مفلس جوان ہے جو ہمارے پڑوس میں رہتا تھا، جب ہم محلہ حمزادی میں مقیم تھے۔ یہ دونوں مورتیں اس درخت کے قریب

ٹھہر کر باتیں کرنے لگیں ایسی جگہ پر کھڑے ہو کر کہ بک ان کی باتیں خوب سن سکتا تھا۔
نوجوان نے کہا: "میری محبوبہ! میں تمہیں ہمیشہ کے لئے چھوڑنے پر آمادہ ہوں اور قسم کھاتا ہوں کہ اپنی پاک اور شریفانہ محبت کے سچے عہد پر قائم رہوں گا، یہاں تک کہ میری ہڈیاں سپرد خاک ہوں"

دوشیزہ نے جواب دیا: "اور میں بھی قسم کھا کر تم سے یہی عہد کرتی ہوں"
نوجوان نے اُس کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ باغ کے دروازے کیطرف چلا تا کہ اپنے گھر کو رخصت ہو۔

اب بک اپنی کمیں گاہ سے نکلا، وہ بالکل خاموش اور سناٹے میں تھا۔ دیر تک چُپ کھڑا کچھ سوچتا رہا۔ اُس نے پھر آسمان، نہر اور باغ کے درختوں کو دیکھا، اُس نے قدرت کے حسن کو، اس انسانی نعیم کو پھر ایک نگاہ دیکھا اور جو کچھ سنا اور دیکھا تھا، تھوڑی دیر اس پر سوچکر بولا: "میرے آقا! بیشک یہ نعمت تو نے اہل محبت ہی کے لئے پیدا کی ہے اور میری جان عزیز کی قسم یہ محبت ہی کی جنت ہے" اب اس نے چند آیتیں تلاوت کیں، پھر اپنے گھر میں داخل ہوا، اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ جو اس کے سکون اور اطمینان، اس کی کامگاری اور رفع پریشانی کی معنی خیز عبارت تھی۔

اس واقعہ کو ایک مہینے کی مدت گزر گئی، اس مہینے کے آخر میں ایک شادی کی شاندار تقریب عمل میں آئی۔ یہ تقریب تھی، ایک امیرزادی کی ایک غریب لڑکے کے ساتھ شادی کی! اور یہ شادی حقیقت میں دنیا کی ہر مشکل اور ہر چیز پر محبت کی جیت تھی!!

خمسہ بر غزل حکیم سنائی

رہی دن رات ظرافت میں بہت ہرزہ سرائی نہ ہوئی ذہن کو جس سے رہ عقبیٰ میں رسائی
مگر اب غیب سے یہ بات مرے جی میں ہے آئی ملکا ذکر تو گویم کہ تو پاکی و خدائی
نروم من بجز آں رہ کہ تو آں راہ نمائی

طلب وصل میں تیری ہیں بنوں عشق مجسم سر شوریدہ سے یارب نہ یہ سودا ہو کبھی کم
یہ تمنا ہے کہ جبتک کہ رہے دم میں مرے دم ہمہ درگاہ تو جویم۔ ہمہ در راہ تو پویم
ہمہ توحید تو گویم کہ بتوحید سزائی

کوئی کعبہ کا ہے ساکن تو گیا کا کوئی باشی کوئی گرجا کا ہے شیدا کوئی دل دادہ کاشی
ہوے متفق اس بات پہ ہر ایک متلاشی نہ بدے خلق تو بودی۔ نہ بود خلق تو باشی
نتو خیزی نہ نشینی۔ نتو کاہی نہ فزائی

تو ہے ادراک سے بالا تو ہے اندیشہ سے فایق نہ کھلے بحث و دلائل سے کبھی تیرے حقایق
وہ تجھے دل ہی میں پالیتے ہیں جو تیرے ہیں شایق نہ سپہری۔ نہ کواکب۔ نہ بروجی۔ نہ دقایق
نہ مقامی۔ نہ منازل۔ نہ نشینی۔ نہ بپائی

کوئی ہندی ہو کہ شامی۔ عجمی ہو کہ حجازی وہ ہو سرمد کہ ہو منصور۔ وہ طوسی ہو کہ رازی
جو ہے اس راز سے واقف وہی لیجائیگا بازی بری از چون و چرائی بری از عجز و نیازی
بری از صورت رنگیں بری از عیب و خطائی

نہ تو ہے جان سے زندہ نہ تو رکھتا ہے کوئی تن نہ تو اعضا نہ جوارح نہ لباس اور نہ دامن
نہ تو فرزند ہے تیرے نہ کفو ہے نہ کوئی زن بری از خفتن و خوردن بری از تہمت مردن

بری از بیم و امیدی۔ بری از رنج و بلائی

کروں ہر لحظہ ثنا تیری یہی چاہتا ہے جی　　مگر عاجز ہوں بیمبر تو بھلا کیا مری ہستی
نہ یہ قدرت ہے قلم کی نہ یہ طاقت ہے زبان کی　　نتواں وصف تو گفتن کہ تو در وصف نہ گنجی

نتواں شرح تو کردن کہ تو در شرح نیائی

نہ چھپی تجھسے تھی کیفیت یوسفؑ باسیری　　جو تھی اوہم کو تری دھن انہیں دوائی فقیری
یہی فاروقؓ سمجھتے تھے بایں شان امیری　　تو علیمی۔ تو حکیمی۔ تو خبیری۔ تو بصیری

تو نمائندہ فضلی تو سزاوار خدائی

وہی ہم تھے نہ سوا تیرے کسی سے بھی مڈلی　　وہی ہم ہیں کہ صفت ایک بھی باقی نہیں اگلی
تری رحمت سے پھر اب عود کرے حالت اصلی　　احدالیس کمثلی۔ صمدالیس کفضلی

لمن الملک تو گوئی کہ سزاوار خدائی

یہی شاپور گنہگار کو مرشد سے ملا پند　　کہ کرے ذکر خدا وند جہاں گر ہے خرد مند
رہے ہر وقت یہی دھن نہو جبتک کہ زباں بند　　لب و دنداں سنائی ہمہ توحید تو گویند

مگر از آتش دوزخ بود ش زود رہائی

شاپور کرمانی وکیل

غزل

ہے مرے واسطے پھر دامن صحرا بیتاب

کب سے ہے دیدۂ مضطر میں تمنا بیتاب
اور ہے تیری تمنا میں کلیجہ بیتاب

جاذبہ موج تنفس کا خبر دیتا ہے
کہ ہے قطرہ کے لئے دامن دریا بیتاب

میں وہ میکش ہوں، ازل ہی سے مرے واسطے تھے
ساقی و جام و صراحی مے و مینا بیتاب

مستیاں کہتی ہیں ساقی تری آنکھوں کی یہی
بہر میکش ہے ہر اک قطرۂ صہبا بیتاب

آج اُسی حسن خود آرا کا ہوں آئینہ میں
تھا مرے واسطے کل جس کا تماشا بیتاب

دیکھئے بحر حقیقت کا ملے کب ساحل
ہے مرے قلب میں پھر موج تمنا بیتاب

در حقیقت میں وہ خاکہ ہوں کہ تھا روز ازل
خود حقیقت کا مرے واسطے نقشا بیتاب

دیکھئے روح تجلی کی وہ کب تک پھونکیں
عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب

اس لئے جی نہیں گلشن میں بہلتا اے دردؔ
ہے مرے واسطے پھر دامن صحرا بیتاب

دردؔ کاکوروی

اقتباسات

اقلیتوں کے مسئلہ کو یورپ نے کیونکر حل کیا؟ لکھنؤ یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر ڈاکٹر رادھا

کمُد مکرجی نے مندرجہ بالا عنوان پر ایک قابلانہ مضمون ۲۶ر فروری ۱۹۲۹ء کو اراکین

کونسل صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ کے سامنے پڑھا تھا، پھر اسی مضمون کو ۲ر اپریل ۱۹۲۹ء

کو اراکین لیجسلیٹو اسمبلی کے سامنے پڑھا۔ اس مضمون میں قابل پروفیسر نے یہ واضح کیا

ہے کہ ہندوستان کے سیاسی مسائل کو حل کرنے میں جو دشواریاں اقلیتوں کے حقوق

طے کرنے میں اس وقت پیش آرہی ہیں یہ کچھ ہندوستان ہی کے لئے مخصوص نہیں

ہیں، بلکہ اقلیتوں کا مسئلہ ایک عالمگیر اور بین الاقوامی مسئلہ ہے۔ جنگ عظیم کے بعد یورپ

میں بہت سی نئی چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستوں کے قیام کی اصل وجہ اگر تلاش

کیجائے تو یہی اقلیتوں کے حقوق کا مسئلہ تھا، اور اگر ان نئی ریاستوں کے دستور

اساسی کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

جنگ عظیم کے بعد جب صلح کانفرنس پیرس میں منعقد ہوئی تو فاتح اقوام کے

نمائندے اس اصول پر متفق تھے کہ مختلف اقوام جن کی زبان ایک ہے اور ایک

نسل سے ہیں لیکن سیاسی حیثیت سے مختلف ریاستوں میں بٹی ہوئی ہیں انکو ایک ریاست

میں متحد کر کے سیاسی حیثیت سے خود مختار تسلیم کر لیا جائے۔ اس لئے کہ یورپ کی

خانہ جنگیوں میں ہمیشہ سے اسی تفریق کی وجہ سے ابتری رہی ہے۔ اس اصول سے

بہر حال کسی کو اختلاف نہ تھا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ اس پر کلیتہً عملدر آمد ممکن العمل

نہ تھا۔ یہ مشکل تھا کہ ہر نسل کی چھوٹی سے چھوٹی آبادی کو ایک علیحدہ خود مختار ریاست

بنا دیا جائے اور یہ بھی دشوار تھا کہ مختلف النسل آبادیوں کو ایک ہی ریاست کے اندر

یکجا ہونے سے قطعًا روک دیا جائے ۔ اس لئے (سیلف ڈٹرمینیشن)
یعنی خودمختاری کے نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے "تحفظ حقوق اقلیت" کے
اصول کو بھی تسلیم کرنا پڑا تاکہ اس کی بنیاد پر مختلف عنصر، مختلف تمدن اور مختلف
جماعتوں کو ایک مشترکہ خود مختار حکومت کے ماتحت یکجا کیا جا سکے ۔

چنانچہ انہیں دو اصولوں یعنی "تحفظ حقوق اقلیت" اور "خودمختاری"
کے ماتحت یورپ کی ازسرنو تعمیر کی گئی اور مختلف ریاستوں کے حدود اربعہ میں وہ اہم
تبدیلیاں واقع ہوئیں جن کی وجہ سے قدیم ریاستوں کا نقشہ بالکل بدل گیا اور بہت سی
جدید چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا قیام عمل میں آیا ۔ وہ قدیم ریاستیں جن میں سے اقلیتوں
کو علیحدہ کرکے کوئی جدید ریاست نہیں قائم کی گئی وہ آسٹریا، ہنگری، بلغاریہ اور
ترکی ہیں ۔ ان حکومتوں سے جو معاہدے اتحادیوں نے بعد از جنگ کئے ہیں ان سب
میں خصوصیت اور اہمیت کے ساتھ ایک دفعہ تحفظ اقلیت کے لئے رکھی گئی ہے چاہے
یہ اقلیت بربنائے مذہب ہو یا بربنائے نسل و زبان ۔ انکے علاوہ جو جدید ریاستیں
قائم کی گئی ہیں مثلاً پولینڈ زیکوسلوویکا، سرب کروٹ سلوین، وغیرہ، ان سے اتحادیوں
نے علیحدہ اور مخصوص طور پر معاہدے لئے ہیں جو "معاہدہ برائے تحفظ حقوق اقلیت"
کے نام سے مشہور ہیں ۔

انجمن بین الاقوامی نے ان معاہدوں کے مطابق اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ
کی نگرانی کے لئے ایک خاص شعبہ قائم کیا ہے اور انجمن میں داخلہ کی یہ ایک شرط قرار
دیگئی ہے کہ داخلہ سے قبل ہر ریاست کو اپنی اقلیتوں کے تحفظ حقوق کے مسئلہ پر
انجمن کو ہر طرح کا اطمینان دلانا ہوگا ۔ انجمن نے یہ بھی صاف صاف ظاہر کر دیا ہے کہ
یہ تحفظ صرف مذہبی اور لسانی اقلیتوں تک محدود ہوگا ۔ سیاسی اور دیگر سماجی
اقلیتوں کو اس سے کوئی سروکار نہ ہوگا ۔

مختلف جدید ریاستوں نے اپنی اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ جس طریقہ پر کیا ہے اس کا اندازہ انکے دستور اساسی کے مختلف دفعات سے ہوتا ہے۔ اور پروفسر ممدوح نے ان دفعات کا حوالہ دیا ہے۔ مثلاً "حکومت سرب کروٹ سلوین" کے دستور اساسی کی دفعہ ۱۲ قابل ذکر ہے جس میں مذہب اور ضمیر کی آزادی ہر شخص کو دی گئی ہے۔ یا ایک دوسری دفعہ میں نسلی اور لسانی اقلیتوں کے ابتدائی تعلیم انہیں کی مادری زبان میں دیئے جانیکا قاعدہ رکھا گیا۔ ریاست پولینڈ کے دستور اساسی کی دفعہ ۱۱۰ میں تمام مذہبی اور لسانی اقلیتوں کو حق دیا گیا ہے کہ اگر چاہیں تو اپنے مصارف سے خیراتی اور مذہبی تعلیم گاہیں اور دیگر سماجی ادارے قائم کریں - ان میں اپنی مذہبی تعلیم کا انتظام کریں اور مادری زبان کو ترقی دیں - ان اداروں اور تعلیم گاہوں کے انتظام اور انصرام میں حکومت کوئی مداخلت نہ کرے گی - کچھ عرصہ ہوا جب جرمنی اور روسی حکومت نے اس امر کی شکایت کی تھی کہ پولش حکومت غیر پولش اقوام کے ساتھ جو قلیت میں ہیں - "معاہدہ تحفظ اقلیت" کے مطابق برتاؤ نہیں کرتی ہے چنانچہ ۱۹۲۴ء میں گرابسکی کی وزارت نے چند نئے قوانین اقلیتوں کے اطمینان کے لئے بنائے تھے ان میں سے ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ جن علاقوں میں غیر پولش اقلیتیں آبادی کی ۲۵ فیصدی ہوں وہاں کے مدارس میں ۴۰ بچوں کے والدین کی درخواست پر اس اقلیت کی مادری زبان میں تعلیم ہوسکتی ہے - زیکوسلووک جمہوریت کے دستور اساسی کی دفعہ ۱۳۲ میں یہ قاعدہ رکھا گیا ہے کہ سرکاری خزانہ کی منظور شدہ رقوم میں سے ایک معقول اور معتد بہ رقم اقلیتوں کی تعلیم کے لئے علیحدہ اور مخصوص کر دیجائے گی - اسی طرح اسٹریا اور ہنگری کے دستور اساسی اور معاہدوں میں یا ترکی کے ساتھ جو معاہدہ لوزان میں کیا گیا تھا اُسمیں اقلیتوں کی تعلیم کے لئے مخصوص انتظام اور دیگر امور کے متعلق صاف اور صریح دفعات موجود ہیں۔

مندرجہ بالا سطور میں جن دفعات اور معاہدوں کا ذکر کیا گیا انہیں طریقوں پر ہندوستان میں اقلیتوں کے مسئلہ کو حل کرنیکی کوشش کرنی چاہئے۔ یورپ میں جن ممالک کو اقلیتوں کے معاملہ میں بین الاقوامی تصفیہ کا پابند بنایا گیا ہے انکا اگر ہندوستان کے ساتھ مقابلہ کیا جائے تو حسب ذیل امور قابل لحاظ ہونگے۔

(۱) - جو نئی ریاستیں صلح کانفرنس کے معاہدہ کے بعد اتحادیوں نے قائم کی ہیں ان میں کہیں کسی ایک قوم کی اکثریت اتنی زیادہ نہیں ہے جتنی کہ ہندو اکثریت ہندوستان میں ہے۔ مثلاً پولش اکثریت کا تناسب ۶۹ فیصدی ہے۔ زیکو سلووک کا ۶۴ فیصدی، سرب کروٹ کا ۷۳ فیصدی اور ہندو اکثریت کا ۷۵ فیصدی۔

(۲) اقلیتوں کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم اور دشوار زیکوسلووک کا ہے جہاں جرمن متمدن تعلیمیافتہ اور طاقتور اقلیت سے سابقہ ہے۔ جرمن اقلیت کا تناسب ۲۳ فیصدی ہے۔ ہندوستان میں اسی طرح مسلمان اقلیتوں کا معاملہ ہے جن کی آبادی کا تناسب ۲۴ فیصدی ہے لیکن حیرت اور تعجب کی بات ہے کہ سب سے زیادہ کامیابی کے ساتھ ریاست زیکوسلووکا نے اپنے ملک کی اقلیتوں کے مسئلہ کو حل کیا ہے۔

(۳) کوئی اقلیت اس وقت تک سیاسی حیثیت سے نہیں تسلیم کیجاتی ہے جب تک کہ وہ ایک خاص تناسب میں نہو۔ بعض دستور اساسی میں یہ تناسب مقرر کر دیا گیا ہے اور جہاں نہیں مقرر کیا گیا ہے وہاں پڑوس کی ریاستوں کے مسلمہ معیار کو تسلیم کر لیا جاتا ہے پولینڈ میں کسی اقلیت کو سیاسی حیثیت سے تسلیم کرنے کے لئے اسکا تناسب کم از کم ۲۵ فیصدی ہونا چاہئے۔ زیکوسلووکا میں ۲۳ فیصدی اور ہنگری میں ۲۰ فیصدی۔

اب اگر اس بین الاقوامی معیار تناسب کا اطلاق ہندوستان پر کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کا تناسب ۲۵ فیصدی ہے اس لئے بین الاقوامی معیار کے مطابق جہانتک ہندوستان کا کلی حیثیت سے تعلق ہے مسلمانوں کے مخصوص حقوق کا تسلیم کرنا ضروری ہے۔ لیکن اگر علیحدہ علیحدہ صوبوں کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ بعض صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہےا ور دیگر صوبجات میں انکی اقلیت ہے وہاں وہ اتنی قلت میں ہیں کہ بین الاقوامی تناسب سے گر گئے ہیں۔ آخرالذکر صوبجات میں جہاں انکی اقلیت سب سے زیادہ طاقتور ہے وہ صوبہ متحدہ آگرہ اور اودھ ہے۔ اور یہاں بھی انکی اقلیت کا تناسب ۱۵ فیصدی ہے۔ اس لئے بین الاقوامی تصفیہ کی روشنی میں جہانتک صوبجات کا تعلق ہو اقلیت کا مسئلہ حقیقۃً ایک ہندو اقلیت کا مسئلہ ہے۔ اس لئے کہ پنجاب اور بنگال دونوں صوبوں میں ہندوؤں کی اقلیت کا تناسب ۴۴ اور ۴۶ فیصدی ہے جو بین الاقوامی تناسب کے مقررہ معیار سے کہیں زیادہ ہے البتہ مرکزی حکومت کا جہانتک تعلق ہے مسلمانوں کی اقلیت کا مسئلہ البتہ قابل غور ہے۔

(۴) کسی ریاست میں مقامی طور پر بھی اقلیتوں کی آبادی کی تقسیم اس طرح ہونی چاہئے کہ ان کی تعداد اکثریت کے مقابلہ میں بہت زیادہ نہ گھٹ جائے ورنہ اقلیت کے ساتھ وہ خاص مراعات نہیں کئے جا سکتے۔ جن کی پابندی ازروے معاہدہ یا دستور اساسی کی دفعات کے مطابق عائد ہوتی ہو۔

(۵) اقلیتوں کے مذہبی اور لسانی مفاد کے تحفظ کے لئے اکثر ریاستوں کے دستور اساسی میں اقلیتوں کی تعلیم وغیرہ کے متعلق آسانیاں فراہم کرنے کے لئے صاف اور صریح طور پر ذکر ہے نیز آبادی کے تناسب اور اسی لحاظ سے سرکاری مدارس میں طلبہ کی تعداد یا کسی اقلیت کے لئے علیحدہ مخصوص

سرکاری مدارس قائم کرنیکے لئے قاعدے مقرر کردئے گئے ہیں۔

(۶) کسی دستور اساسی یا کسی معاہدے میں جو مراعات کسی اقلیت کے ساتھ کی گئی ہے وہ صرف انکی مذہبی، لسانی اور نسلی خصوصیات یا مخصوص رسم ورواج کے لحاظ سے کی گئی ہے۔

(۷) سیاسی اقلیت (مثلاً لبرل یا اشتراکی جماعت) یا سماجی اقلیت (برہمن اور غیر برہمن یا اچھوت کے) حقوق کے تحفظ کا اصول کسی دستور اساسی میں تسلیم نہیں کیا گیا ہے

(۸) کسی دستور اساسی میں تحفظ حقوق اقلیت کے لئے فرقہ وارانہ حلقہاے انتخاب کا اصول نہیں تسلیم کیا گیا ہے۔ بلکہ بنیادی اصول یہ قرار پایا ہے کہ ریاست کے اندر صرف ایک ہی قومیت ہوگی نیز یہ کہ مذہب، نسل اور زبان سے قطع نظر ہر شخص کو کامل مساوی سیاسی اور شہری حقوق حاصل ہونگے

(۹) تحفظ حقوق اقلیت دستور اساسی کی صاف اور صریح دفعات کے ذریعہ کیا گیا ہے اور جمہوری نظام حکومت کے انتخابات اور دیگر سیاسی تغیرات سے ان کا کوئی تعلق نہیں رکھا گیا ہے۔

(۱۰) نمائندگی، سرکاری ملازمت، اور انتظام حکومت کے معاملہ میں اقلیتوں کے مخصوص مفاد کو تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔

غرض اقلیتوں کے اہم مسئلہ کو انجمن بین الاقوامی نے حل کرنیکی کوشش کی ہے اور اس میں کامیابی حاصل کی ہے۔ پھر ہندوستان جو اس انجمن کا ایک رکن ہے کیوں نہ بین الاقوامی اصول اور معیار کے مطابق اور ان تجربات کی روشنی میں جو یورپ کی مختلف ریاستوں کو گذشتہ ۱۰ سال کے اندر ہوئے ہیں۔ اپنے اقلیتوں کے تحفظ حقوق کے مسئلے کو طے کرے۔

شذرات

امریکہ کے مشہور مخیر اینڈریو کارنیگی نے جہاں بنی نوع کی فلاح وبہبود کے لئے اور بہت سے ادارے قائم کئے وہاں کلیسا کی انجمن عامی امن کی بھی بنا ڈالی۔ اس انجمن نے ۱۹۲۵ء میں اعلان کیا کہ وہ دنیا کے مذاہب کی ایک کانفرنس منعقد کرنا چاہتی ہے جس میں اس پر غور کیا جائے کہ مذہبی قوت سے کس حد تک جنگ کے انسداد اور امن کے قیام میں کام لیا جاسکتا ہے۔ ستمبر ۱۹۲۸ء میں سوئٹزر لینڈ کے شہر جنیوا میں ایک ابتدائی کانفرنس کا اجلاس ہوا جس کی کارروائی ایک رسالے کی شکل میں شائع ہوئی ہے۔

... ...

اس رسالے کا نام ہے "مذاہب عالم جنگ کے خلاف" اور یہ کانفرنس کی شاخ بمبئی کی طرف سے ہمارے پاس بھیجا گیا ہے۔ اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جنیوا کی ابتدائی کانفرنس میں مختلف ممالک کے ایک سو نواسی ۱۸۹ نمائندے جمع ہوئے تھے جنہوں نے یہ طے کیا کہ سترہ آدمیوں کی ایک مجلس منتظمہ منتخب کی جائے جس کے صدر ڈاکٹر شیلر میتھوز اور سکریٹری ڈاکٹر اٹکنسن ہوں اور یہ مجلس ۱۹۳۰ء میں کسی مناسب مقام پر ایک بہت بڑی کانفرنس منعقد کرے اور اس میں اپنی تجویز سے تمام اکناف عالم سے مختلف مذاہب کے نمائندوں کو بلائے۔ یہ سب کے سب جمع ہوکر اس بات کا فیصلہ کریں کہ مختلف مذاہب میں کہاں تک جنگ کو روکنے اور امن قائم کرنے کی صلاحیت ہے۔

... ...

ابتدائی کانفرنس میں تقریباً تمام مذاہب کے نمائندے موجود تھے اور ان کے خطبوں کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کم سے کم دنیا کے مذہبی لوگ دل سے کشت وخون کے مخالف ہیں

اور مشرق سے مغرب تک امن و امان کا دور دورہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن یورپ اور امریکہ کے اکثر ممبروں کا رویہ دیکھتے ہوئے یہ اُمید نہیں ہوتی کہ یہ کانفرنس اپنے مقاصد میں کامیاب ہوگی۔ جرمنی کے ڈاکٹر ہاؤ ایر، پادری سی۔ ایف اینڈریوز اور متعدد ایشیائی نمائندوں کی یہ رائے تھی کہ دنیا میں امن کا قیام اس وقت تک ناممکن ہے جب تک نسلی مساوات، بین الاقوامی انصاف اور عالمگیر برادری کو قوموں کے عقیدے اور عمل میں مناسب جگہ نہ مل جائے۔ چنانچہ اینڈریوز صاحب نے اس مضمون کی ایک تحریک پیش کی کہ کانفرنس کی مجلس منتظمہ کو سچا اور پائدار امن قائم کرنے کے لئے ایسی تدابیر اختیار کرنا چاہئے جن سے قوموں میں بھائی چارہ پیدا ہو اور وہ ایک دوسرے سے مساوات اور انصاف کا برتاؤ کریں۔ اس تحریک کی تائید ڈاکٹر ہاؤ ایر (جرمنی) چٹرجی صاحب اور ایس۔ کے۔ دت صاحب نے کی۔ ان حضرات نے اپنی تقریروں میں اس پر زور دیا کہ ہندوستان والے اور دوسرے ایشیائی قدرتی طور پر ان سب انجمنوں اور کانفرنسوں سے بدظن ہیں جنھیں یورپ والے قائم کرتے ہیں۔ انھیں یہ خوف ہے کہ یورپ کے ارباب سیاست جہاں ایشیا کی قومیت کے اُٹھتے ہوئے جوش کو اور طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے دبانا چاہتے ہیں وہاں انھوں نے یہ حامی امن کانفرنس بھی قائم کردی ہے کہ مذہب کی آڑ لے کر مغلوب قوموں کو جنگ سے روکے اور غالب قوموں کی حکومت کی بنیاد مضبوط کردے۔ ان لوگوں کو مطمئن کرنے کے لئے مناسب ہے کہ کانفرنس اینڈریوز صاحب کی تحریک کو منظور کرلے۔ مگر یورپ اور امریکہ کے کئی ممبروں نے نہایت زور و شور سے اس تحریک کی مخالفت کی۔ انھوں نے کہا کہ اس کانفرنس کا کام تو محض یہ ہے کہ مذہب کی مدد سے جنگ کا سد باب کرے اور امن کے قیام کی کوشش کرے۔ اگر وہ بین الاقوامی مساوات اور برادری اور انصاف کے انتظار میں رہے گی تو خدا جانے کب تک اصل مقصد کو ملتوی کرنا پڑیگا۔ غرض نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تحریک مسترد کردی گئی۔

... ...

ہمیں اس کا کوئی حق نہیں کہ بغیر کسی ثبوت کے کانفرنس کے بانیوں اور حامیوں کی نیت پر شبہ کریں اور یہ سمجھیں کہ یہ لوگ بھی انجمن اقوام والوں کی طرح یورپ کی بڑی طاقتوں کے آلۂ کار ہیں اور اُن کے سیاسی مقاصد میں جان بوجھ کر یا لاعلمی کی حالت میں مدد دے رہے ہیں۔ لیکن ہم اتنا ضرور کہیں گے کہ ان حضرات نے مغرب والوں کے عمل تجزیہ کو انتہا تک پہنچا دیا ہے۔ مغرب کے لوگوں میں یہ عام رجحان ہے کہ وہ زندگی کے ہر شعبے کو بالکل جداگانہ چیز سمجھتے ہیں اور اس پر اس حیثیت سے غور کرتے ہیں جیسے اِسے بقیہ زندگی سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ اسی اصول پر وہ سمجھتے ہیں کہ امن اور چیز ہے اور مساوات، برادری، اور انصاف کچھ اور۔ پہلے امن قائم کرلیا جائے پھر یہ چیزیں خود بخود حاصل ہو جائیں گی یا کم سے کم ان کے حاصل کرنے میں بڑی آسانی ہو جائے گی۔

... ...

ہمیں ان حضرات سے یہ عرض کرنا ہے کہ انسان کا نفس ایک واحد مرکز ہے جس میں انسان کی تمام ذہنی قوتیں، اُس کے تمام جذبات اور خیالات جمع ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے متاثر ہوتے ہیں۔ حقیقت میں علمائے اخلاق نے ہمیشہ اس نکتے کو سمجھا ہے کہ انسان کی زندگی کے کسی ایک پہلو کی اصلاح بجائے خود نہیں ہو سکتی جبتک اس کے نفس کی بہ ہیئت مجموعی اصلاح نہ ہو۔ پیمبروں اور ولیوں کی قوت اور کامیابی کا راز یہی ہے کہ وہ انسان کے منفرد خیالات، جذبات یا اعمال کو متاثر کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ اس کی پوری شخصیت پر اثر ڈالتے ہیں۔ ہمیں اس سے بالکل اتفاق ہے کہ دنیا میں اگر امن قائم ہو سکتا ہے تو محض مذہب کے ذریعے سے۔ لیکن مذہب انسان کے دل سے جنگ و جدل کے شوق کو اسی طرح دور کر سکتا ہے کہ پہلے اسے نفرت، تکبر، طمع اور ظلم سے پاک کردے۔ اگر یہ جذبات باقی رہیں گے تو کانفرنسوں کمیٹیوں، تقریروں اور پمفلٹوں کے باوجود لوگ ہمیشہ اپنے ناجائز مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے یا دوسروں کے ناجائز مقاصد کی مخالفت کے لئے جنگ و جدل سے کام لیں گے۔

... ...

اس لئے ہماری رائے میں کانفرنس کو چاہئے کہ اینڈریوز صاحب کے مشورے کے مطابق بین الاقوامی مساوات، برادری اور انصاف کو بھی اپنے مقاصد میں شامل کرلے۔ ہمارا یہ مطلب نہیں کہ وہ کسی خاص قوم یا چند خاص اقوام کی حمایت کرنے لگے کیونکہ یہ ایک سیاسی کام ہے جو اسے اپنے راستے سے دور ہٹالے جائیگا بلکہ برابری، آزادی، اخوت اور عدالت کے عام اصولوں کو لوگوں میں ہر دلعزیز بنانے کے لیئے انہیں تمام تدابیر سے کام لے جن سے وہ امن کا ڈھنڈورا پیٹنے کی بے نتیجہ کوشش کرنا چاہتی ہے۔

مسلم یونیورسٹی کے کورٹ نے اپنے ۷ جولائی کے جلسے میں پٹنہ کالج کے پرنسپل مسٹر ہارن کو پرو وائس چانسلر مقرر کردیا۔ جتنے مسلمانوں میں قومی غیرت اور قومی مصلحتوں کا احساس موجود ہے وہ سب ابتدا سے اس کے مخالف تھے کہ کسی انگریز کو مسلمانوں کی سب سے بڑی قومی درسگاہ کا تعلیمی نگراں بنایا جائے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شامتِ اعمال سے علیگڈھ والوں میں ذاتی مناقشات اور پارٹی بندیاں اس حد تک پہنچ چکی تھیں کہ بغیر سیاست فرنگ کے انکی اصلاح ناممکن تھی۔ بہرحال کورٹ کو اور نئے پرو وائس چانسلر کو یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ عام مسلمان اگر اس انتخاب کو قبول بھی کرتے ہیں تو محض مجبوری سے اور محض عارضی حیثیت سے۔ اور اس عرصے میں بھی اگر مسٹر ہارن یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے ذمہ دار افراد انکی مخالفت نہ کریں تو انہیں چند باتوں کا خیال رکھنا چاہئے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جس خاص مقصد سے ان کا انتخاب ہوا ہے یعنی سیاستِ فرنگ کو کام میں لانا۔ اس پر وہ پورا زور دیں مگر نہایت ایمانداری اور احتیاط کے ساتھ۔ دوسرے یہ کہ اپنے یا اپنے مربیوں کے سیاسی خیالات کو یونیورسٹی میں پھیلانے سے پرہیز کریں۔ تیسرے یہ کہ وائس چانسلر اور مجلس منتظمہ کے ساتھ پورے اتحادِ عمل کا ثبوت دیں۔ اُن کی خوش قسمتی سے وائس چانسلر ایسا شخص مقرر ہوا ہے جس پر مسلمانوں کے ہر طبقے کو اعتماد ہے اور اگر وہ اس کا مستحق ثابت ہوا تو ہمیشہ

رہے گا۔ مسٹر ہارن کو وائس چانسلر کی مدد اور مشورے سے پورا فائدہ اُٹھانا چاہیئے تاکہ وہ اپنے نازک فرائض کو مقررہ میعاد تک کامیابی سے ادا کرتے رہیں اور جاتے وقت نیک نامی کے ساتھ رخصت ہوں۔

... ...

اس سلسلے میں یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے کہ ڈاکٹر شاہ محمد سلیمان صاحب قائم مقام وائس چانسلر کے فرائض نہایت خوبی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ اس وقت مسلم یونیورسٹی کے کام کا بوجھ اُٹھانا بڑی ہمت اور حوصلے کا کام تھا۔ ایک تو سابق وائس چانسلر کے زمانہ سے بیشمار معاملات ایسے چلے آتے تھے جنہیں طے کرنے کے لیئے بڑی محنت اور عرق ریزی کی ضرورت تھی۔ دوسرے پارٹی بندی کی گرم بازاری میں اپنے دامن کو بے لوث رکھنا دشوار تھا اور بدنامی سے بچنا دشوار تر۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ ڈاکٹر صاحب ان مراحل سے بہت آسانی سے گزر گئے اور اب انہوں نے دفتری کام کو اتنا صاف کر دیا ہے کہ آنے والے وائس چانسلر کو دوسری ضروری اصلاحات کا پورا موقع ملے گا۔ حکومت نے ڈاکٹر صاحب کو سرکاری خدمات کے بدلے نائٹ کا خطاب ادا کیا ہے۔ اب قوم کو چاہیئے کہ انہیں قومی خدمات کے صلے میں مناسب معاوضہ دے۔ مگر قومی معاوضہ خطاب یا دولت یا جاہ و منصب کی شکل میں نہیں ملا کرتا بلکہ اس طرح کہ جو ایک کام اچھی طرح کرے اُسے دوسرا کام دیا جاتا ہے جو ایک خدمت عمدگی سے انجام دے اُس سے دوسری خدمت لی جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کسی ایسے ہی معاوضے کے مستحق ہیں۔

جامعہ ملیہ یکم اگست کو کھل جائیگی۔ طلبہ کی درخواستیں داخلہ کے لیئے آرہی ہیں۔ اِن کی اقامت کا مناسب انتظام کرنے کی پوری کوشش کیجارہی ہے۔ ایک بہت بڑی دو منزلہ کوٹھی جو نئی سڑک پر واقع ہے اور ابھی بن کر تیار ہوئی ہے کرائے پر لے لی گئی ہے۔ اور جو

حضرات اپنے بچوں کو جامعہ میں داخل کرانا چاہتے ہوں وہ اس مہینہ کے آخر تک اطلاع دیدیں تاکہ اور عمارتیں کرائے پر لیلی جائیں ورنہ یکم اگست کے بعد اچھے مکانوں کا ملنا مشکل ہو جائیگا۔ بچوں کے سرپرستوں کو ہم مشورہ دیتے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو بچوں کو اپنے ساتھ لاکر داخل کر دیا کریں تاکہ دارالاقامہ کے منتظم تعلیم اور تربیت کے معاملہ میں ان سے تبادلۂ خیالات کر سکیں اگر کسی وجہ سے خود نہ آسکتے ہوں تو ایک مفصل تحریر شیخ الجامعہ کے نام بھیجدیا کریں جس میں بچے کے عادات وخصائل، اُس کی صحت، اُس کی کمزوریوں اور اُس کے عام رجحانات کی تفصیل ہو۔

... ...

اس سال جامعہ کے لڑکوں کے لئے حفظانِ صحت کا خاص انتظام کیا جا رہا ہے۔ طبیہ کالج کے لائق اور ہمدرد ہاؤس سرجن ڈاکٹر ظفریاب حسین صاحب نے جو دو سال سے ڈاکٹر شرما صاحب کے ساتھ جامعہ کے بچوں کا علاج بلا معاوضہ کرتے ہیں وعدہ فرمایا ہے کہ اس سال داخلے کے وقت تمام طلبہ کا طبی معائنہ کریں گے، دارالاقامہ کے نگرانوں کو حفظانِ صحت، غذا، دوا وغیرہ کے متعلق مفصل ہدایات دیدینگے اور وقتاً فوقتاً جانچ کرتے رہیں گے کہ ان ہدایات پر کہاں تک عمل ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ ایثار ہمارے دلی شکریہ کا مستحق ہے۔

The Cultural Side of Islam

Madras Lectures on Islam

(NO. 2)

BY

Muhammad Marmaduke Pickthall

Delivered at Madras in January 1927.

CONTENTS :

Price 1/8/-

Bound 2/-

To be had of :—

National Muslim University Book Depot,

KAROL BAGH,

DELHI.

رجسٹرڈ
نمبر ۱۰۵۲
جامعہ
جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ
نمبر ۶
بابت ماہ جون سنہ ۱۹۲۹ ع
جلد ۱۲
مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
1927

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری   ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ۔ڈی

جلد ۱۲	بابتہ ماہ جون سنہ ۱۹۲۹ء	نمبر ۶

فہرست مضامین

آزادی کی راہیں

باب اول

مارکس اور مذہب اشتراک

ہراس چیز کی طرح جو زندگی رکھتی ہو اشتراک بھی ایک رجحان ہے نہ کہ بندھے اصولونکا
ایک معین اور تعریف پذیر مجموعہ ۔ اگر اشتراک کی تعریف کیجائے تو یقینی ہے کہ
اس میں بعض خیالات شامل ہو جائیں گے جو اکثر لوگوں کے نزدیک غیر اشتراکی ہیں اور
دوسرے ایسے خیالات خارج ہو جائیں گے جو شامل ہونے کا حق رکھتے ہیں ۔ لیکن
میں سمجھتا ہوں کہ ہم اشتراک کی اصلیت سے سب سے زیادہ قریب تر ہونگے، اگر ہم
اس کی تعریف یہ کریں کہ یہ زمین اور سرمایہ کے اجتماعی ملک ہونیکی حمایت کا نام ہے۔
اجتماعی ملک کے معنی ہو سکتے ہیں ۔ایک جمہوری ریاست کی مِلک ، لیکن اس میں کسی
ایسی ریاست کی ملک شامل نہیں سمجھی جاسکتی جو جمہوری نہ ہو ۔ اجتماعی ملک کے معنی
جیساکہ نراجی اشتراکی سمجھتے ہیں یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ایک گروہ کے مرد اور عورتوں
کی آزاد جماعت مالک ہو بلا ان جبری قوتوں کے جو ریاست بنانے کے لئے ضروری
ہیں ۔ بعض اشتراکی توقع کرتے ہیں کہ یہ اجتماعی ملک یک بیک اور اپنی کامل صورت
میں ایک تباہ کن انقلاب کے ساتھ ساتھ آجائے گی ، دوسرے امید کرتے ہیں کہ یہ
رفتہ رفتہ آئے گی ، پہلے ایک صنعت میں بعد کو دوسری میں ۔ بعض اصرار کرتے
ہیں کہ زمین اور سرمایہ کا تمام وکمال جمہور کے ہاتھ میں آنا لازمی ہے ، دوسرے

اس پر قانع ہیں کہ کہیں کہیں ملکیت شخصی کے جزیرہ سے باقی رہجائیں بشرطیکہ یہ بہت وسیع اور طاقتور نہ ہوں۔ ان سب شکلوں میں جو چیز مشترک ہی وہ جمہوریت اور موجودہ نظام سرمایہ داری کا کامل یا تقریبا کامل انہدام اشتراکیوں، نراجیوں اور سنڈکلیوں کا باہمی فرق زیادہ تر اس امر پر منحصر ہے کہ یہ جمہوریت ہو کس قسم کی۔ اصلی اشتراکی حکومت کے میدان میں جمہوریت مشورسی کو کافی سمجھتے ہیں اور اُن کا خیال ہی کہ دستور ریاست کی اس شکل میں جو خرابیاں آجکل معلوم ہوتی ہیں وہ سرمایہ داری کے مٹ جانے سے خود مٹ جائیں گی۔ برخلاف اس کے نراجی اور سنڈکلی سارے کے سارے مشوری نظام کے خلاف ہیں اور جماعت کے سیاسی معاملات کے انضباط کے لئے یہ ایک دوسرا طریقہ چاہتے ہیں۔ لیکن یہ سب کے سب جمہوری اس معنی میں ہیں کہ سب ہر قسم کی مراعات اور ہر نوع کی مصنوعی عدم مساوات کو مٹانا چاہتے ہیں۔ سب کے سب موجودہ جماعت میں مزدور کے حامی ہیں۔ تینوں کے معاشی مذہب میں بھی بہت کچھ مشترک ہی۔ تینوں سرمایہ داری اور نظام مزدوری کے متعلق خیال کرتے ہیں کہ یہ مالک طبقوں کے اغراض کے لئے مزدور سے بیجا فائدہ اٹھانے کے ذرایع ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ (دولت) پیدا کرنے والوں کو آزادی دلانے کا بس ایک ہی ذریعہ ہے یعنی کسی نہ کسی شکل میں ملکیت اجتماعی کا قیام۔ لیکن اس مشترک مذہب کے ڈھانچے کے اندر بہت سے تفرقے ہیں اور خود ان میں جنہیں تنگ معنوں میں اشتراکی کہنا چاہئے نہایت قابل لحاظ اختلافات موجود ہیں بحیثیت ایک طاقت کے یورپ میں اشتراکیت کی ابتدا ہم کہہ سکتے ہیں کہ مارکس سے ہوئی۔ یہ سچ ہے کہ اس سے پہلے بھی انگلستان اور فرانس دونوں ملکوں میں اشتراکی نظریے موجود تھے۔ یہ بھی سچ ہی کہ ۱۸۴۸ء کے انقلاب میں فرانس میں اشتراک نے تھوڑے عرصہ کے لئے ریاست میں خاصہ

اثر حاصل کرلیا تھا۔ لیکن مارکس سے پہلے جو اشتراکی ہوئے انکا رجحان عموماً خیالی خواب دیکھنے کیطرف تھا، چنانچہ یہ کوئی طاقتور یا پائدار سیاسی جماعت (پارٹی) نہ قایم کرسکے۔ یہ مارکس کا حصہ تھا کہ اُس نے اینگلس کی مدد سے اشتراکی مسائل کا ایک مربوط مجموعہ تیار کیا جس میں اتنی سچائی تھی یا جو بظاہر اتنا معقول معلوم ہوتا تھا کہ انسانوں کی کثیر تعداد کے دماغوں پر حاوی ہوسکے اور نیز بین الملل اشتراکی تحریک کی بنیاد ڈالی جو پچھلے پچاس سال میں یورپ کے تمام ممالک میں برابر بڑھتی رہی ہے۔

مارکس کا مذہب سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ان اثرات کے متعلق ہم کچھ واقفیت حاصل کریں جنھوں نے مارکس کے خیالات بننے میں مدد دی۔ یہ ۱۸۱۸ء میں جرمنی کے صوبہ رہائن کے ایک مقام تریوس میں پیدا ہوا۔ اسکا باپ ایک قانونی عہدیدار تھا اور نسلاً یہودی جس نے برائے نام عیسائیت قبول کرلی تھی۔ مارکس نے قانون، فلسفہ، معاشیات اور تاریخ کی تعلیم مختلف جرمن یونیورسٹیوں میں حاصل کی۔ فلسفہ میں اس نے ہیگل کے مذہب کا اثر لیا جو اس زمانہ میں معراج شہرت پر تھا اور ان مسائل کا کچھ نہ کچھ اثر تمام عمر اس کے خیال پر باقی رہا۔ ہیگل کی طرح اس نے بھی تاریخ میں ایک خیال کی نشو و نما دیکھی۔ اس نے تغیرات عالم کا تصور یوں قایم کیا کہ یہ گویا منطقی منازل کی ایک کڑی ہے جس میں ایک حالت انقلاب کے ذریعے ایسی دوسری حالت میں بدل جاتی ہے۔ جو اس کی ضد ہو۔ یہ ایک تخیل ہے جس نے اس کے خیالات کو ایک سخت تجرید کا رنگ دیدیا تھا اور بجائے ارتقار کے انقلاب پر اعتماد۔ لیکن ہیگل کے زیادہ قطعی مسائل میں سے مارکس میں جوانی کے بعد کوئی بھی باقی نہ تھا۔ اسے لوگ نہایت ذہین طالب علم تسلیم کرتے تھے اور یہ بہ حیثیت پروفیسر یا سرکاری عہدیدار کے نہایت خوشحال زندگی بسر کرسکتا تھا، لیکن اس کی سیاسی دلچسپی اور اس کے

انتہا پسند خیالات نے اسے زیادہ دشوار گذار راستوں پر لا ڈالا۔ ۱۸۴۲ء ہی میں
یہ ایک اخبار کا مدیر ہوگیا جسے اس کے انتہا پسند خیالات کی وجہ سے اگلے سال کے
شروع ہی میں پروشیا کی حکومت نے بند کر دیا۔ چنانچہ مارکس نے پیرس کی راہ
لی۔ یہاں یہ اشتراکی کی حیثیت سے مصروف کار ہوگیا اور اپنے فرانسیسی پیشرؤوں[۱] کے
متعلق علم حاصل کرتا رہا۔ یہیں ۱۸۴۴ء میں انگلس سے اس کی وہ دوستی شروع
ہوئی جو ساری عمر قائم رہی۔ انگلس اس زمانہ تک بسلسلہ کاروبار مینچسٹر میں تھا،
اس نے یہاں انگریزی اشتراکیت سے واقفیت حاصل کی تھی اور بڑی حد تک اس
کے مسائل کو قبول کیا[۲]۔ ۱۸۴۵ء میں مارکس پیرس سے نکالا گیا اور انگلس کے
ساتھ بروسیلز میں رہنے کے لئے گیا۔ یہاں اس نے "جرمن مزدوروں کی جمعیت"
قایم کی اور ایک اخبار شائع کرنا شروع کیا جو اس جماعت کا آرگن تھا۔ بروسیلز
کی کارگذاریوں کے سلسلہ میں پیرس کی جرمن اشتراکی لیگ کو اس سے واقفیت
پیدا ہوئی اور اس لیگ نے ۱۸۴۷ء کے ختم پر اسے اور انگلس کو دعوت دی کہ
انکے لئے ایک لائحہ عمل ترتیب دیں، جو جنوری ۱۸۴۸ء میں شائع ہوا۔ یہ ہے
وہ مشہور "اشتراکی اعلان" جس میں پہلی مرتبہ مارکس کا نظام پیش کیا گیا۔ یہ بڑے

---

(۱) ان میں سے خاص فورئیے اور ساں سیماں تھے جنھوں نے اشتراکی ریاستوں کے کچھ خیالی
نقشے تعمیر کئے تھے۔ پرودھاں کو جس سے مارکس کے کچھ بہت دوستانہ تعلقات نہ تھے بجائے
ارتودکس اشتراک کے نراجیوں کا پیشرو سمجھنا چاہئے۔

(۲) مارکس اپنی کتاب "فلسفہ کا افلاس" (۱۸۴۷ء) میں انگریزی اشتراکیوں کا ذکر تعریف کے
ساتھ کرتا ہے۔ خود اسکی طرح یہ بھی اپنے دلائل کو ریکارڈو کے نظریہ قدر پر قایم کرتے ہیں لیکن
اس کا سا تبحر اور اس کی سی علمی وسعت نہیں رکھتے۔ ان میں تامس ہاجکن (۱۷۸۷-۱۸۶۹)

اچھے وقت شائع ہوا۔ اگلے ہی مہینہ، فروری میں پیرس میں انقلاب برپا ہوا اور مارچ میں جرمنی تک پھیل گیا۔ انقلاب کے خوف سے بروسیلز کی حکومت نے مارکس کو بلجیم سے خارج کردیا لیکن جرمنی انقلاب نے اس کے لئے خود اپنے ملک میں واپسی ممکن کردی۔ جرمنی میں اس نے پھر ایک اخبار نکالا جس نے اسے پھر ارباب حکومت سے ٹکرایا اور جوں جوں انقلاب کا ردعمل زور پکڑتا گیا یہ مخالفت بھی بڑھتی گئی۔ جون ۱۸۴۹ء میں اسکا پرچہ بند کرکے اسے پروسیا سے خارج کردیا گیا۔ یہ پیرس واپس گیا لیکن وہاں سے بھی نکالا گیا۔ چنانچہ یہ جاکر انگلستان میں مقیم ہوا، جو اس وقت حامیان حریت کا مامن بنا ہوا تھا، اور اشاعت تحریک کے سلسلہ میں جو تھوڑے تھوڑے زمانہ کے لئے یہ باہر گیا اس سے قطع نظر یہ اپنی موت یعنی ۱۸۸۳ء تک انگلستان ہی میں رہا۔ اس کے وقت کا زیادہ حصہ اپنی بڑی کتاب "سرمایہ" کی تالیف میں صرف ہوا۔ آخری زمانہ میں اسکا دوسرا اہم کام "مزدوروں کی بین الملل جمعیت" کے قیام اور توسیع پر مشتمل تھا ۱۸۶۴ء سے لیکر ۱۸۷۲ء اس کے وقت کا زیادہ حصہ "برٹش

کا نام لیا جاسکتا ہے جو پہلے بحری افسر تھا لیکن بحری نظم کے طریقوں پر ایک تنقیدی رسالہ لکھنے کی وجہ سے موقوف کردیا گیا۔ اس کی تصنیف سے "سرمایہ داری کے خلاف محنت، دماغ" (۱۸۲۵ء) اور دوسری کتابیں ہیں۔ نیز ولیم ٹامس (۱۷۸۵-۱۸۳۳) مصنف کتاب "تحقیق بابتہ اصول تقسیم دولت جو انسانی خوشحالی کے لئے سب سے زیادہ معین ہوں" (۱۸۲۴ء) اور "محنت کا انعام" (۱۸۲۵) : اور پیرسی راون اسٹون جس سے ہاجکن نے زیادہ تر اپنے خیالات لئے ہیں۔ غالباً ان سب سے زیادہ اہم رابرٹ اوون تھا

(۱) اس کی پہلی اور سب سے اہم جلد ۱۸۶۷ء میں شائع ہوئی۔ اور باقی دو جلدیں اس کے انتقال کے بعد ۱۸۸۵ء اور ۱۸۹۴ء میں

میوزیم" میں صرف ہوا جہاں یہ جرمن، صبر کے ساتھ، نظام سرمایہ داری کے خلاف اپنی بے پناہ قرار داد جرم کے لئے مواد جمع کرتا تھا۔ لیکن بین الملی اشتراکی تحریک پر اس کا قابو برابر قایم رہا۔ نپولین کے بھائیوں کی طرح اکثر ملکوں میں اس کے داماد اس کے نائب تھے اور جو اندرونی مناقشے پیدا ہوتے تھے ان میں عموماً اسی کی مرضی غالب رہتی تھی۔

ہندوستان میں تنقید فن کا دور جدید

(۱)

فن اور تنقید فن

جس طرح زمین و آسمان، ابر و باد و باراں، شجر و حجر و بشر، کرشمے ہیں قدرت و ذات خداوندی کے اسی طرح رنگینی شعر و رنگ آمیزی تصویر، موج رقص شیریں اور جوئے شیر فرہاد، بتان آذر اور سبحۂ خلیل جلوے ہیں قدرت و ذات انسانی کے یہ دونوں یعنی ایک طرف بہ زبان انگریزی 'نیچر' اور دوسری طرف آرٹ، تخلیقی پہلو ہیں ایک فرد مدرک، ایک شخصیت کے۔ ہم کو یہ پوری طرح سمجھ لینا چاہئے کیونکہ یورپ میں اُنیسویں صدی عیسوی کے آرٹ کی نیچر پرستی کے بعد جسے نسل انسانی کے فنی ارتقا کے دور اول کی تکمیل سمجھنا چاہئے، جو فنی انقلاب اکسپرشنزم کی صورت میں ظہور پذیر ہوا ہے اس کے پہلے ریلوں کے رفع دفع ہونے کے بعد آج ہم ٹھنڈے دل سے حال اور ماضی کے فنی کارناموں کا موازنہ کر سکتے ہیں، اور اس موازنے سے ہم پر یہ راز فاش ہو جاتا ہے کہ جس وقت انسان اپنا منصب تخلیق صورت کھو بیٹھتا ہے اور محض نقالی فطرت یا اتباع طرز و نقوش پارینہ کو اپنا مسلک بنا لیتا ہے، اس کی کوششوں پر لفظ آرٹ کا کسی صورت سے اطلاق باقی نہیں رہتا۔ جذبات کے نقوش کو الفاظ رنگیں کا جامۂ صد آہنگ پہنانا، اسی کا نام ہے شاعری اور جذبات کے پرتووں کی نقش و رنگ سے تنویر کر دینا اسی کا نام ہے مصوری۔ جس طرح الفاظ کے ٹھنڈے بے جان موتیوں کو ردیف و قافیہ کی لڑیوں میں پرونے والے کو ہم شاعر نہیں بلکہ ناظم کہتے ہیں

اسی طرح مشاہدات فطرت کو کینوس یا کاغذ پر جیسے کا تیسا بنا دینے والے کو ہم تصویر ساز کہیں مصور نہیں کہہ سکتے۔ شاعری جزو پیغمبری اور پیغمبری جزو خدائی اگر ہے تو آفرینش کی بنا پر اور مصور پر اگر دعوائے خدائی کا الزام عاید کیا جاتا ہے تو یہ بھی آفرینش ہی کی بنا پر۔ فن غالب و فن مانی کی بنیادی نوعیت ایک ہے۔ یہ ایک بڑا ادبی عجوبہ ہے کہ شاعر کو تو مصور جذبات کہیں اور مصور کا مصور جذبات ہونے سے کوئی واسطہ نہ سمجھیں اور اُسکی ایک کاریگر کی سی حیثیت قرار دیدیں جو گارے اینٹ کی چنائی کے بجائے رنگ آمیزی میں سرکھپایا کرے اور اپنی باریکی قلم کو معراج فن کا معیار ٹھہرائے۔ زمانہ حال کے مغربی نکتہ رس آرٹ کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ "آرٹ اشکال پُر اظہار کی تخلیق کا نام ہے" لیکن میں اس طوالت کی ضرورت نہیں خیال کرتا کیونکہ ہر وہ شکل جس کی واقعی تخلیق کیجائے اور جو محض مشاہدہ فطرت کی نقل نہ ہو وہ لابد مظہر ہوگی جذبات شخصی کے پس منظر کی۔ آرٹ یا فن سے مراد ہے تخلیق اشکال۔

لیکن ہر بنائی ہوئی شکل پر تخلیق فنی کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ تخلیق فنی اس وقت ہوتی ہے جب انسان کسی شکل کو اصل میں اس شکل کی خاطر اور محض ضمناً افادی اغراض کی بنا پر بناتا ہے۔ جب انسان نے اپنا پہلا پیالہ بنایا ہوگا تو جو شکل اس نے اس پیالے کی بنائی اس کے دائرے اور اس کی ہیئت، اس کی ضروریات مادی پر مبنی نہ تھے بلکہ اس کے انفرادی ترنگ اور من کی موج کا نتیجہ تھے۔ میں خاص طور پر یہ کہنے سے احتراز کرتا ہوں کہ وہ اس کے حس لطیف اور اس کی ذوق جمال پر مبنی تھے۔ حسن ایک تصویر اضافی ہے اور کسی ایسے معیار کا متحمل نہیں جس کا ہر زمان و مکان پر اطلاق ہوسکے۔ فن کی تعریف حسن کے معیار سے کرنا ایک امر بے معنی ہے۔ مزید براں یہ جمالی نقطۂ نظر انسان کی تخلیقی امنگ اور صلاحیت پر ایسے قیود عاید کر دیتا ہے جو اس

کی جدت و شدت اظہار کے لئے نہایت درجہ محدود کن ثابت ہوتے ہیں بلکہ بنا ہو جاتے ہیں فن کی بے بضاعتی اور اس کے جمود کی۔ مثلاً ہم یونانی بت تراشوں اور مغل اسکول کے مصوروں کو پیش کر سکتے ہیں جنکا معیار سراسر جمالی تھا۔ کس درجہ غیر محرک اور بے رس معلوم ہوتے ہیں انکے عمل چینی مصوروں کی آزاد قلمی اور ہندی بت تراشوں کی دیوانہ واری کے سامنے۔

اور جب انسان نے اپنا پہلا بت پرستش کے لئے تراشا تو اس کی شکل کسی مادی ضرورت کی پابند نہ تھی بلکہ اس کی اپنی انفرادی ترنگ کا مظہر تھی اور انہی انفرادی ترنگوں سے رفتہ رفتہ حسن کے ان معیاروں کا ارتقا ہوا ہے جو آج ہمارے پیش نظر ہیں اور انہیں انفرادی ترنگوں کی مجموعی قوت کی بنا پر آئے دن یہ معیار بدلتے رہتے ہیں اور بدلتے رہیں گے۔

لہذا فن کا جمالی پہلو بھی اسی قدر عارضی ہے جتنا کہ اسکا اخلاقی پہلو اور ہرگز اس کا جوہر نہیں۔ فن، حسن اور اخلاق دونوں کی قیود سے بالاتر اور آزاد ہے اور جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے وہ جلوہ ہے انسان کی جذباتی کشمکشوں اور اس کی تخلیقی امنگوں کا۔ یہی کشمکش اور یہی امنگیں کہیں شعر اور ترنم بنکر "فردوس گوش" ہوتی ہیں تو کہیں تصویر اور کہیں رقص کی صورت میں "جنت نگاہ" کا اثر رکھتی ہیں۔ انہیں کشمکشوں اور امنگوں کا نتیجہ ہیں میلو کی زہرہ اور داونچی کی مونالیزا، نٹ راج شوا اور اجنٹا کی کوہ تنگا نیاں، دہلی کی مسجد اور آگرے کا تاج، بیتھوون کی سمفونیاں اور موزارٹ کے آپیرے۔ حافظ و غالب کے اشعار اور رومی و اقبال کی مثنویاں۔

میں نے سطور بالا میں کوشش اس امر کی کی ہے کہ فن سے جو کچھ مراد ہے اس کو مختصراً بیان کر دوں اور اس نقطۂ نظر کو واضح کر دوں جو ہم کو فن کے سمجھنے اس کی تنقید کرنے اور اس سے لذت یاب ہونے میں غلط روی دارزانی سے بچائے اور ہندوستان

کے موجودہ مسئلہ فن پر ایک رائے قائم کرنے میں ہماری رہبری کرے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ فن سے لذت یاب ہونے یا فن کے برتنے کے لئے کسی نقطہ نظر کا دانستہ وجود لازم ہے۔ فن اپنے ارتقا کے بالاترزینوں پر پہنچکر یعنی جہاں وہ صنّاعی سے ہٹکر ایک مستقل تمدنی شعبہ کی حیثیت سے ظہور پذیر ہوتا ہے سراسر مرقع ہوتا ہے انسان کی زندگی کے جذباتی پہلو کا۔ چنانچہ انسان ذہنی نقطہ ہائے نظر اور نظریات فن سے جس قدر آزاد ہوگا اسی قدر اس کے فنی کارنامے پرزور اور بے لاگ ہونگے یہی وجہ ہے کہ جیسے جیسے ذہنی وعلمی نقطہ نظر دنیا پر غالب آتا گیا ہو ویسے ویسے فن کی شدت کیفی گھٹتی گئی ہے اور آج ہماری مجال نہیں کہ ہم فن کے پرانے کارناموں کا کیا بہ لحاظ وزن وجسامت اور کیا بہ لحاظ زور وشدت ایک آن مقابلہ کرسکیں۔ بلکہ فن سے واقعی لطف اندوز ہونے میں بھی ذہنی عنصر کا وجود ایک بڑی حد تک حائل رہتا ہے گو اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہ ہمارے ادراک میں ایسی باریکی پیدا کردیتا ہے جو بذات خود لطف خاص سے خالی نہیں۔

لیکن ہمارا دور بیسویں صدی عیسوی کا دور ہے یعنی کیمرے اور سنیما کا دور' اور ہوائی جہازوں نے تمدنی کنارہ کشی کے آخری امکانات کو مسمار کردیا ہے۔ ہم کو اس سے ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں اور اس میں بنی نوع انسان کی سراسر بہتری ہے لیکن اس خیال سے کہ ہم اپنے ہیرے جواہرات کو گالیونیز کی رنگ برنگی چوڑیوں کے بدلے انکی غیر معمولیت سے متحیر ہوکر تبدیل نہ کرلیں جیسا کہ امریکہ کے وحشی باشندوں کے متعلق مشہور ہے۔ یا سمندر پار سے جو کچھ کوڑا کچرا بمبئی تک بہہ آوے اس کو عجائب روزگار میں سے نہ سمجھیں ہم پر لازم ہے کہ ہم ذہنی عنصر کو استعمال کریں ہم پر لازم ہے کہ ہم تشریح کریں' چھان بین میں سر ماریں اور تفریق وترتیب سے کام لیں۔ کسی کارنامہ فن سے محظوظ یا منغص ہوتے وقت اپنی دماغی کیفیت اور ساتھ

ہی ساتھ کاغذ پر جو نقش و رنگ ہیں انکی تشریح کریں۔ مختصراً یہ کہ ہم کو لازم ہے
کہ ہم اپنے اندر تنقید کی صلاحیت بہم پہنچائیں۔

لیکن دراں حالیکہ آج اس گئے گذرے زمانے میں بھی ہندوستان میں ایسے
اصحاب فن موجود ہیں جنکا پلہ دنیا کے بڑے سے بڑے صاحب فن سے کسی صورت
سے کم نہیں، کیا ہم اپنے یہاں صحیح معنوں میں نقاد فن کی ایک مثال بھی پیش کر سکتے ہیں؟
جو مضامین ہندوستان کے روزانہ اخباروں اور رسالوں میں فنی تنقید کے نام سے
شائع ہوتے رہتے ہیں اور جن میں ہندوستان کے جلیل سے جلیل اور کم مایہ سے
کم مایہ مصوروں کی کم و بیش ایک ہی جیسے الفاظ میں مدح سرائی کیجاتی ہے ان
کو پڑھکر جو روحی صدمہ ہوتا ہے اس کا بیان عبث ہے اور اس کی ساری ذمہ داری
صرف ہندوستانیوں پر عائد نہیں ہوتی۔ انکے معلمین فن یعنی انگریز جو ہندوستان میں
فن اور معیار فن کی ٹکسال قائم کئے ہوئے ایک شان ہمہ دانی کے ساتھ جلوہ گستر ہیں
بذات خود فن کے معاملہ میں فطرتاً صد درجہ کند حس واقع ہوئے ہیں۔ انگلستان
میں مسٹر کلاسوبل ایک دل خوش کن استثنا رہی، (بلکہ یہاں تک ماننا پڑے گا کہ
یورپ کے موجودہ نقادان فن میں انکا انداز بیان سب سے زیادہ صاف اور واضح
ہوتا ہے، گو یہ کہدینا بھی ضروری ہے کہ انکی تنقید کی نشو و نما پیرس کے ارباب فن کے
جمگھٹوں میں ہوئی) لیکن سویز کے اس طرف کا کیا رنگ ہے؟۔ جس عنوان سے
وہ کسی آرٹسٹ کے عمل پر نکتہ چیں ہوتے ہیں وہ کمتر مستثنیات سے قطع نظر سراسر
کھوکھلا اور مضحک ہوتا ہے اور اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ انکے اندر حس فن جو
ایک نقاد سخن کے لئے ناگزیر ہے موجود نہیں۔ وہ مباحث فنی کے متعلق جو ایک
لاطائل لفظی گورکھ دھندوں کی زبان قائم ہوگئی ہے کسی غریب کی تعریف یا کسی غریب
کی مذمت میں صرف کرتے ہیں اور ہمیں اپنے ممدوح یا معتوب کے متعلق کوئی واقعی

اطلاع مطلقاً نہیں دیتے ۔ نقاد کی ذمہ داریاں دوہری ہوتی ہیں ۔ اسکا فرض اولین یہ ہوتا ہے کہ وہ عام افراد سے ، جن میں تنقیدی صلاحیت اور حس فن کم ہوتی ہے فنی کارناموں کو قریب تر کردے اور ان کارناموں سے جو کیفیات خود اس پر طاری ہوتی ہیں خواہ بہ زبان حال خواہ بہ زبان قال دوسروں پر منتقل کردے ، اور ان میں اچھے برے کی تمیز کا جذبہ مشتعل کردے ۔ ضمناً وہ آرٹسٹ کے لئے بھی امداد کا باعث ہوتا ہے اور یہ اس طرح کہ وہ اس کے کمزور پہلوؤں میں چٹکیاں لے لے کر اسے خواب غفلت سے جگاتا ہے ۔ ممکن ہے کہ وہ اس کو اکثر آمادۂ بغاوت کردے لیکن نقاد آرٹسٹ کو جمود سے محفوظ رکھتا ہے ۔

یہ صورت تو بہترین صورت اور نقاد کی یہ حیثیت بہترین حیثیت ہوگی لیکن ایک بڑا خطرہ یہ ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی ساکھ جم جانے کے بعد نقاد فن سے دلال فن ہو کر نہ رہ جائے ۔ بجائے اس کے کہ وہ ہم کو بتلا دے کہ کون کیا ہے ، کہاں تک ہے ، اور کیوں ، وہ آرٹسٹوں کو کیڑوں کے حیاتیاتی نمونوں کی طرح شیشوں میں بند کر کر کے انپر ان کے ناموں اور داموں کی چٹھیاں چپکانے لگتا ہے ۔ بجائے نقش و رنگ کے وہ سونے اور چاندی کو معیار قرار دینے لگتا ہے اور آرٹ کے بازار پر اس طرح حاوی ہو جاتا ہے جس طرح مسٹر مانٹیگو ایک زمانے میں چاندی کے بازار پر حاوی تھے یا شاید اب بھی ہوں ۔ یہ ہے دراصل وہ وبا جو آج کل یورپ میں عام ہو رہی ہے اور ہم کو اس سے بچنے کی پوری کوشش کرنی چاہئے کیونکہ اسکا عہد مغلیہ کی سرپرستی فن سے بھی زیادہ یہ اثر ہوتا ہے کہ آرٹسٹ ایک مزدور بنکر رہ جائے اور اس پر " حکم سرکار کا قلم دربار کا " صادق آئے ۔ بہرحال جو کیفیت آجکل ہماری ہے ہندوستان میں وہ ناگفتہ بہ ہے اور فن کی طرف سے ہمارا نقطۂ نظر کلیتاً غلط ہے ۔ عوام ، جن میں ابتک فنی خود شناسی پیدا نہیں ہوئی ہے ، انکے دلوں کو تو انگریزی باتصویر پوسٹکارڈوں نے مسخر و تاراج

کرلیا ہے۔ میں یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ عوام سے میری مراد غریب و مفلس دہقانی نہیں
کیونکہ آرٹ کے نقطۂ نظر سے بڑے بڑے راجہ مہاراجہ اور یہ دہقانی ایک ہی صف میں
نظر آئیں گے بلکہ عموماً دہقانی کی حسیات ان سے زیادہ تیز اور صحیح پائی جائینگی۔ اب رہے
ایسے لوگ جو فن کا کچھ احساس رکھتے ہیں تو وہ عجیب عجیب مضحک خیالوں اور منصوبوں
کا شکار بنے ہوئے ہیں۔ ان میں سے اکثر فن کو ایک قومی معاملہ بناتے ہیں اکثر ان سے
بھی بڑھکر اس کو ایک مذہبی معاملہ بنائے بیٹھے ہیں یعنی ایک طرح کا ہندو مسلم سوال ۔
اجنٹا ہندوں اور قوم پرستوں کا مسلک ہے تو تاج خلافتیوں کا منتہائے نظر۔ لیکن
دونوں کے دونوں کرافٹ مارکٹ کے مبتذل ٹکے ٹکے والے با تصویر پوسٹ کارڈوں
پر دل وجان سے ریجھ جائیں اور اپنی بدمذاقی کا ذرا احساس نہ کریں۔ ایک طبقہ ایسے
لوگوں کا بھی ہے جو اکثر امریکی سرپرستوں کی صلاح کے بموجب احتیاط کے پیرو ہوکر
ہندوستان کے "خالص آرٹ" کی "خدمت" کرنا چاہتے ہیں۔ میں ان حضرات سے
کہوں گا کہ خدا کے لئے آپ اپنے اپنے کام سے لگئے اور ہندوستان غریب کے آرٹ اور
اس کے مسئلے کو اس کے حال پر چھوڑئے۔ ان خیالات کو دماغ میں جگہ دیکر تصویریں
اگلنی نہ شروع کر دیجئے۔ تصویر بنائے اور ضرور بنائے لیکن جب، کہ جیسے کسی کے دل
میں درد ہو اور اس سے چیخے بغیر نہ بنے، یا یوں کہ آپ کو کچھ کہنا ہے جو آپ کے خیال
میں کسی اور نے ابتک نہیں کہا ہے، یا اس لئے بھی کہ پیٹ ہر شخص کے ساتھ ہے اور
اسکا پالنا لابد، اور اپنی رنگ آمیزی اور تصویر سازی کے گر سب کے لئے ہیں
لیکن خدارا آپ ملک و قوم یا بنی نوع انسان کی خدمت کے خیال سے قلم کو جنبش
نہ دیں۔ مجھے ڈر ہے کہ ان امریکی حضرات نے جو بے نقص سوٹ زیب تن کئے ہوئے
کیل کانٹے سے بالکل درست، غریب فاقہ کش ہندوستان کو ایک مہینے اور اجنٹا کو
ایک دن میں "نپٹانے" کے لئے نئی دنیا سے آتے ہیں ہمارے لئے بہت کچھ باعث مضرت

ثابت ہو رہے ہیں ۔ ہندوستانی کم از کم اتنا تو ہے کہ اپنے فنی احساسات میں ایمانداری سے کام لیتے ہیں اور خود کو دھوکے میں نہیں ڈالتے ۔ میں کہیں بہتر سمجھتا ہوں کہ وہ مبتذل اور بد مذاق تصویروں کو دل سے لگائیں بجائے اس کے کہ وہ اجنٹا کی تصویروں کے سامنے کھڑے ہو کر جھوٹ موٹ کے حال میں مبتلا ہوں اور خود فریب اضطراری کیفیات اپنے اوپر طاری کریں ۔ میں نے ان جہانیاں جہاں گشت غولوں کو یورپ میں برسوں دیکھا ہے اور ان سے خوب واقف ہوں ۔ دنیا کے بہتر سے بہتر فنی کارناموں کو دیکھتے وقت انکا رویہ قابل دید ہوتا ہے ۔ "تحیر انگیز!" "کس درجہ تحیر انگیز!" ان میں سے ہر دیکھنے والا اور دیکھنے والی تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد کہتی رہے گی ۔ ساتھ ہی اس قسم کے اظہار خیال ہوتے رہتے ہیں کہ "یہ لاکھوں میں بنا ہوگا" اور "یہ کروروں میں خریدا گیا ہوگا" اکثر ایسے بھی خوش مذاق ہوتے ہیں جو یہ کہنے سے باز نہیں رہتے کہ امریکہ اگر چاہے تو یہ سب چیزیں خرید لے ۔ اور وہ یکے بعد دیگرے گزرتے جاتے ہیں اور بیچارہ "گائڈ" جو انکے ساتھ ہوتا ہے ان کی بکواس سنتا رہتا ہے اور آثار صنادید کی پرانی رٹی ہوئی داستان شروع سے آخر تک آیت حدیث کی طرح دہراتا ہے اور وہ بھی انکے ساتھ ایک کمرے سے دوسرے کمرے اور ایک برج سے دوسرے برج میں گزرتا جاتا ہے ۔ وہ کچھ نہیں دیکھتے اور انکو بالکل کسی فنی قدر کا حس نہیں ہوتا ۔ میری اپنے ہم ملکوں سے دست بستہ یہ استدعا ہے کہ وہ ان حضرات کو اپنا نمونہ نہ بنائیں ۔ دلی میں رہکر تاج کو دیکھے بغیر اس کی ایک تصویر خیالی لئے ہوئے مرجانا اچھا ، لیکن تاج کو ڈھای کی طرح چھو کر چلے آنا نہیں اچھا ۔

ٹالسٹائے اور مشرق

(ماخوذ)

جس وقت ٹالسٹائے نے وفات پائی کسی کو مطلق گمان نہ تھا کہ اسکا تخیل کبھی اس دنیا میں اثر بھی کریگا۔ مگر اس نے بیج بو دیا تھا اور وہ موسم بہار کی بارش کا منتظر تھا۔ بادل آئے، پانی برسا، کھیتی سرسبز ہوئی اور اب فصل کاٹنے کا وقت ہے۔ ٹالسٹائے کی کشت امید کا ہرا ہونا ہندوستان کے کسان گاندھی کی عرقریزی پر موقوف تھا۔

نوع انسان کی تاریخ میں ایک بات نہایت حیرت انگیز ہے۔ آپ ساری تاریخ دیکھ جائیے جتنی تخیلی امیدیں ارباب فکر کے ذہن میں تھیں اور جن کا پورا ہونا بظاہر محال معلوم ہوتا تھا سب کی سب ایک دن عملاً پوری ہوکر رہیں۔ بات یہ ہے کہ دنیا میں جب کوئی نیا خیال پیدا ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اسکا عکس یعنی ایک مخالف خیال پیدا ہوجاتا ہے۔ ان دونوں میں باہم تصادم ہوتا ہے اور ذہن انسانی کے سمندر میں ایک طوفان و تلاطم برپا ہوجاتا ہے۔ اس طوفان کی لہروں سے زندگی کی کھیتی سیراب ہوتی ہے اور اس سے نئے نئے پودے اُگتے ہیں۔

۱۸۴۸ء میں جب ٹالسٹائے کی عمر اُنیس سال کی تھی اور وہ قازان کے شفاخانہ میں زیر علاج تھا اُسے ایک لاما سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ یہ بزرگ کسی ڈاکو کے ہاتھ سے زخمی ہوکر شفاخانے میں آئے تھے اور انہیں اتفاق سے ٹالسٹائے کے قریب ہی جگہ ملی تھی۔ ان کے فیض سے ٹالسٹائے کے دل میں حقیقت اور محبت کی چنگاری چمک اٹھی۔ تیس سال تک دنیاداری کی راکھ میں یہ چنگاری دبی رہی اور اس کے بعد بھی اسے شعلہ جوالہ بننے کے لئے موافق ہوا نہ ملی۔

البتہ کوئی ساٹھ برس کے بعد ۱۹۰۸ء میں اس چنگاری سے ہندوستان کے ایک نوجوان گاندھی کے دل میں معرفت اور محبت کا شعلہ بھڑکا۔ گاندھی نے تکلیف اور مصیبت کی آندھیوں میں اس شعلہ کو نشو و نما دی یہاں تک کہ اس نے سارے ہندوستان میں اس سرے سے اُس سرے تک آگ لگا دی جس کی آنچ دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی پہنچ رہی ہے۔

اس سے اندازہ ہوگا کہ ٹالسٹائے کو مشرق سے کتنا گہرا تعلق ہے۔ یہ تعلق اس درجہ اہم ہے کہ اگر ٹالسٹائے کی سیرت میں اس کا ذکر نہ کیا جائے تو وہ سیرت نامکمل رہجائے گی۔ ٹالسٹائے کے خیالات سائبیریا ریلوے کی طرح یورپ اور ایشیا کو ملاتے ہیں۔

ٹالسٹائے اور ایشیا کے تعلقات کے متعلق ہم کو اس کے شاگرد رشید پاؤل بیروکاف کی کتاب ٹالسٹائے اور مشرق میں بہت کافی مواد ملتا ہے۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹالسٹائے کو ابتدا ہی سے مشرق سے محبت تھی اور اس کا دل ہمیشہ ادھر کھنچتا تھا۔ جب وہ ایک نوجوان طالب علم کی حیثیت سے جامع قازان میں تعلیم پاتا تھا تو اُسے عربی اور ترکی زبان سیکھنے کا شوق تھا۔ وسط ایشیا کے قیام کے زمانے میں اسے اسلامی تہذیب سے بہت دلچسپی تھی اور وہ اس سے بہت متاثر ہوا۔ ۱۸۷۲ء میں اس نے ابتدائی مدارس کے لئے جو کتابیں تصنیف کیں ان میں تقریبًا سارا مواد ہندوستان اور عرب کے قصوں اور کہانیوں سے لیا گیا تھا۔ جب ٹالسٹائے کو مذہب کی طرف توجہ ہوئی تو اُس نے یہ محسوس کیا کہ انسان کی تسکین اور نجات کے لئے محض انجیل ناکافی ہے۔ چنانچہ اس نے خالص مشرقی مذاہب کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا اور یہ کوشش کرنے لگا کہ مشرقی مذاہب کے اصولوں کو یورپ کے لوگ بھی عقیدت اور احترام سے قبول کرلیں۔ چنانچہ اس نے ایک کتاب ”تخیل العقلا“ کے نام سے تالیف کی جس

میں اس نے انجیل کے حقائق، چینی حکیم (   ) لے اوتسے کے کلام اور سری کرشن جی کے خیالات کو جمع کر دیا۔ اس کا ابتدا سے یہ عقیدہ تھا کہ بنی نوع انسان کے بڑے بڑے مذاہب کے اصول ایک ہی مرکز پر جمع ہو سکتے ہیں۔ اُس نے اس مقصد کے لئے تمام مشرقی ممالک سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری کر رکھا تھا۔

ٹالسٹائے کے تخیل سے زیادہ قریب چینیوں کا تخیل ہے لیکن چین ہی میں اُس کے خیالات پر سب سے کم عمل ہوا ہے۔ ۱۸۸۴ء کے شروع میں ٹالسٹائے نے کنفوشس اور لے اوتسے کی سیرت کا مطالعہ کیا ان میں سے وہ لے اوتسے کی زیادہ قدر کرتا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں اسے دو مغزز چینیوں سے خط و کتابت کرنے کا موقع ملا۔ ان میں سے ایک کا نام سین ہوانگ ٹونگ اور دوسرے کا کوک ہوانگ مینگ تھا۔ موخرالذکر پیکن کی یونیورسٹی میں پروفیسر تھا اور یورپ میں کافی شہرت رکھتا تھا۔ انقلاب کے زمانہ میں وہ جلاوطن کر دیا گیا اور جاپان میں پناہ گزیں ہوا۔

ستمبر ۱۹۰۶ء میں ٹالسٹائے نے جو خط کوک ہوانگ مینگ کو لکھا اس میں اس نے چینیوں کی بیحد تعریف کی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ یورپ کی قوتیں ظلم اور فریب سے چین کے حصے بخرے کرنا چاہتی تھیں اور چین نے انتہائی مہماں نوازی سے اُن کی جوع الارض کو تسکین دینے کے لئے اپنے ملک کو سفرۂ عام اور خوان یغما بنا دیا تھا۔ اس بات سے ٹالسٹائے بہت خوش تھا اور وہ چینیوں کو مشورہ دیا کرتا تھا کہ اس فیاضی پر استقلال سے قائم رہیں۔ آخر میں فتح انہیں کی ہوگی۔ واقعات بتاتے ہیں کہ ٹالسٹائے کی پیشگوئی پوری ہوئی۔ مثلاً اُس زمانہ میں چین نے پورٹ آرتھر اور ڈالنی روس کو دیدیا تھا مگر آگے چلکر روس کو (جنگ روس و جاپان میں) اس کی بڑی زبردست قیمت ادا کرنا پڑی۔ اسی طرح کیوچیو جرمنی کے ہاتھ لگا تھا اور وہی ہائی وی برطانیہ کی دراز دستی کا شکار رہا تھا۔ کیوچیو کا حشر دنیا کو معلوم ہے وی ہائی وی کا بھی انشاء اللہ

ایک دن یہی انجام ہونا ہے۔

مگر چند سال بعد جب چینیوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ یورپ والوں کا مقابلہ انہیں کے ہتھیار سے کریں تو ٹالسٹائے کو بڑی بے چینی پیدا ہوئی۔ وہ سمجھتا تھا کہ اگر چینی بھی یورپ والوں کے متعدی مرض میں مبتلا ہو گئے تو نہ صرف چین کی روحانی ہلاکت کا باعث ہوگا بلکہ ساری دنیا کو نقصان پہنچے گا۔ اسکا خیال ہے کہ بنی نوع انسان کی زندگی میں ایک دن ضرور اصلاح ہوگی اور اس اصلاحی تحریک میں چین دنیا کی رہنمائی کرے گا۔ چینیوں کے پاس ایک بڑی دولت ہے جسے وہ "ڈاؤ" یعنی حسن اخلاق کہتے ہیں۔ اُن میں کفایت شعاری، دیانت داری، نرمی، محنت اور استقلال کی خصلتیں ہیں۔ اگر انہوں نے یہ چیزیں کھو دیں تو وہ کہیں کے بھی نہ رہیں گے۔ یورپ کی تقلید میں سیاسی اور صنعتی انقلاب کرنے سے تو یہی بہتر ہے کہ پرانا استبدادی نظام بدستور باقی رہے۔ یورپ کی حالت زار چینیوں کے پیش نظر ہے :۔ غریبوں کی قابل رحم حالت، سرمایہ داروں اور مزدوروں کی کشمکش، فوج کی بھرتی، جنگ کی تیاری ۔ نوآبادیوں کو لوٹنے کی پالیسی۔ کیا چین والے اس کی تقلید کریں گے؟ نہیں ہرگز نہیں مگر دوسری طرف وہ اس پر بھی کبھی راضی نہ ہوں گے کہ یورپ والے انہیں پامال کر ڈالیں۔ ایسی صورت میں اُنکے لئے صرف ایک راہ ہے اور وہ یہ ہے کہ روحانی قوت سے کام لیں اور روح کے ناقابل شکست ہونے پر یقین رکھیں۔ انہیں اس عقیدے اور اس قوت کو اندرونی اور بیرونی دشمنوں کے مقابلے میں استعمال کرنا چاہئے۔ اگر وہ کرہ ارض کی طرح خاموشی سے اپنے مدار پر حرکت کرتے رہے تو یوروپ ایک دن مجبور ہوگا کہ ان کے سامنے ہتھیار ڈالدے۔ نوع انسان کی خیر و برکت چین کے روحانی پیشواؤں کے ان تین اصولوں میں پوشیدہ ہے، کنفوشس کی "تواضع" لے اوتسے کے "نظم بے ضابطہ" اور بدھ کے "ایثار محبت" میں۔

یہ ہے ٹالسٹائے کی نصیحت چین کو۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا چین نے اس نصیحت پر عمل کیا؟ ٹالسٹائے کا مکتوب الیہ کوک ہوانگ مینگ بہت تنگ خیال آدمی تھا۔ وہ شخصی حکومت کا حامی تھا اور اُسے ہر مرض کی دوا خیال کرتا تھا۔ وہ ناکامیاب ہوا اور ٹالسٹائے کے اصول کے مطابق اُسے ناکامیاب ہونا بھی چاہیے تھا۔ مگر چین کا موجودہ انقلاب بھی روسی حکیم کے راستے سے بہت دور ہے۔ یہ سوائے اس کے کہ تاریخ کے دفتر بے پایاں کا ایک ورق الٹ دے اور کچھ نہیں کرسکتا۔ ٹالسٹائے کے خیالات چین کے ہزاروں برس کے فلسفے کے مطابق ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ چین ان خیالات کو اپنے لئے مشعل ہدایت نہ بنائے۔

جاپان کے متعلق ٹالسٹائے نے جو رائے قائم کی ہے وہ بالکل اس کے خلاف ہے۔ جاپانی بہت بے چین طبیعت رکھتے ہیں اور ان میں نئے خیالات قبول کرنے کا مادہ بہت ہے۔ ایشیا کی قوموں میں سب سے پہلے (غالباً ۱۸۹۰ء میں یا اس کے کچھ پیشتر) جاپانیوں نے ٹالسٹائے سے تعلق پیدا کیا۔ مگر ٹالسٹائے کو ان کی روحانی ترقی کی صلاحیت میں بہت شبہ ہے۔ اس کے نزدیک یہ حُبّ وطن اور فوجی قوت کی پرستش کرتے ہیں اور یورپ کی تہذیب سے مسحور ہو گئے ہیں۔ اس نے جاپان کے جتنے لوگوں سے خط وکتابت کی اُن سب کی طرف سے اُسے مایوسی ہوئی۔ ان میں سے جن لوگوں کو ٹالسٹائے کی پیروی کا دعوٰے ہے ان کی بھی اصل میں یہ کوشش ہے کہ اُس کے اصولوں کی تاویل کرکے ان سب سے حب وطن کی حمایت کا کام لیں۔ مثلاً ایک نوجوان ۱۹۰۴ء میں ٹالسٹائے کی تصانیف کو پڑھ کر چلا اُٹھتا ہے کہ "حقیقت میں ٹالسٹائے ہمارا پیغمبر ہے"۔ مگر چند ہفتے بعد جب جاپان سین ٹاؤ میں روس کے بیڑے کو غرق کر دیتا ہے تو یہی نوجوان حب وطن کی شراب سے متوالا ہو جاتا ہے۔ اور ٹالسٹائے کے بنیادی اصولوں کا مخالف۔

صرف چند جمہوری اشتراکی لیڈر جاپان میں ہیں جو ٹالسٹائے کی طرح جنگ کے مخالف ہیں ۔ مگر ان کے اور ٹالسٹائے کے خیالات میں مجموعی حیثیت سے بہت فرق ہے۔ انہوں نے ستمبر ۱۹۰۴ء میں روسی حکیم کو خط لکھا جس کے جواب میں اس نے ان کا شکریہ ادا کیا اور جنگ کی مخالفت میں ان کی ہمنوائی کی مگر اس کے ساتھ ہی اشتراکیت کی تحریک سے بھی اختلاف ظاہر کیا۔

مگر یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ جاپان پر ٹالسٹائے کا کوئی اثر نہیں پڑا ۔ ٹالسٹائے کی ہشتاد سالہ سالگرہ کے موقع پر جو مجموعہ مضامین شائع ہوا اس میں ایک جاپانی کاٹین چینگ کا بھی ایک مضمون تھا ۔ وہ لکھتا ہے کہ ٹالسٹائے سے جاپان کے لوگ بہت متاثر ہوئے ہیں ، اُس کی مذہبی تصانیف کی بدولت ۱۹۰۲ء ۔ ۱۹۰۳ء میں نہ صرف جاپان کے عیسائیوں میں بلکہ بدھ مذہب والوں میں بھی ایک اخلاقی انقلاب شروع ہوگیا ۔ بدھ مذہب مدت سے ظاہری عبادات و رسوم پر زور دیتا چلا آتا تھا ۔ مگر اب اس میں باطنیت کی تحریک بھی شروع ہوئی ۔ اب جاپان ہر طرف مذہبی احساس ، مذہبی ضمیر کا چرچا ہونے لگا مگر حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی داخلیت بھی خطرے سے خالی نہیں ۔ اس سے علاوہ قربانی اور محبت کے جذبات کے خود پسندی ، خود غرضی ، تعصب ، مایوسی کے پیدا ہونے کا بھی امکان ہے بلکہ بعض اوقات خودکشی تک نوبت پہنچ جاتی ہے ۔ جاپان والے اس قدر جذبات پرست واقع ہوئے ہیں کہ اگر وہ ٹالسٹائے کے مذہب پر ایمان لائیں تو انکے لئے اس کا نباہنا بہت مشکل ہے اور اندیشہ ہے کہ کہیں المناک نتائج نہ پیدا ہوں ۔ پھر بھی جاپان میں ٹالسٹائے کے مریدوں کی چند چھوٹی چھوٹی جماعتیں کوبے کے آس پاس کاشتکاری کرتی ہیں ، اور لوگوں کو حضرت عیسٰی کا پیام محبت پہنچاتی ہیں ۔ روسی حکیم کی یادگار میں ایک علمی انجمن بھی ہے جس کی طرف سے ایک سَو صفحے کا ماہوار رسالہ شائع ہوتا ہے ۔

جاپان میں ٹالسٹائے کے پیرووں میں سب سے زیادہ قابل احترام ذات ایک

شخص کی ہے جس کا نام ڈافوہ چتیز ہے۔ اُس نے ٹالسٹائے کو ایک عقیدت آمیز خط لکھا
لیکن اُس کے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ اس پیر روشن ضمیر کی زیارت کے لئے روانہ ہوگیا
وہ روسی زبان بالکل نہیں جانتا تھا اور انگریزی بھی بہت کم۔ مگر وہ کسی نہ کسی طرح
ٹالسٹائے کے گاؤں یاسنایہ تک پہنچا۔ وہ وہاں صرف پانچ روز قیام کرکے جاپان واپس
آگیا مگر اس تھوڑے عرصے میں اس کے دل پر اُس کے مرشد کی زندگی، بات چیت اور
خصوصاً مسکراہٹ کا اتنا گہرا اثر پڑا جو آج تک باقی ہے اور غالباً تمام عمر باقی رہے گا۔
۱۹۰۸ء میں وہ اپنے روزنامچے میں لکھتا ہے "اگرچہ مجھے ٹالسٹائے سے ملے ہوئے
سات سو تیس دن ہوگئے اور میں اس سے ہزارہا میل کے فاصلے پر ہوں لیکن اُن کی
مسکراہٹ اب تک میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ آج کل میں ایک چھوٹے سے گاؤں
میں رہتا ہوں۔ میرے ساتھ میری بیوی ہے اور ایک کتا۔ ہم سب مل کر ایک مختصر سے
مکان میں گزر کر لیتے ہیں۔ میں نے کچھ ترکاری بو رکھی ہے اور اسکی کیاری میں جو گھاس
روزانہ اُگ آتی ہے کھود کر پھینکتا رہتا ہوں۔ میرا سارا وقت اسی میں صرف ہوتا ہے
اور یہ شغل مجھے بہت محبوب ہے۔ اس میں میری اندرونی زندگی کی تصویر نظر آتی ہے۔
بہت سے لوگوں کی حالت میری سی ہے مگر افسوس ہے کہ وہ اپنا سارا وقت مضمون
لکھنے میں صرف کرتے ہیں اور عمل بالکل نہیں کرتے"

روس کی رعایا میں مسلمانوں کی تعداد دو کروڑ کے قریب ہے۔ اس لئے ٹالسٹائے کو
اکثر مسلمانوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ جن دوستوں سے وہ خط و کتابت کیا کرتا تھا ان
میں بھی مسلمانوں کی تعداد کم نہ تھی۔ ۱۹۰۱ء میں جب ٹالسٹائے نے روس کے عیسائی کلیسا
سے قطع تعلق کیا تو اس نے اپنے ملک کی اعلیٰ مذہبی کونسل کے نام ایک کھلا خط بھیجا۔ اس
خط میں توحید کی وہ یہی روح تھی جس نے تمام عالم اسلام کو ہلا دیا۔ بہت سے مسلمان
ٹالسٹائے کے دل و جان سے حامی ہوگئے، روس کے باشکیریوں، ہندوستان کے مسلمان

رہنماؤں اور استنبول کے سربرآوردہ مسلمانوں نے ٹالسٹائے کو خلوص اور محبت سے بھرے ہوئے خط لکھے جن کا مضمون یہ تھا کہ ٹالسٹائے کے خط میں موحدانہ جذبات دیکھ کر اُنکے دلوں پر اتنا اثر ہوا کہ اُن کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل آئے۔ وہ سب اسے اپنا بھائی اور دل سے مسلمان سمجھتے ہیں اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ زبان سے بھی اسلام کی حقانیت کا اقرار کرلے۔ قادیان ضلع گرداسپور سے کسی صاحب محمد صادق نامی نے بھی ایک خط لکھا جسے پڑھ کر بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ انہوں نے بہت خلوص اور محبت کے ساتھ ٹالسٹائے کو یہ بتایا کہ اسلام میں ایک مجدد پیدا ہوئے ہیں جن کا نام حضرت مرزا غلام احمد ہے۔ ان بزرگ نے عیسائیوں کے باطل خیالات کی تردید میں یہ بھی لکھا کہ کشمیر میں یوزآسف یعنی (عیسیٰ) کی قبر کا انکشاف ہوا ہے۔

جن مسلمانوں نے ٹالسٹائے سے خط وکتابت کی ان میں سے اکثر حماقت اور مسخرے پن کی باتیں کرتے تھے۔ اُن کی کوتاہ نظری، خودبینی اور خودستائی کو دیکھ کر ٹالسٹائے کو قرون وسطیٰ کے عیسائی یاد آتے تھے۔ مثلاً جب ٹالسٹائے اسلام کے ان مجدد پر ایمان نہیں لایا تو خط لکھنے والے بزرگ نے کئی بار اسے لکھا کہ انسان کے پاس خدا کا پیام تین طرح پہنچتا ہے بعض لوگ اپنے عقل وفہم سے ہدایت پاتے ہیں، بعض وحی اور الہام سے اور بعض تلوار کے زور سے۔

ٹالسٹائے ان لوگوں پر اعتراض نہیں کرتا کیونکہ اُس کے خیال میں حقیقت کے طالب کو نہ تو مختلف مذاہب کی کوتاہیوں پر نظر ڈالنا چاہیئے اور نہ اُنکے اختلافی مسائل پر بلکہ صرف اس نقطے کو تلاش کرنا چاہیئے جو تمام مذاہب میں مشترک ہے چنانچہ اُس نے ان قادیانی امام صاحب کو جنہیں اپنے مذہب کی برتری پر اس قدر ناز تھا صرف یہ جواب دیا "ہر اس شخص پر جو سچے دینداری کے جذبات سے لبریز ہے فرض ہے کہ وہ اپنی زندگی کو لوگوں کے لئے نمونہ بنائے اور ایمانداری اور خلوص کے ساتھ نیکی کی تبلیغ

کرے۔ ہم سب کا مقصد ایک ہے اور وہ بھلائی اور نیکی کی زندگی بسر کرنا ہے"

ٹالسٹائے نے اسلام کی بہت تعریف کی ہے اور قرآن کے بہت سے معارف اُس کے دل کو تسکین دیتے ہیں لیکن اُسکا خیال ہے کہ عیسائیت کی طرح اسلام میں بھی بہت سی دور از کار باتیں شامل ہوگئی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ہم اسلام کو قابل قبول اور سچا مذہب ثابت کرنا چاہتے ہیں تو اس میں سے بہت سے عقائد جو غلطی پر اور بہت سے جذبات جو تعصب پر مبنی ہیں نکال دینا پڑیں گے اور صرف وہ چیزیں رہ جائیں گی جو نیکی اور بھلائی کی جڑ ہیں۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی کہتا ہے "اگر تمہیں میری باتیں بری لگیں تو معاف کر دو کیونکہ میں جب حق بات کہتا ہوں تو پوری کہتا ہوں۔ آدمی بات کہنے سے تو میرے نزدیک چپ رہنا بہتر ہے"، مگر دوسری طرف ٹالسٹائے کو بعض روشن خیال اور وسیع النظر مسلمانوں سے بھی سابقہ پڑا۔ چنانچہ ۱۹۰۴ء میں جب وہ روس کی عیسائی جماعت سے علیحدہ ہوا تو مصر کے مشہور مصلح اور رہنما مفتی محمد عبدہٗ نے اسے مبارکباد کا خط لکھا کہ اس کی ذات تمام طالبان حق کے لئے نمونہ ہے اور ان سب کی آنکھیں اس کے نقش قدم پر لگی ہوئی ہیں۔ تقریبًا اسی مضمون کا خط ٹالسٹائے کو مرزا رضا خاں نے جو استنبول میں ایرانی قنصل کی حیثیت سے مقیم تھے لکھا تھا۔

لیکن سب سے زیادہ اثر ٹالسٹائے پر ایک بہائی کے خط کا ہوا۔ یہ جبریل سا شی نام ایک شخص تھا جو عرب کا رہنے والا تھا۔ اُس نے پہلے مذہب عیسوی اختیار کیا اور پھر بہائی ہوگیا۔ اپنے خط میں اُس نے ٹالسٹائے کو اپنے عقائد کی تبدیلی کی داستان لکھی تھی جس کے جواب میں ٹالسٹائے نے لکھا کہ میں مدت سے بہائیت کے متعلق معلومات حاصل کرتا رہتا ہوں اور اس مبحث پر جتنی کتابیں مل سکتی ہیں قریب قریب سب میں نے جمع کر لی ہیں۔ مجھے یقین ہے بہائیت میں اخلاقی تربیت کی قوت ہے اور اس مذہب کو مشرق میں ترقی کا موقع ملیگا بلکہ مذہب عیسوی کی اندرونی کمزوری

کے سبب سے خیال ہوتا ہے کہ مذہب بہائی اس کا قائم مقام ہو جائے تو تعجب نہیں۔

۱۹۰۸ء میں ٹالسٹائے کی ہشتاد سالہ سالگرہ کے موقع پر کلکتے کے ایک مسلمان عبداللہ مامون سہروردی نے ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے ٹالسٹائے کو مبارکباد بھیجی اور آپ یوگی کے لقب سے مخاطب کیا۔ انہوں نے لکھا کہ قرآن ٹالسٹائے کے عدم تشدد کے عقیدے کا ہرگز مخالف نہیں ہے۔ مگر ضرورت اس کی ہے کہ جس طرح ٹالسٹائے انجیل کا مطالعہ کرتا ہے یعنی باطل کی ظلمت میں نہیں بلکہ حق کی روشنی میں، اسی طرح قرآن کا بھی مطالعہ کیا جائے۔ انہوں نے ٹالسٹائے کی تعریف میں کہا کہ وہ نہ مغرب کا نور ہے نہ مشرق کا بلکہ خدا کے انواریں سے ایک نور ہے جو دنیا کی تاریکی کو دور کرنیکے لئے بھیجا گیا ہے۔ انہوں نے پیشین گوئی کی کہ ٹالسٹائے کا عدم تشدد کا عقیدہ ہندوستان کے مہاتماؤں کی تعلیم کے ساتھ مل کر ایک نیا مذہب بنائے گا جس کی تبلیغ کے لئے ایک نیا ہادی پیدا ہوگا۔ یہ پیشین گوئی پوری ہوئی اور وہ شخص پیدا ہوگیا جو ہندوستان میں ٹالسٹائے کے فلسفے کی عملی تفسیر پیش کرتا ہے۔

ہندوستان اُنیسویں صدی کے آخر میں بیدار ہوگیا۔ یوروپ والے بالعموم اس حقیقت سے بیخبر ہیں۔ صرف چند علما جو سیاست اور ملک گیری سے واسطہ نہیں رکھتے بلکہ کتابوں کے ایک ڈھیر کے درمیان اپنی زندگی گزار دیتے ہیں اس بیداری کا علم رکھتے ہیں۔ ۱۸۳۰ء میں کسی کو یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ہندوستان کے خداداد جوہر پھر چمکیں گے لیکن ۱۹۰۰ء میں یہ چمکے اور ایسے چمکے کہ دیکھنے والوں کی نظریں خیرہ ہوگئیں۔ ذہنی زندگی کے ہر شعبے میں خواہ وہ ریاضی ہو یا سائنس، شاعری ہو یا صنعت و حرفت ہندوستان میں ترقی کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ آریہ سماج کے قائم ہونے سے ویدانی فلسفے کے دوبارہ زندہ ہونے کا امکان ہے اس کے علاوہ کیشب چندر سین نے برہمو سماج کی بنیاد ڈالی ہے جس نے خدمت خلائق اور رفاہ عام کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اس میں

کیشب چندر نے مذہب کے عیسوی تخیل اور شرقی تخیل کو ملانے کی کوشش کی ہے۔

ہندوستان کے مذہبی مصلحوں میں سے دو خاص امتیاز رکھتے ہیں ایک تو رام کرشن (۱۸۳۶ء تا ۱۸۸۶ء) اور دوسرے انکے لائق شاگرد سوامی دیویکانند (۱۸۶۳ء تا ۱۹۰۲ء) ان دونوں نے اپنے ہموطنوں میں صدیوں کے بعد بھی مذہبی روح پھونکی ہے۔ ٹالسٹائے جو ہر میدان میں حقیقت کی تلاش میں سرگرم رہتا تھا ان دونوں کی طرف سے بھی غافل نہیں رہا۔ ویدک میگزین کے اڈیٹر رام دیو نے اُسے سوامی ویویکانند کی تصانیف بھیجی تھیں اس نے ان سب کو پڑھا اور ۱۸۹۶ء سے برابر ان مضامین کا مطالعہ کر رہا تھا جو سوامی جی کے قلم سے نکلتے تھے۔ اس کی نظر سے رام کرشن کے مقالات بھی گزرے۔ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ سوامی دیویکانند ۱۹۰۰ء میں یوروپ کی سیاحت کے دوران میں یاسنایا نہ جاسکے کہ ٹالسٹائے سے اور ان سے عمر بھر میں ایک بار تو ملاقات ہو جاتی۔ راقم الحروف کا قصد تھا کہ پیرس میں جاکر اس مقدس مہان کی زیارت کرے مگر شومیِ قسمت سے موقع نہ ملا جس کی آج تک ندامت باقی ہے۔

وہ ہندوستانی جو قلب باصفا رکھتے ہیں ٹالسٹائے کو کرشن کا اوتار سمجھتے ہیں اور بہت سے لوگ اُسے مہاتما کہتے ہیں۔ دی نیو ریفارمر کے اڈیٹر گوپال چیٹی ٹالسٹائے کے پیرو ہیں۔ انہوں نے ٹالسٹائے کی ہشتاد سالہ سالگرہ کے موقع پر (۱۹۰۸ء میں) ایک مضمون لکھا جس میں ٹالسٹائے کو گوتم بدھ سے تشبیہ دی۔ وہ ایک جگہ کہتے ہیں "اگر ٹالسٹائے ہندوستان میں پیدا ہوتا تو لوگ اُسے اوتار سمجھ کر، پرش سمجھ کر، سری کرشن سمجھ کر اُس کا احترام کرتے"

مگر یہ عجیب اتفاق ہے کہ ٹالسٹائے کو ہندوستان میں براہ راست جس جماعت سے سابقہ پڑا وہ سوراجیوں کی جماعت ہے۔ ۱۹۰۸ء میں سی آر داس نے جو آگے چل کر آزادی کی تحریک میں مہاتما گاندھی کے دست و بازو بن گئے ٹالسٹائے کو ایک خط لکھا جس

میں انہوں نے سچائی اور خلوص کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کیا اور ٹالسٹائے کے عدم مزاحمت کے نظریے پر نکتہ چینی کی اسی کے ساتھ انہوں نے ٹالسٹائے سے درخواست کی کہ اُن کے رسالے "فری ہندوستان" کی قلمی اعانت کرے۔ اس کے جواب میں ٹالسٹائے نے ۱۴ دسمبر ۱۹۰۸ء کو ایک طویل خط لکھا جس میں اُس نے پہلی بار عدم مزاحمت اور محبت کا پیام ہندوستانیوں کے نام بھیجا۔ اس نے ہر جملے میں سری کرشن کے فلسفے کو مدنظر رکھا اور ہندوستانیوں پر یہ الزام لگایا کہ وہ اپنی پرانی حکمت و دانش کو چھوڑ کر یوروپ کی تہذیب کی تقلید کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ "توقع تھی کہ برہما، بدھ اور کنفوشس کی قلمرو میں مغربی تہذیب کو کہیں جگہ نہ ملے گی یعنی چینی، جاپانی اور ہندی اپنے اپنے معلم کے نقش قدم پر چلتے رہیں گے۔ اور چونکہ وہ تشدد کے حامیوں کی غلطی سے اچھی طرح واقف ہیں اس لئے وہ مسائل زندگی کے حل کرنے کے لئے آشتی اور محبت کی تدابیر اختیار کریں گے لیکن کیسی بدقسمتی ہے کہ دوسری قوموں کو ان کی غلطیوں سے متنبہ کرنے کے بعد مشرق کے رہنے والے مغربی تہذیب سے مسحور ہوگئے چنانچہ جاپان کا یہی حال ہے اور اسکا انجام ہرگز اچھا نہ ہوگا۔ چین اور ہندوستان کے بعض رہنماؤں کا بھی اس طرف رجحان ہوگیا ہے چنانچہ آپ نے ہندوستان کے سوراج کا ذکر کرتے ہوئے کسی رسالے میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ غاصب کا مقابلہ کرنا نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے اور عدم مزاحمت سے دوسروں کو فائدہ پہنچتا ہے اور ہم کو سراسر نقصان"

"یہ کیوں؟ تم لوگ مذہبی آدمی ہو لیکن مغربی تہذیب سے مسحور ہوگئے ہو اور اپنی قوم کی قدیم رسم محبت کو توڑنا چاہتے ہو . . . . یوروپ کے لوگ جو پہلے مذہب کے غلام تھے اور اب سائنس کے بندے ہیں ہمیشہ سے تشدد کا خیال لوگوں کے کانوں تک پہنچاتے رہے ہیں۔ وہ حق کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ تم نے ان کا مقابلہ کرنے کے لئے کچھ بھی تیاری نہ کی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارا کیا ارادہ ہے۔ تم کہتے ہو کہ انگریزوں نے ہندوستان پر اس لئے قبضہ

کرلیا کہ ہندوستان میں مقابلے کی قوت نہ تھی۔ مگر واقعہ اس کے برعکس ہے انگریزوں کو مقابلہ کرنے میں اس لئے آسانی ہوئی کہ ہندوستانی ابتداسے انتہاتک اس عقیدے پر جمے رہے کہ تشدد ہی ہر منظم جماعت کی بنیاد اور اساس ہے۔ اسی عقیدے کی وجہ سے ہندوستانی اپنے سرداروں کے مطیع بنے۔ اسی عقیدے کے سبب سے وہ آپس میں لڑتے ہیں، یوروپ والوں سے لڑتے ہیں، انگریزوں سے لڑتے ہیں ..... ایک تجارتی کارخانہ جس میں تیس ہزار سے زیادہ افراد نہیں تھے بتیس کروڑ آدمیوں پر غالب آگیا۔ لیکن کیا انگریز اس شخص پر غالب آسکتے ہیں جسے اُن کی طرف رغبت نہ ہو؟ ان باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ نہیں کیا بلکہ ہندوستانیوں نے ہندوستان کو انگریزوں کے سپرد کردیا .... ہندوستان کی زندگی ماضی سے حال تک تشدد کے ماتحت گذرتی رہی ہے۔ ہندوستان دائمی محبت کے قانون کو سمجھنے سے قاصر ہے ... کتنے افسوس کی بات ہے کہ انسان کی عمر جہالت میں گزرتی ہے۔ جو چیز اس کے قبضے میں ہے اُسے وہ دنیا بھر میں تلاش کرتا ہے کیونکہ اُسے علم نہیں کہ وہ اس کے پاس موجود ہے۔ واقعی جاہل کی حالت رحم کے قابل ہے "میں نے اسے (محبت کا) زیور دیا ہے اور یہ (محبت کا) زیور اُس کے پاس ہے مگر وہ اس سے بے خبر ہے،، (سری کرشن)

"انسان کو صرف اس قانون، محبت پر عمل کرنا چاہئے جو اُس کے دل میں ودیعت کردیا گیا ہے اور صرف عدم مزاحمت اور عدم تشدد کے قانون کو پیش نظر رکھنا چاہئے تاکہ وہ زندہ رہ سکے۔ اس طرح نہ صرف کئی سو آدمی کئی ہزار آدمیوں پر غالب نہیں آسکتے بلکہ کئی لاکھ آدمی مل کر ایک آدمی کو مغلوب نہیں کرسکتے۔ بس تم یہ عہد کرلو کہ ہم کوئی گناہ نہیں کریں گے اور گنہگاروں کے ساتھ نہیں رہیں گے، قانون کو نہ توڑیں گے، خراج دینے سے انکار کرینگے، فوج میں نہیں داخل ہوں گے۔ پھر دنیا میں کوئی تم پر غلبہ نہ حاصل کرسکے گا،،

اس طویل خط کے آخر میں ٹالسٹائے نے پھر سری کرشن کے چند جملے نقل کئے ہیں

"بچو! چشم غفلت کھول کر دور تک دیکھو تمہیں ایک محبت سے معمور نئی دنیا نظر آئے گی یعنی فطری عالم جو یری خالص عقل سے بنا ہے ۔ یہی عالم حقیقی ہے ۔ پس تمہیں اندازہ ہوگا اس کمال اور برتری کا جو محبت نے تمہیں عطا کی ہے اور تم پہچانوگے ان باتوں کو جن پر عمل کرنے کی تمہیں محبت نے ہدایت کی ہے ۔

یہ کھلا خط جو ٹالسٹائے نے اصل میں سارے ہندوستانیوں کے نام لکھا تھا ایک نوجوان وکیل کے ہاتھ میں پڑا جو افریقہ کے شہر جوہانسبرگ میں رہتا تھا ۔ یہ شخص جسے دنیا مہاتما گاندھی کہتی ہے اس خط کو پڑھ کر جوش مسرت سے اچھل پڑا ۔ گاندھی نے غالباً ۱۹۰۸ء میں ٹالسٹائے کو خط لکھا جس میں انہوں نے یہ بتایا کہ وہ کس طرح دس سال سے ٹالسٹائے کی تعلیم کے مطابق اپنی قوم کی خدمت کر رہے ہیں اور اس بات کی اجازت چاہی کہ ٹالسٹائے نے جو خط سی ۔ آر ۔ داس کے نام لکھا تھا اس کا ترجمہ ہندوستانی میں شائع کر دیا جائے ۔

ٹالسٹائے نے اس خط کا جو جواب دیا وہ محبت میں ڈوبا ہوا تھا ۔ اُس نے لکھا کہ "میں تمہیں مبارکباد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ ظلم وستم کے مقابلے میں نرمی اور آشتی کا اور غرور و تکبر کے مقابلے میں انکسار و محبت کا بول بالا ہو۔" اس کے بعد جب ٹالسٹائے نے گاندھی کی کتاب ہند سوراج پڑھی تو اسے اس مذہبی تحریک کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ اُس نے گاندھی کو ایک خط میں لکھا کہ تمہارا عدم تشدد اور عدم مزاحمت نہ صرف ہندوستان کے لئے بلکہ ساری دنیا کے لئے قابل قدر ہیں ۔

ٹالسٹائے نے جب گاندھی کی سوانح عمری پڑھی تو اُسے بیحد خوشی ہوئی اور باوجودیکہ وہ اس زمانے میں سخت بیمار تھا مگر اس نے گاندھی کو کئی خط لکھے (مئی ۱۹۱۰ء) جب اسے کسی قدر صحت ہوئی تو اس نے (اپنے مرنے سے ایک مہینہ پہلے یعنی ۷ اکتوبر ۱۹۱۰ء کو) پھر گاندھی کو ایک خط لکھا جو عدم تشدد کے مذہب کے لئے انجیل کا حکم رکھتا ہے ۔ یہ خط جو گویا ٹالسٹائے کا وصیت نامہ ہے جنوبی افریقہ میں "انڈین اوپینین" میں شائع ہوا ۔ سچ پوچھئے

تو عدم تشدد کی پہلی کامیابی اس خط کی بدولت ہوئی ۔

قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ادھر یہ خط شائع ہوا اور اُدھر ۱۹۱۴ء کی عالمگیر جنگ شروع ہوئی جس کے شعلے دیکھتے ہی دیکھتے تمام عالم میں پھیل گئے اور لاکھوں خدا کے بندے اس نفرت اور عداوت کی آگ میں جل کر بھسم ہوگئے ۔

مگر شکر ہے کہ یہ ہلاکت اور تباہی کے ہنگامے ختم ہوگئے ہیں ۔ خونخوار درندوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں بند ہوگئی ہیں اور امن وامان کی بلبل یعنی گاندھی کی خوشگوار آواز صلح و آشتی کے ترانے سنا رہی ہے ۔ انسانی ہمدردی کا یہ نیا مقدس گیت بہت سے لوگوں کو پرانے گیت سے زیادہ شیریں اور زیادہ پر اثر معلوم ہوتا ہے ۔

عربی معاشرت پر ایرانی اثرات

یہ مضمون مشہور جرمن مستشرق فان اے کریمر کے ایک رسالے سے ماخوذ ہے جو
عنقریب بعض ضروری مضامین کے ساتھ کتابی صورت میں شائع ہو جائیگا۔

عراق و ایران کی تسخیر کے تھوڑے ہی دنوں بعد عرب ایرانی شہنشاہوں کی شان و شوکت اور انکے درباری آداب و مراسم اور تکلفات سے واقف ہو گئے تھے۔ اموی خلفا نے بھی ان کی بہت کافی تقلید کی ہے۔ قرآن مجید کے امتناعی احکام کے باوجود دربار دمشق میں شراب نوشی کی رسم عام ہو گئی تھی۔ ابتدا میں یہ لوگ انگور کا ابلا ہوا رس (طلا) یا ایک یونانی شراب جس کا نام رساطون ہے (رساطون یونانی لفظ ہی) استعمال کرتے تھے۔ امویوں کے زوال کے بہت کافی زمانے کے بعد ایک مرتبہ بغداد میں بلور کا ایک بہت بڑا جام دکھایا گیا تھا جس میں خلیفہ ہشام کی بیوی ام حکیم صبوحی پیا کرتی تھی دربار بغداد میں بھی رومیوں کی شراب کی محفلوں کی طرح خوشی کے موقعوں پر میخواروں کو پھولوں کے ہار پہنائے جاتے تھے۔

بایں ہمہ بنو امیہ کے زمانے میں دربار کے آداب بہت زیادہ سخت نہیں تھے ہر شخص دربار میں آجا سکتا تھا اور خاص خاص لوگ یا تو خلیفہ کے پاس ہی دیوان یا کرسیوں اور گدوں پر بیٹھتے تھے۔ ایک درباری نے لکھا ہے کہ ایک روز جب کہ ابھی چاندنی راتیں تھیں اسے ولید ثانی کے دربار میں جانیکا اتفاق ہوا تو ایک بہت بڑے طشت میں اسکے سامنے شراب کے چند جام پیش کئے گئے اور جب اس نے یہ دریافت کیا کہ یہ شراب نوشی کا کونسا موقعہ ہی تو اسے بتایا گیا کہ یہ وہ شراب ہی جسے ایرانی ہفت گاہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور جس کا دور سال کے ایک حصے میں برابر سات ہفتوں

یک قائم رہتا ہے۔ شام کی تفریحوں میں جب رقص سرود کی محفلیں قائم ہوتی تھیں تو خلفا قدیم ایرانی رسم کے مطابق پردے کی اوٹ میں بیٹھ جاتے تھے۔ یہ پردہ کمرے کے وسط میں لٹکا دیا جاتا تھا تاکہ خلیفہ اہل دربار اور گانے والوں سے ممتاز ہو جائے۔ لیکن اس رسم پر تمام خلفا نے عمل نہیں کیا۔

سرود کا فن جسے دربار دمشق میں غیر معمولی مقبولیت حاصل تھی عربوں نے ایرانیوں سے سیکھا تھا۔ شروع شروع کے بہترین گانے والے خواہ وہ مرد ہوں یا عورت یا تو ایرانی تھے یا ایرانی اساتذہ کے شاگرد۔ حریم خلافت میں شب و روز عیش و عشرت کا چرچا رہتا تھا۔ ان لوگوں میں اور مسلمانوں کے اولین خلفا میں جو کسی طرح بھی عام لوگوں سے ممتاز نہیں رہتے تھے کس قدر فرق تھا۔ ولید ثانی ہر روز جواہرات سے مرصع نئے نئے طلائی ہار پہنا کرتا تھا۔ اسی طرح ایک دور دراز صوبے کے عامل۔ عامل خراسان نے ایک مرتبہ دربار خلافت سے شکایت کی کہ اس کے صوبے کی ساری مالگذاری اس کے باورچیخانے کے اخراجات کے لئے پوری نہیں ہوتی۔ رفتہ رفتہ ایرانی لباس کا رواج عام ہوگیا۔ چنانچہ یزید ابن مہلب نے ایک عرب کو اس جرم میں سزا بھی دی تھی۔ عربوں کو ایرانی چیزوں سے خواہ مخواہ کا تعصب تھا ایک شخص نے اپنا چشم دید واقعہ بیان کیا ہے:۔ اسمٰعیل ابن یسار ایرانی نژاد تھا لیکن اس کے آبا واجدا اپنے دوسرے ہم قوموں کی طرح ایک عربی قبیلہ (تیم) کے مولا ہو گئے تھے۔ باوجود اس کے یہ اسمٰعیل ہر ایرانی شے کی تعریف کیا کرتا تھا۔ شروع شروع میں وہ عبداللہؓ ابن زبیر کی خلیفہ کا طرفدار تھا لیکن انکے زوال پر اس نے امویوں کی قصیدہ خوانی شروع کر دی۔ ایک مرتبہ اسے خلیفہ ہشام کے دربار میں حاضر ہونیکا موقع ملا ہشام اس وقت قصر رصافہ میں ایک مرمریں حوض کے کنارے بیٹھا تھا۔ اس نے اسمٰعیل سے کہا کوئی قصیدہ سناؤ۔ اس پر اسمٰعیل نے اپنے وہ اشعار پڑھنا شروع کئے جن میں اس نے اپنے ایرانی الاصل ہونے پر اظہار فخر کیا تھا

اسمٰعیل نے کہا :۔

"مجھے اپنے آبا و اجداد کی قسم میں وہ لکڑی نہیں ہوں جو لڑائی میں آسانی سے ٹوٹ جائے نہ وہ چشمہ ہوں جو خشک ہو جائے میں شریف قبیلے سے ہوں اور شان و شوکت میں کوئی مجھسے بڑھ کر نہیں۔ میری زبان تلوار کی طرح تیز ہے اور اس سے میں اپنے قبیلے اور اپنے خاندان کی عزت کی حفاظت کرتا ہوں خواہ وہ کوئی تاجدار کیوں نہ ہوں۔ میرے آبا و اجداد اپنے زمانے کے بادشاہ تھے۔ وہ نہایت شایستہ، فیاض اور مہماں نواز تھے۔ وہ شہرت اور عزت میں اور اپنی فوج کی کثرت میں خسرو اور شاپور سے مشابہ تھے۔ وہ لڑائی میں شیروں کی طرح حملہ آور ہوتے تھے۔ انہوں نے ترکوں اور یونانیوں کو نیچا دکھایا۔ وہ بھاری بھاری زرہیں پہنکر چلتے تھے جس طرح بھوکے شیر نکلتے ہیں اور اگر تم پوچھو تو میں تمہیں بتاؤں کہ ہم اس نسل سے ہیں جو سب سے افضل ہے۔"

پہلے تو خلیفہ صبر و تحمل کے ساتھ اس کے اشعار سنتا رہا لیکن آخر کار مغلوب الغضب ہو کر کہنے لگا "اسے حوض میں پھینکدو"، جو شیلے درباریوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور حوض میں پھینکدیا جس سے وہ بمشکل تمام ڈوبتے ڈوبتے بچا۔ بالآخر خلیفہ نے اسے شام سے نکالدیا اور اسمٰعیل نے بھاگ کر عرب میں پناہ لی جہاں وہ بغیر کسی روک ٹوک کے اپنے آبا و اجداد کی شان میں مدح خوانی کرتا رہا۔

دولت امویہ کے انقراض کے بعد جب عباسی حکومت قائم ہوئی تو اہل ایران اور ایران کے ہمدردوں کے دن پھر گئے۔ عباسی خلفاء کے دربار اور ان کے دار السلطنت میں بہت کافی ایرانی موجود تھے۔ ان لوگوں کو قرب سلطانی ہی حاصل نہیں تھا بلکہ رفتہ رفتہ انکو بڑے بڑے عہدوں اور مناصب پر فائز کیا گیا جس سے انکی دولت و ثروت اور جاہ و اقتدار میں بے حد اضافہ ہو گیا۔ برامکہ کے مشہور خاندان

کا حال کون نہیں جانتا۔ یہ وہی لوگ ہیں جو اپنے زوال کی منحوس اور المناک ساعتوں تک نہایت مطلق العنانی کے ساتھ حکومت پر متصرف رہے۔ بڑی بڑی مہموں کی سرداری بھی ایرانیوں ہی کے حصے میں آتی تھی۔ خلیفہ ہادی کے زمانے میں ایک ایرانی جو اپنا سلسلۂ نسب ایرانی عمال کے ایک پرانے خاندان سے ملاتا تھا اور جو اسلام قبول کر لینے پر خلیفہ منصور کا مولا ہو گیا تھا خوزستان کا امیر عساکر مقرر ہوا اور اسے اختیار دیدیا گیا کہ وہ اس اہم صوبے کی مالگذاری بھی وصول کر لیا کرے۔

یہ باتیں قدیم عربی جماعت کو نہایت ناگوار گذرتی تھیں اور وہ لوگ اکثر صاف صاف اپنے جذبات کا اظہار کر دیتے تھے۔ اس سلسلہ میں میں ایک ہجو کی طرف اشارہ کروں گا جو شروع عباسی عہد میں ایرانیوں کے خلاف لکھی گئی تھی اور جس سے عربی جذبات کی نہایت صحیح ترجمانی ہوتی ہے :-

"خدا کو یہ نہیں منظور تھا کہ میں تمہیں اسی وقت سے جانتا جب تم گھاس کی منڈی میں بیٹھا کرتے تھے اور ابھی تمہاری خوش قسمتی کا زمانہ نہیں آیا تھا۔ لیکن بمشکل ایک سال گذرنے پایا ہے کہ اب تم ریشم اور بانات کا لباس پہنے ادھر ادھر اکڑتے پھرتے ہو۔ ایک زمانہ تھا جب تمہاری عورتیں کنووں کے پاس بیٹھی دھوپ میں فاختاؤں کے ساتھ چلایا کرتی تھیں۔ خدا کی شان ہے کہ اب انکے بدن پر دنیا بھر کے ریشمی کپڑے نظر آتے ہیں۔ کیا انکو وہ زمانہ بھول گیا جب ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا وہ پہاڑیوں میں پتھر توڑا کرتی تھیں اور اپنے کرتے کے دامنوں میں گھاس کے بڑے بڑے گٹھے باندھ کر لایا کرتی تھیں۔ اب جوان کو مال و دولت نصیب ہوا تو وہ کس قدر بے شرمی سے جھوٹ بولتے ہیں اور کہتے ہیں ہم شریف ہیں، ہم دہقانوں کی اولاد ہیں۔ اور اگر ان میں سے کسی کمینے سے کمینے سے بھی پوچھا جائے کہ تم کون ہو تو نہایت غرور سے کہتا ہے

میں بہرام چوبیں کا بیٹا ہوں - میرا کون مقابلہ کرسکتا ہے، میں وہ ہوں جسے
کسریٰ نے مال و دولت عنایت کیا تھا اور اپنا وارث بنایا تھا"
ایرانیوں کے غرور پر اس سے زیادہ شدید حملہ اور کیا ہو سکتا ہے ؛-
" دیکھو اب انہوں نے گدہوں کی بجائے اپنی زینیں نہایت قیمتی ٹٹوؤں پر کس لی
ہیں اور ترکاری بوتے بوتے امرا و سلاطین کے محلوں میں پہنچ گئے ہیں - وہ
عربوں سے نفرت کرتے ہیں اس لئے کہ ان کو خدا اور اس کے رسول سے
نفرت ہے -"

لیکن اس اظہار غیظ و غضب کے باوجود جو سلب قوت اور زوالِ اقتدار کا ضروری نتیجہ تھا - عربوں کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا - دربار خلافت میں ایرانی اثر بتدریج بڑھتا گیا - یہانتک کہ خلیفہ ہادی، ہارون الرشید اور مامون الرشید کے عہد میں تو اس کی انتہا ہو گئی - مامون کے اکثر وزرا ایرانی تھے یا ایرانی النسل - بغداد میں ایرانی وضع قطع اور ایرانی طرز معاشرت دن بدن مقبول ہوتا گیا - رفتہ رفتہ لوگوں نے نوروز مہرجان اور رام قدیم ایرانی تیوہار بھی منانا شروع کر دئے - ارکان سلطنت ایرانی لباس پہنتے تھے - چنانچہ دوسرے ہی عباسی خلیفہ کا حکم تھا کہ ملازمین حکومت قلانیس (لمبی لمبی مخروطی سیاہ ٹوپیاں جو یورپ کی ٹاپ ہیٹ سے مشابہ تھیں) استعمال کیا کریں (۷۷۰ء - ۱۵۳ھ) دربار میں بھی ایرانی شہنشاہوں کے سے زرتار کپڑے پہنے جاتے تھے اور یہ صرف خلفا کا حق تھا کہ اس لباس کو جسے چاہیں عنایت کریں ہمیں متوکل کے زمانے کا ایک سکہ ملا ہے جس میں خلیفہ ایرانی لباس پہنے نظر آتا ہے -
اگرچہ ابتدا میں بھی مسلمان تصویر سازی کے کچھ بہت زیادہ مخالف نہیں تھے لیکن اس واقعہ سے یقین ہو جاتا ہے کہ دربار خلافت میں قدیم اسلامی تعصبات کا خاتمہ ہو چکا تھا اور یہ سب کچھ ساسانیوں کی تقلید کا نتیجہ تھا - بغداد کے اعلیٰ طبقوں [illegible]

اثرات کے اس طرح سرایت کر جانے سے مذہبی زندگی میں بھی ایک نئے ہیجان اور ایک جدید انقلاب کے آثار پیدا ہوئے۔ عراق میں ایسے مسلمانوں کی کمی نہیں تھی جنہوں نے نہایت خاموشی کے ساتھ ان مذہبی عقائد کو اختیار کر لیا تھا جنہیں اسلام سے کوئی نسبت نہیں تھی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ سب کچھ خاندانی اثر یا اجنبیوں سے میل جول کا نتیجہ تھا۔ عباسی عہد میں ان خیالات کو از سر نو تحریک ہوئی۔ بصرہ میں جو عہد خلافت کا سب سے بڑا تجارتی مرکز تھا۔ نہ صرف کثیر التعداد غیر عرب آبادی (جس میں ایرانی عنصر غالب تھا) موجود تھی بلکہ تجارتی تعلقات کی بدولت وہاں ہندی اثرات بھی پھیل رہے تھے۔ اسی شہر میں سب سے پہلے عقیدہ اختیار نے جسکی ابتدا دمشق میں ہوئی تھی ایک عقلی نظام دینیات کی شکل اختیار کی اور آگے چل کر مذہب اعتزال کے نام سے غیر معمولی وقعت حاصل کی۔ یہیں سب سے پہلے وہ آزاد خیال لوگ پیدا ہوئے جو رفتہ رفتہ اسلام سے بیگانہ ہوتے گئے اور یہیں سے مذہب سے بے اعتنائی کی وہ تحریک پیدا ہوئی جس سے آگے چلکر دربار خلافت بھی محفوظ نہیں رہا۔

ایثار کی فتح

تراوش قلم: میٹلڈا سیراؤ

(۱)

میٹلڈا سیراؤ (پیدائش ۱۸۵۶ء) ایطالیہ کے زنانہ اہل قلم کی صف اول میں شمار کی جاتی ہے۔ اس نے اپنے ملک کے سارے نسوانی طبقہ کے خلاف ایک شاہراہ زندگی اختیار کی۔ تیس سال کی عمر تک وہ مختلف شخصیتوں کے سوانح حیات پر رسائل و جرائد میں قلم فرسائی کرتی رہی۔

اس کے ابتدائی عہد کی تحریرات میں فرانسیسی حکمائے "واقعیت" (مثل زولا وغیرہ) کا رنگ علانیہ نمایاں ہے۔ بیلزاک کی روح سے ارباب قلم میں شاید ہی کوئی اس قدر متاثر ہو جیسی کہ میٹلڈا ہے۔ بعد میں اس نے نفسیات انسانی کا مطالعہ و تجربہ پیش کرنے والے ناول نویسوں کا مذاق اختیار کیا اور اس کے بھی بعد وہ تصوف جدید کے مسلک سے تعلق رکھنے والی جماعت مصنفین کے زمرہ میں داخل ہو گئی۔ چنانچہ اس کا افسانہ "ولی" اسی رنگ کا آئینہ دار ہے۔ اس کا طرز تحریر کسی قدر مردانہ ہے۔ لیکن اس کے قصوں میں بلا کا جوش و جذبہ ہوتا ہے۔ اُس کے ایک جدید افسانہ کی (ہیروئن) ایک امریکن عورت ہے لیکن وہ اہل امریکہ کے اس مذاق ادبی سے قطعاً کوئی ہمدردی نہیں رکھتی جس کا تقاضہ یہ ہے کہ "ہر قصہ کا خاتمہ مسرت آمیز اور نیک انجام پر ہو۔ مگر اس افسانہ (ایثار کی فتح) میں اس نے اسی امریکن مذاق کا تتبع کیا ہے، چنانچہ یہ قصہ اہل امریکہ کے نقطۂ نظر سے ایک "کامیڈی" ہے۔ اور خود مصنفہ کی زاویۂ نگاہ سے ایک "ٹریجیڈی"!

صوفیہ اپنے کام سے سر نہ اٹھاتی تھی اور اس کی نرم و نازک انگلیاں بڑی چابکدستی سے غفیس لیس پر متحرک تھیں لیکن لولو ادھر اُدھر کمرے میں ٹہل رہی تھی اور طاقچوں میں رکھے ہوئے سامانِ آرائش سے کھیل رہی تھی، یا وہ پھر کسی میز کی دراز کو کھولتی اور بے معنی انداز سے اس کے اندر جھانکتی

تھی۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس وقت اس کا جی کسی کام میں نہیں لگتا اور وہ بیتاب ہے کہ سلسلۂ گفتگو شروع کرے۔ مگر ساتھ ہی اپنی بڑی بہن کے پُروقار انداز سے مرعوب بھی ہے۔ خیر اب وہ ایک گیت گنگنانے لگی۔ اُس نے ایک شعر پڑھا، لیکن صوفیہ نے کوئی التفات نہ کیا۔ آخر لولو کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا اور اب وہ پوری بیباکی سے ہمکلام ہونے پر مجبور ہوگئی۔ وہ اپنی بہن کے بالکل سامنے جا کھڑی ہوئی اور پوچھا:-

"صوفیہ! انہیں کچھ خبر ہے کہ اُستانی نے مجھے کیا کہا ہے ؟ !"

"یقیناً کوئی دلچسپ بات نہ کہی ہوگی"

"صوفیہ! یہ ایسا خشک و سرد جواب ہے کہ اُس کو سُنکر گرمی کے موسم میں بھی آدمی کی رگ و پے میں سردی سرایت کرجائے! میری کشمیری بہن! آخر یہ سردی اور سرد مہری تم میں کہاں سے آگئی ہے ؟"

"لولو! تم ابھی تک بالکل بچہ ہو !"

"ہاں! یہی تو تم کو غلط فہمی ہے؛ میری پیاری بہن! میں بچہ نہیں ہوں؛ میری تو اب شادی ہونے والی ہے !"

"کیا کہا ؟ !"

"جی ہاں! یہی وہ غیر دلچسپ بات ہے جو جینٹے نے مجھ سے کہی ہے !"

"کس قدر لغو بات ہے! میں تمہاری گفتگو کا ایک لفظ بھی سمجھنے سے قاصر ہوں"

"اچھی بات ہے؛ تو اب میں تم کو ساری داستان ہی سنادوں، جس طرح ڈرا مانویس سُنایا کرتے ہیں؛ لیکن حضور کے گوش گذار رہے کہ یہ ذرا طویل اور مُسلسل تذکرہ ہوگا؛ اور میں سرکارِ عالی سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ پوری توجہ سے اُس کو سُننا بھی گوارا فرمائیں گی ؟"

"ہاں ہاں! لیکن جلدی کیجئے"

"میدانِ مریخ میں جس دن گھوڑ دوڑ ہوئی ہے وہ دن اور وہ موقعہ اس داستانِ عشق کا

وقت اور محل ہے۔ آپ وہاں تشریف فرما تھیں۔ اس لئے کہ آپ تو حسب معمول اپنی کتابوں میں مستغرق تھیں !"

"اگر تم نے اسی طرح قصہ بیان کیا اور نفس مضمون کو چھوڑ کر ایسی ہی بیراہ روی اختیار کی تو میں ایک حرف آیندہ سننے کے لئے تیار نہیں ہوں !"

"اجی آپ سُنیں تو ! یہاں تو وہ حال ہو رہا ہے کہ :-

مرا دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد　　　　وگر دم درکشم ترسم کہ مغز اُستخواں سوزد

"اچھا اب آپ شروع بھی کریں گے یا نہیں ؟"

"ارے صاحب ذرا دم تو لینے دیجئے ! اچھا تو گھوڑ دوڑ میں ہم اگلی صف میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں پاؤ لولیوٹیو آیا اور ہمارے سامنے ایک خوبصورت نوجوان کو پیش کیا۔ یہ رابرٹ مانٹی فرینکو تھا۔ خیر رسمی صاحب سلامت اور طرفین سے بے معنی تکلف و تپاک کے بعد وہ لوگ عین ہماری پشت والی قطار میں بیٹھ گئے۔ ہمارے آپس میں دو چار ہی جملوں کا تبادلہ ہوا تھا کہ گھوڑ دوڑ کے شروع ہونے کا سگنل ہوا۔ تم جانتی ہو کہ گارگن (گھوڑی) میری منظورِ نظر تھی، مجھے مطلق خبر نہ تھی کہ میرے حق میں وہ کس قدر بے مُروّت ثابت ہونے والی ہے ! خیر۔ آدمی کو حیوانوں کی مُحسن کشی پر بھی صبر کرنا پڑتا ہے۔ العرض دَوڑ شروع ہو گئی اور گھوڑے گرد و غبار کے بادل میں غرق ہو گئے۔"

بس یکبارگی چلائی کہ "گارگن جیت گئی"۔

فرینکو نے کہا: "نہیں، بلکہ لارڈ لیویلو (گھوڑا) جیتا !"

میں اُس کی تردید پر کبیدہ خاطر ہوئی مگر وہ مُسکراتا رہا اور اسی جملہ کی تکرار کرتا رہا۔ آخر ہماری نوک جھونک اسی شرط پر ختم ہوئی کہ دیکھیں دونوں میں سے کون جیتتا ہے۔ کامل نصف گھنٹہ کی اُمید و بیم کے بعد مجھ کو معلوم ہوا کہ گارگن نے مجھے دھوکا دیا۔ میں ہاری اور مانٹی فرینکو جیتا۔ ذرا اس بات پر غور کرنا ! اب میں اُس سے کہہ رہی ہوں کہ میں ابھی شرط کا روپیہ ادا کرتی ہوں،

اور وہ سرنگوں ہو کر آداب بجالاتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ کچھ مضائقہ نہیں، جلدی کیا ہے" تھوڑی دیر کے بعد میں اُس سے شیا جا پر ملتی ہوں اور ایک مستفسرانہ نگاہ اُس پر ڈالتی ہوں اور وہ بدستور سرخم کرتا ہے اور ایک معنی خیز تبسم اس کے چہرہ پر ظاہر ہوتا ہے۔ بس بالکل تھیٹر کا سا معاملہ تھا! اب میں انتہائی اشتیاق تجسس کی حالت میں ہوں ....

رابرٹو ایک جوانِ رعنا ہے، ۲۶ سال کی عمر ہوگی؛ اور آج صبح کا یہ واقعہ ہے کہ مانٹی فرنیکو جو میرے آیندہ خسر بننے والے ہیں دو گھنٹہ تک امّی کے ساتھ مصروفِ گفتگو رہے!"

"اچھا!" صوفیہ کے مُنہ سے نکلا۔

"جی! اب تو لوگوں کے چہروں پر توجّہ کی علامات نظر آتی ہیں! خیر! تو جن باتوں پر اُس مُلاقات میں بحث ہوئی ہے اُن کی مجھ کو پوری اِطّلاع ملی ہے: مختصراً یہ کہ شادی کے جملہ مراتب اب طے پا گئے ہیں، مگر ہاں ایک نہایت اہم جزوی امر کا تعین ابھی باقی ہے۔ یعنی یہ کہ میئر کے دفتر ("دار النکاح") میں اب مجھے کس دن جانا ہے، اور آیا میں اُس دن خاکستری گون پہنوں گی یا قرمزی رنگ کا؟ اور ہاں اُس دن مجھ کو پھندنے دار ٹوپی پہننی چاہیئے یا بے پھندنے کی؟"

"تم تو ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو؟"

"ہوا کا گھوڑا؟ بھلا یہ کیونکر؟ تمہیں کہو اب کون سی رُکاوٹ باقی ہے؛ رابرٹو اور میں ایک دوسرے پر دیوانہ وار شیدا ہو جائیں گے؛ ہمارے والدین بھی اس رشتہ سے مطمئن ہیں۔"

"اور تم اِس طریقے سے ایک شخص سے شادی کر لو گی؟!" صوفیہ نے سوال کیا۔

"اِس طریقے کے کیا معنی ہیں؟ یہ تو بہت معنی خیز لفظ ہے!"

"یعنی یہی کہ بغیر اس کو جانے ہوئے اور بغیر اُس سے محبّت و اُلفت کے پینگ بڑھائے ہوئے!"

"مگر ایسا تو نہیں ہے، میں اس کو جانتی ہوں، میں نے اُس کو گھوڑ دوڑ میں دیکھا،

پھر باہر ٹہلتی ہوئی بھی اُس سے ملی ؛ باہمی شناسائی اِس حد تک بڑھ گئی ہے کہ میں اُس کی پرستش کرنے لگی ہوں ! پرسوں کا ذکر ہے کہ محض اس بات پر کہ میری اُس کی مُلاقات نہ ہوسکی میں نے دوپہر کا کھانا نہ کھایا اور صرف تین پیالی چاء پر دن گزار دیا ؛ اُس دن میں قریب تھا کہ خودکُشی کرلیتی !"

"اُور وہ ! ؟" صوفیہ نے پوچھا

"وُہ ؟ وہ بھی یقیناً مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے ، پس معلوم ہوا کہ مجھ سے مُحبّت بھی کرتا ہے" لولو نے جواب دیا اس جواب میں ایک فاتحانہ لہجہ تھا ؛ مگر جب اُس نے دیکھا کہ اس بات پر صوفیہ کا چہرہ زرد پڑ گیا ہے تو وہ اس نا عاقبت اندیشانہ انداز پر مُتاسّف ہوئی ۔ بہن کے سر پر جُھک کر اُس نے پیار سے پوچھا :

"کیوں بہن ! کیا میرے مُنہ سے کوئی ناگوار بات نکلی ؟"

"نہیں پیاری نہیں ! تم ٹھیک کہتی ہو ؛ جب کوئی عشق کرتا ہے تو شادی بھی کرتا ہے ! لیکن جب مُحبّت نہ ہو تو مُحبّت پیدا تو نہیں کی جاسکتی !

عِشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتشِ غالبؔ ✤ کہ لگائے نہ لگے اور بُجھائے نہ بنے !"

یہ کہنے کے بعد صوفیہ کے مُنہ سے ایک آہ نکلی !

"بہن ! یہ کیا کہا کہ "لگائے نہ لگے ؟" میں تم سے کہتی ہوں کہ اس آگ کا بھڑکانا آسان ہے ، صوفیہ ! لیکن تمہاری طرح جب کسی کے ابروؤں سے متانت ٹپکتی ہو ، آنکھوں سے غم برستا ہو ، اور ہونٹوں پر کبھی تبسّم نہ پیدا ہوتا ہو ! جب تمہاری طرح کوئی لڑکی جاکر کونے میں بیٹھ جائے اور وہاں مصروفِ غور و فکر ہو جائے ، درآنحالیکہ دوسری لڑکیاں ناچتی کودتی اور ہنسی دِلّگی کرتی پھر رہی ہوں ۔ جبکہ تمہاری طرح کوئی ہر وقت پڑھا ہی کرے اور عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بجائے فلسفیانہ اور شاعرانہ خواب ہی دیکھا کرے ! اور جبکہ تمہاری طرح کوئی لڑکی کم سنی ہی میں بڑے بوڑھوں کا سا متفکرانہ انداز اختیار کرلے ، تو اُس وقت تو بلاشبہ یہ

مشکل ہے کہ کوئی اُس سے محبّت کرے !"

صوفیہ نے اپنا سر جھکا لیا اور کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس کے ہونٹوں پر آہستہ سے ایک ارتعاش پیدا ہوا اور ایسا معلوم ہوا کہ اُس کے لب پر آہ ہے۔ لیکن وہ ضبط کرنا چاہتی ہے! یہ حالت دیکھکر لولو نے پوچھا:

"بہن! کیا میں نے تمہارے جذبات کو پھر مجروح کر دیا؟ .... یقین ماننا کہ میں نے یہ ساری باتیں اس لئے کہی ہیں کہ لوگ تم سے بھی محبّت کرنے لگیں، اور میں تمکو شانِ محبوبی میں دیکھوں! تمہارے گرد و پیش محبّت و اُلفت کا حصار رہو اور میں تم کو ایک روز دُلہن بنا ہوا دیکھوں! ہاں! کیا خوب ہو کہ میری اور تمہاری شادی ایک ہی دن رچے!!"

"اُس سے بڑھ کر کوئی حماقت نہیں! سُنا لولو! میں بڑھاپے تک کنواری رہنا چاہتی ہوں!"

"نہیں میری دوشیزہ! میں اس کو کب گوارا کر سکوں گی! تم کیسی خراب آدمی ہو! خُدا نے تم کو کیا عجیب الخلقت بنایا ہے! اگر رابرٹ واقعی کوئی اچھا آدمی ہے تو اُس کا ضرور کوئی کنوارا بھائی بھی ہونا چاہیئے، کاش ایسا ہی ہو!"

گفتگو یہیں تک پہونچی تھی کہ اُن کی ماں کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ ہوا خوری کے لباس میں تھی۔

"کیا آپ پھرنے جا رہی ہیں، امّی؟" لولو نے پوچھا۔

"ہاں پیاری میں اس وقت مُنیم کے یہاں جا رہی ہوں"

"اوہو! مُنیم کے یہاں! تو معلوم ہوا کوئی کاروبار کا معاملہ ہے۔

"بس لولو! تم کو جلد حقیقت معلوم ہو جائے گی! صوفیہ! تھوڑی دیر کے لئے تم میرے ساتھ چلو۔"

"ایں! کیا صوفیہ کو بھی کمبخت مُنیم کے ساتھ کوئی سابقہ پڑا کرتا ہے؟!"

"لولو! میں کہتی ہوں کہ تم کبھی متین بھی ہوگی؟"

"بہت جلد امی! آپ خود دیکھ لیں گی۔"

لولو نے دروازہ کھولا تاکہ ماں اور بہن باہر نکل جائیں، اور پھر اُن کو دو دفعہ جُھک کر سلام کیا۔ اور دَبی زبان سے کہا: "میڈیم میڈیمائسل!"

جب دونوں کمرے سے روانہ ہوگئے تو لولو نے دروازے پر سے ان کو پکارا۔ اور ایک فرمایشی قہقہہ لگایا:

"ہاں ہاں! اپنی باتیں جاری رکھیئے، جاری رکھیئے! میں بھی جان بوجھ کر انجان بن جاؤں گی۔"

(۳)
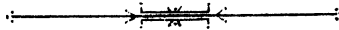
بحیثیت مجموعی رابرٹ مانٹی فرینکو کوئی صاحب فکر آدمی نہ تھا۔ سچ یہ ہے کہ اس کو اپنی فکر و نظر کو نشو و نما دینے کا کوئی موقع ہی نہ ملا تھا۔ گھوڑوں کی سواری، ملاقاتیں اور دعوتیں ان ہی ہنگامہ آرائیوں میں اُس کے دن اُڑ جاتے تھے؛ اور اُس کی زندگی اب نہایت پُرلطف طریقے سے اُس کی حسین مہ جبین لولو کی آغوشِ اُلفت میں بسر ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ بعض دردسری کے کام بھی رابرٹ کو انجام دینے پڑتے تھے: یعنی وکلاء کے ساتھ اوقات مقررہ پر طے شدہ قرارداد کے مطابق مُلاقات کرنا۔ معاہدوں پر دستخط کرنا اور پُرانے قرضوں کی حساب فہمی وغیرہ وغیرہ۔ اور آئندہ متاہل زندگی کی تیاریوں اور شادی کی کوشش میں جو مسلسل دورے اُس کو کرنے پڑتے تھے۔ اُن کا تو کچھ ذکر ہی نہیں! بمشکل اُس کو آدھا گھنٹہ مطالعہ کے لئے ملتا ہوگا۔ یا کسی ہوٹل کے سامنے پندرہ منٹ چہلقدمی کے لئے! الغرض اس کو کبھی کسی نے اس حال میں نہ دیکھا کہ وہ غور و فکر میں محو ہو، نہ کبھی یہ سُنا کہ وہ کسی اجتماعی مسئلہ کے حل کرنے میں مصروفِ فکر پایا گیا ہو۔ رابرٹ کی زندگی کسی دردناک حادثہ سے آشنا نہ ہوئی تھی اور نہ اُس کی سیرت میں کوئی رستمانہ بات تھی بلکہ اس کے برعکس وہ ایک دنیادار اور کاروباری مزاج کا آدمی تھا اور اُس کے

بہت سے ساتھی اُس کی اس اُفتادِ مزاج پر رشک کرتے تھے۔

لیکن آج دوپہر کو خلافِ معمول اُس کو اس رنگ سے دیکھا گیا کہ وہ اپنی آرام کرسی پر لیٹا ہوا تھا۔ اُس کی ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر رکھی ہوئی تھی اور اُس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی اور مُطالعہ کرنے کی حقیقی خواہش کے آثار اُس کے چہرہ پر نمایاں تھے! کتاب اگرچہ دلچسپ تھی، لیکن یہ عجیب بات تھی کہ کتاب کا پڑھنے والا ایک بے خودی و محویت کے عالم میں تھا واقعہ یہ ہے کہ حقیقت کچھ اس سے بھی زیادہ تھی یعنی وہ کسیقدر مُضطر و مُضطرب بھی تھا! اُس کو ورق گردانی کا کوئی موقع نہ ملتا تھا اس لئے کہ دو تین سطریں پڑھنے کے بعد اُس کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مطبوعہ حروف اپنی جگہ سے محو ہو گئے ہیں، اِدھر اُدھر اڑتے پھرتے ہیں، آپس میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں، اور پھر نظر سے بالکل غائب ہو جاتے ہیں! آج غیر شعوری طور سے رابرٹو کا دل و دماغ فکر و تخیّل کی نئی اور غیر معلوم دُنیا کی سَیر کر رہا ہے!!

"والد اس نسبت سے مطمئن ہیں؛ میری سب چچیوں نے اپنی دُعائیں بھیجی ہیں، لیکن میری رشتہ کی بہنیں خفا ہیں! اُدھر ہوٹل کے حلقۂ احباب میں جو میرے دوست آشنا ہیں وہ ایک معنی خیز انداز میں مجھ کو مُبارکبادیں دے رہے ہیں! میرے قلبی دوست بڑی گرمجوشی سے میرا ہاتھ اپنی گرفت میں لے لیا کرتے ہیں۔ سوسائٹی میں یہ ساری باتیں پسندیدگی کے آثار ہیں اور فی الواقع شادی کی ایک "فضا" پیدا ہو گئی ہے۔ .... اس حقیقت سے انکار کرنا مشکل ہے کہ لولو بہت حسین ہے؛ جس وقت وہ اپنی شوخ و شنگ آنکھیں مجھ پر ڈالتی ہے، ہاں جب وہ مصروف تبسّم ناز ہوتی ہے اور اُس کے لب لعلین کی آڑ میں دُرِ دندان کی جھلک دکھائی دیتی ہے تو بے اختیار میرے جی میں یہ بات آتی ہے کہ اُس کا پیارا سر اپنے ہاتھوں میں لے لوں، اور بار بار اُس کو چُوموں! اُس کی سیرت بھی بہت خوب ہے؛ یوں کہنا چاہیئے کہ وہ زرّین مزاج رکھتی ہے، ہمیشہ خوش و خرّم اور ہشاش بشاش رہتی ہے، بہت نیک نہاد ہے، ہنسی دل لگی کے لئے ہر وقت آمادہ رہتی ہے۔ بہت ذہین اور حاضر جواب ہے:

خوش فعلیوں اور شگفتہ طبعیوں سے لبریز ہے ، اور کبھی مغموم و ملول نہیں ہوتی ؛ غرض یہ کہ ہماری اُس کی خوب نبھے گی ۔ میں پُر متانت انداز کو پسند نہیں کرتا ۔ مجھے تو اُس کے دیکھنے تک کی برداشت نہیں ۔ بالخصوص اُن لوگوں میں جن سے میں محبّت کرنا چاہتا ہوں مجھکو ہمیشہ ایسا محسوس ہوا ہے کہ آدمی کے چہرے کے ایسے آثار کے پیچھے اندرونی رنج و غم ہوتا ہے جس سے میرا دل مطلقاً ناآشنا ہے ، اور جس کا میرے پاس کوئی درماں نہیں ۔ بلکہ مجھکو یوں کہنا چاہیئے کہ ایسے غم و الم کا میں غیر ارادی طور سے خود باعث بنجاتا ہوں ! صوفیہ جو میری سالی بننے والی ہے اُس کی طبیعت کا یہی رنگ ہے ۔ مجھے سرد مہر اور جذبات سے خالی چہرے سے چڑ ہے ۔ جب کبھی وہ میرے سامنے آجاتی ہے میرے ہوش و حواس گُم ہو جاتے ہیں ۔ میرے ہونٹوں سے ہنسی کافور ہو جاتی ہے ، اُس وقت اگر موسمِ بہار کا شاندار آفتاب بھی ضیا پاشی کر رہا ہو تب بھی میرے لئے یہ سارا حسین منظر ماہِ نومبر کا ایک سرد و خشک اور بے رونق اور بے کیف دن بن جاتا ہے ! اس وقت مجھے لوٹو سے بھی خوش طبعی کرنے کی جرأت نہیں ہوتی ! الغرض صوفیہ سارے جوش و مسرّت کی قاتل ہے ! .... ممکن ہے
اُس نے وہ ناگوار اثر محسوس کیا ہو جو وہ مجھپر ڈالتی ہے کیونکہ جس وقت وہ مجھسے بات کرتی ہے تو آنکھیں چار نہیں کرتی ۔ مجھ سے ہاتھ بھی نہیں ملاتی ، اور اگر اُس کو مجھے کسی بات کا جواب ہی دینا ہوتا ہے تو وہ مختصر ترین الفاظ اختیار کرتی ہے ۔ شاید وہ میری ناپسندیدگی کو جان گئی ہے ، ممکن ہے میری روش سے شاکی بھی ہو !

"مگر لوٹو کو دیکھو کہ ہمیشہ ہنستی رہتی ہے ؛ وہ کتنی شوخ ہے ! وہ کبھی مجھ سے متانت کا ایک کلمہ بھی نہیں کہتی ، اور کبھی اس کو اس قسم کا لفظ مُنہ سے نکالنا بھی پڑتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بن رہی ہے ، اُسے یہ زبان ہی نہیں آتی "

"وہ مجھ سے محبّت کرتی ہے ، مگر وہ محبّت نہیں جو دیوانگی کی حد تک پہونچی ہوئی ہو ، سچ تو یہ ہے کہ اس معاملہ میں میرے جذبات بھی مجنونانہ نہیں ہیں ۔ اور یہ بات بہت اچھی ہے !

اگر مجھ سے پوچھا جائے تو میں کہوں گا کہ دو نظریوں پر میرا عقیدہ بالکل راسخ ہے: ایک یہ کہ جو مرد اور عورت آپس میں ہمرشتہ ہونا چاہتے ہیں اُن کو ہم رشتہ ہونا چاہیئے؛ دوسرے یہ کہ اُن کو اپنی ازدواجی زندگی کا آغاز تیز و تند جذباتِ عشق سے نہ کرنا چاہیئے۔ یہی ہم دونوں کا معاملہ ہے! مَیں اور لولو آپس میں بہت ہی خوشی و خرّمی کی زندگی بسر کریں گے؛ ہم اٹلی کا ایک چکّر لگائیں گے لیکن عجلت کے ساتھ نہیں۔ چھوٹی چھوٹی منزلیں کریں گے اور ہر قسم کی لُطف و آسایش سے لذّت لیں گے، جہاں چاہیں گے قیام کر دیں گے، اور بہت ہی حقیر اور غیر اہم چیزوں کو بھی بے دیکھے نہ چھوڑیں گے۔ اس طرح ہم اپنی سیر و سیاحت میں تین مہینے صرف کر دیں گے؛ مگر نہیں، یہ کافی نہ ہوگا! یوں کہنا چاہیئے کہ چار مہینے! مجھ کو اس بات سے خوشی ہوگی کہ مَیں لولو کو صوفیہ کی ماتمی صحبت سے تھوڑے دنوں کے لئے ہٹا لیجاؤں گا! لیکن میں کہتا ہوں کہ کیا یہ کوئی فطرت کا تقاضا ہے کہ یہ لڑکی (صوفیہ) اس سن و سال میں اس قدر متین ہو! اُسکی عمر ۲۳ سال سے زیادہ نہ ہوگی، اور اس کا چہرہ حُسن کے نقش و نگار سے خالی نہیں ہے! واقعہ یہ ہے کہ اس کی آنکھیں بہت حَسِین ہیں اور سارا انداز تو ایسا ہے جیسا کہ ایک بادشاہ بیگم کا ہوتا ہے! اگر وہ اس درجہ خشک و پُر وقار نہ ہوتی تو اُس میں دلفریبی اور باصرہ نوازی کے بہت سے سامان موجود تھے۔ میں شرط لگاتا ہوں کہ اگر اس کا یہی رنگ رہا تو وہ بڑھاپے تک ناکتخدا ہی رہیگی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید اس کو کوئی اندرونی روحانی جانکاہ غم ہے؛ ممکن ہے اس پردے کے پیچھے کوئی داستانِ عشق چھپی ہوئی ہو یعنی کسی "عشقِ ناکام" کا معاملہ! مجھ کو کتنا اشتیاق ہے کہ مجھے اُس کی اس غیر معمولی خاموشی اور بے خودی کا راز معلوم ہوتا! میں اور لولو ایکی مرتبہ جب اکیلے ہوں تو میں اس معمّے کی بابت اس کا خیال معلوم کروں گا۔

ہاں میری لولو پھولوں کی بھی عاشق ہے، اپنے اس مذاق گلچینی سے اس نے مجھ کو اُسی شام کو مطلع کیا تھا جب مجھے اُس کے گھر جانے کا دوسرا موقع تھا۔ اپنے نازک ہاتھوں سے وہ کس انداز سے پھولوں کو توڑتی ہے! اور یہ پھول اُس کے ہونٹوں کے قریب جاکر ہمرنگی کی

وجہ سے کیسی غیر معلوم اور ناقابلِ شناخت ہو جاتے ہیں! اور ہاں تھوڑی دیر کی "خانہ براندازیِ چمن" کے بعد وہ کیسا پیچ و تاب کھاتی ہے کہ اور پھول اور کلیاں اب توڑنے کو نہیں رہیں! سچ مچ بڑی پیاری ہے، بڑی ہی پیاری ہے! ایک دن اُس نے چپکے سے میرے کان میں کہا، کہ "جب بادل گرجتا ہے تو میرا جی لرز جاتا ہے اور میں دوڑ کر اپنا سر تکیوں میں چھپا لیتی ہوں"

اپنے مذاق لباس کے متعلق ذکر کرتے ہوئی اُس نے یہ بات بیان کی کہ "میں مدتوں سے ایک سیاہ مخمل کے گون کا خواب دیکھ رہی ہوں کہ جس کے گلے اور آستینوں پر سفید جھالر لگی ہو، پوشاک کے معاملہ میں میرا یہ محبوب تخیّل ہے"

اُس نے مجھکو جتا دیا ہے کہ "میں رشک و رقابت کا ایک قاتلانہ جذبہ رکھتی ہوں، ایسا جسکے لئے اہلِ اسپین ضرب المثل ہیں اور اپنے دشمن سے انتقام لینے کے لئے میری خواہش یہ ہوتی ہے کہ میں ایک چھوٹا سا زرکار دستہ کا خنجر خریدوں!"

جس وقت ان الّڑھ پنے کے طفلانہ خیالات پر وہ سرگرم گفتگو ہوتی ہے تو اُس وقت پرستش کے قابل ہوتی ہے! اور تو اور صوفیہ بھی بعض اوقات اُس کی باتیں سُنکر مُسکرانے پر، مجبور ہو جاتی ہے، اور پھر اُس وقت اس لڑکی کا چہرہ کتنا دلفریب ہو جاتا ہے! الیکن جیو فیہ! ارے یہ صوفیہ! اس کے قلب کی گہرائیوں کو کوئی کب پا سکے گا؟!"

یہاں پہونچکر اُس کے گھٹنوں پر رکھی ہوئی کتاب فرش پر گر پڑتی ہے، اور یہ نوجوان اس آواز سے چونک پڑتا ہے اور حیرت زدہ ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا ہے. ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ خود اپنے کو پہچاننے سے قاصر ہے!

مگر یہ وہی ہمارا دوست رابرٹ مانٹی فرنیکو ہے جو حسین تخیلات کے پرستان میں اِس وقت مصروفِ خواب ہو گیا ہے!

---

(۳)

جھٹپٹا یوں چھایا ہوا تھا جیسے آسمان سے بھوری راکھ برس رہی ہو صوفیہ کھڑکی میں

بیٹھی ہوئی سڑک کے ہجوم اور شور و غوغا کو دیکھ اور سُن رہی تھی۔ یہ وہ موقع تھا جب شہر کا چوک لوگوں کی چہل پہل سے بہت بارونق ہو جاتا ہے اور مجمع کے تصادم سے یہ جگہ کافی خطرناک بھی ہو جاتی ہے۔ پیدل راہ گیروں اور گاڑیوں کی کثرت سے بازار میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ الغرض ایک مسلسل زندہ سیلاب تھا جو اس راہ سے رواں تھا صوفیہ کی آنکھیں کسی خاص شخص کو ڈھونڈھ رہی تھیں۔ یکبارگی اُس کے چہرے پر ایک سُرخ رنگ آ گیا۔ اُس نے آہستہ سے اپنا سَر جُھکایا، اُس کے رخسارے زرد پڑ گئے اور پیچھے ہٹ کر وہ کمرے میں چلی آئی۔ ایک منٹ کے بعد لولو آندھی پانی کی طرح آدھمکی، دروازوں کو دھڑ سے کھولا۔ کرسیوں اور میزوں کو اِدھر اُدھر پھینکا اور چشم زدن میں صوفیہ کے پاس کھڑی تھی۔

"کیا کر رہی ہو تم یہاں، ڈانا صوفیہ سینٹ انجیلو؟ غالباً پڑھ رہی ہو گی؟"

"جی ہاں پڑھ رہی تھی۔"

"لیکن تم نے اس کی بھی ضرورت محسوس نہ کی کہ کھڑکی میں کھڑی ہو کر اس وقت سڑک کے منظر کا لطف اُٹھاتیں؟!"

"اور اگر یہ مقصد عالیہ میں حاصل بھی کر لیتی تو کیا ہو جاتا؟"

"ہیہات! ہیہات! ابھی میں تو اس وقت بالاخانہ پر البینا درزی کی منتظر تھی، چنانچہ آج شام کو زیب تن کرنے کے لئے وہ میرا گون تیار کر کے لایا تھا جس کے دیکھنے میں مَیں مشغول تھی۔ اور اسی کام میں مَیں اتنی دیر وہاں رُکی رہی۔ انتظار اور بےصبری سے میرا بُرا حال ہو رہا تھا کیونکہ میں جلد سے جلد یہاں حاضر ہونا چاہتی تھی۔ کل شام کو میں نے رابرٹو سے کہا تھا کہ اپنا خاکستری اُوَر کوٹ پہنکر آئے، گاڑی میں بہت نفیس سامان اور گھوڑے پر اعلےٰ درجہ کا ساز ہو، اور ٹھیک ساڑھے چھ بجے سیر کو نکلنے کا انتظام کیا جائے۔ لوگ کیا جانیں کہ وہ میری فرمایش کی حرف بحرف تعمیل کریگا!"

"رابرٹو تو اسی ساز و سامان کے ساتھ ابھی اپنی گاڑی میں یہاں سے گذرا تھا اور وہ اسی رنگ کا اُوَر کوٹ بھی پہنے ہوئے تھا۔"

"خدا کی قسم ؟!" لولو چلّا اُٹھی، "کیا یہ واقعہ ہے ؟ نہیں بھلا کس طرح معلوم ہُوا ؟ میں سمجھتی تھی کہ تم پڑھنے میں مشغول ہو گی !"

"میں کھڑکی میں بیٹھی ہوئی تھی"

"اور تم نے رابرٹو کو پہچان لیا ؟ مگر تم تو کبھی اُس کی طرف دیکھتی بھی نہیں ! کیسی عجیب بات ہے ! ہاں بتاؤ تو کیا اُس نے تم کو سلام کیا تھا ؟"

"ہاں !"

"ہاں بہن بتا نا تو اُس نے اپنی ٹوپی کس طرح اُتاری تھی ؟"

"ٹوپی کس طرح اُتاری تھی ؟ ! .... جس طرح ہمیشہ اُتارتا ہے ؟ !"

"اچھّا تم نے بھی اُس کے سلام کا جواب دیا تھا ؟"

"جواب ؟ کیا تم سمجھتی ہو کہ میں آداب تہذیب سے اس قدر عاری ہوں کہ کسی کے سلام کا جواب نہ دوں ؟ !"

"اچھّا یہ بتاؤ کہ تم اُس کو دیکھ کر کچھ مُسکرائی بھی تھیں ؟"

"ہرگز نہیں ! ـــــ مگر میں وثوق کے ساتھ یہ بھی نہیں کہہ سکتی، ممکن ہے کوئی اضطراری حرکت اس قسم کی ہو گئی ہو"

"تم اچھّی آدمی نہیں ہو، صوفیہ ! بیچارا رابرٹو تو کل مجھ سے تمہارا بہت ذکر کرتا رہا"

"یہی ذکر کہ صوفیہ کوئی اچھّی آدمی نہیں ہے ؟"

"جی نہیں، تمہاری خاموشی اور کم سخنی کی بابت پوچھتا تھا ؛ وہ کہتا تھا کہ تم دونوں بہنوں کی طبیعت میں یہ بُعد المشرقین کیوں ہے ؟ لیکن میں نے تمہاری نسبت ایک پورا نشریہ قصیدہ کہہ کر سُنا دیا : میں نے اُس سے کہا کہ صوفیہ مجھ سے بدرجہا زیادہ اچھی لڑکی ہے۔ مجھ سے زیادہ محبّت واُلفت کے جذبات سے لبریز ہے۔ مجھ سے زیادہ شان محبوبی رکھتی ہے اور اس میں اگر کوئی عیب ہے تو یہی کہ وہ اپنے ان تمام صفات پسندیدہ کو چھپانا چاہتی ہے ! صوفیہ

سچ کہتی ہوں۔ اُس نے انتہائی دلچسپی سے میری زبان سے تمہاری فِطرت کی تفسیر سُنی! ہاں آخر میں پھر اُس نے یہ پوچھا کہ صوفیہ آخر مجھ سے کیوں اس قدر دور دور رہتی ہے ؟"

"دور دور ؟"

"کم از کم اُس کے الفاظ یہی تھے اور تم خود ہی انصاف کرو کہ اُس نے کچھ غلط کہا ؟ ماشاءاللہ آپ اس سے کتنا خُلوص اور مُحبّت کا برتاؤ کرتی ہیں۔ لیکن میں نے تو اس معاملہ میں بھی تمہاری وکالت کی۔ سچ پوچھو تو میں نے دنیاسازی اور ظاہر داری سے کام لیا، اس لئے کہ میں نے اُس سے کہا کہ صوفیہ تو تم کو بہت پسند کرتی ہے۔ اور تمہاری در پردہ بہت ہی قدر شناس ہے!"

"لولو! تم بھی ایک ہی آفت کا پَرکالہ ہو!"

"میں جانتی ہوں کہ یہ بات صحیح نہ تھی، لیکن میں تم سے پھر کہتی ہوں کہ رابرٹو تمہارا اتنا قدرداں اور ثنا خواں ہے کہ تمہارا اُس کے ساتھ یہ مغائرت کا سلوک بڑی بے دردی اور احسان ناشناسی ہے!"

صوفیہ نے اپنی باہیں چھوٹی بہن کے گلے میں ڈالدیں اور اُس کے رُخساروں کو بوسہ دیا! لولو بھی لپٹ گئی، اور بڑے پیار اور چاؤ کے لہجہ میں کہا کہ "بہن بتاؤ تو 'بیچارے رابرٹو کی جگہ تمہارے دل میں کیوں نہیں ہے ؟"

یہ سُننا تھا کہ صوفیہ یکبارگی بہن کو چھوڑ کر پیچھے ہٹی، اور بُت بن کر رہ گئی!

"اچھا" لولو نے فوراً کہا، میں اب سمجھی، تم آج شام کی ہَوا خوری میں ہمارے ساتھ جانا نہیں چاہتی ہو۔"

"نہیں، میں نے کچھ قسم تو کھائی نہیں۔ مگر بات یہ ہے کہ میرے سَر میں درد ہے! تم امّی کے ساتھ کیوں نہیں چلی جاتیں ؟"

"میں تو روز ہی جاتی ہوں اور آج بھی جاؤں گی۔ میں اِس تفریح کا لُطف کیسے

چھوڑ سکتی ہوں ؟"

"کیا رابرٹو بھی تمہارے ساتھ جا رہا ہے ؟"

"نہیں وہ آج کلب جا رہا ہے، جہاں اس وقت ڈائرکٹروں کا ایک مشورے کا جلسہ ہونے والا ہے۔ میں اس فرصت کو غنیمت جان کر اس سے فائدہ اُٹھانا چاہتی ہوں۔ بعد میں بال میں جاؤں گی جہاں کل صبح تک مصروفِ رقص رہوں گی !"

"اور اگر کہیں اُس کو یہ معلوم ہو جائے ؟"

"اور بھی اچھا ہے ! اُس کو ابھی سے معلوم ہو جائیگا کہ میں اس معاملہ میں بالکل آزاد بے قید رہنا چاہتی ہوں، یہ کہ اگر وہ مجھ پر کسی قسم کی بندشیں عائد کرنے کا خیال رکھتا ہو تو چھوڑ دے میں اس کو کبھی گوارا نہ کروں گی کہ اُس کی عادت بگاڑ دوں !"

"مجھ کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم کو اُس سے بس برائے نام ہی محبّت ہے۔" صوفیہ نے کہا

"نہیں محبّت تو بہت سخت ہے، لیکن یہ محبّت میں اپنے ہی نقطۂ نظر سے کرنی چاہتی ہوں۔ ہاں بہن اب مجھ کو جا کر جلدی جلدی کپڑے بدلنا ہے۔ اس میں بھی تو مجھ کو کم سے کم دو گھنٹے لگیں گے۔"

صوفیہ کھڑی روانہ ہونے والی گاڑی کو دیکھ رہی ہے جس میں اُس کی ماں اور بہن سیر کو جا رہی ہیں۔ وہ اب اکیلی رہ گئی، بالکل یکہ و تنہا۔ اور اُس کی خواہش بھی یہی تھی ! بچپن کے زمانہ میں جب کبھی کوئی اُس کو ستایا کرتا تھا تو اس وقت بھی اُس کا یہی معمول تھا کہ تنہائی میں جا کر رویا کرتی تھی ! یہ پُرانی عادت اس میں آج بھی باقی تھی۔ اب وسیع ڈرائنگ روم (نشست گاہ) میں اُس کے سوا کوئی نہ تھا۔ کمرہ روشنی سے بقعۂ نور ہو رہا تھا۔ صوفیہ کے ہاتھ بے حس و حرکت تھے۔ اور اُس کا سر آرام کرسی کی پُشت سے لگا ہوا تھا۔ اُس کے چہرہ پر دلدوز غم کا نقاب تھا جس میں ایک نہایت سخت اندرونی کشمکش کی جھلک نظر آ رہی تھی ! ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس بے کسی اور تنہائی کے عالم میں اس دردناک غم کے احساس نے اور بھی شدّت اختیار کر لی ہے۔

امرِ واقعی کا ادراک جسے وہ عرصہ سے دبا رہی تھی۔ اس وقت ایک واضح اور خوفناک حقیقت بنکر آنکھوں کے سامنے تھا!

اتنے میں کسی کے پاؤں کی آہٹ ہوئی اور صوفیہ چونک پڑی۔ کیا دیکھتی ہے کہ رابرٹو ہے! نو وارد نے جب اس لڑکی کو کمرے میں اکیلا دیکھا تو وہ رُکا اور ٹھٹکا، لیکن بعد میں یہ خیال کر کے کہ گھر کے باقی لوگ دوسرے حصہ مکان میں ہوں گے وہ پھر آگے بڑھا۔ صوفیہ مضطرب ہو کر کھڑی ہو گئی!

"شام بخیر صوفیہ!"

"شام بخیر ———"

دونوں ایک کشمکش میں مبتلا تھے!

"خدایا! یہ لڑکی کس قدر ملول اور افسردہ رہا کرتی ہے!" رابرٹو نے اپنے دل میں کہا۔

اس اثناء میں صوفیہ نے اپنے ہوش و حواس درست کر لئے تھے اور اس کے چشم و ابرو ایک مرتبہ پھر متانت و وقار کی تصویر تھے! آخر کار دونوں بیٹھ گئے، لیکن ایک دوسرے سے کسی قدر فاصلہ پر!

"آپ کی والدہ اچھی ہیں؟"

"جی ہاں، اچھی ہیں، شکریہ!"

"اور لولو؟"

"وہ بھی بالکل اچھی ہے"

اب پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ رابرٹو نے ایک عجیب جذبۂ مسرت محسوس کیا جس میں تلخی کی بھی آمیزش تھی!

"تو لولو کسی کام میں ہے؟" اس نے پوچھا۔

صوفیہ کے دل میں ایک خفیف اضطراب پیدا ہوا جس کو اُس نے دبا دیا۔

"وہ امی کے ساتھ بال میں گئی ہوئی ہے۔" صوفیہ نے جواب دیا، ساتھ ہی اُس نے یہ محسوس کیا کہ رابرٹو اس پر مزید سوالات کرے گا۔

چونکہ اس وقت صوفیہ اتفاق سے بالکل تنہا تھی۔ اس لئے رابرٹو نے خیال کیا کہ یہ بڑی بے مروّتی ہوگی اگر وہ تھوڑی دیر ٹھہر کر اُس کے ساتھ باتیں نہ کرے۔ یہ خیال آنا تھا۔ کہ رابرٹو کے دل میں ایک ناقابل مزاحمت جذبہ پیدا ہوا کہ کسی طرح یہاں سے بھاگ جائے۔ تاہم اُس نے اپنی نشست سے حرکت نہ کی۔

"میں اس وقت ادھر یوں نکل آیا کہ ہمارے کلب میں آج دوستوں کی کافی جمعیت نہ تھی اور حاضرین کی مطلوبہ تعداد فراہم نہ ہوئی۔" رابرٹو نے یہ بات اس انداز میں کہی کہ گویا وہ اپنی اس وقت کی مداخلت بے جا کے لئے معذرت پیش کر رہا ہے!

"لیکن لولو آپ کی تشریف آوری کی متوقع نہ تھی، مجھے اس بات کا افسوس ہے" صوفیہ نے کہا رابرٹو نے فوراً قطع کلام کر کے کہا "خیر کوئی بات نہیں ہے!"

مگر رابرٹو کے منہ سے یہ جملہ بہت بے پروائی سے نکلا جس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ اُسے لولو کی غیر حاضری سے کوئی خاص مایوسی ہوئی۔

"اور آپ تشریف نہ لے گئیں؟" اس نے سلسلۂ گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں میں تو نہیں گئی، آپ جانتے ہیں کہ میں "بال" کی ایسی دلدادہ نہیں ہوں۔"

"آپ کا خاص شوق تو شاید مطالعہ ہے؟"

"جی ہاں یہ مجھے بہت مرغوب ہے۔"

"لیکن اس مسلسل کتب بینی سے آپ کی صحت کو تو نقصان نہ پہونچے گا؟" رابرٹو نے کہا۔

"جی نہیں میری آنکھیں کافی قوی ہیں!" یہ کہتے ہوئے صوفیہ نے ذرا تیز نظروں سے اُسے دیکھا۔

"کافی قوی ہیں، اور کافی حسین!" رابرٹو نے اپنے دل میں کہا۔ "مگر آہ ان میں کوئی جوش اور جذبہ نہیں" (صوفیہ سے) "میرا مطلب یہ ہے کہ ——"

"اخلاقی نقصان، شاید؟" صوفیہ نے اُس کی بات کاٹ کر کہا "مگر میں ایسا خیال نہیں کرتی، جس قسم کی کتابیں میرے مطالعہ میں رہتی ہیں اُن سے مجھ کو بہت سکون قلب حاصل ہوتا ہے۔"

"تو کیا تم سکون قلب کی محتاج ہو؟!"

"ہم سب ہی اس آبِ حیات کے پیاسے ہیں!"

صوفیہ کی آواز عارفانہ متانت کے لہجے میں ڈوب گئی؛ رابرٹو کو اس میں بڑا لطف آیا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اس مزے سے وہ پہلی بار لذّت اندوز ہو رہا ہے۔ آج وہ اُس پُراسرار عورت کی آنکھوں سے دوچار ہے جو ابھی تک اُس کے لئے مکتوب سربستہ کا حکم رکھتی تھی اور جو اس وقت اپنے ہر لفظ سے اور ہر ادا سے اپنی مخفی ہستی کے اوپر سے نقاب اُٹھا رہی تھی صوفیہ کا تکلف اور سرد مہری اس وقت رخصت ہو چکی تھی؛ وہ اس وقت ایسی ازخود رفتہ تھی کہ اس کا وقار و تمکنت تھوڑی دیر کے لئے معطّل ہو گیا تھا، چنانچہ گرمیٔ کلام اور ذوق گفتگو میں وہ بار بار رابرٹو کو نظر بھر بھر کے دیکھتی بھی تھی، کبھی کبھی مسکرا بھی دیتی تھی، اور اُس سے بالکل ایک دوستانہ انداز میں سرگرمِ گفتگو تھی! اس سے پہلے اُن کے باہمی تعلقات کس قسم کے تھے! اور اس وقت کیا رنگ نظر آ رہا تھا!!

"لیکن جب میں کوئی کتاب پڑھا کرتا ہوں" رابرٹو نے کہا، "تو مجھ کو اس بات کی بیحد جستجو رہتی ہے کہ خود مصنف کی ہستی اور حقیقت کو معلوم کروں اور یہ پتہ لگاؤں کہ اس کی سیرت و سرشت کیسی ہے، آیا وہ بھی دُنیا کے علائق سود و زیاں میں حصّہ دار رہا ہے، آیا اُس نے بھی عشق و عاشقی کی ہے، اور آیا وہ بھی ہجر و وصال کی لذّت سے آشنا ہوا ہے ——"

"میرا خیال ہے کہ آپ کا یہ اصول تنقید غلط فہمی پر مبنی ہے؛ کتابیں لکھنے والے "جگ بیتی" سُناتے ہیں۔ "آپ بیتی" نہیں کہتے!"

"اور یہ غالباً خودداری اور وقار کی بنا پر؟" رابرٹو نے رائے دی۔

"نہیں بلکہ رشک و رقابت سے" صوفیہ نے تصحیح کی، "جہاں تک میرا خیال ہے یہی بات ہے؛ بعض مُعاملات ایسے ہوتے ہیں جن میں انسان یہ گوارا نہیں کرسکتا کہ اس کا رازِ عشق نہاں خانۂ دل سے نکلکر گوشِ اغیار تک پہونچے۔"

صوفیہ نے جس وقت یہ لفظ کہے اُس کی آواز میں کوئی تغیّر پیدا نہ ہوا، اُس کے چہرے پر صاف گوئی کے آثار ہُویدا تھے، اُس کا لہجہ بالکل معصومانہ اور مخلصانہ تھا۔ رابرٹو کو اس "حدیث دیگران" میں "سرّ دلبران" کی جھلک نظر آتی تھی! رابرٹو کے لئے اب کوئی بات تعجب خیز نہ تھی، اور ہر چیز قدرتی اور توقع کے مُطابق نظر آتی تھی؛ حتّٰی کہ اُس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اُس پُراَسرار روح رکھنے والی لڑکی صوفیہ کے ساتھ اُس کی یہ شام کی صحبت بھی گویا ایک نوشتۂ تقدیر اور اَمرِ الٰہی تھا! جس وقت وہ جُدا ہوئے ہیں تو دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا گویا کہ وہ اس طرح سے مزید اطمینان کرنا چاہتے ہیں کہ انھوں نے ایک دوسرے کی روح کا بھید معلوم کرلیا ہے۔ رخصتی کے وقت صوفیہ نے مصافحے کیلئے ہاتھ بڑھایا۔ رابرٹو نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اُسے جُھک کر بوسہ دیا! اب اس گرمجوشانہ مُلاقات کا آخری لمحہ آگیا اور دونوں نے ایک دوسرے کو خُداحافظ کہا۔"

جب صوفیہ کی موجودگی اور گفتگو کی طِلسمی فضا ختم ہوگئی تو رابرٹو کا دل و دماغ ایک شدید کشمکش میں مُبتلا ہوگیا۔ بہ یک وقت خوش و خرّم بھی تھا، اور ملول و غمگین بھی! وہ مرجانے پر آمادہ تھا، لیکن ساتھ ہی ایک مژدۂ حیات بھی اُس کے کانوں میں پہونچ رہا تھا! اُس کا دماغ بالکل کام نہ کرتا تھا کہ لولو کے متعلق کیا رائے قایم کرے، اپنی حالت کو کیا سمجھے اور اپنے مستقبل کے بارے میں کس نتیجے پر پہونچے۔

صوفیہ بہت خوش ہے، بہت ہی خوش ہے! چنانچہ اسی غیر معمولی جذبہ خوشی سے مغلوب ہوکر وہ زار و قطار رونے لگی! اس عالم میں اُس کا سر پھر اپنے بستر کے تکیوں میں چھپ گیا تھا!

(۴)

تین مہینے گذر گئے ہیں اور لولو کی شادی برابر ملتوی ہوتی رہی ہے - لولو کی ماں جو اس التوا و تاخیر کا راز سمجھنے سے قاصر تھی بار بار لولو کو تخلیہ میں لیجاتی اور اس گو مگو کا سبب پوچھتی لیکن لولو ہمیشہ یہی جواب دیتی کہ :

"میں ابھی انتظار کرنا چاہتی ہوں ؛ مجھ کو رابرٹو کے دل و دماغ سے پوری واقفیت حاصل کرنے کی ضرورت ہے !"

واقعہ یہ ہے کہ اس لڑکی میں بھی غور و فکر کے آثار پیدا ہو گئے تھے ! اُس کی زندگی، میں بظاہر کوئی تغیر نہیں ہوا تھا' وہ پہلے کی طرح گایا کرتی تھی، ہنستی تھی، مذاق کرتی تھی لیکن وقتاً فوقتاً وہ اپنے ان زندہ دلانہ مشاغل کو ترک کر دیتی تھی اور اس اثنا میں اپنی بہن کی فطرت کا مُطالعہ کرتی ! یا رابرٹو کے ایک ایک لفظ کو غور سے سنتی ! لوگ اُسے اکثر اس حال میں دیکھتے کہ اُس کے ہونٹ بھچے ہوئے ہیں، اور بھویں کھنچکر آپس میں مل گئی ہیں - یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ اہم مسائل پر غور کر رہی ہے -

پھر لولو ہونے والے واقعات کو دیکھتی، اُس کے گرد و پیش عجیب و غریب واردائیں پیش آ رہی تھیں ! رابرٹو میں اب وہ مادیت اور ہشاشی و بشاشی باقی نہیں رہی ہے، بلکہ وہ متفکر، مغموم، زرد اور مضطرب الحال سا نظر آتا ہے ! وہ بہت کم سخن ہو گیا ہے اور جو کچھ مختصر سی گفتگو کرتا بھی ہے تو اُس سے ایک بے خودی اور خود فراموشی ٹپکتی ہے ! جن چیزوں سے اُس کو پہلے غیر معمولی دلچسپی تھی اَب اُن سے وہ کسی ذوق و التفات کا اظہار نہیں کرتا ! کبھی کبھی بہت سخت جد و جہد کے بعد وہ اپنی اس غیر حالت پر قابو حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے، اور وہی پچھلا رابرٹو بن جاتا ہے - لیکن یہ قلب ماہیت محض آنی ہوتی ہے اور چند لمحوں سے زیادہ باقی نہیں رہتی ! وہ کبھی "بننے" کا عادی نہ تھا - اور اس قسم کی کوششوں میں ہمیشہ بُری طرح ناکامیاب ہوا کرتا تھا - سچ یہ ہے کہ اُس کے قلبی اضطراب

اور اُس کی روحانی کوفت کی غمازی، اُس کی آنکھیں کیا کرتی تھیں!

ہاں ان دنوں صوفیہ بھی کچھ بدلی بدلی سی نظر آتی تھی! یعنی ایک مضطر و مضطرب صوفیہ، جو کبھی جوشِ محبت میں اپنی بہن کو سینہ سے لگاتی اور کبھی کئی کئی گھنٹے اس حالت میں گذار دیتی کہ اس کو نہ دیکھتی، اور نہ دیکھنا کیا معنی اس سے گریزاں سی نظر آتی! اس کے چہرے پر شرم و حیا کی اضطراری کیفیت سُرخی بن کر جھلکتی اور معاً غائب ہو جاتی۔ اُس کی آنکھیں شعلہ افشانی کرتیں اس کی آواز کبھی گہری اور جوشیلی ہوتی، اور کبھی خشک و خشن! عالمِ جذب و جوش میں اُس کے ہاتھ کانپنے لگتے۔ اُس کی راتوں کی نیند حرام ہو گئی؛ لولو آدھی رات کے وقت اُٹھتی، اور برہنہ پا صوفیہ کی خوابگاہ کے دروازہ پر کان لگا کر سنتی اور بہن کو بے چینی سے کروٹیں بدلتے اور روتے پاتی۔ لولو پوچھتی: "بہن کیسی طبیعت ہے؟" مگر ہمیشہ ایک ہی جواب تھا کہ "کچھ نہیں لولو!"

جب رابرٹو اور صوفیہ آپس میں ملتے اور اُن کی یہ مُلاقات بلا ناغہ روزانہ ہوتی، تو جو انقلاب دونوں کی دنیائے دل میں پیدا ہو گیا تھا وہ اُس وقت اور بھی نمایاں ہو جاتا! گفتگو برائے نام ہی ہوتی؛ جوابات یا تو اضطراری انداز میں دئے جاتے یا وہ بالکل مبہم اور بے معنی سے ہوتے! عجب انوکھے طریقے سے وہ ایک دوسرے پر نظریں ڈالتے، کبھی کبھی تو ایسا ہوتا کہ ملاقات کی پوری پوری شامیں سکوتِ مطلق میں گذر جاتیں، اور کوئی ایک کلمہ بھی دونوں کی مہرِ خاموشی کو نہ توڑتا! لیکن ساتھ ہی دونوں ایک دوسرے کی حرکات و سکنات کے مطالعہ میں غرق پائے جاتے! وہ کبھی پہلو بہ پہلو نہ بیٹھتے، لیکن یہ ضرور دیکھنے میں آتا کہ جس کتاب کو صوفیہ کی اُنگلیوں نے مَس کر دیا ہوتا اُسکو رابرٹو کسی نہ کسی حیلہ سے ہاتھ میں اُٹھا لیا کرتا! بعض اوقات جب صوفیہ کمرے میں نہ آتی تو رابرٹو لمحہ بہ لمحہ مُضطرب ہوتا جاتا اور بند دروازوں کی طرف رُخ کر کے فرضی سوالات کا ایک خود فراموشی کے لہجہ میں جواب دیا کرتا! کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ صوفیہ کو آئے ہوئے ابھی پانچ ہی منٹ ہوئے ہوں گے کہ رابرٹو اپنی

ہیئت سنبھالتا اور چل دیتا! لڑکی روز بروز زرد پڑتی جاتی تھی، اور اُس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے! آخر کار اُس نے ارادہ کر لیا کہ کسی کو منہ نہ دکھائے گی۔ چنانچہ ہر ہفتہ کسی نہ کسی دن شام کے وقت وہ کمرے میں بند ہو کر بیٹھ جاتی جہاں وہ بے صبر و بے تاب لرزاں و مرتعش نظر آتی، اور اپنی سوزشِ قلب سے سُلگا کرتی!

ایک دن شام کو لولو کمرے میں داخل ہوئی، اور اُس نے صوفیہ کو مخاطب کر کے کہا:

"کیا اس وقت میرے لئے ایک کام کرو گی؟"

"تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟"

"مجھ کو اس وقت ایک خط لکھنا ہے، مگر رابرٹو باہر کھڑا انتظار کر رہا ہے؛ تم اِتنا کریں کہ ذرا وہاں چلی جائیں اور اُس کے پاس بیٹھیں، کیوں جاؤ گی؟"

"لیکن میں ——————"

"بہن کیا اس کمرے میں پڑی پڑی اپنے کو ہلاک کر لو گی؟! کیا میری اتنی سی بات مان لینے میں تم کو کوئی بڑی قربانی کرنی پڑے گی!"

"اچھا پھر تم جلدی چلی آؤ گی؟" صوفیہ نے پوچھا۔

"مجھے تو بس چند سطریں لکھنے کے لئے چند منٹ چاہئیں"

صوفیہ نے باہر کی طرف رُخ پھیرا؛ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس سخت آزمایش کے لئے وہ اپنا جی کڑا کر رہی ہے! وہ اُٹھی لیکن دروازہ تک پہونچ کر ٹھہر گئی؛ رابرٹو باہر چبوترے پر اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا: آخر اُس نے ہمت کی اور قدم بڑھاتی ہوئی اُس کے پاس جا پہونچی۔

"لولو نے مجھے بھیجا ہے" اُس نے زیرِ لب آواز میں کہا۔

"مگر تم کو یہاں آنے میں اپنے آپ پہ بہت جبر کرنا پڑا ہو گا!"

"جبر؟! - نہیں تو!"

صوفیہ کے سارے بدن میں رعشہ ہے۔ رابرٹو اس کے قریب ہی کھڑا ہے، اُس کے

چہرے کی ہیئت ایک خاص جذبہ نے بدل دی ہے!

"صوفیہ! میں نے تمہارے ساتھ کیا کیا ہے؟" رابرٹو بولا۔

"جی کچھ نہیں، آپ نے کیا کیا ہے؟ للٰلّٰہ! میری طرف ان نظروں سے نہ دیکھئے! میں التجا کرتی ہوں، ہاتھ جوڑ کے کہتی ہوں!"

"صوفیہ، تم جانتی ہو کہ تم میرا دل لے چکی ہو! بالکل لے چکی ہو!!"

"اُف چُپ رہو، رابرٹو، چُپ رہو! خدا کے لئے ایسا کلمہ مُنہ سے نہ نکالو! تم سوچتے نہیں کہ اگر لولو ہماری باتیں سُن پائے ________"

"مجھ کو لولو سے محبت نہیں! اب میں تمہارا دلدادہ ہوں!"

"آہ! یہ غدّاری! یہ بے وفائی!!"

"میں اس جُرم کا مُعترف ہوں، لیکن اَب تو مَیں تمہارا عاشق ہوں! اچھا اب مَیں جاؤں گا ________"

"خوب!" لولو کمرے کے دوسرے دروازے میں کھڑی ہوئی دور سے چلّائی، "خوب! آج تو تم دونوں میں صلح نامہ سا ہو گیا ہے!"

اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ صوفیہ بھاگی، اور اس نے اپنا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا! لیکن رابرٹو بالکل بے حس و حرکت کھڑا کا کھڑا رہ گیا؛ اس کے سکوت وجمود کا یہ حال تھا کہ گویا وہ ایک سنگی مجسمہ ہے!

"رابرٹو!" لولو نے پکارا۔

"لولو"

"یہ تمہیں ہو کیا گیا ہے؟!"

"کچھ نہیں؛ اب جاتا ہوں"

اور بغیر اُس کی اجازت وہ چل کھڑا ہوا! روانہ ہوتے وقت وہ یاس و دلشکستگی کی

ایک تصویر تھا! لولو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی، وہ حیران کھڑی ہوئی تھی، اور خیالات میں مستغرق!

"اُف! میں یہاں اور وہ وہاں!" لولو کی زبان آہستہ سے متحرک ہوئی، لیکن اس افسانۂ عشق کا ماضی کتنا شاندار تھا! خیر، کچھ نہیں!

ہر چہ بادا باد حرفے چند میگویم بہ او　　　کار خود در عاشقی ایں بار یکسو می کنم!"

---

(۵)

"اور بس ان تمام قوی دلائل اور اہم مصالح کی بناء پر میں اب رابرٹ مانٹی فرنیکو سے شادی نہیں کر سکتی" لولو نے آخر کار اپنی ماں سے کہہ دیا!

"یہ کس قدر نامعقول دلائل ہیں! بیٹی ذرا ان کے مہمل پن پر تو غور کرو!" ماں نے اپنا سَر ہلا کر کہا۔

"ماں! بس قصّہ مختصر یہ ہے کہ میں آپ سے صاف صاف کھلی کھلی بات کہتی ہوں کہ رابرٹو کی ذات میں اب میری مسّرت قلب کا کوئی سامان نہیں ہے۔ اور میں نے طے کر لیا ہے کہ اُس کے ساتھ ہرگز شادی نہ کروں گی!"

یہ باتیں صاف صاف اور کُھلی کُھلی تو ضرور ہیں، لیکن ایک وہم وجنون سے زیادہ نہیں! تم جانتی ہو کہ رابرٹو تم سے مُحبّت کرتا ہے"!

"خیر اگر وہ مجھ سے مُحبّت بھی کرتا ہے تو اُس کی

طبیعت کو ہوگا قلق چند روز　　　سنبھلتے سنبھلتے سنبھل جائیگی!"

"لیکن تم اس بات کو بھول جاؤ گی کہ تمہارے اور اس کے درمیان قول و قرار ہو چکے ہیں؟!"

"ہم اپنے قول و قرار کو واپس لے لیں گے؛ اب وہ زمانہ نہیں کہ لوگ جبراً شادی

کرنے پر مجبور کئے جائیں!"

"دنیا کیا کہے گی؟!"

"اماں! ذرا اِس "دنیا" کی تعریف تو کرنا!"

"یہی سب لوگ!"

"مجھے بتائیے کہ یہ "لوگ صاحب" کون بزرگ ہیں؟! مجھے ان کی خدمت میں اب تک نیاز حاصل نہیں ہوا! میں ان "حضرت لوگ" کی اتنی مرہونِ منّت نہیں ہوں کہ اُن کی خاطر اپنی ساری زندگی کو تلخ کرلوں!"

"کس قدر آتش کا پرکالہ ہو! لیکن اب مجھے بتاؤ کہ رابرٹو سے میں کس طرح معاملہ طے کروں؟ میں اُس سے کہوں تو کیا کہوں؟"

"جو چاہیئے کہدیجئے، آپ کو اختیار ہے، آپ میری ماں ہیں۔"

"آہ! کیا یہ میرا فرض ہے کہ تم نے جو اندھے پنے سے غلطیاں کی ہیں اُن کا خمیازہ میں بھگتوں؟! افسوس کیسی رسوائی ہو گی!"

"میں رسوائی کی رسومات کو نہیں مانتی؛ بہتر ہے کہ آپ اس سے یہ بات مہذب طریقہ سے نرمی کے ساتھ کہدیں؛ میرا تو یہ خیال ہے کہ آپ اُس سے میری برائی بھی کر سکتی ہیں اُس سے کہیئے کہ لولو ایک شکی طبیعت کی خفیف الحرکات اور طفلانہ مزاج لڑکی ہے؛ کہدیجئے کہ بحیثیت بیوی کے وہ بہت بُری ثابت ہو گی؛ کہیئے کہ اُس میں قطعاً متانت نہیں ہے۔ نیز یہ کہ وہ شان وقار سے بالکل خالی ہے اور یہ کہ لولو کی بہن ——————"

"لولو کی بہن؟! تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا ہے!"

"اجی! آپ بڑی آسانی سے یہ کہہ سکتی ہیں؛ فی الحال رابرٹو اور صوفیہ ایکدوسرے سے بے تعلق سے ہیں۔ لیکن اگر ان کی راہ ورسم اور جاری رہی اور وہ ایک دوسرے کے مذاق سے زیادہ واقف ہوئے تو پھر انہیں ایک دوسرے سے وحشت نہ رہے گی۔ وہ

ایک دوسرے کے قدر دان اور مدّاح ہو جائیں گے، اور پھر ـــــــــ کون کہہ سکتا ہے کہ کیا ہوگا؟! اور آپ کی بھی تعریف ہوگی کہ کتنی اچھی ماں تھی جس نے آخر بڑی ہی لڑکی کو پہلے بیاہا!"

"سچ کہتی ہو! ـــــــــ"

"اور میں بھی بے شوہر کے نہ رہوں گی اور ابھی اس کے لئے کون جلدی ہے؛ میں بمشکل اٹھارہ برس کی ہوں گی۔ ابھی تو چند روز تک میں تفریح کرنا چاہتی ہوں، ابھی کچھ دنوں ناچوں گی کودوں گی۔ اور اپنی پیاری ننھی سی ماں کے ساتھ اپنی جوانی کا لطف اٹھاؤنگی!"

"تم بھی آفت ہو آفت!" ماں نے کہا اور یکبارگی مُحبّت سے مغلوب ہو کر لولو کو گلے سے لگا لیا۔

"شکر ہے کہ آپ میرے نقطۂ نظر کو سمجھ گئیں! اچھا اب یہ نا ملائم خبر ملائمت و خوبصورتی کے ساتھ رابرٹو کو پہونچا دیجئے۔ لیکن یہ کہیئے کہ ہم اب بھی آپس میں دوست رہیں گے، اگر رابرٹو اور صوفیہ ایک دوسرے کے عشق میں مُبتلا ہو جائیں تو اُن کو ہونے دیجئے۔ جو چیز مقدّر ہو چکی ہے اس کو کون روک سکتا ہے؟

"لیکن نٹ کھٹ لڑکی! تجھے یقین ہے کہ معاملات صلح و آشتی کے ساتھ ہمارے حسبِ مرضی ہی طے پا جائیں گے، اور کوئی مشکل پیش نہ آئے گی؟ تم جانتی ہو کہ میں جھگڑے سے کتنا بھاگتی ہوں؟"

"میری پیاری ماں! میں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں اور آپکی بدعقیدگی کا کیا علاج کروں؟ آپ تو سینٹ ٹامس سے بھی زیادہ منکرانہ دماغ رکھتی ہیں! ہاں مجھکو جو وسیع تجربہ ان معاملات میں حاصل ہے اس کی بنا پر میں کہہ سکتی ہوں کہ کوئی بدنامی کی صورت پیش نہ آئے گی۔ رابرٹو ایک شریف آدمی ہے اور وہ کبھی مجھ سے یہ تقاضا نہ کرے گا کہ میں بغیر مُحبّت کئے اُس سے شادی کرلوں!"

"جو چیز مجھ کو ناممکن نظر آتی ہے وہ متوفیہ کا معاملہ ہے ـــــــــــ"

"اماں، کوئی چیز ناممکن چیزوں سے زیادہ ممکن نہیں!" لولو نے بڑی عالمانہ شان متانت سے کہا۔

"پیاری لولو! ایک ہی وقت میں اتنے فلسفیانہ ملفوظات کا ڈھیر نہ لگا دو! بس اتنا ہی بہت ہے! ہم کو یہ سارے پیچیدہ معاملے مستقبل پر چھوڑ دینا چاہئیں، شاید وقت ہی ہماری بگڑی کو بنا سکتا ہے۔ لیکن یہ جو کچھ بھی ہو ہمیں تو کلام نہیں کہ تمہارا دماغ صحیح نہیں ہے!"

"ہاں میں بہت وہمی ہوں ـــــــ"

"وہمی تو کیا، مگر یہ تمہاری خامکاری ہے، اور قوت فیصلہ کی غلطی"

"نہیں نہیں، میں پرلے درجہ کی وہم پرست ہوں۔ آپ جو کچھ فرمائیں مجھے قبول ہو مجھکو وعظ و پند سنائیے تنبیہ کیجئے۔ میں ان سب باتوں کی مستحق ہوں، ہاں ہاں! کہئیے، رک کیوں گئیں؟ میں تو منتظر ہوں، کیا آپ کے پاس اب کچھ اور کہنے کو نہیں؟"

"پیاری آؤ۔ مجھے ایک بار پیار کرنے دو اور پھر جا کر سو رہو! شب بخیر!"

"شکریہ اماں، شب بخیر"

(۶)

"خیر چلو اچھا ہے" لولو کی ماں نے اپنے دل میں کہا، "لولو ابھی کم سن بھی ہے اور ہم آئے دن ان کم سن لڑکے لڑکیوں کی شادیوں کا انجام دیکھتے رہتے ہیں۔ خدا ہم کو ان افسوسناک نتائج سے بچائے رکھے! ہاں، مصلحت یہی ہے!"

"واہ وا!" لولو نے چونک کر اپنے دل میں کہا" واہ میں نے کس حکمت عملی سے کام لیا اور والدہ کو قائل کرنے میں اس فن لطیف کی کیسی داد دی! میں تو ایک بہت اچھی

غزل

از مولٰنا آزاد سبحانی

اس ضعف کا کیا کہنا بخشے جو توانائی
اس یاس کے میں صدقہ دی جس نے شکیبائی

ہے مذہب اُلفت کا آئین جُدا گانہ
سرمستی ہے ہشیاری نادانی ہے دانائی

عشاق کا سرمایہ، ناطاقتی و پیری
سرمایہ معشوقاں رعنائی و زیبائی

ہر درد پہ ہنگامے ہر رنج پہ فریادیں
اور اس پہ ہے حضرت کو دعوائے شکیبائی

ہر قید سے بے قیدی، ہر وضع سے بے وضعی
رکھنا ہے یہی مشرب بننا ہے جو شیدائی

عاشق کو ہر اک جلوہ بس جلوۂ جانانہ
مجنوں کی نگاہوں میں ہر جلوہ تھا لیلائی

ہم عاشق صادق ہیں ہم ننگ کے دشمن ہیں
ہم ڈھونڈتے پھرتے ہیں بدنامی و رسوائی

ہر شمع ہے پروانہ ہر ہوش ہے دیوانہ
کیا طرفہ تماشا ہے یہ انجمن آرائی

کوئی نہیں جز تیرے، تو اور تیری شانیں
عارف کی نظر میں ہے یہ معنئ یکتائی

وہ جلوہ نما ہر جا، میں جلوہ طلب ہر جا
ہر جگہ میسر ہے اُن کی مری یکجائی

ہر رنج کے شکوے بھی ہر جور پہ طعنے بھی
کس مُنہ سے پھر اپنے کو کہتا ہے تمنائی

اِک بندۂ عاجز کی فریاد نہیں سنتا
سچ کہنا مرے دارا، کیا ہے یہی دارائی

سبحانئ وحشی کو معذور رکھے خلقت
دیوانہ ہے دیوانہ، سودائی ہے سودائی

ولہٗ

کوئی ایسا ہے جسے کہئے کہ یہ با ہوش ہے
جو بھی ہے اس بزم میں وہ سر بسر مدہوش ہے

ساری مے میخانۂ عالم کی ہو جاتی ہے صرف
بیشک اس میخانہ میں کوئی بڑا مے نوش ہے

یہ سبق دیتا ہے دریا کو سمندر کا خروش
جس میں جتنا مادّہ ہے اتنا وہ پُر جوش ہے

یہ وہ مے خانہ ہے جسکی ہائے دہو ہے دائمی
دل کے خم خانہ میں ہر دم شغل نوشا نوش ہے

دل کی اس افسردگی پہ کھا نہ دہوکا اے حریف
شعلہ ہی تو ہے اگرچہ شعلۂ خاموش ہے

قتل ہوتے ہیں مسلمانوں کے ہاتھوں سے حُسینؑ
وائے اس دنیا پہ جب مسلم بھی ناحق کوش ہے

رحم کے قابل ہے تیرا حالِ زار اے مردِ عشق
بار ہے کونین کا اور تیرا نازک دوش ہے

اس کے رنج و غم کا پیمانہ ہی کیا جانچے کوئی
یہ مریضِ عشق جو آٹھوں پہر بیہوش ہے

محویت میں ہو چکا ہوں ساری دنیا سے الگ
التفاتِ یار میں ہوں اور تری آغوش ہے

دیکھتی ہے لغزشیں اور پردہ در ہوتی نہیں
وہ نگاہِ رحم دیکھو کتنی لغزش پوش ہے

دل سے بالکل محو کر دے دوش کو ماضی پرست
فکرِ فردا کر کہ بے انجام ذکرِ دوش ہے

ہو بھی تو دلکش کوئی نغمہ بیان و پند کا
رند مستغرق کا تو ہر رونگٹا اک گوش ہے

کس کو ساغر میں ملی ہے اور کس کو اوک میں
اس ذرا سے فرق پر کیوں میکشو یہ جوش ہے

کوئی کیف اس دہر کا لُطفِ بقا رکھتا نہیں
جو ہے یاں صرفِ فنا ہی نیش ہے یا نوش ہے

کاٹتا ہے زندگی سبحانی اب اس وضع سے
سر بکف، زنجیر در پا، و کفن بر دوش ہے

غزل

از حضرت درد۔ کاکوری

رواں ہیں اشک اور ہر دم کلیجہ مُنہ کو آتا ہے
الٰہی خیر ہو دل کی یہ آخر ماجرا کیا ہے

ورق حسرت کا ہے دست الم میں اللہ دل غمگیں
نہ وہ بزم شبانہ ہے نہ وہ ذوق تمنا ہے

رواں ہیں اشک، چہرہ پر اُداسی، پھول دامن میں
الٰہی کون بہر فاتحہ مدفن پہ آیا ہے

خبر دیتا ہے ہر دم جاذبہ موج تنفس کا
کہ پھر مہجور قطرے کیلئے بیتاب دریا ہے

سر محفل دلوں میں پھونک دی ہے آگ سی جس نے
یہ سوز دل ہے یا ساز جگر کا اِک ترانا ہے

ترے صدقہ نہ پنہاں ہو ابھی اے جلوۂ پنہاں
ترے قرباں ابھی تجھکو کہاں جی بھر کے دیکھا ہے

جگر میں ٹیس، لب پر آہ، اشک آنکھوں میں دل زخمی
ہمارا قلب، یا اِک محشر انگیز تمنا ہے

کہیں روز ازل حُسن ازل کو دیکھہ پایا تھا
سبب یہ ہے جو ہر دم درد دل اپنا تڑپتا ہے

ولہ

باز بکوئے من گذر، کرد کہ کرد یار کرد
باز بسوئے من نظر، کرد کہ کرد یار کرد

باز زتیغ غمزہ ہا، کشت کہ کشت یار کشت
ظلم وستم بریں جگر، کرد کہ کرد یار کرد

باز لبوئے بسملاں، دید کہ دید یار دید
باز بخستگاں نظر، کرد کہ کرد یار کرد

برق جمال بر دلم، ریخت کہ ریخت یار ریخت
باز لعشق شور وشر، کرد کہ کرد یار کرد

دعوتِ جذب بیخودی، داد کہ داد یار داد
بیخودو دوست وبے خبر، کرد کہ کرد یار کرد

سوز و گداز درد دل، داد کہ داد یار داد
باز زناز یک نظر، کرد کہ کرد یار کرد

تنقید و تبصرہ

کتب :-

ہندوستان کے معاشرتی حالات - اسلام اور غیر اسلام
اسلام اور غلامی - مختصر تاریخ گجرات

ہندوستان کے معاشرتی حالات | مجموعۂ خطبات علامہ عبداللہ یوسف علی صاحب۔ شائع کردہ ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد، قیمت عہر

پچھلے برس ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد کی دعوت پر جناب عبداللہ یوسف علی صاحب نے ہندوستان کے ازمنہ متوسطہ کے معاشرتی اور اقتصادی حالات پر متعدد خطبات دیے تھے جن کو اب ہندوستانی اکاڈیمی نے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ عبداللہ یوسف علی صاحب کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ تاریخ اور معاشیات انکے خاص مضامین ہیں۔ جو لوگ تاریخ ہند سے ذوق رکھتے ہیں وہ ان خطبات کو نہایت دلچسپ اور مفید پائیں گے۔ طلبہ کو خصوصیت کے ساتھ ان سے استفادہ کرنا چاہیئے۔ پہلے خطبے میں عبداللہ یوسف علی صاحب نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ ہندوستان کی تاریخ کے مختلف ادوار قائم کئے ہیں اور پھر ازمنہ متوسطہ کے تین حصے قرار دیکر دوسرے تیسرے اور چوتھے خطبات میں یکے بعد دیگرے ساتویں صدی دسویں اور گیارہویں صدی اور چودھویں صدی عیسوی (اس لئے کہ ازمنہ متوسطہ کے یہی تین حصے ہیں) کے معاشرتی اور اقتصادی کوائف پر نہایت دلچسپ انداز میں نظر ڈالی ہے۔ عبداللہ یوسف علی صاحب کے یہ خطبات معلومات کا ایک بے بہا گنجینہ ہیں

اور جو لوگ ان سے مدد لیکر اپنے مطالعہ کو وسعت دینے کی کوشش کرینگے۔ انکے علم میں یقیناً قابل قدر اضافہ ہوگا۔ اس لئے کہ جناب عبداللہ یوسف علی صاحب نے ہماری توجہ جن مسائل کیطرف منعطف کرائی ہے وہی دراصل تاریخ کی جان ہیں۔ ہماری زبان میں حروب وسنین کے متعلق تو غالباً بہت کافی کتابیں موجود ہوں گی لیکن ایک رسالے کی شدید ضرورت تھی جس کے مطالعہ سے علم دوست طبقہ تاریخ ہند کے اصلی مسائل کیطرف توجہ کرتا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جناب عبداللہ یوسف علیصاحب کے ان قابل قدر خطبات نے اس ضرورت کو بوجہ احسن پورا کر دیا ہے۔ ابتدا میں تمہید کے طور پر انہوں نے کتابت وطباعت کی بحث چھیڑتے ہوئے حامیان اردو کو مشورہ دیا ہے کہ وہ ٹائپ سے بے اعتنائی نہ برتیں بلکہ جہانتک ہوسکے اسے "حسین وجمیل" بنانے کی کوشش کریں۔ ہماری رائے میں انکا یہ مشورہ نہایت مفید ہے۔

اسلام اور غیر مسلم | از محمد حفیظ اللہ صاحب پھلواردی۔ قیمت ۸/ اور ۳/ ملنے کا پتہ:۔
اسلام اور غلامی | مسلم بکڈپو پھلواری شریف (پٹنہ)

یہ دو نہایت ہی مفید رسالے ہیں جن میں مولوی محمد حفیظ اللہ صاحب نے بڑی خوش اسلوبی سے ان الزامات کی تردید کی ہے کہ اسلام کی اشاعت بزور شمشیر عمل میں آئی یا یہ کہ اسلام نے غلامی کو جائز ٹھہرایا ہے۔ مسلمانوں کے لئے ان دونوں رسالوں کا مطالعہ بہت مفید ثابت ہوگا۔ مولوی حفیظ اللہ صاحب نے اپنا مطلب بڑی خوبی سے ادا کیا ہے اور جابجا قرآن پاک، احادیث اور مسلم اور غیر مسلم مورخین کے بیانات اپنے دعوے کی تائید میں پیش کئے ہیں۔

مختصر تاریخ گجرات | مصنفہ سید ابوظفر صاحب ندوی پروفیسر مہاودیالے، مطبوعہ مطبع معارف اعظم گڈھ۔ مصنف سے مہاودیالے احمدآباد (گجرات) کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

یہ تاریخ گجرات پر ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جس میں ابوظفر ندوی صاحب پروفیسر

مہاود یالے نے بچوں کی واقفیت کے لئے راجگان وسلاطین گجرات کے مختصر حالات جمع کر دیے ہیں آخر میں تحریک ترک موالات اور کسی قدر انگریزی عہد کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ ہماری رائے میں یہ کتاب بچوں کے لئے کچھ بہت زیادہ مفید نہیں اس لئے کہ محض واقعات اور سنین کے مطالعہ سے بچوں کے دماغ پر کچھ اچھا اثر نہیں پڑتا۔ بہتر ہوتا اگر کتاب کو زیادہ دلچسپ بنانیکی کوشش کیجاتی۔

رسائل واخبار :۔

ادبی دنیا ۔ کامیابی ۔ جدت ۔ دولت کونین ۔ موٹر کار ۔ مومن

ادبی دنیا لاہور | ماہوار باتصویر رسالہ زیر نگرانی سر عبدالقادر۔ چیف ایڈیٹر تاجور صاحب نجیب آبادی۔ ایڈیٹر حنیف صاحب ہاشمی۔ تقطیع ۲۰×۲۶/۴ حجم تقریباً نوے صفحے۔ کاغذ اچھا لکھائی چھپائی اوسط درجے کی سرورق بہت خوشنما سالانہ چندہ مع محصول ڈاک ۱۲/ ہے

بڑی خوشی کی بات ہے لاہور سے ایک اور قابل قدر ادبی رسالہ نکلا ہے۔ اس کے دو نمبر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سلامت مذاق اور تنوع مضامین کے لحاظ سے دوسرے رسالوں سے سبقت لیجائے گا۔ اس قیمت میں بڑے سائز پر عمدہ مضامین کے نوے صفحے شائقین ادب کے لئے ایک ایسی نعمت ہے جسے وہ یقیناً ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ اس رسالے میں اور کئی خصوصیات ہیں جو اسے دوسرے رسالوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ تصویروں کے انتخاب میں خوش مذاقی سے کام لیا جاتا ہے۔ دنیا کی بہت سی زبانوں سے چیدہ ادبی ٹکڑوں کا ترجمہ شائع ہوتا ہے۔ آخر میں ایک فرہنگ ہوتی ہے جس میں مشکل الفاظ کے معنی دئے جاتے ہیں۔

ہم اس رسالے کی ادارت کو چند مخلصانہ مشورے دینا چاہتے ہیں۔ ایک تو یہ

کہ رسالے کا سائز اتنا بڑا نہ رکھا جائے۔ اس سے دیکھنے والے مرعوب تو ضرور ہوتے ہیں مگر مانوس نہیں ہوتے۔ دوسرے یہ کہ دوسری زبانوں سے جو ترجمے دئے جاتے ہیں وہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں تک محدود نہ ہوں بلکہ مکمل قصے یا مضامین ہوں جن سے اس زبان کی خصوصیات کا اندازہ ہو سکے۔ یہ ضرورت نہیں کہ ہر پرچے میں تمام دنیا کی زبانوں سے ترجمے موجود ہوں۔ باری باری سے تین چار زبانوں کے ترجمے چھاپے جا سکتے ہیں۔ آخر میں ہمیں یہ کہنا ہے کہ ارباب ادارت کو زبان کے معاملے میں زیادہ احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ زبان کی خوبی ادب کی جان ہے۔

کامیابی دہلی | ماہوار رسالہ زیر ادارت ڈاکٹر سعید احمد صاحب بریلوی۔ تقطیع ۲۰×۳۰ حجم ۴۸ صفحے۔ لکھائی چھپائی نفیس کاغذ عمدہ سرورق بہت خوشنما قیمت سالانہ ؏

یہ اپنے طرز کا بالکل نیا رسالہ ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں میں عزم و استقلال، کسب حلال کا شوق اور کامیابی کا ولولہ پیدا کیا جائے۔ مضامین کا انتخاب اور ترتیب قابل داد ہے۔ بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ اصلاحی مضامین خشک نہیں ہیں بلکہ زبان کی سلاست اور روانی نے انہیں شگفتہ بنا دیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ڈاکٹر سعید احمد صاحب جیسے ادیب کی نگرانی میں یہ رسالہ اونچے ادبی معیار پر قائم رہے گا۔

جو دو پرچے اب تک نکلے ہیں ان میں مضامین زیادہ تر ادبی ہیں یا اصلاحی۔ غالباً آئندہ پرچوں میں ایسے مضامین بھی شائع ہونگے جن سے تجارت، زراعت اور دوسرے پیشوں میں کامیابی کے ذرائع معلوم ہوں۔ کامیابی کا ترانہ سنانے کے ساتھ کامیابی کی راہ دکھانا بھی ضروری ہے

روزنامۂ جدت | چیف اڈیٹر سید شبیر حسن صاحب قتیلؔ۔ ملنے کا پتہ۔ روزنامہ جدت لکھنؤ لکھائی چھپائی متوسط۔ کاغذ بھی متوسط۔ بڑا سائز۔ چندہ سالانہ لعہ ششماہی صہ فی پرچہ ۱ر

کسی ملک میں آجکل کثرت سے اخبارات کا شائع ہونا اس کے مہذب اور تعلیم یافتہ

ہونیکی سب سے بڑی دلیل ہے اس لحاظ سے ہمارے ملک میں جس کثرت سے اخبارات شائع ہوں اسی قدر ہماری نیکنامی ہے۔

ہمارے سامنے اس وقت روزنامہ جدت کا دوسرا نمبر ہے۔ کاغذ اور صفحات کے لحاظ سے اس کی ایک پیسہ قیمت بہت ہی کم ہے۔ اودھ کے باشندوں کے لئے یہ نایاب موقع ہے کہ کم سے کم قیمت میں ایک روزنامہ کا مطالعہ کرسکتے ہیں۔

مضامین کی ترتیب اور زبان بھی خاصی ہے۔ لیکن ایک اخبار کا جہاں یہ فرض ہو کہ وہ اپنی ظاہری زیبائش کو قائم رکھے۔ اپنی باطنی خوبیوں کو بھی برقرار رکھنا چاہئے۔ شاید جدت اس آخری خوبی کو اس نمبر میں قائم نہیں رکھ سکا۔ ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ جدت کو جانبدارانہ جذبات سے علٰحدہ رہکر خدمت قوم کرنا چاہئے

دولت کونین | اڈیٹر جناب مفتی محمد نعیم صاحب فاضل دیوبند۔ ملنے کا پتہ لودھیانہ (پنجاب) سائز ۲۰×۲۶/۸ قیمت سالانہ ۶؍ فی پرچہ ۴؍

یہ ایک مذہبی رسالہ ہو۔ اس میں کثرت سے وہی مضامین درج ہوتے ہیں۔ جن سے مسلمانوں کی اصلاح مقصود ہوتی ہے۔ خاص خاص مہینوں کی مناسبت سے ان کی خصوصیات اور انکے متعلق احکامات بھی درج کئے جاتے ہیں۔ مفتی صاحب موصوف ایک اسلامی درسگاہ کے مہتمم بھی ہیں۔ اس لئے اس رسالے کے اجراسے غالبًا ان کا مقصد یہ بھی ہوگا کہ اس درسگاہ سے لوگوں کو روشناس کرایا جائے۔

موٹر کار | اڈیٹر عبدالرحیم صاحب۔ چندہ سالانہ رؤسا سے ۳؍ عوام۔ طلبہ اور موٹر ڈرائیوروں سے ۱۲؍۔ سائز چھوٹا۔ ملنے کا پتہ۔ اڈیٹر موٹر کار گورکھپور (یو۔پی)

رسالہ موٹر کار کی تیسری کا نمبر ۲-۲۶ ہمارے سامنے ہیں۔ اس کا مقصد مشنیوں کے متعلق عمومًا اور موٹر کار اور موٹر سائیکل کے متعلق خصوصًا معلومات فراہم کرنا ہے۔

نام کے پڑھنے سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ اس میں سارے مضامین موٹر ہی کے متعلق

ہونگے لیکن ایسا نہیں ہے۔ دلچسپی کے لئے غزلیات اور ادبی مضامین بھی درج کئے جاتے ہیں۔ ایک ایسے شہر سے جو ادب اردو کے لئے مشہور نہ ہو ایسے مختلف اور مجتمع المقاصد رسالہ کا نکلنا قابل مبارکباد ہے۔

رسالہ مومن | اڈیٹر مولوی حافظ وحی الدین احمد۔ ملنے کا پتہ اڈیٹر رسالہ مومن منگل بازار ہزاری باغ (بہار) سالانہ چندہ ۱۲ ممالک غیر سے ۲ فی پرچہ ۳

خدا کا شکر ہے کہ مسلمانوں نے بھی اب ایسی زبان کیطرف توجہ کی ہے جو تقریباً انہیں کی ہے

رسالہ مومن اس کا کافی ثبوت ہے۔ یہ رسالہ ہندی رسم الخط میں شائع ہوتا ہے اس میں مضامین بہت سادے اور مذہبی رنگ لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہم مسلمانوں کو خاص طور پر مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اس رسالہ کو ضرور خریدیں۔ بشرطیکہ وہ ہندی سمجھ لیتے ہوں۔

شذرات

جامعہ کا یہ نمبر مئی کے نمبر کے بعد چند ہی روز کے وقفہ سے شائع ہو رہا ہے امید ہے کہ انشاء اللہ اگست کے مہینے میں بھی اسی طرح دو نمبر شائع ہوں گے۔ اور رسالہ اپنے معمولی وقت پر آجائے گا۔

جب سے رسالہ کی اشاعت مقررہ وقت سے پیچھے ہو گئی ہے قارئین کرام مسلسل شکایت اور تقاضے کے خطوط لکھ رہے ہیں۔ اس سے ہمیں شرمندگی بھی ہے اور خوشی بھی۔ شرمندگی تو ظاہر ہے کہ اپنے تصور پر ہے مگر خوشی اس بات کی ہے کہ ہمارے رسالے کے پڑھنے والے اسے شوق سے پڑھتے ہیں اور اگر کسی نمبر کے پہونچنے میں دیر ہو تو پہلے انتظار۔ اور پھر شکایت اور تقاضا کرتے ہیں۔ بظاہر یہ معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے مگر ادارت جامعہ کے خیال میں بہت غنیمت ہے۔ کہ جامعہ کے سے خشک رسالے سے کچھ حضرات تو دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس رسالے کی کوشش ابتدا ہی سے یہ ہے کہ جتنے مضامین پیش کئے جائیں، وہ علمی شان، ادبی لطف اور سلامت مذاق سے خالی نہ ہوں۔ اس کے علاوہ بلند تر اخلاقی اور مذہبی مقاصد بھی پیش نظر ہیں۔ اگرچہ ابھی کل مضامین اُس معیار تک نہیں پہونچے جو مدیران جامعہ اور مُربیان جامعہ نے قایم کیا ہے پھر بھی عام سطح سے رسالہ ضرور اونچا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی اشاعت محدود ہے اور اس کے قدردان کم ہیں۔ لیکن ہمیں اس کمی کا افسوس نہیں۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ رسالے کے پڑھنے والے حضرات وہی ہوں جو معیار کے بلند ہونے کی شکایت نہیں بلکہ بلند تر ہونے کی تاکید کریں۔

ہمارے موقر ہمعصر رسالہ "کامیابی" کے جولائی نمبر میں مکرمی ڈاکٹر سعید احمد صاحب نے جامعہ ملیہ کے کارکنوں کو بہت مفید مشورہ دیا ہے۔ صحیح مشورہ بڑی قیمتی چیز ہے خصوصاً جب مشورہ دینے والے کا دل خلوص اور ہمدردی سے لبریز ہو۔ ممدوح کی رائے یہ ہے کہ جامعہ والے شہر سے دور کسی گاؤں میں ایک بستی بسائیں، جہاں جامعہ کے بچوں اور اُستادوں کے علاوہ بچوں کے والدین بھی رہ سکیں اور جامعہ کے کارکنوں کے ساتھ اس تعلیمی تجربے میں شریک ہوں جو وہ کررہے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جامعہ کے لوگوں کے پیش نظر جو نصب العین ہے یعنی وہ تعلیم جو زندگی کی صحیح تفسیر ہو وہ تربیت جو عقیدے اور عمل پر مبنی ہو وہ سادگی جو رُہبانیت کی حد تک نہ پہونچے وہ مذہبیت جس میں تنگ خیالی اور تعصب کی بُو نہ ہو وہ روشن خیالی جو لامذہبی اور بے اصولی سے پاک ہو، وہ حُبّ وطن جو اسلام کی وسعت نظر کے منافی نہ ہو وہ قوم پرستی جو خدا پرستی سے نہ روکتی ہو اس کے حاصل کرنے کے لئے یقیناً "موجودہ تہذیب و تمدن" کی فضا سے باہر رہنا ضروری ہے۔ یہ فضا نفرت، عداوت، بغض و حسد، شک و شبہہ، پست خیالی اور پست ہمتی کی زہریلی ہواؤں سے مسموم ہو رہی ہے۔ اس سے دور رہنا ہماری صحت کے لئے بلکہ زندگی کے لئے ضروری ہے۔ جامعہ کے کارکنوں کے دل میں بہت دنوں سے یہ ارادہ ہے۔ اور وہ دہلی کے قرب و جوار میں مناسب جگہ تلاش کررہے ہیں۔ مدیر "کامیابی" کے یہ الفاظ انھیں اپنے خیال میں اور پختہ اور اپنے ارادے میں اور مستقل کردیں گے۔

مگر اکثر مفید اور اہم تجاویز کی طرح اس تجویز کے ساتھ بھی بہت سے خطرات

وابستہ ہیں جن سے بچنے کے لئے بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ تمام تعلیمی اور اصلاحی کاموں کا اصل مقصد یہی ہوتا ہے کہ پوری قوم کی زندگی کو سُدھاریں۔ اگر اصلاح کی کوشش کرنے والے ایک چھوٹی سی جماعت کے ساتھ آبادی سے دور جابسیں تو یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں ان کا رشتۂ تعلق ہیئت اجتماعی سے منقطع نہ ہو جائے۔ اور اگر تعلق باقی بھی رہے مگر صرف اتنا کہ وہ کشمکش زندگی سے الگ بیٹھے تحریروں اور کتابوں کے ذریعہ اصلاحی تدابیر بتایا کریں تو اس سے کچھ زیادہ کام نہیں چلتا۔ ضرورت اس کی ہے کہ وہ اجتماعی زندگی میں جہاں تک ممکن ہو، عملی حصّہ لیں اور اپنے بھائیوں کے دوش بدوش ساری کڑیاں جھیلیں۔ جو شخص حیاتِ قومی کی کشتی کو منجدھار سے نکالنا چاہتا ہے اس کے لئے یہ کافی نہیں کہ کنارے پر کھڑا ملّاحوں کو ہدایتیں دیتا رہے بلکہ اس کا کام یہ ہے کہ کشتی میں رہ کر کشتی والوں کو تسکین دے۔ ملّاحوں کا ہاتھ بٹائے اور اُن کی ہمّت بڑھائے۔

اگر یہ مقصد آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے پائے تو تعلیمی اور علمی مقاصد کیلئے گوشہ نشینی میں کوئی ہرج نہیں۔ تعلیم کے لئے بچّوں کو عام زندگی کے شور و شر سے بچا کر ایک گوشۂ عافیت میں رکھنا ایسا ہی ہے جیسے باغبان چھوٹے پودوں کو طوفان ابر و باد کی زد سے باہر کسی گرم خانہ میں یا محفوظ کیاریوں میں رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے۔ کہ یہ حفاظت عارضی ہے ایک دن ان پودوں کو سورج کی گرمی۔ آندھی کی تیزی اور پانی کے طوفان کا مقابلہ کرنا ہے لیکن اس کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ جب ان کی جڑوں میں زندگی کا رس دوڑ جائے گا اور مضبوطی و استحکام پیدا ہو جائے گا تو وہ عناصر کے حملوں کی تاب نہ لا سکیں گے اور وہ اس کا خیال رکھتا ہے کہ جیسے جیسے اُن کی نشوونما مکمل ہوتی جائے وہ انھیں آہستہ آہستہ ان قوتوں کی مقاومت کی مشق کراتا جائے

جن سے اُنھیں عمر بھر کا سابقہ ہے۔

اگر جامعہ ملیّہ والے اپنی تجویز پر جسے مدیر "کامیابی" کی تائید حاصل ہے عمل کریں تو انھیں ان سب باتوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔ "بے ہمہ اور با ہمہ" کی راہ صرف صوفیوں ہی کے لئے دشوار گزار نہیں بلکہ ہر سالک زندگی کو اس کی صعوبت کا احساس ہوتا ہے لیکن بے اس کٹھن مرحلے سے گزرے چارہ بھی نہیں ہے۔

جنوبی جرمنی کے شہر میونک میں ایک نیم سیاسی اور نیم علمی ادارہ جرمن اکاڈمی کے نام سے قائم ہوا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ جرمنی کے قومی ادب کو ترقی دے، غیر ممالک کو جرمنی کی علمی خدمات سے آگاہ کرے اور بین الاقوامی سیاسی مباحث میں جرمنی کی قلمی حمایت کرے۔ اس اکادمی نے ابھی حال میں تین وظائف کا اعلان کیا تھا جو ان ہندوستانی طالب علموں کو دئے جائیں گے جنھیں ہندوستان میں تعلیم ختم کرنے کے بعد میونک یونیورسٹی میں طب، انجینیری، اور کیمیا یا طبعیات میں ریسرچ کرنے کا شوق ہو۔

یہ غالباً پہلا وظیفہ ہے جو کسی یورپ کی یونی ورسٹی نے ہندوستانی طالبعلموں کے لئے مخصوص کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جرمن اکادمی کو جیسا اس نے اعلان کیا ہے ہندوستانیوں کی مہماں نوازی کا احسان اُتارنا ہے جو اُنہوں نے میونک یونیورسٹی کے چند طالب علموں کے ساتھ برتی تھی لیکن پھر بھی ہمارا یہ فرض ہے کہ اس کا تہ دل سے شکریہ ادا کریں۔ غریب ہندوستانیوں کو کون اس قابل سمجھتا ہے کہ اُن کی حقیر خدمات کا مُعاوضہ دے۔

اخباروں میں روز یہ خبر آرہی ہے کہ روس اور چین کے تعلقات بہت کشیدہ ہیں اور ان دونوں میں عنقریب جنگ شروع ہونے والی ہے بلکہ باوجود باقاعدہ اعلان جنگ نہ ہونے کے ایک آدھ معرکہ ہو بھی چکا ہے ان خبروں سے ان سب لوگوں کو سبق حاصل کرنا چاہیئے جو سمجھتے ہیں کہ روس خلوص کے ساتھ ایشیائی قوموں کی آزادی اور ترقی کا حامی ہے اور بغیر اپنی کسی غرض کے ان کی مدد کرنے کو موجود ہے۔

کچھ دن پہلے جب چین کے قوم پرستوں کی جماعت جنوبی حصہ ملک پر قبضہ کرنے کے بعد شمالی مستبدوں سے سرگرم پیکار تھی تو روس نے ایثار کے لمبے چوڑے دعووں کے ساتھ ان کی مدد کا وعدہ کیا اور کچھ تھوڑی بہت مدد کی بھی لیکن بہت جلد اس ایثار کی حقیقت کھل گئی اور معلوم ہو گیا کہ روسی جو مددگار بن کر آئے تھے مالک بنکر رہنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ غریب قوم پرستوں کو ایک وقت میں دو دشمنوں کا بلکہ متعدد دشمنوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ایک طرف تو شمالی مستبد حکومت کا دوسری طرف بالشویکوں اور ان سادہ لوح یا بدنیت چینیوں کا جو ان کے اثر میں تھے اور تیسری طرف دول یورپ کا جو خفیہ سازشوں کا جال پھیلا رہی تھیں خدا نے ان کی مدد کی اور چینی قوم ان اندرونی اور بیرونی دشمنوں پر غالب آئی۔ لیکن اب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی مشکلات کا خاتمہ نہیں ہوا ہے بلکہ اسے پھر ان دشمنوں سے ایک ساتھ یا علیحدہ علیحدہ مقابلہ کرنا ہو گا۔

جو لوگ یورپ کی سیاسی تاریخ سے واقف ہیں انھیں روس کے قول و فعل میں یہ اختلاف دیکھ کر کوئی تعجب نہیں ہوتا۔ یورپ میں مدتوں سے یہ قاعدہ چلا آتا ہے کہ کسی ملک کے نظام حکومت کی اندرونی تبدیلیوں سے سیاست خارجیہ میں

کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فرانس میں جب وہ عظیم الشان انقلاب ہوا جس نے
تمام دنیا میں تہلکہ مچا دیا اور صدیوں کی جمی ہوئی شاہی حکومت کو چند دنوں
میں نیست و نابود کر کے جمہوری حکومت کی بنیاد رکھی تو کیا اس کی بیرونی سیاسی
پالیسی بدل گئی؟ تاریخ سے پوچھئے تو وہ کہے گی ہرگز نہیں۔ فرانس کی زمین کی
بھوک اور قوت کی ہوس نہ صرف نپولین کے زمانہ میں بلکہ نپولین کے بعد بھی بدستور
باقی رہی اور آج تک باقی ہے۔ اسی طرح روس کے جو ارادے اور حوصلے ہمیشہ
سے چلے آرہے ہیں ان میں اشتراکی انقلاب سے کسی طرح کی کمی نہیں ہوئی۔ بلکہ اور
زیادتی ہو گئی ہے۔ کیونکہ روس کی فوجی طاقت اب پہلے سے بہت زیادہ ہے
روس کا دانت چین، ہندوستان، ایران، ٹرکی پر جیسے پہلے تھا اب بھی ہے۔

ایشیا والوں کو خصوصاً ہندوستانیوں کو یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ قوموں
کے اندر مختلف جماعتوں میں خواہ کتنا ہی اختلاف ہو لیکن غیر قوموں کے مقابلے
میں اُنہیں اپنی عصبیت قایم رکھنا پڑتی ہے اور اسی پر ان کی زندگی منحصر ہے۔
روس کی بالشویک حکومت ہو یا انگلستان کی لیبر حکومت کسی سے یہ توقع رکھنا
کہ وہ اپنے ملک کے مفاد کو پس پشت ڈال کر کسی اصول یا کسی نصب العین
کی حمایت میں ایشیا کی کمزور قوموں کا ساتھ دے گی بڑی نادانی ہے۔
بفرض محال اگر کسی مُلک کی حکمراں جماعت اس ایثار پر آمادہ بھی ہو جائے تو
عام قوم اُس جماعت کو ایک دن بھی برسر حکومت نہ رہنے دیگی۔